رجسٹرڈ نمبر ایس ۱۰۴۳

قیمت

۸ر

تصانیف نیاز فتحپوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اُس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔

قیمت دو روپیہ (عہ/)

علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں ۳۲۔ افسانے ۱۹۳۳ء تک کے درج ہیں۔ زبان قدرت بیان علو تخیل اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے

قیمت چار روپیہ (للعہ)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے ایک روپیہ کم

مکتوبات نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شائع ہوئے ہیں نیز وہ جو شائع نہیں ہوئے جذبات نگاری اور سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں یہ بالکل پہلی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں مع تصویر حضرت نیاز ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شایع ہوئی ہے۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (عہ۸/)

علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان اس کی تخیل اس کی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشا عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ/)

علاوہ محصول

اُردو شاعری

یعنی جنوری ۳۵ء کا نگار جس میں اُردو شاعری کی تاریخ، اس کی عہد بہ عہد ترقی اور ہر زمانے کے شعرا پر بسیط نقد و تبصرہ کیا گیا ہے مع انتخاب کلام، اس کی موجودگی میں آپ کو کسی اور تذکرہ دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور جس میں سات مضامین اڈیٹر نگار کے لکھے ہوئے ہیں حجم ۲۵۶ صفحات۔ قیمت عہ/ علاوہ محصول

ہندی شاعری

یعنی جنوری ۳۶ء کا نگار جس میں ہندی شاعری کی تاریخ اور اس کے تمام ادوار کا بسیط تذکرہ موجود ہے اس میں تمام مشہور ہندو شعراء کے کلام کا انتخاب مع ترجمہ کے درج ہے۔ ہندی شاعری کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ مقصود ہو تو اُردو میں آپ کے لئے صرف یہی ایک مجموعہ کافی ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہ/

"نگار" جنوری ۳۷ء

(۱) "ڈرامہ اصحاب کہف" یہ ڈرامہ مصری انشا پرداز توفیق الحکیم کی کتاب "اہل الکہف" سے ماخوذ و مقتبس ہے اور تنہا یہی ایسی چیز ہے جو آپ کے ذوق انشا و تخیل کو آسودہ کرنے والی ہے۔ اس کے علاوہ (۲) اسکر وائلڈ کے خطوط جو اُس نے سارہ (مشہور ایکٹرس) کو لکھے تھے اور جو دنیائے ادب و انشاء میں خاص مرتبہ کی چیز سمجھے جاتے ہیں۔ وائلڈ اپنے طرز انشا و ندرت بیان کے لحاظ سے یوروپ میں جس مرتبہ کا شخص شمار ہوتا تھا اسکا اندازہ آپ ان خطوط سے کرسکتے ہیں (۳) مسئلۂ خلافت و امامت" (آزادیٔ خیال شیعی کے قلم سے) مسئلۂ خلافت و امامت لاکھ قدیم و لاینحل سہی پھر بھی اس سلسلۂ تحقیق و جستجو میں بعض ایسی باتوں کے نکلنے کا امکان ہے جن سے مفاہمت کی کوئی صورت پیدا ہوسکے چنانچہ اس سلسلہ کا یہ پانچواں مقالہ ہے اسکے بعض عنوان یہ ہیں:۔ مسئلۂ خلافت کے مبادی مقدمات نفس مسئلۂ خلافت۔ مسئلۂ خلافت کے فروع و جزئیات وغیرہ ——— صفحات ۱۴۴ —— قیمت عہ/ علاوہ محصول

"نغمۂ کارواں" کا حصہ عدم گنجائش کے باعث اس مہینے کے پرچے میں شایع نہیں ہو سکا

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شایع ہو جاتا ہے
رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا
سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (سے)
بیرون ہند سے بارہ شلنگ آٹھ روپیہ (سے) سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد (۳۴)	فہرست مضامین جولائی ۱۹۳۸ء	شمار (۱)

ملی ہر قی قوام (تسابکرۂ خوری قیمتی فی توارعہم) جو قطعاً نزلہ نہیں پیدا کرتا - شیخ

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

شمار - ۱	جولائی ۳۸ سنہ ء	جلد - ۳۴

ملاحظات

لکھنؤ اور شیعہ سنّی نزاع

دنیا میں اختلاف ہمیشہ رہا ہے اور رہیگا اور غالبًا یہ کہنا نادرست نہ ہوگا کہ نوعِ انسانی کی ترقی بہت کچھ اسی "اختلاف" کی ممنون کرم ہے، لیکن ساتھ ہی اس کے ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اسی اختلاف نے ملک کے ملک ویران کردئے اور قوم کی قوم کو تباہ کرکے رکھدیا ــــ اختلاف وہی ایک مگر نتیجے دو؟ اس کے سمجھنے کے لئے ذہن انسانی کی گزشتہ تاریخ کا مطالعہ کیجئے

اختلاف دو قسم کا ہوا کرتا ہے، ایک ذہنی اور دوسرا اعتقادی۔ ذہنی اختلاف سے میری مراد اُن دو آزاد ذہنوں کا اختلاف ہے جن میں سے ہر ایک حق وحقیقت کی جستجو چاہتا ہے اور اعتقادی اختلاف سے مراد اُن دو مذہبی جماعتوں کا اختلاف ہے، جن میں سے ہر ایک ذہنی غلامی میں مبتلا ہے اور دوسرے سے محض اپنی روایات کو تسلیم کرانا چاہتا ہے

وہی قسم اول کا اختلاف ہے جس نے حکماء و فیلسوف، مخترع و موجد دنیا میں پیدا کئے اور یہی دوسری قسم کا اختلاف ہے جس نے انسانیت کو شل کرکے رکھدیا۔ سنی شیعہ اختلاف بھی یہی روایتی اختلاف ہے، جس کا تعلق ذہن کی آزادی سے نہیں ہے بلکہ صرف ان معتقدات سے ہے جن کو ہم نے بغیر ذاتی فکر و تدبر کے صحیح باور کرلیا ہے اور جن کے خلاف سننے کی تاب [illegible] نہیں لاسکتی، بہرحال یہ تو اُصولی گفتگو ہے جس کا یہ محل نہیں اس وقت دیکھنا صرف یہ ہے

کہ لکھنؤ میں جو یہ نزاع پیدا ہوئی ہے اس میں واقعی غلطی کس کی ہے اور فساد کا اصل ذمہ دار کس کو قرار دیا جائے گا

سُنّی کہتے ہیں کہ ہم خلفاء کو اچھا سمجھتے ہیں اس لئے ہمیں علی الاعلان اس کے ظاہر کرنے کا حق حاصل ہے، شیعہ کہتے ہیں کہ ہم اُن کو بُرا سمجھتے ہیں اس لئے ہمیں بھی اُن کو بُرا کہتے پھرنے کا حق پہونچتا ہے۔ اس مسئلہ کو آپ اگر کسی منصف حاکم کے سامنے پیش کریں گے تو وہ یقیناً یہی فیصلہ صادر کرے گا کہ علی الاعلان نہ تم خلفاء کو بُرا کہو نہ وہ اچھا کہیں اور یہی اصل روح ہے اس فیصلہ کی جو یو۔پی کی حکومت نے کیا ہے، لیکن شیعہ اس پر مطمئن ہیں اور سُنّی نہیں ہیں۔ عام طور پر اس بحث کے سلسلہ میں سنیوں کی طرف سے عقلی یا اخلاقی استدلال یہ پیش کیا جاتا ہے کہ دنیا میں کسی کی تعریف کرنا اتنا بُرا نہیں ہو سکتا جتنا اسکو گالیاں دینا، لیکن اس قسم کی حجتوں سے سنّی اسوقت کام لے سکتے جب خود اُن کے تمام عقاید عقل پر قایم ہوتے، معاملہ مذہب کا ہے جس میں عقل کو دخل نہیں اس لئے کسی عقلی حجت سے کام لینے کا حق نہ سنیوں کو حاصل ہے نہ شیعوں کو، دونوں جیسے ہیں، ویسا ہی ان کو سمجھ کر فیصلہ کرنا ہوگا

حکومت یقیناً مذہبی آزادی کی طرفدار ہے، لیکن اگر یہ آزادی فتنہ و فساد کی باعث ہو، تو بیشک اس آزادی کو چھین جانا چاہئے اور اس بنا پر اگر "مدح صحابہ" کے لئے یہ پابندی عاید کی گئی ہے کہ پہلے اس کی اجازت حاصل کر لینا ضروری ہو تو میں اس کو انتہائی نرم حکم سے تعبیر کروں گا، ورنہ فیصلہ تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ مدحِ صحابہ قطعاً ممنوع ہے۔ اس مسئلہ میں یہ بحث اُٹھانا کہ عقاید کے لحاظ سے شیعہ قابل استحسان ہیں یا سُنّی، بالکل بے محل ہے، دیکھنا صرف یہ ہے کہ ان میں کون اپنے مسلمات مذہب سے ہٹ کر آگے بڑھنا چاہتا ہے، خواہ وہ کتنے ہی لغو و مہمل کیوں نہ ہوں

تھوڑی دیر کے لئے مان لیجئے کہ شیعہ کا خلفاء کو بُرا کہنا یا بُرا سمجھنا، نہایت رکیک حرکت ہے، لیکن اس کا انکار سُنّی بھی نہیں کر سکتے کہ یہ اُن کے مسلک و مذہب کی بنیاد ہے اور آج سے نہیں بلکہ اسی وقت سے جب واقعۂ کربلا[1] پیش آیا، لیکن کیا کوئی سُنّی کہہ سکتا ہے کہ خلفاء یا صحابہ کی مدح و ثنا میں جلوس نکالتے پھرنا یا کوئی مخصوص بزم قایم کر کے اس کا اعلان کرنا اسکے مذہب میں داخل ہے۔ یہ تو خیر صحابہ کا معاملہ ہے، میں کہتا ہوں کہ خود رسول اللہ کی شان میں بھی اس انداز سے قصاید مدحیہ پڑھنا یا ذکر میلاد کی صحبتیں برپا کرنا سنیوں کے ایمان و مذہب میں داخل نہیں

اب رہا سنیوں کا یہ استدلال کہ آزاد شہری ہونے کی حیثیت سے ان کو مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ جن کو وہ اچھا کہتے ہیں انکو اچھا نہ کہیں، سو اس میں شک نہیں کہ ان کی یہ دلیل خاصہ وزن رکھتی ہے، لیکن اگر اسی کے مقابلہ میں شیعہ یہ کہیں (اور ان کا کہنا بالکل حق بہ جانب ہوگا) کہ وہ صحابہ کو بُرا کہنے کا حق مذہب کے لحاظ سے بھی رکھتے ہیں اور آزاد شہری ہونے کے لحاظ سے بھی، تو کسی کے پاس اس کا کیا جواب ہوگا۔ ہر چند بظاہر یہ بات بہت عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ "اچھا کہنے اور بُرا کہنے" کو

---

[1] ممکن ہے شیعہ حضرات اپنے مذہب کی ابتدا وفات رسول کے بعد ہی سے قرار دیں، لیکن میرے نزدیک شیعوں کی اجتماعیت نے مذہب کی حیثیت واقعۂ کربلا کے بعد اختیار کی ہے۔

ایک ہی درجہ کی چیز قرار دیجائے، لیکن جب سوال دلآزاری کا آجائے گا تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ شیعہ کے کانوں کے لئے مدحِ صحابہ وہی حکم رکھتی ہے جو سُنّیوں کے لئے تبرّا

دنیا کا کوئی فیصلہ ہو، نفسیاتی حقیقت کو اس سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا پھر کون ہے جو دشمن کی تعریف سُنکر ناخوش نہ ہوگا اور اس کی دلآزاری نہ ہوگی۔ شیعوں کو نفسِ مدح صحابہ سے کوئی عناد نہیں ہے بلکہ اس اسپرٹ یا رُوح سے ہے جو اس کے ذریعہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ سُنّیوں کا موجودہ اصرار ضد اور ہٹ کے سوا کچھ نہیں، کیونکہ یہ انھیں خود بھی معلوم ہے کہ مذہب کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ اور لکھنؤ میں ۹ء سے قبل کبھی یہ بدعت نہیں دیکھی گئی

میں نے خود یہ جلوس دیکھے ہیں اور اُن والنیٹروں کو بھی دیکھا ہے جو اپنے آپ کو گرفتار کرا دینے کے لئے باہر نکلتے ہیں، ان کے ساتھ میں نے وہ الفاظ بھی سُنے ہیں جن کے ذریعہ سے "مدحِ صحابہ" کا فرض انجام دیا جاتا ہے، سچ عرض کرتا ہوں کہ جب یہ منظر میرے سامنے آیا ہمیشہ "ثم رددناہ اسفل سافلین" کی تصویر نگاہوں کے سامنے آگئی

شیعہ سُنّی کا مذہبی اختلاف تو خیر قیامت تک دور نہیں ہو سکتا، لیکن مذہب کی بنا پر تمدنی و معاشرتی تعلقات کو خراب کر لینا اتنی بڑی حماقت ہے کہ شاید مذہب بھی اس کو برداشت نہیں کر سکتا حالانکہ عقل کا حامی وہ بھی نہیں ہے

ہرچند حکومت فتنہ و فساد کو روک سکتی ہے، وہ ایسے قانون وضع کر سکتی ہے جو دو لڑنے والوں کو ایک دوسرے سے دور رکھ سکے، لیکن یہ جو کچھ ہوگا عارضی ہوگا، ناقابلِ اطمینان ہوگا۔ حقیقی امن و سکون اُسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب خود جماعت کے اندر اس کا احساس پیدا ہو جائے اور یہ بغیر رواداری کے ممکن نہیں

اپنے جذبات کے مقابلہ میں دوسروں کے جذبات کی رعایت آسان نہیں لیکن انسانیت کا اقتضاء بہرحال یہی ہے اور جب تک ہم اس پر کاربند نہ ہوں صرف "حیوانِ ناطق" ہیں، انسان نہیں ہیں

اب رواداری کے باب میں یہ کہنا کہ فلاں جماعت تو اس سے کام لے اور فلاں نہیں، ذرا خلافِ اصول ہے، رواداری کے معنی ہی ہیں دونوں فریق کا ایک دوسرے کی طرف جُھکنا، اس لئے صحیح معنے میں رواداری کی شان اُسوقت پیدا ہو سکتی ہے جب دونوں اپنی اپنی جگہ ایثار سے کام لیں، لیکن اگر کوئی ایک فریق اس کے لئے طیار نہیں تو اس کے معنے یہ نہیں کہ دوسرا بھی طیار نہ ہو۔ اگر شیعہ (باوجود اس کے کہ خود حضرت علی کی زندگی یکسر مسالمت اور رواداری کی زندگی تھی) اس پر آمادہ نہیں تو نہ ہوں۔ سُنّیوں کو وسعت نظر سے کام لیکر ایثار دکھانا چاہئے اور انھیں اعلان کر دینا چاہئے کہ چونکہ شیعوں کے لئے مدح صحابہ باعث دلآزاری ہے اس لئے ہم اس کو ترک کئے دیتے ہیں

یہ سنیوں کی اتنی بڑی اخلاقی فتح ہوگی کہ شیعہ حضرات خود اپنی مغلوبیت کو چند دن میں محسوس کرنے لگیں گے اور ہو سکتا ہے کہ اس کا ردّ عمل یہ ہو کہ وہ بھی مدح صحابہ کو گوارا کر لینے کا اعلان اپنی طرف سے کر دیں

شیعہ سُنّی، بہرنوع ایک ہی جسم کے اعضاء ہیں، ایک ہی قوم کے افراد ہیں، ایک ہی خدا اور رسول کے ماننے والے ہیں

ان کو ایک دوسرے کے ساتھ ملکر رہنا پڑے گا اگر وہ اپنی سلامتی چاہتے ہیں، اُن کو یہ مذہبی تعصبات ترک کرنا ہوں گے، اگر وہ زندہ رہنا چاہتے ہیں، ورنہ قانونِ قدرت جس کی زد سے نہ کوئی رسول بچا ہے نہ آلِ رسول، نہ خلفاء اس کا مقابلہ کر سکے ہیں نہ صحابہ اب بھی وہی ہے جو پہلے تھا اور انسے کبھی اس کشتی کو ساحل تک نہیں پہونچایا جس کے بیٹھنے والوں نے خود ساحل تک پہونچنے کی کوشش نہیں کی۔

کانگرس سے ہم کیا چاہتے ہیں

پچھلے چھپنے نگار میں، مختصراً میں نے کانگرسی حکومتوں کی اس ذہنیت کا ذکر کیا تھا جو ہندو مسلم کشیدگی میں اضافہ کا باعث ہو رہی ہے، اور اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا تھا کہ کانگرس نے اپنا نصب العین چاہے "پورنا سوراج" مقرر کیا ہو یا "مزاج" لیکن جن ہاتھوں میں اس کی قسمت کا فیصلہ ہے وہ ہندوستان کے لئے مستعمراتی آزادی سے زیادہ کچھ نہیں چاہتے۔ اس میں شک نہیں کہ مستعمراتی آزادی ایک نوع کی آزادی ضرور ہے لیکن ہے بہرحال وہ غلامی ہی کی ایک قسم جس میں ہمیشہ اکثریت کو فایدہ اور اقلیت کو نقصان پہونچتا ہے تا آنکہ یا تو اقلیت اکثریت کے ساتھ شامل ہو جائے یا اس کے لئے مخصوص تحفظات قایم کر دئے جائیں

میں نے تحفظات کی پالیسی کو کبھی مفید سمجھا اور نہ جداگانہ انتخاب کو، کیونکہ ان کی بنیاد بے اعتمادی ہے اور دو قوموں کے تعلقات جب تک اعتماد پر قایم نہ ہوں، آپس کا اختلاف کبھی مٹ نہیں سکتا۔ اسی لئے میں نے نہ کبھی "مسلم لیگ" کی طرفداری کی اور نہ مسٹر جینا کے مطالبات کی، کیونکہ اس قسم کا سودا نتیجہ کے لحاظ سے ہمیشہ نقصان رساں ثابت ہوتا ہے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ مسلمان ہندوؤں کے اخلاق اور اپنی قوت پر بھروسہ کرکے شریک ہوتے اور متفقہ عزم کے ساتھ ملک کی آزادی کے لئے کوشش کرتے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا، یہاں تک کہ آج کانگرس کا مفہوم ہی "ہندو جماعت" ہوکر رہ گیا ہے

ایسا کیوں ہوا اور اس غلطی کا ذمہ دار کون ہے؟ یہی وہ سوال ہے جس کے جواب کی جستجو ہمیں ارباب کانگرس کی ذہنیت کے مطالعہ کی طرف متوجہ کرتی ہے اور جو ہمیں اس نتیجہ تک پہونچاتی ہے کہ اس باب میں اگر مسلمانوں سے غلطی ہوئی تو ہندوؤں سے بھی ہوئی اور سچ پوچھئے تو ان سے زیادہ ہوئی

مسلمانوں کی غلطی تو یہ تھی کہ انھوں نے خود اپنے اوپر اعتماد نہ کیا اور ہندوؤں کی یہ کہ وہ اپنے آپ کو قابل اعتماد نہ بنا سکے۔ انھوں نے زبان سے تو ہمیشہ یہی کہا کہ وہ مسلمانوں کے تمام مطالبات ماننے کے لئے طیار رہیں، ان کے قومی و مذہبی جذبات کی رواداری ان کا فرض ہے لیکن علاوہ اس کو صحیح نہ ثابت کر سکے

وزارتیں قبول کرنے سے قبل جو حالت کارکنان کانگرس کی تھی وہ یقیناً مختلف تھی اور اسی کو سامنے رکھکر بعض مسلمانوں کو اس میں شرکت کی ہمت ہوئی تھی، لیکن جب قیام حکومت کے بعد سے ہندوؤں کی بے نیازیاں مسلمانوں کی طرف سے بہت

نمایاں ہوگئیں تو مسلمان سخت مایوس ہوگئے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ مسلم لیگ جو کانگرس حکومتوں کے قیام سے قبل مردہ ہوچکی تھی بعد کو پھر اس میں آثارِ حیات نظر آنے لگے اور فرقہ وارانہ لڑائیاں بھی بہ نسبت پہلے کے زیادہ ہوئیں

کانگرس حکومتوں میں ہندو پبلک کا یہ خیال کہ اب حکومت ہندوؤں کی ہے، نہایت خطرناک بات ہے اور اس خیال کے ماتحت جو زیادتیاں ہندوؤں کی طرف سے ہو رہی ہیں اس کے ذمہ دار یقیناً ارباب کانگرس ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کانگرس کا نصب العین یہاں ہندو راج قایم کرنا ہے، لیکن اس وقت جن ہاتھوں میں کانگرس کا نظام ہے ان کا طرزِ عمل بہت مشکوک ہے۔ مثلاً آپ زبان ہی کے مسئلہ کو لیجئے کہ کانگرس کا فیصلہ تو یہ ہے کہ ایک عام سہل زبان اختیار کی جائے جو ہندو مسلمانوں کے درمیان تبادلۂ خیالات کا مشترک ذریعہ قرار پائے، لیکن کانگرسی وزرا کا یہ حال ہے کہ وہ قصداً اس میں سنسکرت کے مشکل الفاظ لانے کی کوشش کرتے ہیں اور عام طور پر جو زبان وہ ہر وقت اپنے گھروں میں بولتے ہیں اسے اپنی پبلک تقریروں اور تحریروں میں استعمال نہیں کرتے۔ پھر کیا پنڈت جواہر لال نہرو کو اس کا علم نہیں ہے۔ کیا گاندھی جی اس سے ناواقف ہیں، کیا کانگرس کی آل انڈیا ورکنگ کمیٹی کے کانوں تک یہ شکایتیں اسوقت تک نہیں پہونچیں۔ یقیناً سب اس حقیقت سے آگاہ ہیں لیکن وہ اس طرزِ عمل پر نکتہ چینی نہیں کرتے اور اس طرح مسلمانوں کو کانگرس کی طرف سے بدظنی کا موقعہ ملتا ہے۔

اسی طرح فرقہ وارانہ فسادات میں کانگرسی وزرا کی طرف سے جو طرزِ عمل اختیار کیا جاتا ہے وہ بھی غیر جانب دارانہ نہیں ہوتا اور حقیقت کو چھپانے میں انھیں ترکیبوں سے کام لیا جاتا ہے جو اس سے قبل کی حکومت اختیار کیا کرتی تھی۔

سالِ گزشتہ جس وقت انتخابات کے مسایل سامنے تھے، کانگرس نے ایک تحریک (Muslim Mass Contact) کے نام سے شروع کی تھی۔ اس تحریک کا مقصود یہ تھا کہ کانگرس براہ راست عام مسلمانوں سے تبادلۂ خیال کر کے ہندو مسلم کشیدگی کو دور کرے اور کانگرس کے اغراض و مقاصد ان کو سمجھائے۔ اس میں شک نہیں کہ تحریک نہایت مفید تھی لیکن اس پر عمل نہیں کیا گیا۔ اگر کانگرس واقعی پورے عزم کے ساتھ وسیع پیمانہ پر اس تحریک کو شروع کر دیتی تو نہ مسلم لیگ کو اُبھرنے کا موقعہ ملتا، اور نہ انتخابات میں کانگرس کو ناکامی ہوتی

میں یہ جانتا ہوں کہ ہندو نہ چاہتے ہوئے بھی مسلمانوں کو اپنا ہم خیال بنانے پر ایک حد تک مجبور ہیں اور اسکا سبب صرف یہ ہے کہ اگر ہندو مسلم کشیدگی نے زیادہ خطرناک صورت اختیار کرلی تو پھر ان کا استعمراتی آزادی والا خواب بھی خوابِ پریشاں ثابت ہوگا، لیکن اس مصلحت کے اقتضاء کے لحاظ سے جو طریق کار وہ اختیار کر رہے ہیں، صحیح نہیں ہے

پنڈت جواہر لال نہرو نے سب سے پہلے خط مسٹر جینا کو اس وقت لکھا جب انتخابات میں کانگرس کو مسلم لیگ کے خلاف ناکامی ہوئی تھی اور غالباً اس خیال سے لکھا تھا کہ اگر مسٹر جینا مصالحت کے لئے راضی ہوگئے تو گویا یہ رضامندی نہ صرف مسلم لیگ بلکہ تمام مسلمانانِ ہند کی ہوگی، لیکن یہ خیال پنڈت جی کا صحیح نہ تھا، جس کا ثبوت اب خود مسٹر جینا کے جدید شرائط سے جن کے خلاف خود مسلمانوں کی بعض جماعتوں کی طرف سے احتجاج کیا جا رہا ہے، پنڈت جی کو مل گیا ہوگا

ہم جانتے ہیں کہ لارڈ لن لتھگو کی ملاقات کے بعد ہی گاندھی جی کا مسٹر جینا کو گفتگوئے مصالحت کا پیغام دینا کیا معنی رکھتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ گاندھی جی کی طرح مسٹر جینا کے دل میں بھی یہی ہو کہ وفاق کو قبول کر لینا چاہئے، لیکن مسٹر جینا یقیناً مسلمانانِ ہند کے صحیح نمایندے نہیں ہیں اور ان کا کوئی قول مسلمانوں کے خلاف حجت نہیں ہو سکتا

مسٹر جینا کا اس شرط پر زور دینا کہ انھیں کو تمام مسلمانوں کا واحد نمایندہ سمجھا جائے، ممکن ہے اس میں ان کا جذبۂ تفوق و حکمرانی بھی شامل ہو اور ہو سکتا ہے کہ در پردہ "وفاق" کی راہ کو آسان بنا دینا بھی ان کے پیشِ نظر ہو۔ بہرحال اس تمام گفتگو سے مقصود یہ بتانا ہے کہ اگر کانگرس واقعی مسلمانوں کو شریکِ کار بنانا چاہتی ہے اور ملک میں امن و سکون پیدا کرنا اس کا مقصود ہے تو اس کی صورت یہ نہیں ہے کہ وہ مسٹر جینا یا کسی اور ایسے ہی مدعیِ سیاست سے گفتگو کر کے مطمئن ہو جائے، بلکہ اس کی صورت یہ ہے کہ وہ عام مسلمانوں کے جذبات کو پہچانے اور سچے دل سے رواداری پر آمادہ ہو جائے

اس کے جواب میں ارباب کانگرس کہیں گے کہ وہ بارہا اس کا اعلان کر چکے ہیں اور وہ ہر ایثار کے لئے طیار رہیں، لیکن انکا یہ جواب اطمینان بخش نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ عمل سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ ارباب کانگرس لاکھ زبان سے کہیں کہ وہ مسلمانوں کو اپنا ہی ایک جزو سمجھتے ہیں، لیکن عملی زندگی میں وہ ہم سے بالکل جدا ہیں اور ان کی ہر ہر بات سے جذبۂ نفرت ظاہر ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو دفاتر میں ملازم ہیں یا جن کو عمال حکومت سے واسطہ پڑتا رہتا ہے، ان سے پوچھئے کہ اسوقت مسلمان ہونا کتنا بڑا جرم ہے اور اس جرم کی کتنی سخت سزا اسے برداشت کرنا پڑتی ہے۔ پھر اگر ارباب کانگرس واقعی مسلمانوں سے اتحادِ عمل چاہتے ہیں، تو اس کی تنہا تدبیر یہ ہے کہ پہلے وہ اپنی جماعت کی اس ذہنیت کو دور کریں جو مسلمانوں سے نفرت کرنا سکھاتی ہے۔ اعتماد کوئی مادی چیز نہیں ہے جو ہم کسی سے لے سکیں یا کسی کو دے سکیں، اس کا تعلق دماغی کیفیت اور قلبی احساس سے ہے اور قلب و دماغ کا اطمینان صرف خلوص و صداقت سے پیدا ہوتا ہے

یہ تو ہوا ہمارا وہ مطالبہ جو ہم کانگرس سے کرتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ ہمیں مسلمانوں سے بھی کچھ کہنا ہے اور وہ یہ کہ کانگرس سے علٰحدہ رہ کر وہ کبھی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ اگر ہم کو اس کا یقین ہوتا کہ وہ اپنی جماعتی تنظیم کبھی کر سکتے ہیں یا یہ کہ ان میں واقعی کسی دلسوز اور مخلص رہنما کا وجود پایا جا سکتا ہے، تو ہم اس کا انتظار کر سکتے تھے کہ وہ پہلے آپ کو سنبھال لیں اور پھر کانگرس میں شریک ہوں، لیکن ان کا باہمی اختلاف جو زیادہ تر مذہبی رجحانات کا نتیجہ ہے کبھی دور نہیں ہو سکتا اور اگر اس کے دور کرنے کی کوئی تدبیر ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ وہ کسی ایسے ادارہ میں شریک ہو جائیں جو مذہبیات سے بالکل علٰحدہ صرف سیاسیات سے تعلق رکھتا ہے اور ایسا ادارہ صرف کانگرس ہے۔ کانگرس میں شریک ہونے کے بعد تو مسلمان بیشک کسی ایک مرکز پر جمع ہو سکتے ہیں، لیکن اس سے علٰحدہ رہنے کی حالت میں انکے مذہبی اختلافات انکی سیاسی تحریکوں کو بھی کامیاب نہ ہونے دیں گے

اسوقت مسلمانوں کی امیدیں سب سے زیادہ مسلم لیگ سے وابستہ ہیں لیکن بدقسمتی سے اس کشتی کا ناخدا ایسا

برخود غلط اور ضدی واقع ہوا ہے کہ ساحل تک پہونچنے کی کوئی توقع نہیں۔ مسٹر جِنا جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کانگرس میں اس لئے شریک نہیں ہوتے کہ وہاں ان کا شمار دوسرے درجہ کے لیڈروں میں بھی نہیں ہو سکتا اور مسلم لیگ کو اس لئے کامیاب نہیں بنا سکتے کہ ان میں ایثار و قربانی کا جذبہ موجود نہیں ہے۔ ان کو شرکتِ کانگرس کی دعوت دیجاتی ہے تو وہ ایسی شرائط پیش کرتے ہیں کہ ہندو تو ہندو خود مسلمانوں کے لئے بھی قابل قبول نہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود اعتمادی کی کیفیت ان سے بالکل مفقود ہو گئی ہے

حال ہی میں مسلمانوں کا جو جلسۂ عام ہوا تھا اور جس میں کانگرس سے مصالحت کا مسئلہ درپیش تھا، اس کی کارروائی دیکھنے سے ہماری مایوسیاں بہت بڑھ جاتی ہیں۔ مسٹر جِنا نے اپنی تقریر میں کہا کہ مسلمان کمزور ہیں اور ہندو قوی اس لئے دونوں میں مصالحت ممکن نہیں۔ سر سکندر حیات خاں، شرکتِ کانگرس کو ہندوؤں کی غلامی سے تعبیر کرتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر اس کے معنے یہ ہیں کہ مسلمانوں کو بدستور انگریزوں کا دستِ نگر رہنا چاہئے اور قومی اسپرٹ کو خیرباد کہدینا چاہئے — ان کے اندر ایسا خوف سما گیا ہے کہ بظاہر اس کے دور ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی اور اب چارۂ کار سوائے اس کے کوئی نہیں کہ یا تو مسلمان کوئی اور لیڈر منتخب کریں اور اگر اس میں ناکامی ہو (جو یقینی ہے) تو پھر اپنی قوت اور خدا پر بھروسہ کر کے کانگرس میں شریک ہو جائیں۔ اگر غلامی مسلمانوں کے لئے واقعی مقسوم ہو چکی ہے اور کانگرس میں شریک ہونا ہندوؤں کا غلام بننا ہے تو میں کہوں گا کہ یہ غلامی اس غلامی سے بہتر ہے جو وہ اختیار کرنا چاہتے ہیں

آیندہ جنوری ۳۹ء کا "نگار"

"مصحفی" نمبر ہوگا

اساتذۂ قدیم میں "مصحفی" جس مرتبہ کا شاعر ہوا ہے، اس کا اندازہ یوں نہ کرنا چاہئے کہ میر کے ساتھ ساتھ اس کا نام بھی لیا جاتا ہے بلکہ اس طرح کہ شاعری کی جن جن اصناف میں اس نے اپنا کلام پیش کیا اُن کو چھونے کی ہمت میر کو کبھی نہیں ہوئی تمام اُردو شعراء میں یہ خصوصیت صرف مصحفی کو حاصل تھی کہ اس نے ہر رنگ کو اختیار کیا اور جس رنگ کو اختیار کیا اسے اپنا لیا خصوصیت کے ساتھ مشکل زمینوں کو مانوس بنا دینا۔ کہ اس باب میں تو اس کا ہمسر کوئی پیدا ہی نہ ہوا

مصحفی نمبر بہت ضخیم ہوگا اور مومن نمبر کی طرح انتہائی احتیاط کے ساتھ مرتب کیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں جن جن عنوانات کے مقالے درکار ہیں ان کی مختصر سی فہرست یہ ہے:- (۱) مصحفی کی شاعرانہ خصوصیات - (۲) مصحفی تذکرہ نگار کی حیثیت سے - (۳) مصحفی اور اس کے ہمعصر اساتذہ - (۴) مصحفی اور اس کے تلامذہ (۵) مصحفی کی شاعری پر ماحول کا اثر - (۶) مصحفی بہ حیثیت ایک انسان (۷) مصحفی ایک نقاد کی حیثیت سے - (۸) مصحفی اور مختلف اصناف سخن وغیرہ وغیرہ - ان کے علاوہ آپ اور جو عنوان مناسب سمجھیں اس پر لکھ سکتے ہیں۔ مضمون معہ تصویر زیادہ سے زیادہ اکتوبر ۳۸ء کے آخر تک پہنچ جانا چاہئے۔

منیجر نگار

مسئلۂ خلافت وامامت

(انسانیت اور اسلام کے نقطۂ نظر سے)

جولائی ۳۷ء کے نگار میں بہ عنوان مندرجۂ صدر جو مضمون شائع ہوا ہے وہ گویا خلافت وامامت کے مسئلہ پر ایک فیصلہ کن بحث کی دعوتِ عام ہے اور نگار کے اڈیٹر صاحب چاہتے ہیں کہ اصل موضوع پر دونوں فرقوں کی جانب سے ایسے دلائل پیش کئے جائیں کہ دنیا کسی حد تک اس قدیم اور دشوار تر گتھی کو سلجھانے کے قابل ہو سکے!۔ فاضل مقالہ نگار نے اس مسئلہ کے تصفیہ میں پہلے انسانیت اور پھر اسلام کے نقطۂ نظر سے گفتگو کرنے کا دعویٰ کیا ہے اس لئے آیئے دیکھیں کہ انسانیت واسلام کے جو اُصول انھوں نے مقرر کئے ہیں وہ کس حد تک لائق تسلیم ہیں اور انسانیت انھیں گوارا بھی کرتی ہے یا نہیں

وہ انسانیت کا مدار عقل عمومی پر رکھتے ہیں ملاحظہ ہو:۔

"عقل عمومی سے میری مراد وہ معمولی فہم وفراست ہے کہ جسے روزمرہ کے کاروبار میں ہم کام میں لاتے ہیں اور جس کے ذریعہ سے ہم بہت سی ابتدائی صداقتوں کو پہچانتے ہیں۔ ایسی صداقتیں جن پر بنی نوع انسان عمومیت کے ساتھ متفق ہوتے ہیں اور جن سے عامۃ الناس کو اعتقاداً نہیں بلکہ سمجھ بوجھ کر اختلاف رائے کی گنجائش نہیں ہوتی مثلاً سچ بولنا اچھا ہے۔ یہ ہماری عقل عمومی کا فیصلہ ہے۔ اس طرح "انسان کا قتل کرنا" وحشیانہ فعل ہے یا "جھوٹ بولنا" بری بات ہے۔ اس نوع کے تمام اُصول وکلیات ایسے ہیں کہ جنھیں ہماری عقل عمومی تسلیم شدہ قرار دیتی ہے"

افسوس ہے کہ فاضل مقالہ نگار کی اس تشریح سے بھی ابہام رفع نہیں ہوتا کیونکہ اس سلسلہ میں اس امر کی تشخیص کہ فلاں بات سچ ہے اور فلاں جھوٹ کس کے ذمہ قرار پائے گی۔ یہ ایک اُلجھن ہے

اب میں ایک اور نگاہ سے اس قول کو جانچتا ہوں ـــ اس بحث میں عقل عمومی کو حجت قرار دیا گیا ہے یعنی عقل عمومی جس شئے کا انکار کرے وہ رد کر دینے کے قابل ہے اور جس شئے کو قبول کرے وہ قابل اخذ ہے۔ اگر یہ نظریہ صحیح مانا جائے اور عوام کا اقرار یا انکار حجت ہو جائے تو کوئی اصل اپنے مقام پر ثابت نہیں رہتی۔ یہی عقل عوام تھی جو ایک زمانے میں

شہنشاہیت مطلقہ کے سامنے جھکی ہوئی تھی اور اب یہی عقل عمومی ہے جس کے لئے بقول آں محترم اشتراکیت جاذب نظر بنی ہوئی ہے

اصل یہ ہے کہ عوام ہر زمانہ میں کالانعام ہوا کرتے ہیں اور آج بھی ہیں۔ عوام ہمیشہ ایک مخصوص جماعت کے ہاتھ میں ہوا کرتے ہیں۔ اس لئے عوام کا رجحان کبھی سند کے قابل نہیں ہوسکتا اور صاحب نظر عوام کی قبولیت یا عدم قبولیت کو کبھی اہمیت نہیں دیتے بلکہ نفس مسئلہ پر نظر رکھتے ہیں

میرے قول بالا کی دلیل خود اس مضمون میں موجود ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ "کسی مذہب کا معیار صداقت یہ ہونا چاہئے کہ اس سے کسی انسانی جماعت کا حق غصب نہ ہوتا ہو" یہ جزاول ہے۔ اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ "الوہی امامت سے انسانی جماعت کا حق غصب ہوتا ہے" یہ جز ثانی ہے ان دونوں کو ملانے سے جو نتیجہ نکلے گا وہ سامنے ہے۔ بالکل ممکن ہو کہ عقل عمومی ہمزبان ہوجائے لیکن یہ ہمزبانی صاحب فکر کو مسحور نہ کرسکے گی۔ وہ تو یہ دیکھے گا کہ اس قضیہ کے اجزا جو قایم کئے گئے ہیں وہ کہاں تک صحت رکھتے ہیں۔ اب میں ان مطالب کی طرف بڑھتا ہوں جو اس تحریر کی روح ہیں۔

"رسول اکرم نے ہرگز یہ فیصلہ نہیں کیا کہ ان کی وفات کے بعد حضرت علی خلیفہ ہوں اور یہ مسئلہ شاہان خود مختار کی طرح نسلاً بعد نسلٍ قایم رہے

(۲) حضرت علی کی "الوہی امامت" کے سلسلہ میں جتنی روایات و احادیث پیش کی جاتی ہیں وہ سب یا تو موضوع، جعلی اور خود ساختہ ہیں یا ان کا مفہوم وہ نہیں ہے جو الوہی امامت کی تصدیق کرتا ہو"

یہ دعوے ہے اور اس دعوے کو نباہنے کے لئے کچھ تنقیحات قایم کرتے ہوئے نتیجہ یہ نکالا گیا ہے کہ الوہی امامت کا مطلب یہ ہو کہ

"خداوند کریم نے یہ طے کردیا تھا کہ رسول کریم کے بعد ان کے داماد حضرت علی خلیفہ ہوں اور ان کے بعد یہ منصب جلیل ان کی اولاد میں سے کسی کو عطا کردیا جائے اور اس طرح یہ سلسلہ تاقیامت جاری ہے"

اس نتیجہ پر زور دیتے ہوئے کچھ اور بھی فرمایا گیا ہے جو قابل غور ہے، طوالت کے خیال سے اپنے ہی لفظوں میں ان کا خلاصہ درج کئے دیتا ہوں :-

(۱) خلافت و امامت صرف علی کی نسل کے لئے مخصوص ہے

(۲) ہر خلیفہ کی جگہ اس کا بیٹا ہی مسند نشین ہوگا۔ مثل شاہان خود مختار

(۳) تمام دنیا کے مسلمان حضرت علی کی دائمی اور ابدی خلافت میں رہنے پر مجبور ہیں وہی اولوالامر و آقا و مولا ہوں اور ہر مسلمان ان کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور۔ تمام دنیا کے مسلمان خواہ کتنے ہی متقی و متورع ہوں، اس سے محروم رہتے ہیں

(۴) بانی اسلام کی گویا خواہش تھی کہ ان کی نسل تاقیامت مسلمانوں پر حکومت کرے اور یہ حکومت

مطلق العنان ہو، اس طرح خانوادۂ علی کے لئے گویا نسلی امتیاز قایم ہو جاتا ہے اور آل علی کا ہر فرد گویا ماں کے پیٹ سے یہ حق لیکر پیدا ہوتا ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان اس کے سامنے سر عقیدت جھکائیں"

اور یہ وہ باتیں ہیں جنھیں عقل عمومی قبول نہیں کرتی۔

قبل ازیں کہ دعوے اور استدلال پر توجہ کی جائے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انصاف پسند حضرات اس پر بھی غور فرمائیں کہ آج ہم جس نسلی امتیاز سے متنفر ہیں، آج جو شہنشاہیت ہماری نظروں میں کھٹکتی ہے کیا عقل عمومی اس سے اسی طرح متنفر اور بیزار رہی ہے اور کیا سقیفہ بنی ساعدہ میں بمقابلہ انصار جو یہ استدلال پیش کیا گیا تھا کہ "الائمۃ من قریش" کیا اسکے معنی اس کے سوا کچھ اور تھے۔ کیا اس استدلال سے نسلی امتیاز کی بو نہیں آتی اور اگر یہ صحیح ہے تو پہلے عقل عمومی آنکھ بند کرکے تسلیم کرنے پر کیوں مایل ہے اور اس کے بعد بھی صدیوں تک جو صورت اسلامی حکومت کی پائی گئی کیا وہ شہنشاہیت نہ تھی!

اب رہا نسلی امتیاز۔ کیا میں سوال کر سکتا ہوں کہ مختلف اقوام میں اور مختلف زمانوں میں اس امتیاز کا احساس رہا ہے یا نہیں؟ اور آج بھی ہے یا نہیں؟ یہ عالمگیر احساس مجھے تو کبھی گم ہوتا نظر نہ آیا بلکہ بنی نوع انسان کی ایک وسیع جماعت ہمیشہ اس کی حمایت کرتی نظر آئی

یہ خیال کہ اسلام اس نسلی امتیاز کو مٹانے کے لئے آیا تھا کم از کم کلام مجید سے تو ثابت ہوتا نہیں بلکہ برخلاف اس کے اس امتیاز کی تائید ثابت ہوتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:-

"ان اللہ اصطفےٰ آدم و نوحا و آل ابراہیم و آل عمران علی العالمین"

کیا اس سے آل ابراہیم اور آل عمران کا نسلی امتیاز ثابت نہیں ہوتا۔ اس سے بھی تیز تر سنئے:-

"ام یحسدون الناس علیٰ ما آتاہم اللہ من فضلہ لقد آتینا آل ابراہیم الکتاب والحکمۃ و آتیناہم ملکا عظیما فمنہم من آمن بہ و منہم من صد عنہ و کفیٰ بجہنم سعیرا"

(کیا یہ لوگ ان لوگوں سے حسد رکھتے ہیں اس شے پر جو خدا نے اپنے فضل سے انھیں عطا کر دی۔ بے شک ہم نے آل ابراہیم کو کتاب بھی دیدی اور حکمت بھی اور انھیں ملک عظیم عطا کر دیا اب کوئی تو اس پر ایمان لاتا ہے اور کوئی رکتا ہے اور جہنم کے شعلے اس کے لئے بہت کافی ہیں)

آل ابراہیم پر برکتوں کی بارش اور اس شد و مد سے کہ جو اس پر ایمان نہ لائے اس کے لئے جہنم کے شعلے ہیں کس امر پر دال ہے اور کیا یہ اس امر کا بین ثبوت نہیں ہے کہ خود مشیت الٰہی نوعی اور نسلی امتیاز کی حامی ہے

بلاشک و شبہ رسول اللہ کا مقصود جو اسلام لیکر دنیا کے سامنے آئے، دنیا و عقبیٰ میں صرف سعادت بشری کا حصول تھا اور چونکہ اسلامی نقطۂ نظر سے دنیا، آخرت کا مقدمہ ہے اور دین وحی الٰہی ہے اس لئے اس میں کسی انسانی

مصلحت اندیشی کو دخل نہیں ہو سکتا اور اس کی تبلیغ میں ایک پیغمبر کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے لئے یا اپنی نسل کے واسطے یا اپنی قوم اور اپنے ملک کی خاطر کسی سلطنت کی بنیاد قایم کر جائے اگرچہ دنیا یہ شبہ کرتی ہے اور بعض نے تو حتماً و جزماً اسکا اعلان بھی کر دیا ہے چنانچہ یزید کہتا ہے :۔

لعبت ہاشم بالملک فلا
خبر جاء ولا وحی نزل

(ایک ہاشمی نے سلطنت کے لئے یہ کھیل کھیلا حالانکہ نہ کوئی خبر آئی نہ کوئی وحی نازل ہوئی) ۔ شیعی حلقوں میں جس سلطنت اور جس حکومت کو آل نبی کا حق سمجھا جاتا ہے، وہ دنیاوی حکومت نہیں ہے، بلکہ وہ ایسی سعادت کبریٰ ہے جسکا راز آنحضرت کے سینے میں رکھا گیا اور جس کو بروئے کار لانا بھی آپ کے فرائض میں داخل تھا۔ مقصد الٰہی یہ تھا کہ اس قانون کے ماتحت حیات انسانی کی تنظیم اس طرح کی جائے کہ سعادت کا کوئی انفرادی و اجتماعی پہلو چھوٹنے نہ پائے۔ لیکن یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ کوئی قانون زیر عمل نہیں آسکتا جب تک کہ حکومت کی باقاعدہ تشکیل نہ ہو۔ چنانچہ حضرت پیغمبر اپنے وقت میں خود حاکم تھے لیکن یہ حکومت نہ شہنشاہیت تھی نہ اسے "ڈکٹیٹرشپ" سے تعلق تھا اور نہ "جمہوریت" کی ممنون احسان تھی بلکہ فی الحقیقت یہ حکومت، نبوت الٰہیہ کی ایک شعاع تھی۔ یوں سمجھنا چاہئے کہ نبوت کے دو پہلو تھے۔ ایک یہ کہ بارگاہ الٰہی کے احکام اس کی مخلوق تک پہونچا دیں اور دوسرا یہ کہ ان کے اجرا کا انتظام بھی فرمائیں۔ اس اعتبار سے جس طرح نبوت من جانب اللہ ہے اسی طرح یہ حکومت بھی ہے اور رسول اللہ کے بعد لامحالہ ہم کو اس کے لئے محل قابل کی تلاش کرنی پڑے گی

یہاں علی و عمر کی بحث نہیں ہے۔ اگر علی محل قابل ہیں تو چشم ما روشن اور اگر عمر اس کی قابلیت رکھتے ہیں تو دل ماشاد مگر اس کا ذریعہ و شناخت بھی صرف زبان وحی ہونا چاہئے جو عقل عمومی سے بہت زیادہ بلند ہے

جائیکہ سلطان خیمہ زد غوغا نباشد عام را

ظاہر ہے کہ اس حکومت میں اکتساب کو دخل نہیں تھا بلکہ یہ عطیۂ الٰہی تھی اور یہ جہاں بھی قایم ہو، اس کی شان برقرار رہنی چاہئے۔ جہاں پائی جائے من اللہ پائی جانی چاہئے اور "من اللہیت" کے معلوم کرنے کا ذریعہ صرف رسول ہے۔ اب اسے حکومت الٰہیہ سمجھئے، خلافت الٰہیہ کہئے، امامت الٰہیہ فرمائیے، جو کچھ چاہے کہئے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس چیز کو خود رسول بھی اپنے اختیار سے کسی کو عطا نہیں فرما سکتے تھے!

"ربک یخلق ما یشاء و یختار ما کان لہم الخیرۃ"

یہ ہے وہ امامت الٰہیہ جو طبقۂ شیعہ کا مطمح نظر ہے۔ اس امامت کے لئے یہ ہرگز ضروری نہیں ہے کہ عوام بھی اسکے ساتھ رہیں اور اُس کا یہ بھی فرض نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو اپنی طرف جذب کرنے کے لئے پروپیگنڈا کرے۔ اسقدر بیان سے غالباً امامت الٰہیہ کے متعلق شیعہ نظریہ واضح ہو گیا ہوگا

حضرات اہل سنت جن کو خلفاء کہتے ہیں ہم بھی انھیں خلفا کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک جماعت کے اتفاق سے وہ خلیفہ بنے، ہم بھی اسی کے قایل ہیں وہ کتنے ہی اچھے سہی لیکن یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی حکومت، حکومت الٰہیہ ہے کیونکہ اجماع و شوریٰ خود اس کے منافی ہیں لیکن مصیبت یہ ہے کہ حضرات اہل سنت جس کو خود حاکم بنالیں اس کی نسبت یہ اعتقاد رکھنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ اب اس کا ہر قول، ہر فعل، ہر حرکت حکم خدا ہے اور یہیں سے سارا جھگڑا پیدا ہوتا ہے، شیعہ یہ کہتے ہیں کہ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ ہم اس کو ضرور حاکم اسلامی سمجھیں گے۔ اس کی حکومت، حکومت اسلامی کہلائے گی مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ اُسے حکومت الٰہیہ بھی تسلیم کر لیا جائے

الغرض! شیعہ کے نزدیک خلفاء کی خلافت ایک دنیوی قسم کی حکومت تھی اور یہی سبب ہے کہ علی مرتضیٰ کو بھی اس خلافت کے لحاظ سے جو علی الظاہر انھیں اُصول کے ماتحت انھیں ملی کوئی خاص فضیلت حاصل نہیں ہوئی، وہ اس خلافت کے باعث عالم تشیع سے روشناس نہیں ہوئے۔ اگر یہ چند روزہ حکومت نہ ہوتی تو بھی علی بہر حال علی ہی رہتے

فاضل مضمون نگار نے صفحہ ۶ پر جو تنقیحات قایم فرمائی ہیں اگرچہ وہ بہت کچھ بحث طلب بلکہ اصلاح طلب ہیں لیکن ان سے اور بعد کی تشریحات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کے نزدیک اولاد علی میں خلافت کا محصور ہونا دوسری جماعتوں کی حق تلفی ہے۔ لیکن حق تلفی کا سوال اسوقت پیدا ہوتا ہے جب دو برابر کے حقداروں میں سے کسی ایک کا حق غصب کیا جائے یا کسی زیادہ مستحق شخص کے مقابلہ میں کم استحقاق رکھنے والے کو ترجیح دیجائے۔ لیکن چونکہ "امامت الٰہیہ" کا تعلق اکتسابات دنیادی سے نہیں ہے جن میں فرق و امتیاز کا پایا جانا ضروری ہے بلکہ محض منشار خداوندی سے ہے اس لئے اگر اس کے صحیح مفہوم کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ اعلان کیا گیا کہ:-

"خداوند عالم طے کر چکا ہے کہ رسول کریم کے بعد خلافت الٰہیہ علی ہی کے لئے ہے اور علی کے بعد اس کے گیارہ فرزندوں کے لئے"

تو اس میں کیا قباحت لازم آتی ہے۔ ہاں یہ خیال دماغ سے نکل جانا چاہئے کہ یہ عطیہ ان لوگوں کو اولاد رسول ہونے کی حیثیت سے ملا ہے یا رسول یہ چاہتے تھے کہ میری نسل مسلمانوں کی گردنوں پر مسلط رہے، کیونکہ اگر اولاد رسول ہونے کی حیثیت مدنظر ہوتی تو خود علی کو یہ شئے کیسے ملتی، اور اگر اولاد علی کا لحاظ کیا جائے تو علی مرتضیٰ کی اولاد دوسری بی بیوں سے بھی ہے یہ منصب وہاں کیوں نہ پہونچا اور اگر بنو فاطمہ کا لحاظ کیا جائے تو اولاد امام حسن اس سے کیوں محروم رہی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس امر میں کسی نسلی امتیاز کا لحاظ نہیں کیا گیا

نوع انسان میں آدم سے لیکر آج تک بیشمار انسان گزرے ہیں لیکن ان لاتعداد انسانوں میں سے صرف چند منصب نبوت پر سرفراز ہوئے، اس کے کیا معنی؟ یہاں بھی یہ حق تلفی نظر آتی ہے۔ عقل کا جواب اس مقام پر یہ ہے کہ غصب حقوق کا اطلاق وہاں ہوا کرتا ہے جہاں کوئی حق پایا بھی جائے اور جب حق کا وجود ہی نہ ہو تو غصب حقوق یعنی چہ!

میں اس تحریر میں بیان کر چکا ہوں کہ اس منصب جلیل کو مقرر کرنے کا اختیار خود رسول کو بھی نہیں تھا، ہاں اعلان

ان کے فرائض تبلیغ میں ضرور تھا اور یہ اعلان بطریق شیعہ بذریعہ اہل بیت علی التواتر ثابت ہے

فاضل مقالہ نگار نے طعناً لکھا ہے کہ شیعہ تمام دنیا کی آبادی میں دس فیصدی بھی نہیں ہیں۔ اگر یہ تحقیق صحیح مان لی جائے تو بھی دس فیصدی بہت ہیں کیونکہ جس فرقے پر صدیوں تک تلوار چلی ہو اور چل رہی ہو اس کا صفحۂ عالم پر باقی رہ جانا ہی حیرتناک امر ہے۔ بہرحال وہ جتنے بھی ہیں شرفا ہیں اس لئے کہ عوام الناس مصائب میں ثابت قدم نہیں رہ سکتے اب سوال یہ ہے کہ انھوں نے ان تمام دنیوی زحمتوں کو قبول کیوں کیا؟ کیا ان کے لئے حکومتوں میں منضم ہو جانا ممکن نہ تھا یقیناً تھا لیکن ان کی نظر مادی فوائد پر نہیں تھی بلکہ وہ دین صحیح اور اسلام صحیح کے طلبگار تھے اور ان کے نزدیک اسلام صحیح کی حامل دوسری ہستیاں تھیں۔ لہذا انھوں نے حکام وقت کے مظالم سہے مگر ان کا دامن نہ چھوڑا

خوجہ اور بوہرہ حضرات کے مرشدوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تمام اولاد علی کو جو صاحب مضمون نے خلافت الٰہیہ کا مرکز بنایا ہے۔ یہ محض ایجاد بندہ ہے۔ اسی طرح آغاخاں اور ملا طاہر سیف الدین کی تعلیم جو کچھ ہو۔ عقیدہ خلافت الٰہیہ اس کا ذمہ دار نہیں

یہاں یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فرقہ اسماعیلیہ کے ظہور کا سبب کیا ہے؟ ناظرین غور فرمائیں کہ روس میں بالشوزم کی بنیاد کیوں پڑی؟ ظاہر ہے کہ شاہان روس کے مظالم بالشوزم کی ظہور میں آنے کا سبب ہیں۔ اگر عوام امن و سکون کی زندگی بسر کریں۔ مظلوم کو ظالم کی طرف سے کھٹکا نہ ہو۔ عدالت صحیحہ کا دور دورہ ہو تو بغاوت کے جراثیم پیدا ہی نہیں ہوتے لیکن اگر ایسا نہ ہو تو ابن آدم کا یہ فطری حق ہے کہ امن و آزادی کی تدبیر سوچے۔ اب اسوقت کی اسلامی حکومتوں پر نظر کیجئے۔ ظاہر ہے کہ وہ منصوص من اللہ تو تھیں نہیں اور ظلم و استبداد دنیا میں پھیل رہا تھا اس لئے ایک جماعت نے ان سے گلوخلاصی کی کوشش کی

وہ ہستیاں جو منصوص من اللہ تھیں انھوں نے تو ہمیشہ صبر و سکوت کا حکم دیا نہ خود ان امور میں حصہ لیا اور نہ کسی کو اجازت دی لیکن یہ صبر و حلم ہر شخص کا حصہ نہیں ہوتا جس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو جاتا تھا وہ حکومت کے خلاف اُٹھتا تھا اور اپنی جان دیدیتا تھا۔ علوئیین، سلاطین وقت کے خلاف اُٹھے اس کا راز یہی ہے اور اس معاملہ میں وہ قطعاً معذور تھے۔ چنانچہ زید بن علی اسی جذبہ کے تحت حکومت کے خلاف میدان میں آ گئے اور حضرت ابوحنیفہ گویا ان کے خاص معاونین میں سے تھے (اگرچہ انھوں نے عین وقت پر عذر کر دیا) آئمہ اہل بیت جو ان حضرات کو روکتے تھے اس کا سبب یہ تھا کہ انکی حقیقت بین نگاہیں انجام کو جانتی تھیں

سب جانتے ہیں کہ جب دنیا سے حق و ناحق کا امتیاز اُٹھ جاتا ہے تو ہر نوع کا انتشار و اضطراب پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ یہی ان موقعوں پر بھی ہوا وہ لوگ جو ان سلطنتوں سے تنگ آئے ہوئے تھے ان کی نظر میں علوئیین اور فاطمیین کی کی ناکامیاں بھی تھیں اور وہ ایک نئے اور کامیاب ذریعہ کی جستجو کر رہے تھے پھر چونکہ ہر ناکامی انسان کے لئے سبق ہے

کامیابی کا لہٰذا انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ بنو علی و بنو فاطمہ جو ناکام رہتے ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ ان حضرات میں سب اوصاف سہی لیکن قیادت مذہبی انھیں حاصل نہیں اور جن بزرگواروں کو صحیح مذہبی عظمت حاصل ہے وہ اس میں شرکت نہیں کرتے اور ان کی عدم شرکت کے راز سے سب آگاہ ہیں اس لئے ملک کو کوئی دلچسپی ان سے نہیں رہتی اور حکومت بآسانی مقابل آنے والوں کو زیر کر لیتی ہے

فکر کرنے والوں کے سامنے جب کوئی ایسا "سبب" آجاتا ہے جو ان کے ارادوں میں حائل ہو تو وہ اس کے دور کرنے کی فکر کیا ہی کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ عزم کر لیا گیا کہ ایک مذہبی مسند الگ قایم کی جائے تاکہ قائد کا وقار مذہبی حیثیت سے بھی مسلم ہو۔ چنانچہ اسی خیال کے تحت اس تجویز کو عمل میں لایا گیا اور آخر ایسی کامیابی ہوئی کہ بڑی بڑی قہار خلافتوں کے بنائے کچھ نہ بن سکی فرقہ باطنیہ کی بنیاد قایم ہوئی جس کے ہاتھوں بڑے بڑے حکام قتل ہوئے۔ اب انھیں کو ساجاتا ہے۔ لیکن بالشویکوں نے روس کے شاہی خاندان کا چن چن کے خاتمہ کیا تو اس پر کسی نے آہ بھی نہ کی بلکہ اشتراکیت کو سراہا جا رہا ہے۔ حالانکہ جس روح کے تحت زار روس تباہ ہوا اسی کی بنا پر بڑے بڑے گُلّا قتل ہوئے جو فی الحقیقت عوام کو قابو میں رکھنے کے لئے ظالمانہ حکومتوں کے ایجنٹ تھے

اہل نظر انصاف فرمائیں کہ ایسے فرقوں کی پیدائش کا سبب ظالمانہ حکومتیں ہیں یا عقیدہ خلافت الٰہیہ

مزید توضیح ملاحظہ ہو۔ اہل سنت کے پاس انعقاد خلافت کے چار طریقے ہیں:۔

(۱) اجماع۔ یعنی ایک ہم خیال گروہ کا مل جل کر کسی کو حاکم بنا لینا۔ ہم خیال اس لئے کہتا ہوں کہ آزاد و واقعی اجماع محقق نہیں

(۲) استخلاف۔ یعنی جانے والا کسی کے لئے کہہ جائے کہ یہ میرا جانشین ہے

(۳) شوریٰ۔ یعنی ایک محدود جماعت کے مشورہ سے کسی کو نامزد کر دینا

(۴) قہر و غلبہ۔ یعنی جس کے ہاتھ میں بھی تلوار آجائے اور سلطنت حاصل کر لے

واقعتاً جامعیت اسی کا نام ہے یعنی جتنے طریقے بھی حکومت کے ہو سکتے ہیں وہ سب گھیر لئے گئے ہیں۔ کسی قسم کی بھی حکومت ہو وہ ان صورتوں سے خالی نہ ہوگی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جن جن صورتوں سے حکومتوں کا ظہور رہا ان سب کو حق مانتے ہوئے یہ اصول تصنیف کئے گئے ہیں۔ گویا حکومتیں کسی اصول کے تحت نہیں بلکہ اصول حکومت کے تحت ہیں۔۔۔ یہاں تک غنیمت ہے لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ ان کی اطاعت خدا و رسول کی اطاعت سمجھی جاتی ہے اور انکی بیعت سے تقاعد کرنے والا مستوجب جہنم۔ چنانچہ ایسے ہی موقعوں کے لئے یہ حدیث پیش کی گئی ہے:۔

"من مات ولم یعرف امام زمانہ مات میتۃً جاہلیۃ"

صاحبان غور و فکر سے التماس ہے کہ طرق چہارگانہ جو بیان کئے گئے وہ اصل میں تین ہی ہیں اس لئے کہ اجماع و قوعی و شوریٰ کی روح ایک ہی ہے اور یہ تینوں طریقے بلاشبہ متضاد ہیں اب سوال یہ ہے کہ ان میں اسلامی طریقہ کونسا ہے؟

اگر یہ سب کسی اسلامی حکم کے تحت ہیں تو معاف کیجئے ایک اہم اور اُصولی مسئلے میں ایسے متضاد احکام ! عقلاً ایسے اسلام کو دور ہی سے سلام کرنا چاہئے

میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس بحث کے آخر میں اپنی تحریر کا خلاصہ درج کر دوں تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو۔

(۱) اسلام بلاشک و شبہ سعادت البشر کے لئے آیا ہے

(۲) اسی سعادت کا ایک جزو خلافت الٰہیہ ہے

(۳) خلافت الٰہیہ ایک موہبت الٰہیہ ہے وہ کسی نسلی امتیاز پر نہیں بلکہ جوہر ذاتی کی بنا پر ہے کسی ایک نسل میں اس کا پایا جانا اس مفہوم کا حامل نہیں کہ نسلی امتیاز مدنظر رکھا گیا ہے

(۴) خلافت الٰہیہ سے کسی فرد یا جماعت کی حق تلفی کا ذکر ایک دھوکا ہے۔ پہلے یہ ثابت کیا جائے کہ فلاں شخص یا فلاں خاندان اس عطا کا مستحق تھا۔ بغیر اثبات حقوق کے غصب حقوق کہنا ایک بے معنی بات ہے

(۵) اگر غیر مستحق مدعیان امامت پیدا ہوئے تو امامت الٰہیہ اس کی ذمہ دار نہیں

(۶) عقل عمومی کی حجت کا دعویٰ غلط ہے

یہاں تک انسانیت مفروضہ کے متعلق عرض کیا گیا۔ اب قرآن و احادیث کی طرف توجہ کی جاتی ہے

شیعہ اور سنیوں میں ایک اُصولی اختلاف یہ بھی ہے کہ شیعہ ہر مسئلہ کو اسلام کی روشنی میں دیکھنا چاہتے ہیں برخلاف اس کے حضرات اہل سنت کا مسلک دوسرا ہے۔ چنانچہ اسی تحریر سے معلوم ہو سکتا ہے کہ محرر کے نزدیک "انسانیت" اور شے ہے اور "اسلام" اور شے

مسئلہ قرآن میں سب سے پہلے جس چیز پر نظر جاتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن پاک کے مطالب صاف و صریح سمجھ میں بھی آسکتے ہیں یا نہیں۔ ملاحظہ کیجئے یہ کتاب خود اپنے متعلق کیا کہتی ہے :-

"فیہ آیات محکمات ہن ام الکتاب و اُخر متشابہات"

اس میں بعض آیات محکمات ہیں جو اُم الکتاب ہیں اور دوسری متشابہات ہیں اور خود قرآن یہ نہیں بتاتا کہ فلاں آیت محکم ہے اور فلاں متشابہ۔

اس کتاب میں اجمال بھی ہے۔ مثلاً اقیموا الصلوٰۃ و اٰتوا الزکوٰۃ۔ لغت کے لحاظ سے دیکھو تو صلوٰۃ کے معنی دعا اور زکوٰۃ کے معنی نمو۔ قرآن یہ کہیں نہیں بتاتا کہ صلوٰۃ سے مراد وہ عبادت ہے جس کے اجزاء تکبیر۔ قیام۔ رکوع۔ سجود۔ تشہد وغیرہ ہیں یا زکوٰۃ سے مراد وہ خیرات ہے جو مذہبی فرض کے طور پر ادا کی جاتی ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے :-

"ان اللہ اصطفیٰ آدم و نوحاً و آل ابراہیم" (خود قرآن کچھ نہیں بتاتا کہ آلِ ابراہیم سے مراد کل ہیں یا بعض)

دوسری جگہ فرمایا ہے :-

"یقول الذین کفروا لست مرسلا قل کفی باللہ شہیدا بینی و بینکم و من عندہ ام الکتاب"

کافر کہتے ہیں کہ تو رسول نہیں ہے - کہدے میرے اور تمھارے درمیان شہادت دینے کے لئے خدا کافی ہے اور وہ شخص جس کے پاس علم الکتاب ہے - یہ صاحب علم الکتاب کون ہے ؟ قرآن بظاہر خاموش ہے

ایک اور آیت ملاحظہ ہو :-

"انہ لقرآن کریم فی کتاب مکنون لا یمسہ الا المطہرون"

یہ قرآن کریم ہے جو کتاب مکنون میں ہے اسے پیش نہیں کریں گے مگر مطہر - وہ کتاب مکنون کیا ہے جو ظرف قرآن ہے ؟

یہ چند مثالیں بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں - ورنہ ایک ایک قدم پر یہی مشکل پیش آتی ہے یہ مشکلات تو تفسیر کی حد تک ہیں اب رہی تاویل وہ تو ایک دریائے ناپیدا کنار ہے

آیات قرآنی کے سلسلہ میں اعتراضاً تحریر فرمایا گیا ہے کہ اہل تشیع تاویل کرنے اور اصل مفہوم کو کچھ سے کچھ کر دینے میں اُستاد مانے جاتے ہیں اور اسلام میں اس نوع کی تاویل کا دروازہ سب سے پہلے اسی فرقہ نے کھولا ہے اور حاشیہ پر پروفیسر نکلسن کی کتاب کا بھی حوالہ دیا گیا ہے

پہلے تو انھیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ تاویل کے معنی ہیں کسی لفظ کو اس کی حقیقت اولیہ کی طرف پلٹانا چنانچہ بعض مقام پر یہی حقیقت اولیہ مراد لی جاتی ہے اور ظاہر لفظ کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا اور بعض مقام پر حقیقت اولیہ بھی مدنظر رکھی جاتی ہے اور ظاہر معنی بھی

مثلاً "ید اللہ فوق ایدیہم" - اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر ہے - معلوم ہے کہ "ید" یا "ہاتھ" سے ظاہری معنے مراد نہیں ہو سکتے - اس لئے یہاں "قوت و قدرت گرفت" کے معنی مراد لئے جائیں گے اور ظاہر معنی کا قطعاً لحاظ نہ ہوگا

مثال ۲ - اقیموا الصلوٰۃ - ظاہر ہے کہ نماز کی حقیقت اولیہ رجوع الی اللہ ہے - اب یہ معنی بھی ملحوظ رہیں گے اور اس کے مفہوم ظاہری کا بھی لحاظ رکھا جائے گا جو شارع علیہ السلام نے متعین فرما دیا ہے کیونکہ بعض ارکان کے خلاف کوئی دلیل عقلی یا نقلی موجود نہیں ہے - بلکہ علی التواتر یہی اُصول عبارت تسلیم کیا گیا ہے - یہ ہیں تاویل کے معنی جو عرض کئے گئے - اب اگر اس قسم کی تاویل کا دروازہ شیعوں نے کھولا ہے تو وہ اولوالالباب ہیں - صاحب فہم و فراست ہیں - لیکن اگر فاضل مضمون نگار اپنے خیال میں تاویل کے معنی یہ سمجھ رہے ہیں کہ اصل مفہوم و منشاء کو کھینچ تان کر کچھ سے کچھ بنا دینا تو اس کی تفصیل آیندہ اوراق میں آئے گی - یہاں صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ مطالب قرآنی ہر عامی اور نامحرم کی سمجھ میں نہیں آسکتے - اسی لئے اس کے معلم اول خود رسول اللہ تھے مسلمان مجبور تھے کہ وقت نزول آیۃ رسول اللہ سے اس کا مطلب دریافت کریں، دریافت کرتے تھے اور جواب پاتے تھے - انھیں جوابات کو تفسیر سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس تفسیر چھوڑ کر قرآن کو

کافی سمجھنا یا خود اس کے مفہوم متعین کرنا رسول کے مرتبۂ معلمیت سے انکار کرنا ہے
اب سوال یہ ہے کہ مسئلہ کی صورت کیا ہے؟ آیا تفسیر سے ہاتھ اٹھا لیں یا اس پر عمل کریں؟ اور اگر عمل کریں تو کس کے توسط سے؟ شیعہ دوسری صورت کو اختیار کئے ہوئے ہیں اور توسط کے معاملہ میں ان کی نگاہ اہل بیت پر جمی ہوئی ہے۔
مطالب قرآنی کے متعلق یہ ہے شیعی نقطۂ نگاہ۔ اب میں قایل کی قرآن فہمی پر نظر کروں گا۔ ابتدائے عنوان میں تحریر فرماتے ہیں

"وہ قرآنی آیات جن کی بنا پر حضرات شیعہ کی جانب سے عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان سے حضرت علی کی الوہی خلافت پر مضبوط قرائن قائم ہوتے ہیں"

اس تحریر سے یقین دلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ صرف اتنی ہی آیتیں مدار مذہب شیعہ ہیں۔ خیر آئیے مطلب کی طرف۔

(۱) "لیس البر بان تاتوا البیوت من ظہورہا ولکن البر من اتقی واتوا البیوت من ابوابہا"

(نیکی یہ نہیں ہے کہ گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے داخل ہو بلکہ نیکی یہ ہے کہ اللہ سے ڈرو اور گھروں میں دروازے سے داخل ہو) ــ تفسیر آیت یہ ہے کہ بزمانہ جاہلیت عرب جب حالت احرام میں ہوتے تھے دروازوں سے گھروں میں داخل نہیں ہوتے تھے بلکہ پشت خانہ پر کھڑکی سی بنا لیتے تھے۔ اسی میں سے آتے جاتے تھے اور اسے جزو دین سمجھتے تھے۔ اسلام نے اس آیت کے ذریعہ اس رسم پرستی کی ممانعت کر دی

یہ تو وہ حقیقی مفہوم ہوا جو الفاظ سے مترشح ہوتا ہے اور جو اس آئت کی شان نزول پر مبنی ہے۔ لیکن ذرا نظر کو وسعت دیجئے احکام قرآنی کسی خاص مسئلے سے متعلق صادر تو ضرور ہوتے ہیں لیکن ان میں اس قسم کے سارے واقعات کا احاطہ مقصود ہوتا ہے۔ ایسا نہ ہو تو قوانین اسلامی مختص المقام فرمان ہو کر رہ جائیں گے۔ اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ اس حکم میں سیدھا راستہ چلنے کی طرف اشارہ ہے۔ کج روی کی ممانعت کی گئی ہے۔ اب آپ خود غور کیجئے کہ آیت کی تاویل غلط ہی یا صحیح تاویل یہ ہے کہ ہر فن میں ہر علم میں، ہر مسئلہ میں اسی قاعدے سے داخل ہونا چاہئے جو اس کے لئے معین مقرر ہے اگر عقب سے آؤ گے یعنی خلاف قاعدہ داخل ہو گے تو کچھ استفادہ نہ کر سکو گے۔ یہ ایک سیدھا سا عقلی اصول ہے اور اسی آیت کے تحت میں آ رہا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ ہر فن میں داخل ہونے کے لئے اس شخص کے پاس جانا چاہئے جو اس فن کی تعلیم دیتا ہے۔ چنانچہ اسی عقلی اصول کی بنا پر نحو کا دروازہ نحوی ہے اور راگ کا دروازہ گویا۔ نحو سیکھنے کے لئے نحوی کے پاس جائیے اور راگ سیکھنے کے لئے گویئے کے پاس۔ اسی طرح خدا شناسی کا ذوق ہے تو رسول کے پاس جائیے کیونکہ معرفت الٰہی کا دروازہ رسول ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ علم رسول کا دروازہ کون ہے یعنی علم رسول کا باب تو ضرور ہونا چاہئے مگر وہ ایسا کون ہے جو ہر حیثیت سے واقف علم رسول ہو۔ شیعہ یہاں تک تو صرف بحکم عقل آتا ہے اور جب تلاش کا قدم بڑھتا ہے تو اس کی خوش قسمتی سے ارشاد رسول اس کے لئے مشعل راہ بن جاتا ہے کہ "انا مدینۃ العلم وعلی بابہا"

اب اس شناخت کے بعد اس کی نظر اس ارشاد الٰہی پر جاتی ہے:۔

"ہل یستوی الذین یعلمون والذین لایعلمون انما یتذکر اولوالالباب"

اب میں عرض کرتا ہوں کہ اس استدلال میں کیا خرابی ہے اور آپ ہی متعین کیجئے کہ آخر عالم علم رسول کا حقہ کون ہے۔

(۲) "الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا"

(ترجمہ۔ آج میں نے تمہارے دین کی تکمیل کر دی اور اپنے احسان کو تم پر پورا کر دیا (نعمت کا ترجمہ احسان کیا خوب) اور میں نے پسند کیا کہ تمہارا دین اسلام (ہو)

اس کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ "سمجھ میں نہیں آتا اس آیت میں کونسا خلا یا نقص ہے جو حدیث غدیر کے ضم کرنے کی ضرورت ہوئی"

بے شک ذرا دور کی بات ہے۔ اس مقام پر بھی کسی قدر تفصیل کی ضرورت محسوس ہوتی ہے واضح ہو کہ "الیوم" میں "الف" "لام" کا فی نمایاں ہے یہ "الف" "لام" "یوم" کو جو نکرہ ہے معرفہ بنا رہا ہے اسی لئے اس کا ترجمہ "آج" کیا گیا۔ مگر میں ترجمہ کرتا ہوں "آج کا دن" کہ اصل لفظ کی قوت اسی میں باقی رہتی ہے۔ الغرض الیوم سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دن کوئی مخصوص دن ہے۔ اب آپ فرمائیں کہ وہ روز مخصوص کونسا ہے۔ فرض کیجئے ہمارے سامنے ایک پروگرام ہے اور جب اس پروگرام کا جزو اخیر انجام پا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج کے دن ہم نے اس پروگرام سے فراغت پائی۔ یا آج کے دن ہم نے اس کی تکمیل کر دی، ہاں یہ واضح رہے کہ پروگرام کی تکمیل کے پانچ دس دن بعد بلکہ اس کے دوسرے ہی دن "الیوم" کہنا درست نہ ہوگا۔ اسی طرح سے آیۂ مذکور میں نہ صرف یوم مخصوص بلکہ نبوت کے پروگرام کے جزو اخیر کی شناخت بھی ضروری ہے۔ اس کو خلا یا نقص نہیں کہتے بلکہ اسے "دعوت تفکر" کہتے ہیں۔

یہ ارشاد کہ "رسول کریم نے اپنی وفات سے قبل یہ اعلان فرمایا" کچھ مفید نہیں ہے اسی کو تعریف المجہول بالمجہول کہتے ہیں۔

لفظ مولیٰ سے جو تعرض کیا گیا ہے۔ میں اس کی طرف توجہ نہیں کرنا چاہتا۔ اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اب کچھ کہا جائے تو کس کے سامنے

(۳) "وانذر عشیرتک الاقربین واخفض جناحک" الخ

(ترجمہ۔ اپنے قریب کے رشتہ داروں کو متنبہ کر دے اور جو ایمان والے تیرے ساتھ ہیں ان کے سامنے اپنے بازو نیچے رکھ (یعنی ان کے ساتھ نرمی سے پیش آ)

اب سوال یہ ہے کہ اس حکم کی تعمیل رسول اللہ نے کی یا نہیں؟ اگر کی تو کیا کوئی عنوان خاص اختیار کیا یا ویسے ہی عام طور پر کھڑے ہو کر اعلان کر دیا۔ آخر تاریخی حیثیت واقعہ کی کیا ہے۔ فاضل مضمون نگار نے اس مقام پر وعدہ کیا تھا کہ بیعت عشیرہ کے واقعہ پر بحث احادیث میں روشنی ڈالی جائے گی۔ مگر تمام بحث احادیث میں اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں تھا

گویا پی گئے۔ اگر ڈپٹی نذیر احمد مرحوم زندہ ہوتے تو اس موقعہ پر ضرور لکھ دیتے کہ "معلوم ہوا پانی مرتا ہے"

(۴) " انما ولیکم اللہ ورسولہ والذین آمنوا الذین یقیمون الصلوٰۃ ویؤتون الزکوٰۃ وہم راکعون"

(ترجمہ۔ تمہارا رفیق تو صرف اللہ ہے اور اس کا رسول اور وہ لوگ جو ایمان لے آئے ہیں نماز پڑھتے ہیں اور عجز و انکسار سے زندگی گزارتے ہیں)۔ "ولی" کا ترجمہ "رفیق"! کیا کہنا

سوال یہ ہے کہ اگر کسی کے لئے کوئی ایسی صورت حال پیدا ہو جائے اور اسے کسی کی ولایت میں آنا پڑے تو وہاں ولی کے کیا معنی ہوں گے

اب دوسرے پہلو کو دیکھیئے۔ "وہم راکعون" کا ترجمہ فرمایا گیا ہے "اور عجز و انکسار سے زندگی گزارتے ہیں" اب میں اس کا ترجمہ یہ کرتا ہوں کہ "واؤ" کو "عاطفہ" نہیں "حالیہ" قرار دیتا ہوں اور کہتا ہوں۔ "وہ زکوٰۃ دیتے ہیں درآنحالیکہ وہ رکوع میں ہوتے ہیں"، کونسا قانون عربیت اس ترجمہ سے روک سکتا ہے اس طرح اس آیت کے دو ترجمے ہوگئے ایک وہ جو صاحب مضمون نے کیا ہے دوسرا یہ جو میرے قلم سے نکلا ہے، ایسی حالت میں ضروری ہے کہ ایک ایسا معیار ہو جس کی طرف دونوں رجوع کر کے فیصلہ کر سکیں اگر کوئی معیار نہیں ہے تو پھر معاملہ یونہی مبہم کا مبہم رہیگا

اب میں از روئے مفہوم اس آیت کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ مفہوم اولین یہ ہے کہ اس آیت کی رو سے ایک گروہ تو اولیا کا ہے جس کا سلسلہ خود ذات باری ہے۔ دوسری وہ جماعت ہے جو "کم" کی مخاطب ہے جن سے کہا گیا ہے کہ اللہ و رسول اور ان ان صفات والے لوگ تمہارے ولی ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جن پر یہ ولایت مقرر ہوئی ہے ان کا الیقین کئے بغیر آیت تشنہ مفہوم ہی رہے گی

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھنا چاہیئے کہ "اولیا" کا طبقہ الگ ہے اور "مولیٰ علیہم" کا طبقہ الگ اور طبقۂ اول میں لازماً کچھ ایسی صفات ہیں جو انھیں دوسرے طبقہ سے ممتاز کر رہی ہیں۔ ورنہ ایک جماعت کو ولی قرار دینا اور دوسری کو "مولیٰ علیہم"، ایک بے معنی بات ہے۔ پس ماننا پڑے گا کہ طبقۂ ثانی میں وہ صفات نہیں ہیں جن کا طبقۂ اولی حامل ہے اب بحکم عقل سلیم واجب ہے کہ "وجہ امتیاز" کی تلاش کی جائے اور وہ ایسی شے ہو کہ دوسروں میں نہ پائی جا سکے۔ دیکھئے "الذین آمنوا" سے کچھ بھید نہیں کھلتا۔ اس لئے کہ ایمان ایک شے مشترک ہے جو کم و بیش ہر مخاطب میں موجود ہے اسی طرح "یقیمون الصلوٰۃ" بھی کوئی روشنی نہیں ڈالتا۔ سب ہی نماز پڑھتے ہیں۔ علیٰ ہذا "یؤتون الزکوٰۃ" ادائے زکوٰۃ سے بھی کوئی خصوصیت خاصہ ظاہر نہیں ہوتی اس لئے صاحب مضمون کے ترجمے کی بنا پر اس آیت کا کوئی مفہوم صحیح پیدا نہیں ہوتا اور نہ کوئی وجہ امتیاز معلوم ہوتی ہے

بر سبیل تنزل زیادہ سے زیادہ اگر کوئی مفہوم پیدا کریں تو یہی ہوگا کہ جن کا ایمان اعلیٰ درجہ کا ہے۔ جو انتہائی خضوع و خشوع سے ہمیشہ نماز پڑھتے ہیں جو برابر زکوٰۃ دیتے ہیں۔ جو ہمیشہ خضوع و خشوع سے زندگی گزارتے ہیں۔ یہ لوگ ولی ہیں ان لوگوں کے

جن کا ایمان ادنیٰ درجہ کا ہے یا صرف زبانی ہے۔ لیکن مفہوم پھر بھی مبہم کا مبہم رہ جاتا ہے۔ بتایا جائے وہ بڑے ایماندار کون ہیں جو کمزور ایمان والوں کے رفیق ہیں؟ پھر یہ بھی ہے کہ ایمان کی کمی و بیشی ایک امر باطنی ہے۔ اسی طرح خضوع و خشوع فی الصلوۃ ان امور کا کون اندازہ لگائے؟ غرض اس مفہوم کی بنا پر بھی انسان کسی صحیح نقطہ تک نہیں پہونچ سکتا اور فاضل مضمون نگار نے جو ترجمہ پیش کیا ہے اس کی بنا پر آیت گورکھ دھندا ہو کر رہ گئی ہے

برخلاف ازیں دوسرا ترجمہ "وہ زکوٰۃ دیتے ہیں درآنحالیکہ رکوع میں ہوتے ہیں" ایک نہایت صاف و صریح "وجہ امتیاز" ہے اور یہ شان امتیازی جہاں پائی جائے گی وہیں ولایت مستحق ہو جائے گی۔ اس بات کی پروا نہیں کہ یہ "امتیاز" کہاں پایا جاتا ہے؟ ہمیں اصرار نہیں کہ علی ہی اس کے حامل ہیں نہیں۔ ابوبکر میں ثابت ہو جائے فبہا۔ عمر میں ثابت کر دیجئے قبول۔ لیکن محض اس بنا پر کہ علی میں یہ "شان امتیاز" پائی جاتی ہے۔ مفہوم آیت کو بدلنے کی سعی کرنا دیانت کا کام نہیں ہے

اب میرا سوال یہ ہے کہ "ولی" کا ترجمہ "رفیق" کس بنا پر فرمایا گیا ہے۔ آیا "ولی" اور "رفیق" مترادف الفاظ ہیں؟ یا لفظ ولایت مشترک ہے۔ اگر مشترک ہے تو کسی ایک معنی کے ساتھ مخصوص کرنے کے لئے قرینے کی ضرورت پڑتی ہے مثلاً لفظ "عین" کہ "سورج" کے معنی بھی دیتا ہے اور "چشمہ" کو بھی "عین" کہتے ہیں۔ "آنکھ" کے لئے بھی مستعمل ہے۔ پس جب تک کوئی قرینہ نہ پایا جائے تو کسی ایک معنی کے ساتھ مخصوص نہیں ہو سکتا۔ اب بتایا جائے کہ اس آیت میں کونسا قرینہ تھا جسکی بنا پر "ولی" کے معنی "رفیق" کر لئے گئے

(۵) "یاایہا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ واللہ یعصمک من الناس"

(ترجمہ۔ اے رسول وہ تمام چیزیں لوگوں تک پہونچا دے جو تیرے رب کی جانب سے تجھ پر نازل ہوئی ہیں اور اگر تو نے ایسا نہ کیا تو تو نے کچھ نہ پہونچایا اس کا پیغام اور اللہ لوگوں سے تیری حفاظت کرے گا)

اس آیت کے متعلق خلاصہ ارشاد یہ ہے کہ مفہوم آیت بجائے خود مکمل ہے۔ شان نزول دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آیئے اس کا امتحان کریں۔ مفہوم اولین کے لحاظ سے آیت میں جو پہلو نکلتے ہیں۔ قابل ملاحظہ ہیں۔

(۱) "ما انزل الیک" "جو تیری طرف نازل کیا جا چکا" اس سے یہ مفہوم نہیں معلوم ہو سکتا کہ وہ نازل شدہ شے ایک ہے یا کئی ہیں۔ مثلاً زید۔ عمرو سے کہتا ہے۔ "افعل ما قلت لک" وہ کر جو تجھ سے کہہ چکا ہوں ضروری ہے کہ متکلم اور مخاطب کے ذہن میں تو وہ مفہوم موجود ہو لیکن سننے والا یہ نہیں کہہ سکتا اور نہ حتماً کہہ سکتا ہے کہ وہ ایک کام ہے یا کئی کام ہیں۔ پس "ما" کا ترجمہ جو "وہ چیزیں" کیا گیا کس دلیل سے؟ یہ ہے پہلے ہی قدم پر لغزش

(۲) اس آیت میں ایک ایسی تاکیدی شان ہے جو تہدید کی حد تک پہونچ رہی ہے

(۳) وعدۂ حفاظت ایسی بتا رہا ہے کہ اس میں لوگوں کی طرف سے خوف بھی ہے

(۴) ضروری بات ہے کہ وہ شے جس کی بابت اس شد و مد سے حکم تبلیغ ملا ہے وہ پہلے نازل ہو چکی ہو اور رسول اسے

جاتا ہو۔ جیساکہ مثال میں اشارہ کیا گیا
جب تک ان پہلوؤں کو روشنی میں نہ لایا جائے۔ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ مفہوم بجائے خود مکمل ہے۔ ہاں مکمل ہے مگر ان عقدوں کے کھل جانے کے بعد۔ بغیر ان پہلوؤں کو روشن کئے یہ کہتے ہوئے چل دینا کہ "مفہوم بجائے خود مکمل ہے" بحث تو نہ ہوئی۔ دامن چھڑانا ہوا

یہی مشکلات ہیں جو انسان کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ شان نزول کی طرف رجوع کرے اور شان نزول کو دیکھ کر جو مطالب پیدا ہوں انھیں پیش کرے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا قطعاً صحیح نہیں ہے کہ اس صورت میں قرآن سے استدلال نہ ہوگا بلکہ شان نزول یا حدیث سے استدلال رہ جائے گا کیونکہ جس طرح صرف۔ نحو معانی۔ بیان کی قرآن فہمی کے لئے ضرورت ہے اسی طرح شان نزول۔ تاریخ۔ حدیث کی بھی ضرورت ہے یہ سب قرآن فہمی کے ذرائع اور وسائل ہیں۔ اب اگر کوئی شخص بہ لحاظ علم معانی و بیان قرآن سے استدلال کرے تو کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ یہ شخص قرآن سے نہیں بلکہ معانی و بیان سے استدلال کر رہا ہے

بحث آیات ختم ہو رہی ہے اور اس اختتام پر مجھے کہنا پڑتا ہے کہ فاضل مضمون نگار نے اس بحث میں قطعاً کامیابی حاصل نہیں کی۔ سطحی سطحی باتوں سے دل بہلانا چاہا ہے جن سے صاحب فکر و نظر کے سامنے کوئی فایدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔ آیات کی بحث ختم ہوگئی اور مجھے یقین ہے کہ قارئین کرام کو اس کا اندازہ ہوگیا ہوگا کہ صاحب مضمون نے جس تفصیلی آیات کو غیر واقعی تاویل سمجھا ہے وہ تاویل ہے یا حقیقت۔ اس بحث میں میری جانب سے صرف اس قدر کوشش کی گئی ہے کہ جو مغالطہ ذہنی مضمون نگار کو ہوا ہے اور مغالطہ منطقی انھوں نے دینا چاہا ہے اس کی اصلاح ہو ناہے ورنہ ان آیات کے رموز و اسرار پر ابھی بحث و گفتگو کی بہت گنجایش ہے۔ باقی

"نگار" کے پُرانے پرچے

نگار کے مندرجۂ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں جن کی دو دو تین تین کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت ہو طلب کرلیں۔ قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں :-

(سنہ ۲۲ء) ستمبر ۴ر۔ (سنہ ۲۶ء) جنوری، جون، نومبر ۵ر فی پرچہ۔ (سنہ ۲۷ء) اپریل، مئی و جون ۴ر فی پرچہ (سنہ ۲۹ء) دسمبر ۵ر (سنہ ۳۰ء) مئی ۴ر۔ (سنہ ۳۱ء) جولائی تا دسمبر ۴ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۲ء) فروری تا دسمبر (علاوہ اپریل) ۴ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۳ء) فروری۔ جولائی و اکتوبر ۴ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۴ء) مارچ ۴ر (سنہ ۳۵ء) نومبر ۵ر۔ (سنہ ۳۶ء) فروری۔ مارچ۔ اپریل۔ جون۔ نومبر۔ دسمبر ۵ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۷ء) مارچ۔ اپریل۔ مئی جون۔ جولائی۔ اگست۔ اکتوبر۔ نومبر و دسمبر ۸ر فی پرچہ

مینجر نگار لکھنؤ

سیاسی مسئلہ بن جاتا ہے اور اس کے عام اصول بیکار ہو جاتے ہیں، اس لئے اطالیہ کی ساکھ کسی یکسی طرح قایم رہی اور جنگ حبشہ میں تین کرور ۳۰ لاکھ پونڈ صرف کرنے کے بعد بھی وہ بدستور زندہ و سلامت موجود ہے۔ بہرحال اس میں کلام نہیں کہ اطالیہ کی اقتصادی حالت عرصہ سے نازک ہے اور ہو سکتا ہے کہ حبشہ پر حملہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو، لیکن اسی کے ساتھ بعض اور محرکات بھی شامل تھے۔

لوگوں کو لندن کے اس خفیہ معاہدہ کا علم ہوگا جو گزشتہ جنگ عظیم کے دوران میں اطالیہ کے ساتھ ہوا تھا۔ اطالیہ سے کہا گیا کہ اگر وہ جرمنی کے خلاف اتحادیین کا ساتھ دیگا تو مال غنیمت کا بڑا حصہ اس کو دیا جائے گا۔ چنانچہ وہ اس لالچ میں آگیا اور جنگ میں شریک بھی ہوا، لیکن نتیجہ وعدہ و امید کے خلاف نکلا۔ اسی کے ساتھ مسولینی کی خارجہ پالیسی کو بھی دیکھئے کہ وہ کس قدر ناکام رہی۔ فرانس نے ٹیونس کی طرف سے اسے مایوس کر دیا، البانیہ میں اس کا اقدام غیر مفید ثابت ہوا، عربوں کے ساتھ جنگ کرنے میں اس نے غلط فریق کا ساتھ دیا۔ اور دول بلقان میں باہم اختلاف قایم رکھنے کی کوشش اس لئے ناکام رہی کہ جگوسلیویا، رومانیہ، ٹرکی اور یونان میں باہم گر معاہدہ ہوگیا۔ آسٹریا اور ہنگری پر البتہ وہ اپنا اثر قایم کر لیگا (لیکن اب کہ جرمنی نے اس پر قبضہ کر لیا ہے، یہ بھی باقی نہیں رہا)

اطالیہ کی اقتصادی اور سیاسی حالت تو آپ نے سن لی، اب اسی کے ساتھ آپ مسولینی کی ذہنیت کو بھی سامنے رکھئے مسولینی تمام ڈکٹیٹروں کی طرح اقتدار پر جان دیتا ہے اور کچھ نہ کچھ اسے کرنا ضرور تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے سیاسی اقدامات نہایت خطرناک ہیں، وہ اچھی طرح واقف تھا کہ حبشہ کی مہم نہایت دشوار ہے، وہ خوب سمجھتا تھا کہ بحر روم میں اس کے سواحل ہر وقت برطانیہ کے گولوں کا آماجگاہ بن سکتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ وہ اپنے قوی اقتدار کو بھی ہاتھ سے دینے پر آمادہ نہ تھا اور اطالیہ کی تمام گزشتہ مایوسیوں اور ذلتوں کا انتقام لینے کے لئے بے چین تھا۔ اور چونکہ حبشہ ہی ایک ایسا ملک تھا جو دول یورپ کی مستعمراتی دستبرد سے اسوقت تک محفوظ رہا تھا، اس لئے اس نے اسی کو اپنا نشانہ بنایا۔

اس جگہ یہ بحث دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ برطانیہ اور فرانس کی دستبرد سے حبشہ کیونکر محفوظ رہا

بات یہ ہے کہ اول تو حبشہ کی سرزمین ایسی ہے جہاں کوئی یوروپین قوم مستقل طور سے آباد نہیں ہو سکتی، دوسرے یہ کہ حصول دولت کے فطری ذرایع وہاں بہت موہوم ہیں اور پھر یہ کہ وہاں کے جنگجو وحشی قبایل سے سر بر آنا آسان نہیں تاہم دول عظمیٰ کی مداخلت سے یہ ملک آزاد نہ رہ سکا اور ۱۸۹۱ء سے ۱۸۹۴ء تک برطانیہ اور اطالیہ دونوں وہاں اپنا حلقہ اثر قایم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اطالیہ کو تو خیر اس سے کوئی فایدہ نہ ہوا لیکن برطانیہ کامیاب رہا کیونکہ ٹسانا جھیل اسی کے تصرف میں تھی جس سے سوڈان اور مصر میں آبپاشی ہوتی ہے۔ ہر چند ۱۹۰۶ء میں حبشہ کی آزادی کو اطالیہ نے تسلیم کر لیا تھا لیکن فرانس، برطانیہ اور اطالیہ نے باہم معاہدہ کرکے اس کو اصولاً تین حصوں میں تقسیم کر لیا تھا۔ یہ جنگ عظیم سے پہلے کی ملوکانہ پالیسی تھی جس کے خلاف حبشہ نے صدائے احتجاج بھی بلند کی، لیکن بیسود ثابت ہوئی

اس کے بعد ۱۹۱۵ء میں جو خفیہ معاہدہ لندن میں ہوا (اور جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) اس کی رو سے یہ طے پایا کہ اگر فرانس و برطانیہ، افریقہ میں مستعمراتی توسیع کریں تو اطالیہ کے ساتھ یہ رعایت ملحوظ ہوگی کہ اس کے مستعمرات (اریٹریا سومالی لینڈ۔لیبیا) کی حد بندی کے متعلق اس کی موافقت میں فیصلہ کیا جائے گا

۲۳ء میں حبشہ، لیگ اقوام کا ممبر ہوا اور فرانس و برطانیہ کی حمایت و اعانت پر بھروسہ کر کے مطمئن ہو گیا ۲۵ء میں مسٹر چیمبرلین (وزیر اعظم برطانیہ) اور مسولینی میں ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے دونوں نے طے کر لیا کہ حبشہ کے کس حصہ میں کس کا کتنا اثر تسلیم کیا جائے گا۔ برطانیہ جھیل ٹسانا میں ایک بندھ بنانا چاہتا تھا اس لئے مسٹر چیمبرلین نے مسولینی کو اس پر راضی کر لیا کہ اگر وہ اس میں دخل نہ دیگا تو برطانیہ حبشہ کے مغرب میں اطالوی اثرات کو تسلیم کریگا اور اریٹریا سے سومالی لینڈ تک جو جدید ریلوے لائن وہ نکالنا چاہتا ہے اس کی حمایت کریگا۔ لیکن یہ معاہدہ عملی صورت اختیار نہ کر سکا کیونکہ شاہ حبش نے جنیوا کے اجلاس میں اس کی سخت مخالفت کی اور یہ معاہدہ ختم ہو گیا

۲۸ء میں اطالیہ نے حبش سے ایک دوستانہ معاہدہ کیا اور ہر ایک نے دوسرے کی آزادی کو تسلیم کر لیا اور اس کے بعد سات سال تک کوئی بات ایسی پیدا نہ ہوئی کہ اس معاہدہ کو توڑا جاتا، آخر کار ۳۵ء آیا اور مسولینی نے اپنی پہلی ضرب استعمال کی

۵ دسمبر ۳۴ء کو ولوال کا سرحدی جھگڑا شروع ہوا، حالانکہ وہ حدود سومالی لینڈ سے سو میل حبشہ کے اندر واقع ہے۔ اس نزاع کی ابتدا یوں ہوئی کہ ایک کمیشن نے (جو انگریزی و حبشی ممبروں پر مشتمل تھا) بمقام ولوال ایک اطالوی فوجی دستے کو خیمہ زن پایا۔ یہ دیکھ کر انگریز تو واپس گئے، لیکن حبشیوں نے اس سے جنگ کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۳۲ اطالوی اور ایک سو دس حبشی سپاہی مارے گئے

مسولینی (جس نے فی الحقیقت یہ چھیڑ اسی لئے کی تھی کہ لڑائی کا بہانہ ہاتھ آجائے) آپے سے باہر ہو گیا اور شاہ حبش سے مطالبہ کیا کہ وہ معافی چاہے، اطالوی جھنڈے کو سلامی دے اور ۲۰ ہزار پونڈ تاوان ادا کرے، لیکن حبش اس پر راضی نہ ہوا اور اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا وہ سب کو معلوم ہے

مسولینی نے یہ سمجھا تھا کہ برطانیہ اس کے اقدام کی مخالفت نہ کریگا لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ برطانیہ کچھ زیادہ موافق نہیں ہے تو جنوری ۳۵ء میں مسولینی نے دوبارہ برطانیہ سے گفت و شنید کرنا چاہی، لیکن جب اس نے دیکھا کہ برطانیہ معاملہ کو لیگ اقوام پر چھوڑ رہا ہے اور اس کے خلاف تجارتی ناکہ بندی کی تجویز ہو رہی ہے تو وہ بپھر گیا اور اسنے لیگ سے علٰحدہ ہونے کی دھمکی دیتے ہوئے، ۳ اکتوبر کو حبشہ پر حملہ کر دیا۔ اس وقت اس نے مارننگ پوسٹ کے نمائندہ کو جو بیان دیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعی مسولینی کے دل میں کیا تھا۔ اس نے کہا کہ "اب ہم سے یہ کہنا کہ لڑائی سے باز آئیں بہت بعد از وقت ہے۔ پرتگال کو دیکھو، بلجیم اور ہالینڈ کو دیکھو، ان میں سے کون ایسا ہے جو زرخیز مستعمرات کا

مالک نہیں۔ یقیناً اطالیہ کو بھی ایسی ہی مستعمرات ملنا چاہئیے اور جس وقت ہمیں اس میں کامیابی ہوگئی، تو ہم بھی ویسے ہی صلح پسند ہو جائیں جیسے اور ممالک ہیں"۔ نیویارک کے اخبار سن (Sun) سے اس نے کہا کہ:-
"ہم پر کیوں اُن باتوں کا الزام لگایا جاتا ہے جو خود تمھارے لئے جایز ہیں، جب تمھارے اغراض تم کو مجبور کرتے ہیں تو کبھی جنگ سے پس وپیش نہیں کرتے، لیکن ہمارے لئے ایسا کرنا جرم ہے"۔ ایک بار اس نے اپنی تقریر کے دوران میں کہا کہ "تقدیر کا پہیا اب منزل تک پہونچنے کے لئے گردش میں آگیا ہے اور اب اس کو نہیں روکا جا سکتا"

اسے سب سے زیادہ غصہ برطانیہ پر تھا۔ وہ یہ دیکھ دیکھ کر جل رہا تھا کہ برطانیہ خود تو ایک چوتھائی کرۂ ارض پر قابض ہے اور ۴۵ کروڑ انسانوں پر حکومت کر رہا ہے لیکن اطالیہ کو اس کی بھی اجازت نہیں دیجاتی کہ وہ حبشہ ایسے حقیر اور اُجاڑ حصۂ زمین پر متصرف ہو جائے۔ اسے معلوم تھا کہ برطانیہ نے ہندوستان پر کیونکر قبضہ کیا، وہ جانتا تھا کہ جنگ بوئر میں برطانیہ نے کیا کیا، وہ واقف تھا کہ اس نے جاپان کو کیوں منچوریا پر قابض ہو جانے دیا۔ مصر کے اندر اسکی ریشہ دوانیاں، عدن کا الحاق، ایران کے معاملات میں اس کی مداخلت، جنگ کریمیا میں روس کے خلاف ترکوں سے اتحاد، قبرص کا قبضہ، سوڈان میں ملوکانہ اقدام، یہ اور اسی قسم کے بہت سے واقعات برطانوی تصرفات کے اسے معلوم تھے[1] اور وہ اندر ہی اندر کڑھ رہا تھا کہ خود اپنے حرکات کو تو برطانیہ دیکھتا نہیں اور اطالیہ کی مخالفت میں لیگ اقوام کا بہانہ ڈھونڈھ رہا ہے

اعلانِ جنگ کے بعد برطانیہ نے یہ سوچا کہ اگر اطالیہ میں اسباب حرب کی درآمد بند کر دیجائے، تو ممکن ہے، حبشہ کی جان بچ جائے، لیکن اول اول سب سوچ بچار ہی میں پڑے رہے اور آخر کار جب مسولینی نے ایک لاکھ فوج حبشہ میں اُتار دی تو ان کے کان کھڑے ہوئے اور ناکہ بندی کے لئے بحر روم میں جنگی جہاز جمع ہونے لگے۔ اسی کے ساتھ مسٹر ایڈن نے اقتصادی ناکہ بندی کی بھی تجویز پیش کی، اور اس طرح مسولینی کا غصہ اور بڑھتا گیا

حقیقت یہ ہے کہ لیگ اقوام کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب برطانیہ کی پالیسی تھی، جو ایک طرف یہ بھی چاہتا تھا کہ اطالیہ حبش پر قابض نہ ہونے پائے اور دوسری طرف وہ اطالیہ سے بگاڑنا بھی مناسب نہ جانتا تھا۔ کیونکہ اندیشہ یہ تھا کہ اگر اطالیہ لیگ اقوام سے علٰحدہ ہو گیا تو یقیناً جرمنی سے مل جائے گا۔ اسوقت لیگ کے سامنے حقیقتاً اطالیہ اور حبشہ کا سوال

---

[1] سنہ ۱۸۱۸ء سے برطانیہ نے جن آزاد حکومتوں پر اپنا قبضہ قایم کیا، ان کی فہرست ملاحظہ ہو:- بلوچستان - برما - قبرص - ویہائے وی - ہانگ کانگ - کویت - سنائی - شمالی گائینا - جنوبی گائینا - مشرقی گائینا - جزائر سلیمان - جزائر ٹونگا - سوڈان - اگانڈا - برٹش ایسٹ افریقہ - برٹش سومالی لینڈ - زنجبار - ٹرنسوال - آرینج فری اسٹیٹ - رھوڈیسیا - برٹش سنٹرل افریقہ - نائجیریا -
علاوہ ان کے آمرانہ حیثیت سے وہ فلسطین - ٹرانس جارڈن ٹینگن یکا - ٹوگو - کیمرون - سوتھ ویسٹ افریقہ پر بھی قابض ہے -

نہ تھا بلکہ جرمنی کا تھا۔ کبھی یہ خیال ہوتا تھا کہ اطالیہ کے خلاف ناکہ بندی نامناسب ہے کیونکہ اطالیہ کی کمزوری سے ہٹلر کو ہاتھ پاؤں پھیلانے کا موقعہ مل جائے گا اور وسطِ یوروپ کا امن وسکون درہم برہم ہوجائے گا، کبھی یہ سوچتے تھے کہ ناکہ بندی ضروری ہے تاکہ اطالیہ کی حالت کو دیکھ کر ہٹلر کو تنبیہ حاصل ہو اور دوسرے ملکوں میں مداخلت کے خیال کو ترک کردے۔

اسی کے ساتھ یہ اندیشہ بھی تھا کہ اگر اطالیہ کو زیادہ سختی کے ساتھ باز رکھا گیا تو ممکن ہے دوسری عالمگیر جنگ شروع ہوجائے۔ الغرض برطانوی مدبرین اس باب میں مختلف الخیال تھے اور اسی لئے بحرِ روم میں انکے جنگی جہازوں کی نقل وحرکت اسوقت تک شروع نہیں ہوئی، جب تک لیبیا میں اطالوی توجوں کے اجتماع سے مصر اور مالٹا کی طرف سے برطانیہ کو خطرہ پیدا نہ ہوگیا۔ اطالیہ کے خلاف ناکہ بندی کے متعدد اسباب یہ تھے:۔

ایک یہ کہ اگر اسوقت لیگ اقوام نے کوئی موثر کارروائی نہیں کی تو اس کا رہا سہا اقتدار بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہوجائیگا اگر منچوریا کے مسئلہ میں لیگ اقوام نے جاپان کے خلاف کوئی قدم نہیں اُٹھایا تھا تو خیر کوئی بات نہ تھی کیونکہ وہ معاملہ ایک دور دراز ایشیائی حصہ کا تھا، لیکن حبشہ تو گویا گھر کی بات تھی اس لئے اگر اسوقت اطالیہ کی مداخلت کو گوارا کرلیا گیا تو آئندہ جرمنی کو بھی اس کا حوصلہ ہوگا اور یوروپ کا امن خاک میں مل جائے گا۔

دوسرے یہ کہ مقبوضات برطانیہ سب کی سب ناکہ بندی پر زور دے رہے تھے

تیسرے یہ کہ انگلستان کی لبرل جماعت جو فاسزم کی دشمن ہے مسولینی کو نیچا دکھانا چاہتی تھی

چوتھے یہ کہ جب جون ۳۵ء میں لارڈ سیسل نے لوگوں کی رائے حاصل کی تو معلوم ہوا کہ تقریباً تین کروڑ آدمی اقتصادی ناکہ بندی کے موافق ہیں اور تقریباً پون لاکھ اقتصادی و حربی دونوں قسم کی ناکہ بندیاں چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب کسی ملک کی نصف آبادی ایک طرف ہوجائے تو کیونکر اس کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے

علاوہ اس کے لیبر پارٹی بھی پوری طور سے ناکہ بندی کی موافقت میں تھی اور جنرل اسمٹس نے ظاہر کیا کہ حبشہ اور اطالیہ کی یہ جنگ برطانوی مستعمرات میں گورے اور کالے کی جنگ سمجھی جائے گی جو برطانوی اغراض کے منافی ہے۔

اسی کے ساتھ یہ خیال بھی تھا کہ مبادا اطالیہ کی کامیابی مصر، بحرِ احمر، اور ہندوستان کے لئے کوئی خطرہ بن جائے

الغرض ناکہ بندی کا فیصلہ کرلیا گیا لیکن بالکل بادلِ ناخواستہ اور عمل کیا گیا اتنی سست روی کے ساتھ کہ اس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ اقتصادی یا تجارتی ناکہ بندی تو خیر کچھ ہوئی بھی لیکن اسبابِ حرب کی درآمد اطالیہ میں برابر جاری رہی اور نہر سویز کو اطالیہ کے خلاف بند کردینے کی جو تجویز برطانیہ یا لیگ اقوام نے پیش کی تھی اس پر تو عمل ہوا ہی نہیں۔

ادھر ظاہر میں تو یہ سب کچھ ہورہا تھا، لیکن اندرونی طور پر کیا سمجھوتے ہورہے تھے۔ اس کی داستان بھی سن لیجئے محکمۂ خارجہ کے اربابِ حل وعقد اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ اس جنگ کو کیسے ختم کرنا چاہیئے۔ ۸ر دسمبر کو سر سیموئیل ہور (برطانیہ کے وزیر خارجہ) پیرس گئے اور وہاں مسٹر لیول سے کچھ گفتگو کی، لیکن کچھ پتہ نہ چلا کہ آپس میں

کیا طے کیا گیا۔ لیکن اتفاق سے فرانس کے اخباروں کو کچھ پتہ چل گیا اور ان کے ذریعہ سے انگلستان کے اخباروں کو بھی معلوم ہوگیا کہ حبش کا ایک حصہ اطالیہ کو رشوت میں دینا طے کرلیا گیا ہے۔ اس سے انگلستان کی پبلک میں ہیجان پیدا ہوگیا۔ اب کابینہ کو فوراً کچھ نہ کچھ کرنا ضروری تھا، اس لئے مسٹر بالڈوین نے فوراً کابینہ کو طلب کرکے "ہور۔لیول" سمجھوتہ کی منظوری دیدی اور اتنی جلدی اس کو طے کیا کہ وزراء کو یہ سمجھنے کا بھی موقعہ نہ ملا کہ فی الحقیقت اس سمجھوتہ کی نوعیت کیا ہے کہا جاتا ہے کہ اس وقت کمرہ سے نقشے بھی ہٹا دئے گئے تھے تاکہ لوگوں کو یہ سمجھنے کا بھی موقعہ نہ ملے کہ حبشہ کا کتنا حصہ اطالیہ کو دیا جا رہا ہے

دوسرے دن مسٹر بالڈوین نے ایوان وزارت میں ایک تقریر کی جس سے اس سمجھوتہ پر کچھ روشنی پڑتی تھی۔ انھوں نے دوران تقریر میں کہا کہ "اسوقت میرے لبوں پر مُہر لگی ہوئی ہے، لیکن جس وقت یہ ہنگامہ فرو ہوجائے گا تو میں تفصیل بیان کردوں گا اور مجھے امید ہے کہ کوئی آواز بھی میرے خلاف نہ اُٹھے گی،،

اس بیان نے لوگوں میں حیرت و اضطراب کی لہر دوڑا دی اور حقیقت معلوم کرنے کے لئے بیچین ہوگئے۔ سرسموئیل ہور ابھی تک واپس نہ آئے تھے۔ ۱۳ر دسمبر کو اس سمجھوتہ کی تفصیل شایع ہوئی، جو لوگوں کے اندیشہ سے زیادہ خراب ثابت ہوئی ۱۴ کو ہور نے وزیر برطانیہ متعینۂ حبش کو تار بھیجا کہ شاہ حبش پر پورا اثر ڈال کر راضی کیا جائے۔ لیکن ادھر پبلک کی برہمی برابر بڑھتی جا رہی تھی چنانچہ مسٹر ایڈن نے صاف صاف کہدیا، فرانس اور برطانیہ دونوں ملکر حبش کو ڈبو دینا چاہتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کی موافق جماعت بھی متزلزل ہوگئی، مسٹر بالڈون پر ہرطرف سے اعتراضات ہونے لگے یہاں تک کہ ٹوری جماعت بھی مخالف ہوگئی۔ اس صورت میں کسی نہ کسی کو قربانی کا بکرا ضروری تھا۔ اس لئے جب سرسموئیل ہور، سوئٹزرلینڈ سے واپس آئے تو مسٹر بالڈون نے انھیں کی بھینٹ چڑھا دی، یعنی ان کو وزارت خارجہ سے استعفا دینا پڑا اور یہ سمجھوتہ ختم ہوگیا

۱۹ر دسمبر کو ہور نے دارالعوام میں دبی زبان سے کچھ جوابدہی کی، لیکن مسٹر بالڈوین کے لبوں پر جو مُہر سکوت لگی ہوئی تھی وہ نہ ٹوٹی، اسی لئے بعض نے یہ رائے قایم کی کہ استعفا اصل میں بالڈوین سے طلب کرنا چاہئے تھا نہ کہ ہور سے۔

مسٹر بالڈوین جن باتوں کو ظاہر نہ کرسکتے تھے وہ یہ تھیں کہ اگر اطالیہ کے خلاف ناکہ بندی کی گئی اور خصوصیت کے ساتھ پٹرول وغیرہ کی درآمد وہاں بند کردی گئی تو بالکل ممکن ہے کہ وہ جھنجھلا کر برطانوی بیڑہ پر حملہ کردے اور اس صورت میں سارے یوروپ کے اندر جنگ چھڑ جانا یقینی تھا، اسی کے ساتھ ایک جماعت کا خیال تھا کہ اطالیہ اس جنگ میں ناکام رہے گا اور یوروپ کی موجودہ سیاسیات متزلزل ہوجائے گی، دوسری جماعت کا خیال تھا کہ وہ کامیاب ہوگا، اس لئے مناسب یہی ہے کہ اختتام جنگ سے قبل اس کو حبش کا ایک ٹکڑا دیکر راضی کرلیا جائے ۔۔ ان صورتوں میں مناسب یہی تھا کہ ناکہ بندی وغیرہ کی کارروائی سے قبل ہی اطالیہ کو حبشہ کا ایک ٹکڑا دیکر راضی کرلیا جائے، لیکن یہ تدبیر کامیاب

نہ ہوئی اور آخرکار ناکہ بندی شروع ہوئی ۔ یہ ۳۶ء کی ابتدائی بات ہے

مسولینی جو برطانیہ و فرانس کی ترکیبوں کو غور سے دیکھ رہا تھا آخرکار سمجھ گیا کہ اسے کیا کرنا ہے اور اس نے فوراً ۵ لاکھ اطالوی سپاہ معہ جدید آلات حرب اور زہریلی گیس وغیرہ کے اسقدر تیزی کے ساتھ حبش پہونچا دی کہ لوگ حیران رہ گئے نتیجہ جو کچھ ہوا سب کو معلوم ہے ۔ ۵ مئی کو عدیس ابابا فتح ہو گیا اور شاہ حبش فرار ہو گیا

رہائن لینڈ میں ہٹلر کی کامیابی، حبش میں مسولینی کی فتح اور جنگ اسپین حقیقتاً سب ایک ہی زہریلے درخت کی شاخیں ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اب ڈیماکریٹک حکومتیں اس کو ماننے لگی ہیں کہ بلا پس و پیش اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالدینا بھی بجائے خود ایک قوت ہے اور اس قوت کا بہترین مظاہرہ فاسزم اور نازیزم کی طرف سے ہو رہا ہے

مسولینی کی کامیابی حبشہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ فاسسٹ جماعت کے حوصلے بڑھ گئے اور یورپ کے مختلف حصوں میں اس نے جارحانہ اقدام شروع کر دیا

اس وقت یورپ آماجگاہ ہے اس تصادم کا جس میں ایک طرف حق و قانون کی پناہ ڈھونڈھی جا رہی ہے اور دوسری طرف تیغ و تفنگ سے فیصلہ چاہا جاتا ہے ۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ فیصلہ دشوار ہے، تاہم یہ یقینی ہے کہ کچھ نہ کچھ ہو کر رہیگا اور جلد ہو کر رہیگا ۔

راہب

(ایک ایکٹ کا ڈرامہ)

راہب اونچے مینار پر بیٹھا کتاب پڑھ رہا ہے :۔

"لغزش، انسانی سرشت میں داخل ہے، کون ہے جو ان لغزشوں سے مبرّا ہے؟ ان کو مٹانا تو درکنار انکا ادراک بھی مشکل امر ہے۔ کون ہے جو ایک عورت کو دیکھے اور اپنا دین و دل نہ کھو بیٹھے؟ کون ہے جو کسی دوشیزہ کو دیکھ کر اپنی روحانیت برقرار رکھ سکے"۔

کچھ سوچ کر آپ ہی آپ کہنے لگتا ہے :۔

"یقیناً ہمارے عیسےٰ کو ضرور کوئی خطرناک عورت ملی ہوگی میں بھی ایسی ہی عورت کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ آجتک جتنی عورتیں مجھے ملی ہیں سب کی سب شریف خصایل تھیں"

پھر پڑھنے لگتا ہے :۔

"اے بیٹے! اگر تو سعادت دامن چاہتا ہے تو عورت کو طاعون خیال کر، اپنی پوری طاقت سے عورت دور بھاگ، اُس کے آگے سر نہ جھکا۔ عورت کی سرشت میں داخل ہے کہ مرد کا تعاقب کرے"

اوپر دیکھ کر آپ ہی آپ :۔

"میرے مینار کی چوٹی سے اچھی جگہ کوئی نہیں ہے۔ لیکن مسیح تو عورت کو بہت سخت الفاظ سے یاد کرتے! غالباً اُنھیں عورت سے ملنے کا موقع نہ ملا ہوگا"

(مینار کے نیچے سے ایک آواز) راہب! معزز راہب!

راہب ــ کون ہے، مجھے کون بلاتا ہے؟

آواز (نزدیک سے) ایک زائر

راہب ــ کیا زائر ہمارے لئے کوئی ہدیہ لایا ہے؟

زائر ۔ ہاں، کھجوروں کی دو ٹوکریاں

راہب ۔ صرف دو؟ (کچھ سوچکر) خیر، اوپر آجاؤ! (کچھ وقفہ کے بعد سیڑھیوں سے ایک سر دکھائی دیتا ہے)

زائر ۔ راہب! معزز راہب

راہب ۔ (اپنی آواز میں اجنبیت پیدا کرتے ہوئے) معزز نوجوان مینار کے نیچے سے آوازیں دینا کوئی معنی نہیں رکھتا

زائر ۔ (ذرا اور اوپر آکر) لیکن مینار پر چڑھنا بھی کوئی آسان کام نہیں

(وہ مینار پر آکر راہب کے سامنے کھڑا ہوجاتا ہے، یہ ایک جوشیلا نوجوان ہے اور زائرین کے لباس میں ملبوس ہے)

آپ ہی ہیں معزز راہب! اور یہی ہے آپ کا مقدس مینار (گھٹنوں کے بل جُھک کر) کس قدر مبارک ہے آج کا دن کہ مجھے آپ کی زیارت نصیب ہوئی

راہب ۔ نوجوان! اگر تم احتیاط سے کام نہ لوگے تو گر پڑو گے۔ میں کوئی ایسا بڑا راہب نہیں ہوں۔ ہاں تو وہ کھجوروں کے متعلق تم نے کیا کہا تھا

زائر ۔ میں دو ٹوکریاں لایا ہوں۔ (کھڑا ہوکر کپڑوں میں سے تلاش کرتا ہے) ایک یہ اور دوسری ۔۔۔۔ معزز راہب، میرا خیال ہے کہ میں دوسری ٹوکری مینار کے نیچے بھول آیا ہوں

راہب ۔ (غصہ سے) تم بڑے لاپرواہ معلوم ہوتے ہو

زائر ۔ میں کل کسی کے ہاتھ بھیج دوں گا

راہب ۔ کل تم کیوں نہیں آسکتے؟

زائر ۔ کیونکہ میں ایک راہبہ کارنیلیا کی زیارت کرنے جارہا ہوں۔ سنا ہے کہ اُس نے تین سال سے کچھ نہیں کھایا۔

راہب ۔ (حسد سے) تو تم غلطی سے راستہ بھول کر میری طرف آگئے ہو، ہاں ہاں کارنیلیا کے پاس جلدی جاؤ ورنہ وہ مرگئی تو تمہارے لئے بہت بُرا ہوگا

زائر ۔ لیکن آپ تو کارنیلیا سے زیادہ مشہور ہیں، اسی لئے کارنیلیا کے لئے کھجوروں کی صرف ایک ٹوکری لئے جارہا ہوں اور آپ کے لئے دو لایا ہوں

راہب ۔ ایک دوسری کا تو صرف وعدہ ہے اور یہ کھجوریں کارنیلیا کے لئے کیوں لئے جارہے ہو وہ تو کچھ نہیں کھاتی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے تم سے کیوں کہا کہ احتیاط کرو ورنہ نیچے گر پڑو گے

زائر ۔ (جھک کر) خدا کے لئے برہم نہ ہوجئے، میں بہت دور سے چل کر آیا ہوں۔ یہاں پہونچنے میں پانچ سال صرف ہوگئے ہیں

راہب ۔ تم نے راستہ میں کتنے راہبوں کی زیارت کی ؟
زائر ۔ جتنے راستہ میں مل سکے، لیکن آپ سب سے زیادہ مقدس و بزرگ ہیں
راہب ۔ (کچھ نرمی سے) مجھے خوشامد کی ضرورت نہیں ہے
زائر ۔ لیکن میں تو بالکل درست کہتا ہوں۔ تمام دنیا میں آپ کی شہرت ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ آپ کو ایکدفعہ دیکھکر آپ کو بھلا دینا ممکن نہیں۔ ہزاروں آدمی صرف آپ کی زیارت کے لئے ہر قسم کی قربانی کرنے کو طیار ہیں۔
راہب ۔ ہاں بہت سے لوگ لیکن وہ اپنی عقیدت کا مظاہرہ کھجوروں کی صرف دو ٹوکریوں سے کرتے ہیں، نہیں بلکہ ایک سے، اور دوسری صرف وعدہ کی صورت میں
زائر ۔ لیکن میں تو غریب ہوں۔ کھجوریں آپ کے مینار کے نیچے بکتی ہیں اور وہ کچھ بہت زیادہ گراں قیمت بھی نہیں۔
راہب ۔ ہوں ۔ تو یہ وجہ ہے کہ میرے پاس آج کل کھجوریں ہی لائی جاتی ہیں۔ میں اکثر حیران ہوا کرتا تھا۔ نوجوان! اگر تم غریب ہو تو تم نے پانچ سال سفر میں کس طرح صرف کئے ؟
زائر ۔ میں نہیں جانتا۔ معزز راہب! دنیا بہت عظیم الشان ہے اور آزادی بہت اچھی
راہب ۔ یہ تو بہت پرانا خیال ہے اس سے یہ تو ظاہر نہیں ہوسکتا کہ تم زائروں کے لباس میں کیوں ملبوس ہو
زائر ۔ شاید آپ کو معلوم ہو کہ آجکل سفر کرنے کا آسان طریقہ صرف یہی ہے۔ ایک زائر بہت سی چیزیں بغیر قیمت ادا کئے دیکھ سکتا ہے۔ اگر اُسے قیمت ادا کرنی بھی پڑے تو وہ کچھ زیادہ نہیں ہوتی
راہب ۔ کیا تمھیں کھجوریں بھی ارزاں مل گئی ہیں ؟
زائر ۔ آپ کے لئے مخصوص کھجوریں ہوتی ہیں جو کچھ کم درجہ اور ———
راہب ۔ (غصہ سے) کیا یہ کم درجہ ہوتی ہیں ؟ میں اس کے متعلق ضرور دریافت کروں گا۔ میرے الفاظ یاد رکھو کہ کل تک وہ دوکان یہاں نہیں رہے گی۔ میں اُنھیں کم درجہ کھجوریں رکھنے کا مزا چکھاؤں گا۔
زائر ۔ میرا خیال ہے کہ آپ کوئی سخت بددعا نہیں دیں گے۔
راہب ۔ خیر، تمھیں اس سے کیا واسطہ۔ ہاں، تو تم زائرین کے لباس میں اس لئے سفر کرتے ہو کہ تمھارا خرچ کم ہو۔ کس قدر نفرت انگیز عمل ہے۔ اچھا اب تم اس مینار سے جلد اُتر جاؤ۔ تم نے اپنی کھجوروں ——— کم درجہ کھجوروں کی قیمت سے زیادہ گفتگو کرلی ہے۔ جلد اُتر جاؤ اور کارنیلیا کے پاس جاؤ، میں تمھیں دیکھنا نہیں چاہتا
زائر ۔ آپ بھی تو اس مینار سے نیچے اُترئے، دیکھئے موسم بہار میں دنیا کیسی خوبصورت ہوجاتی ہے
راہب ۔ میں خوبصورتی سے نفرت کرتا ہوں
زائر ۔ نہیں، آپ ضرور یہاں سے اُتر کر نیچے جائیے اور دنیا کے عجائبات دیکھئے، اگر میں اپنی تمام عمر سفر میں

صرف کردوں تب بھی ان عجائبات کو نہیں دیکھ سکتا

راہب ــ میں ان عجائبات کی کوئی پرواہ نہیں کرتا

زائر :ــ نہیں، آپ غلطی پر ہیں۔ کیا آپ پہاڑوں پر گھوم کر جانے والی سڑک کی خوبصورتی اور دل آویز و دلکش میدانوں کی پرواہ نہیں کرتے ؟ کیا آپ اس مینار کے مقابلہ میں وہاں رہنا پسند نہیں کریں گے ؟

راہب ــ ہرگز نہیں

زائر :ــ (کچھ وقفہ کے بعد) آپ تمام راہبوں میں سب سے زیادہ عجیب ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ میں ایسی قربانی کے لئے طاقت کہاں سے آئی ؟ کیا یہ سب کچھ مذہبی یقین نے سکھایا ہے ؟

راہب ــ اگر تم تمام رات یہاں رہو تب بھی نہیں بتاؤں گا

زائر :ــ یہ مذہبی یقین ہے، میں اچھی طرح جانتا ہوں، اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا

راہب :ــ کارنیلیا تمہارا انتظار کرتی ہوگی، جاؤ، جلدی جاؤ،

زائر :ــ کیا آپ اس مینار سے میرے ساتھ نیچے نہیں اُتریں گے ؟

راہب :ــ ہرگز نہیں ۔ میں یہاں نامعلوم عرصہ تک بیٹھا رہوں گا

زائر :ــ اس کا مجھے یقین نہیں آتا

راہب :ــ اگر یقین نہیں آتا تو سفر ختم کردو اور میری طرح مینار پر بیٹھ رہو

زائر :ــ میرے لئے یہ ممکن نہیں۔ میں آخری سانس تک سفر کرتا رہوں گا

راہب :ــ اچھا تو جاؤ ــ کارنیلیا کے پاس جاؤ

زائر :ــ پیشتر اس سے کہ میں جاؤں میرے لئے دعائے خیر کیجئے

راہب :ــ ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم میری دعا کے قابل نہیں ہو

زائر :ــ جب تک آپ میرے لئے دعائے خیر نہیں کریں گے تب تک نہیں جاؤں گا۔ میں اسے حاصل کرنے کے لئے پانچ سال سے سفر کر رہا ہوں

راہب :ــ اچھا تو تم بھی میری طرح یہاں نامعلوم عرصہ تک بیٹھے رہو

(دور سے باجہ بجنے کا شور سنائی دیتا ہے)

زائر :ــ یہ کیا ؟

راہب :ــ مجھے کیا معلوم

زائر :ــ (مینار سے نیچے دیکھتے ہوئے) کوئی جلوس ہے، گھوڑے اور سپاہی ساتھ ہیں۔ درمیان میں ایک

سنہری گاڑی بھی ہے یہ جلوس ضرور کسی بادشاہ کا ہوگا

راہب:۔ (انگڑائی لیتے ہوئے) ہوگا

زائر:۔ مجھے جلد نیچے جاکر اسے دیکھنا چاہئے

راہب:۔ ہاں جلد جاؤ خداحافظ

(نیچے اُترتے ہوئے) خداحافظ

راہب:۔ (انگڑائی لیکر ایک کھجور اُٹھاتا ہے اور اُسے غور سے دیکھتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد غصہ میں آکر زائر کی طرف پھینک دیتا ہے) بے وقوف! عجائباتِ دنیا۔ اونہہ!

کتاب کھول کر پڑھتا ہے:۔

"بے وقوفوں کی باتیں مت سنو، "جواب جاہلاں باشد خاموشی" پر عمل کرو"

(اوپر دیکھ کر) کتنی اچھی بات کہی ہے! (شور زیادہ قریب آجاتا ہے) کیا ایسی فضول آوازوں سے مجھے کبھی نجات نہ ملے گی؟ —— آہ!

دوبارہ پڑھتا ہے:۔

"زندگی آگ ہے جسے عورت بھڑکاتی ہے"

(دوبارہ شور کی آواز سنکر) برا ہو اس آواز کا میں نہیں چاہتا کہ میرے خیال کی دنیا میں یوں خلل ڈالا جائے

(بہت نیچے سے ایک آواز) بادشاہ سلامت کے لئے راستہ صاف کرو

راہب:۔ دنیا میں کہیں بھی امن نہیں، خیر——

وہ پھر پڑھنے لگتا ہے:۔

"عورت صبح کے وقت متبسم نظر آتی ہے اور تمہارا دین و دل لے جاتی ہے، شام تک تمہاری عزت و شہرت کو خاک میں ملا دیتی ہے۔ ستارے چمکنے سے پہلے تم تباہ ہو جاتے ہو اور جب ......"

شاہی مسخرا:۔ بادشاہ سلامت کے لئے راستہ صاف کرو

(راہب کتاب بند کر دیتا ہے اور بالکل سیدھا بیٹھ جاتا ہے جیسے کہ عبادت کر رہا ہو

شاہی مسخرا:۔ بادشاہ سلامت کے لئے راستہ ....

راہب:۔ تم اس طرح چیخنے کی بجائے بادشاہ کو سیڑھیاں چڑھنے میں مدد کیوں نہیں دیتے؟

مسخرا:۔ بادشاہ سلامت......

بادشاہ:۔ (مینار کے اوپر آکر) بے وقوف تو راہب کے امن میں خلل کیوں ڈالتا ہے؟

راہب :۔ میں نے بھی اسے چپ ہونے کے لئے کہا تھا
بادشاہ :۔ اچھا، آپ ہیں معزز راہب اور یہ ہے آپ کا پاکیزہ مینار!
راہب :۔ ہاں
بادشاہ :۔ آپ نے تمام دنیا کو حیرت میں ڈال دیا ہے
راہب :۔ ہاں
بادشاہ :۔ کیا آپ کو کوئی دنیاوی خواہش نہیں ہے؟
راہب :۔ ہاں، نہیں ہے۔
راہب :۔ یہ کون ہے؟
بادشاہ :۔ شاہی مسخرا
راہب :۔ میں حیران ہوں کہ تم اس کی معیت کس طرح برداشت کر سکتے ہو؟
بادشاہ :۔ بادشاہ کو ہر چیز برداشت کرنی پڑتی ہے۔ معزز راہب شاید آپ ہمیں دولتمند اور خوش نصیب خیال کرتے ہیں
راہب :۔ نہیں، میں تمھیں بدنصیب سمجھتا ہوں
بادشاہ :۔ ہاں میں بدنصیب ہوں۔ بادشاہ ہونے کی تکلیف سے زیادہ کوئی تکلیف نہیں ہے۔ میں موت کو شاہی زندگی پر ترجیح دیتا ہوں
راہب :۔ (انگڑائی لیکر) کیا آپ کسی ضروری کام کے لئے آئے ہیں
بادشاہ :۔ میں آپ کی مدد چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ یہ مینار چھوڑ کر میرے ساتھ چلیں۔ سوائے اس مسخرہ کے میرا کوئی دوست نہیں، کوئی ایسا نہیں جس پر میں اعتبار کرسکوں اور اُسے اپنا دل دکھا سکوں۔ اس لئے آپ نیچے اُتریں اور ہماری مدد کریں۔ مینار کو اسی طرح چھوڑیئے اور نیچے آکر ہماری روحانیت کو بلند کیجئے۔ میں آپکو کوئی دنیاوی انعام نہیں دوں گا کیونکہ میں جانتا ہوں آپ بھی میری طرح دولت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہوں گے۔ یہ ہے وہ عظیم الشان کام جس کو آپ اور صرف آپ انجام دے سکتے ہیں
راہب :۔ کیا تمھارا ملک بہت بڑا ہے؟
بادشاہ :۔ ہاں بہت بڑا
راہب :۔ کیا تمھارے ملک میں کوئی بھی ایسا نہیں جو بدی کو دور کر سکے
بادشاہ :۔ کوئی نہیں۔ میں نے برسوں بے سود تلاش کی۔ لوگوں کے دلوں میں صرف برائی بھری ہوئی ہے
راہب :۔ میں اس پر یقین نہیں کر سکتا

بادشاہ:۔ مگر یہ بالکل سچ ہے

راہب:۔ ہوگا مگر میں مینار سے نیچے نہیں اُتر سکتا، میں یہاں نامعلوم مدت تک بیٹھا رہوں گا

(سیڑھیوں میں سے عورت کی آواز) راہب! معزز راہب!

راہب:۔ خدایا، آج میری گلوخلاصی ہوگی یا نہیں یعین اُسوقت جبکہ میں بددعا کرنے لگا تھا ایک عورت آگئی

آواز:۔ معزز راہب! ہم اوپر آرہے ہیں، یہ مینار بہت خطرناک ہے

راہب:۔ یہاں تمھارے لئے کوئی جگہ نہیں ہے

آواز:۔ میری مالکہ آپ کو دیکھنے کی بہت خواہشمند ہے

راہب:۔ اپنی مالکہ سے کہدو کہ نیچے چلی جائے ورنہ میں دھکا دیکر نیچے گرادوں گا

پراکلا:۔ (اوپر آکر) کیا واقعی آپ زیارت کرنے والی عورتوں کو دھکا دیکر نیچے گرادیتے ہیں؟

راہب:۔ نہیں میرا یہ مطلب نہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ یہاں بیک وقت چار آدمی نہیں ٹھہر سکتے، جگہ بالکل نہیں ہے اپنی مالکہ سے یہ کہدو

پراکلا:۔ میری مالکہ اس کو غلط سمجھے گی

راہب:۔ پچھلے مہینے ایک عورت چار بچوں کو لیکر مجھے دیکھنے آئی لیکن صرف دو کے ساتھ واپس گئی، تم سمجھیں؟

بادشاہ:۔ (مسخرے سے) اُن کو نیچے اُتار دو اور آؤ ہم واپس چلیں

مسخرا:۔ نیچے جاؤ بادشاہ سلامت واپس جانا چاہتے ہیں

(پراکلا نیچے کسی سے گفتگو کرتی ہے)

پراکلا:۔ میری مالکہ کہتی ہے کہ وہ نیچے نہیں جائے گی۔ کاش میں ایسے خوفناک مینار پر نہ ہوتی۔ اگر تم اوپر آنے نہ دوگے تو میں گر پڑوں گی

راہب:۔ آہ! میں کیا کروں، تم اوپر آجاؤ لیکن حیران ہوں کہ تم بیٹھوگی کہاں

پراکلا:۔ یہ بالکل معمولی بات ہے، میں تمھارے پاؤں پر اس طرح بیٹھ جاؤں گی

(اُس کے پاؤں پر بیٹھ کر اپنا سر جھکا لیتی ہے)

راہب:۔ نامعقول!

پراکلا:۔ لیکن مجھے تو کسی نہ کسی طرح توازن قایم رکھنا ہے، پھر کیا کروں؟

راہب:۔ (بادشاہ سے) کیا تم مجھے اس مصیبت سے نہیں بچا سکتے؟

بادشاہ:۔ میں دوسروں کے معاملات میں خواہ مخواہ دخل نہیں دیا کرتا۔ دوسری عورت کو بھی اوپر بلا لو تاکہ ہم چلے جائیں

(یوڈوشیا سے) آپ اوپر آجائیں

راہب :۔ آپ کو یہ کہنے کا کوئی حق حاصل نہیں

بادشاہ :۔ ہم یہاں تمام رات نہیں ٹھہر سکتے۔ علاوہ اس کے چونکہ یہ نیچے نہیں جائے گی اس لئے اسے اوپر آجانا چاہئے

یوڈوشیا :۔ (اوپر آتے ہوئے) پراکلا کہاں ہے؟ (اس کو دیکھ کر) ہاں وہ ہے

راہب :۔ محترمہ! یہ میرا قصور نہیں کہ تمھاری خادمہ عقل سے خالی ہے

پراکلا :۔ بیگم! میں نے یہ صرف اپنے آپ کو بچانے کے لئے کیا ہے ورنہ مجھے تو مینار سے نیچے گرنے کا اندیشہ تھا

راہب :۔ (انگڑائی لیکر) میری گزشتہ زندگی میں اس طرح کبھی بے عزتی نہیں کی گئی۔ آہ میں کتنا بدبخت ہوں!

پراکلا :۔ آپ بگڑتے کیوں ہیں۔ میں ابھی اُٹھ جاؤں گی

بادشاہ :۔ راہب! خدا حافظ! مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے پاس دو بدطینت اور ناسمجھ عورتیں چھوڑے جا رہا ہوں

(مسخرا نیچے اُترتا ہے اور اپنے مالک کا انتظار کرتا ہے)

یوڈوشیا :۔ (تیزی سے) پراکلا! راہب کو چھوڑ کر الگ کھڑی ہو جاؤ

(پراکلا اپنی خواہش کے خلاف اُٹھ کر الگ کھڑی ہو جاتی ہے)

بادشاہ سلامت! ہم نہ بدطینت ہیں اور نہ ناسمجھ، میری خادمہ ابھی بچہ ہے۔ وہ ابھی درست اور نادرست میں امتیاز نہیں کر سکتی۔ میں اس راہب کے لئے بہت دور سے آئی ہوں۔ آپ ہمیں ناسمجھ اور بدطینت کہکر انصاف نہیں کر رہے ہیں۔ دنیا کی بدنامی اور بے عزتی عورتیں نہیں کرتیں بلکہ ہمیشہ مرد کیا کرتے ہیں

بادشاہ :۔ معاف فرمائیے، واقعی آپ جیسی خوبصورت عورتیں ہمیشہ عقلمند اور نیک طینت ہوا کرتی ہیں

یوڈوشیا :۔ (نرمی سے) میں آپ کی عزت افزائی کا شکریہ ادا کرتی ہوں

راہب :۔ ذرا ہوش سے کام لو۔ ایسی نادانیوں کے لئے اس مینار پر جگہ نہیں ہے

بادشاہ :۔ ہاں یہ درست ہے، اے خاتون! خدا حافظ! معزز راہب! خدا حافظ، شاید کچھ عرصہ کے بعد تم سمجھ جاؤ کہ اس طرح بیٹھے رہنے سے خلق خدا کی مدد کرنا کہیں زیادہ بہتر ہے۔ معزز لیکن غیر مفید راہب! خدا تمھاری مدد کرے

راہب :۔ اور تمھاری بھی اے بدنصیب اور مجھ سے زیادہ غیر مفید بادشاہ

(بادشاہ نیچے اُتر جاتا ہے)

راہب :۔ کیا تم بہت دور سے آرہی ہو؟

یوڈوشیا :۔ ہاں بہت دور سے۔ میں بہت دور پہاڑی پر رہتی ہوں۔ میرا نام یوڈوشیا ہے لوگ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں

راہب :۔ تمھاری شہرت کس بات میں ہے؟

یوڈوشیا :- کس بات میں ؟ آپ بھی عجیب انسان ہیں - میں اپنے ــــ اپنے حسن کی وجہ سے مشہور ہوں - کیا آپ کے خیال میں میں خوبصورت نہیں ہوں ؟

راہب :- یہ مجھ سے کیوں پوچھتی ہو ؟

یوڈوشیا :- اس لئے پوچھتی ہوں کہ اگر میری غلط فہمی ہو دور ہو جائے - اکثر لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ تم بہت زیادہ حسین ہو لیکن وہ سب راہب ــــ آپ جیسے راہب نہیں، میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھے بتائیں

راہب :- اچھا تو میں کہے دیتا ہوں کہ تم بہت حسین ہو - میں نے بہت عورتیں دیکھی ہیں لیکن تم ایک خاص کشش رکھتی ہو جس کا سبب غالباً تمھاری دوشیزگی ہے

یوڈوشیا :- میں خوش ہوں کہ آپ مجھے دوشیزہ خیال کرتے ہیں

راہب :- میرا مطلب یہ نہیں - میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ تم دوشیزہ معلوم ہوتی ہو

یوڈوشیا :- آپ کو معلوم ہونا چاہئیے کہ آپ کا لہجہ ضرورت سے زیادہ سخت ہے

راہب :- تو کیا تم نرم لہجہ میں گفتگو کرنے آئی ہو ؟ اچھا تو یہ بتاؤ تم کیا چاہتی ہو ؟

یوڈوشیا :- شاید آپ جانتے ہوں کہ مرد عموماً بے وقوف ہوتے ہیں اور اُن میں حیوانیت بدرجۂ اتم موجود ہوتی ہے اُنکو خوش کرنا کوئی مشکل کام نہیں - اس لئے میں ایسے لوگوں سے اپنی خوبیاں سنکر تنگ آگئی ہوں - اب میں ایسے شخص سے ملنا چاہتی ہوں جو میرے حسن کا تو قائل ہو لیکن مجھے محبت کرنے سے نفرت کرتا ہو

راہب :- یوڈوشیا ! تم غلطی پر ہو - کیا تم مجھے بھی مسخر کرنا چاہتی ہو - لیکن ایک راہب کو مسخر کرنا آسان کام نہیں

یوڈوشیا :- معزز راہب ! ایسا نہ کہو میں فوراً معلوم کر لیتی ہوں کہ میرے ساتھ گفتگو کرنے والا شخص مجھ سے محبت کرتا ہے یا نہیں اور جو مجھ سے محبت کرنے لگتا ہے وہ وہی کرتا ہے جو میں کہتی ہوں

راہب :- لیکن میں تو ان میں نہیں ہوں

یوڈوشیا :- آپ بھی اُنہی میں سے ایک ہیں

راہب :- میں اس سے بالکل انکار کرتا ہوں

یوڈوشیا :- (اپنی نگاہیں اُس کی نگاہوں میں ڈال کر) راہب ! کہدو کہ یہ غلط ہے

راہب :- (غصہ سے بھر جاتا ہے) تم بڑی شریر ہو تم میں اتنی ہمت کہاں سے آئی کہ یہاں آکر میری بزرگی کو داغدار کرو -

پراکلا :- (اردگرد نظر دوڑا کر) مجھے تو بھوک لگی ہے

راہب :- وہ کھجوروں کی ٹوکری اسے دے دو ــــ ہاں، تم میں اتنی ہمت کہاں سے آئی کہ یہاں آؤ اور مجھ پر اپنا جادو چلاؤ

یوڈوشیا:۔ نہیں یہ جادو نہیں ہے۔ یہ میری ایک طاقت ہے جس کے استعمال کرنے میں مجھے بالکل شرم محسوس نہیں ہوتی۔ راہب! میں تمھیں مجبور کر سکتی ہوں کہ تم میرے ساتھ محبت کرو اور میں اس کا تجربہ کرنا چاہتی ہوں، اچھا، آؤ میرے ساتھ مینار سے نیچے اُترو

راہب:۔ کیا؟

یوڈوشیا:۔ مینار سے نیچے اُترو۔ آؤ میرے ساتھ نیچے چلو

راہب:۔ مینار سے نیچے اُتروں؟، ایسا ہونا ناممکن ہے۔ میں یہاں نامعلوم عرصہ تک بیٹھا رہوں گا

(مسکراتا ہوا اُس کی طرف دیکھتا ہے)

یوڈوشیا:۔ میں نے تم جیسا خوفناک انسان کبھی نہیں دیکھا۔ تم ایک مسرور زندگی کو جس میں تمھاری خواہش کے مطابق سب کچھ میسر ہو سکتا ہے اس مینار کی زندگی پر قربان کر رہے ہو۔ میرا خیال ہے کہ مذہبی جوش تمھیں اس پر مجبور کرتا ہے، لیکن میں تو اس خیال سے ڈرنے لگتی ہوں

راہب:۔ ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ تم اپنی زندگی بسر کرو اور میں اپنی

یوڈوشیا:۔ مگر میں اپنی زندگی سے تنگ آگئی ہوں۔ میرا راستہ آسان نہیں۔ تاہم مصائب اور تلخ تجربات کے بغیر مسائلِ زندگی کو حل نہیں کیا جا سکتا

راہب:۔ یوڈوشیا! مجھے تم پر رحم آتا ہے، اگر تم اپنی زندگی میں تھوڑی تبدیلی کر لو تو؟

یوڈوشیا:۔ اپنی زندگی میں تبدیلی پیدا کر لوں؟ ہرگز نہیں۔ ایسی زندگی میری سرشت میں داخل ہو چکی ہے۔ میں آخر وقت تک ایسی ہی زندگی بسر کروں گی — ہم جا رہے ہیں، خدا حافظ معزز راہب!

راہب:۔ خدا حافظ، یوڈوشیا!

(وہ اُس کی طرف دیکھتی ہے اور چلی جاتی ہے)

شام ہو گئی ہے اور چند ستارے بھی آسمان پر نظر آ رہے ہیں۔ راہب کتاب کھولتا ہے۔

راہب پڑھتا ہے:—

"جب ایک عورت تبسم خوشی سے معمور تمھارے سامنے آتی ہے تو کیا تم ————

(جلد کتاب بند کر دیتا ہے) اندھیرا ہو گیا ہے، اب میں نہیں پڑھ سکتا"

اندھیرا ہو جاتا ہے اور مینار کے گرد ایک بگولہ سا نظر آتا ہے۔ اُس میں سے طرح طرح کی آوازیں آتی ہیں—

راہب سنبھل کر بیٹھ جاتا ہے اور گانے کی آواز میں کہتا ہے:—

"کتنی ہی سخت آندھیاں آئیں لیکن صبر کو کسی روشنی کی ضرورت نہیں جو اُس کا راستہ روشن کرے

ہر رات مجھے صبر کی تلقین کرتی ہے

جنگ کے دوران میں بہت نقصان ہوتا ہے لیکن کامیابی زیادہ نقصان اُٹھانے والے کے پاؤں چومتی ہے"

(ایک عجیب آواز) راہب! خوش الحانی سے گاؤ

راہب:۔ میں خوش الحانی سے گا رہا ہوں۔ میری روح رات ہی کے وقت بیدار ہوتی ہے

(گاتا ہے) "خوشی مذہبی یقین پختہ ہو جانے کے بعد حاصل ہوتی ہے اور امن قبر کی تلخی کو تباہ کر دے گا"

آواز:۔ اس سے بھی زیادہ خوش الحانی سے گاؤ

راہب:۔ جس طرح میں چاہوں گا گاؤں گا

(گاتا ہے) "جو لوگ اپنے داغِ عصیاں کو آنسوؤں سے دھوتے ہیں وہ خوش رہیں گے۔ وہ موت کے دروازہ پر کھڑے ہیں لیکن خوف محسوس نہیں کرتے"

آواز:۔ راہب! ٹوٹے ہوئے ساز کی طرح گانا بند کر دو اور اچھی آواز میں گاؤ

راہب:۔ میں تو نہایت خوش الحانی سے گا رہا ہوں

آواز:۔ خوش الحانی سے؟ (زور سے ہنسی کی آواز مینار کو ہلا دیتی ہے) تمھیں اس سے بھی زیادہ خوش الحانی سے گانا چاہیئے

راہب:۔ کیوں؟

آواز:۔ آنے والے کا خیر مقدم کرنے کے لئے

راہب:۔ اب میرے پاس کون آئے گا؟

بہت سی آوازیں:۔ ابلیس

راہب:۔ ابلیس؟ کیا یہ شور اسی کی علامت ہے کہ ابلیس آرہا ہے؟ میں بالکل نہیں ڈرتا۔ ابلیس پہلے بھی آتا رہا ہے اب بھی آجائے۔ وہ کہاں ہے؟ آوازیں (آہستہ سے) وہ آرہا ہے راہب! وہ آرہا ہے

راہب:۔ اُسے آنے دو

ابلیس (راہب کے دائیں ہاتھ ظاہر ہوتا ہے) راہب! شکریہ، میں آگیا ہوں

(ابلیس اونچا، جوان اور خوبصورت معلوم ہو رہا ہے۔ اُس کے سر پر بالوں کی خوبصورت ٹوپی ہے وہ آہستہ آہستہ احتیاط سے بول رہا ہے۔ لباس کافی چکدار ہے۔ ایک دوست اُس کے ساتھ ہے۔ وہ سیاہ رنگ اور غصہ سے بھرا ہوا ہے۔ تینوں کے چہرہ پر زرد روشنی پڑ رہی ہے)

راہب:۔ میرا سلام قبول فرمایئے

ابلیس :۔ اور میرا بھی ------- اے میرے دوست!

(وہ جھک جاتا ہے)

راہب :۔ اب تم پہلی دفعہ سے بہت اچھے معلوم ہو رہے ہو

ابلیس :۔ سوچ لینے دو ـــــ ہاں، پچھلی دفعہ میں بوڑھا ملاح بنکر آیا تھا

راہب :۔ نہیں، تم کچھوے کی شکل میں آئے تھے

ابلیس :۔ ہاں ٹھیک ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں بولتا تھا تو تم خوفزدہ ہو جاتے تھے

راہب :۔ یہ تمھاری انتہائی بے وقوفی تھی۔ میں حیران تھا کہ تم یہاں کیونکر آگئے

ابلیس :۔ ہا، ہا۔ (دوست سے) کیا تمھیں یہ معمولی سا واقعہ یاد ہے؟

دوست :۔ تمھارا خیال ہے کہ میں تمھارا ہر فضول واقعہ یاد رکھوں

ابلیس :۔ اچھا تو پہلے پہل تم خوفزدہ ہو گئے تھے ـ ہا، ہا

راہب :۔ یہ تمھارے لئے جائز نہ تھا

ابلیس :۔ اب میں یہاں کیا کرنے آیا ہوں!

راہب :۔ میں نہیں جانتا کہ تم یہاں اسوقت کیوں آئے ہو۔ آج میرے پاس کافی مہمان آئے

ابلیس :۔ اُنہی زائرین کی وجہ سے میں یہاں آیا ہوں ۔ میں ــــ نہیں ہم ------

دوست :۔ مجھے گفتگو میں شامل نہ کرو

ابلیس :۔ بہت اچھا، میں تمھارا آخری مہمان ہوں ۔ کیا تمھیں معلوم ہے کہ اُن کو بھی میں نے ہی بھیجا تھا

دوست :۔ تم جھوٹ کہتے ہو، وہ خود یہاں آئے تھے

ابلیس :۔ نہیں میں نے تجویز کی تھی کہ وہ یہاں آئیں، ہاں، تو تم نے ان سے کیا کہا

راہب :۔ یہی کہ میں یہاں نامعلوم عرصہ تک بیٹھا رہوں گا

ابلیس :۔ تو تم پر کسی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ بالکل غلط ـــ پہلے زائر کی باتوں نے بھی تم پر اثر کیا، بادشاہ کا امر ابھی اثرانداز ہوئے بغیر نہیں رہا ------ خیر، یہ ذکر چھوڑ دو ـــــ جب ہم یوڈوشیا ----------

راہب :۔ (غصہ میں) چپ رہو ـــــ بدمعاش کہیں کا، یوڈوشیا کا نام نہ لے

ابلیس :۔ تم بہت مغرور ہو۔ تمھارا خیال ہے کہ تم اس مینار پر بیٹھ کر دوسروں سے زیادہ خدا کو خوش کر سکتے ہو۔ تم یہاں بیٹھ کر خیال کرتے ہو کہ تمھارا کام ختم ہو چکا۔ یہ سب کچھ دکھاوا ہے، دھوکا ہے، فریب ہے، تم دنیا میں اپنے آپ کو مشتہر کرنا چاہتے ہو کہ لوگ تمھاری تعریف کریں۔ تم محض لوگوں کو دکھانے کے لئے یہاں بیٹھے ہو۔ یہ

سب کچھ بے فایدہ ہے۔ فطرت مجبور ہے کہ تم سے بدلہ لے اور تمھارا غرور و تکبر خاک میں ملا دے

راہب:۔ غرور نہیں، یہ سب کچھ عادت کی وجہ سے ہے

ابلیس:۔ کیا ؟

راہب:۔ ہاں، عادت! تم میرے مذہبی یقین پر تعجب کرتے ہو اور سمجھتے ہو کہ میرا غرور بے فایدہ ہے۔ میں تمھیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ مذہبی یقین نہیں بلکہ عادت ہے۔ اگر مجھ میں طاقت ہوتی تو میں ضرور مینار سے نیچے اُترتا۔ میں پہلے زائر کے ساتھ پہاڑوں کی خوبصورت گھومتی ہوئی سڑکوں پر جاتا۔ میں بادشاہ کی مدد کرتا۔ میں یوڈوشیا ۔ آہ! یوڈوشیا کے ساتھ بھی جاتا لیکن میں اپنی عادت سے مجبور ہوں۔ مجھ میں اتنی طاقت اور ہمت نہیں کہ میں مینار سے نیچے اُتروں۔ میری زیارت کرنے والے لوگ مجھ سے زیادہ نیک ہوتے ہیں۔ ایک طوائف جس کا مقصد روپیہ کمانے کے سوا کچھ نہیں ہوتا، اپنے شراب پئے ہوئے چاہنے والے کے ساتھ یہاں آتی ہو لیکن بزرگی میں مجھ سے زیادہ ہوتی ہے۔ میں نے یہ زندگی عالم شباب میں شروع کی تھی۔ اب میں خواہ غلطی پر ہوں یا صحیح راستہ پر، خواہ اس کا کوئی فایدہ ہو یا نہ ہو اس زندگی کو ترک نہیں کر سکتا۔ میں کسی دوسرے ماحول میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں یہاں نامعلوم عرصہ تک بیٹھا رہونگا۔ تمھیں یہاں اُسوقت آنا چاہئے تھا جبکہ میں نے یہ زندگی شروع کی تھی

ابلیس:۔ لیکن عالم شباب کے جوش پر قابو حاصل کرنا میری طاقت سے باہر ہے

راہب:۔ خیر، اب یہ بالکل بے وقت ہے۔ اب میری عادت ہو گئی ہے اس لئے میری بقیہ زندگی بھی یہیں بسر ہوگی۔

ابلیس:۔ میں اسے ماننے کے لئے طیار نہیں۔ عادت تو اتنی سخت نہیں ہوا کرتی

راہب:۔ پہلے زائر سے کہکر دیکھو کہ اپنا سفر ترک کر دے، بادشاہ سے کہو کہ حکومت چھوڑ دے، یوڈوشیا سے کہو ——— لیکن اس پر عمل نہ کرنا ——— کہ اپنی دلوں پر قابو حاصل کرنے والی طاقت کو ترک کر دے، پھر دیکھو وہ کیا کہتے ہیں

ابلیس:۔ لوگوں کے خیالات عموماً بدل جاتے ہیں

راہب:۔ ایک شخص کی زندگی میں فوراً انقلاب برپا کر دو۔ تم دیکھوگے کہ چند روز میں پھر اسی راستہ پر آجائیگا۔ اس رات میرے مینار کو توڑ دو، تم مجھے چند روز میں کسی دوسرے مینار پر دیکھوگے۔ اب تم جاؤ میں تھک گیا ہوں، اور مجھے گفتگو کی ہمت نہیں۔ جاؤ اور میرے مُریدوں کو بہکاؤ اور دیکھو وہ کیا کہتے ہیں۔ لیکن اب یہاں نہ ٹھہرو۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔ (ابلیس چلا جاتا ہے)

راہب:۔ اُف، کسقدر تکلیف دہ دن تھا۔ شکر ہے کہ سب چلے گئے ——— رنج کے بعد خاموشی اور خاموشی کے بعد مکمل راحت ہوتی ہے۔ اس اندھیری رات میں ——— آہ! یوڈوشیا، تو مجھے بے وقت کیوں ملی ——— اب مجھے سو جانا چاہئے ——— سو جانا چاہئے (آنکھیں بند کر لیتا ہے اور بڑبڑاتا ہے) میں یہاں ایک نامعلوم عرصہ تک بیٹھا رہوں گا ——— (خاموشی)

——— پردہ ———

(ایف سلیڈن سمتھ) مترجمہ افضل ——— گڑھ۔ جالندھر

ریاستوں کی آزادی وفاق کے نقطۂ نظر سے

ریاستوں کے متعلق شرکت وفاق کے بارہ میں اسوقت تک جتنی رائیں ظاہر کی گئی ہیں ان کو دیکھ کر بے اختیار یہ مصرعہ یاد آتا ہے کہ :- تو کہے گبر مجھے، گبر مسلماں مجھ کو ــــ درانحالیکہ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ اسوقت ریاستوں کے سامنے "کفر و ایمان" سے زیادہ من و تو کا جھگڑا درپیش ہے اور ان کو اسکے فیصلہ کا کوئی موقعہ نہیں دیا جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ریاستوں کے طرز عمل کے متعلق برطانیہ عظمیٰ اور برطانیۂ ہند دونوں جگہ سخت غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے ایک طرف تو ریاستوں پر یہ الزام قایم کیا جاتا ہے کہ وہ "مکمل خود مختاری" کا مطالبہ کرکے حد درجہ خود غرضانہ پالیسی اختیار کرنا چاہتی ہیں اور دوسری طرف یہ کہا جاتا ہے کہ شرکت وفاق سے وہ اپنے جایز حقوق ملکیت کو بھی ہاتھ سے دیدینے پر آمادہ ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ دونوں الزام بے بنیاد ہیں

پہلے الزام کی لغویت تو اس سے ظاہر ہے کہ ریاستوں کے نقطۂ نظر سے "خود مختاری" کا تصور ہی بالکل بے معنی چیز ہے۔ کیونکہ جیسا سر ہنری مین نے ۱۸۶۴ء کے مقدمۂ کاٹھیاوار کے سلسلہ میں ظاہر کیا ہے، "خود مختاری" کوئی ایسی چیز نہیں جس کے درجے متعین ہو سکیں۔ ہندوستانی ریاستیں صحیح معنے میں اسی وقت "خود مختار" کہلائی جا سکتی ہے جب شہنشاہ ہند سے ان کے تعلقات اطاعت و فرمانبرداری محو ہو جائیں، از روئے معاہدات تاج سے جو رشتہ قایم ہے اسے توڑ دیں اور برطانوی حکومت سے بالکل قطع تعلق کرکے خارجی مدافعت اور اندرونی حفاظت کی تمام پیچیدگیوں کی ذمہداری اپنے سر لے لیں۔ پھر جب ریاستیں اس عمل کی اہلیت نہیں رکھتیں اور نہ نظریہ کے لحاظ سے اسے مناسب سمجھا جا سکتا ہے تو پھر یہ کہنا کہ ان کا مطالبۂ خود مختاری خود غرضی پر مبنی ہے کیونکر درست ہو سکتا ہے۔ اس پر یہ اعتراض ضرور ہو سکتا ہے کہ خود مختاری کے ایسے وسیع معنی لینے کی ضرورت نہیں، بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ کیا ریاستوں کی یہ کوشش نہیں ہے کہ وہ حکومت بالادست کی گرفت سے آزاد ہو جائیں اور کیا ان کا یہ مطالبہ خود ان کے یا پورے ملک کے مفاد کے لئے درست ہو سکتا ہے؟

اس الزام کی صحت یا عدم صحت پر حکم لگانے سے پہلے ضروری ہے کہ آپ حکومت بالادست کی اس عملی سیاست کو سمجھ لیں جو ریاستوں پر صرف کی جاتی ہے

اس میں شک نہیں کہ سر ہنری مین کے قول کے مطابق "خود مختاری" تقسیم ہونے والی چیز نہیں اور نہ اس کے

ٹکڑے کئے جا سکتے ہیں، لیکن ریاستہائے ہند اور تاج کے موجودہ تعلقات کو دیکھ کر ماننا پڑتا ہے کہ زیر بحث "خود مختاری" ریاستوں اور تاج کے مابین ضرور تقسیم ہوگئی ہے اور قوت بالادست نے ریاستوں کی اُس خود مختاری پر جو از روئے اسناد و معاہدات انھیں حاصل ہونا چاہئے، یقیناً بہت کچھ قبضہ کر لیا ہے

قبل اس سے کہ ہندوستان کے لئے وفاقی طرز حکومت تجویز کی جاتی، ریاستیں ڈر رہی تھیں کہ ان کی بچی کھچی آزادی بھی کہیں ختم نہ ہو جائے۔ وہ اچھی طرح واقف تھیں کہ برطانیہ کی سیاسی حکمت علی بہت سے معاملات میں ان کی آزادی چھین چکی ہے اور جو کچھ باقی رہ گئی ہے وہ بھی اس رحم و کرم پر موقوف ہے۔ پھر ان کا یہ اندیشہ صرف قیاس پر مبنی نہ تھا بلکہ سرکاری طور پر بھی اس کی تصدیق ہو چکی تھی کیونکہ سر رابرٹ ہالینڈ نے (جب وہ حکومت ہند کے معتمد سیاسی تھے) ایکبار ظاہر کیا تھا کہ اس زمانہ میں جب حکومت برطانیہ تمام ملک کو سیاسی وحدت میں تبدیل کرنا چاہتی تھی تو حالات جدیدہ کے ماتحت دستوری اُصول میں بہت تغیر کرنا پڑا، اور اس اُصول کی رو سے بعض مسایل میں (مثلاً مسایل حدود بندی، تعمیر ریلوے و تار، چھاؤنیوں کا نظم و نسق وغیرہ) ان تعلقات سے تجاوز کرنا پڑا جو مابین تاج اور ریاستہائے ہند قایم تھے اور ریاستوں کی منظوری یا عدم منظوری کا اس باب میں کوئی لحاظ نہیں کیا گیا۔ سر ہالینڈ نے اس کا اعتراف کیا کہ برطانوی حکومت اور ریاستوں کے تعلق نے (ماورار معاہدات و اسناد) جو رواجی صورت اختیار کر لی ہے وہ نیت کے لحاظ سے قابل اعتراض نہیں اور نہ اس کا مقصود رئیسوں کے اختیارات کو کم کرنا ہے گو ایک حد تک وہ متصرفانہ ضرور ہے۔

الغرض ریاستیں برطانیہ کی اس پالیسی کو بہت مشتبہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں اور اچھی طرح جانتی تھیں کہ جن طریقوں سے ان کی آزادی رفتہ رفتہ ختم کی جا رہی ہے وہ نہ صرف یہ کہ اب بھی جاری ہیں بلکہ برطانوی ہند کے قومی مطالبات کی وجہ سے زیادہ سخت و وسیع ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن رؤسا ہند کی تمام انفرادی و اجتماعی کوششیں تاج اور ریاستوں کے تعلقات کی تعیین نہ کرا سکیں بلکہ اس کے برخلاف جب ہارکورٹ بٹلر کمیٹی سے اصرار کیا گیا کہ وہ قوت بالادست کے اختیارات کی تعیین کر دے تو قوت بالادست کا مفہوم اور زیادہ وسیع و لچکدار صورت میں پیش کیا گیا اور اس کا سبب صرف یہ تھا کہ حکومت ہند کا محکمۂ سیاسیات اپنے اقتدار و اختیار کو ہاتھ سے دینے کے لئے طیار نہ تھا

برطانوی قوم، منطق پسند قوم نہیں ہے کہ وہ محض تصورات و قیاسات سے کام لیا کرے وہ ہمیشہ موجودہ مشکلات کو سامنے رکھ کر ان کا فوری علاج سوچتی ہے۔ اُنیسویں صدی کی ابتدا میں جو معاہدات اس قوم نے کئے تھے وہ اسی وقت کے لحاظ سے مناسب تھے اور ان کا مقصود صرف یہ تھا کہ تمام ریاستیں ایک دوسرے سے جدا کر دی جائیں اور اسکا امکان باقی نہ رہے کہ وہ کسی وقت آپس میں ملکر حکومت برطانیہ کے اقتدار کو کم کر دیں۔ جس زمانہ میں یہ معاہدے ہوئے تھے اسوقت برطانوی ہند میں کوئی بات ایسی نہ تھی جو موجودہ ترقی یافتہ طرز حکومت سے مشابہ ہوتی۔ لیکن بعد کو جب آہستہ آہستہ نظم و نسق نے مرکزی طرز حکومت کی صورت اختیار کر لی تو برطانوی ہند اور ریاستہائے ہند کی حکومتوں کے درمیان نمایاں فرق

الگ خدمت مذہب وعلم میں وقف ہیں اور اس اثر کے سامنے وہ ترک خوں آشام تلوار یا
بھی جو خلفاء کو اجل کے گھاٹ اُتارتیں او ۔ سر تسلیم خم کرتی ہیں تو اسی طرح سیکڑوں شیوخ
تبلیغی دھن میں پرخطر سمندر کے راستہ اور پرامن تجارتی طریقہ سے حواریان حضرت مسیح اور
منادیان بودھ کی طرح ان سے بدرجہا زیادہ زبردست کامیابی حاصل کر رہے ہیں۔ اسی
راستہ سے چین میں مسلمانوں کی کثیر آبادی اصلی باشندوں کا جزو بن جاتی ہے۔ جزائر بحر ہند
اور ہندوستان کے تمام ساحل پر عرب ہی تجارت کے مالک ہیں۔ ہندو راجاؤں کے زیر
حمایت وہ مسجدیں بناتے اور تبلیغی کام انجام دیتے ہیں جس میں ذات کی تفریق ان کی بڑی
معاون تھی۔ سواحل پر اسلامی آبادی کی حالت سندھ سے بھی بڑھی ہوی ہے۔ اور بقول
پروفیسر آرنلڈ " اس میں ہرگز شبہ نہیں کہ ہندوستان میں اسلام کو اپنی اشاعت میں
بڑی اور مستقل کامیابی ایسے اوقات اور مقامات پر ہوی ہے جہاں مسلمانوں کی سیاسی طاقت
بہت ہی ضعیف تھی " یہ اثر ایسا زبردست ہے کہ مابعد ترک و مغل فرماں روایان ہند کی
صدیوں کی حکومت اس کی نظیر سے خالی ہے ۔ غرض اسمٰعیلیہ نے بحری راستہ سے سواحل
ہند میں اپنا مستقل اثر پیدا کرلیا۔ مصر کی حکمرانی نے بلحاظ اپنے موقع کے تمام دنیا کی تجارت
پر اسمٰعیلیہ کو اقتدار دیدیا تھا جیسا کہ لی بان نے تصریح کی ہے۔ اور یہی ان کی
حیرت انگیز ثروت کا بڑا ذریعہ تھا لیکن اسمٰعیلیہ کا یہ اثر ساحل گجرات تک محدود رہا اس
سے آگے سواحل ملیبار و کارومنڈل اسمٰعیلیت سے پاک اور قدیم پرانے اسلامی عام
جماعتی اصول پر برقرار رہے جیسا کہ اس وقت تک بھی وہی حالت برقرار ہے۔

خاندان سبکتگین | ولولا دفع الناس بعضھم ببعض کے اصول کے مطابق جب بنی بویہ
کا ستارہ اوج اقبال پر تھا تو ایک نئی طاقت ابھر رہی تھی۔ آل سامان میں جب معمولی
اسباب ضعف پیدا ہونے لگے تو اسی دربار کے ایک ترک غلام الپتگین نے غزنی میں اپنا
دربار الگ جمایا اسی الپتگین کا غلام سبکتگین تھا جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ

اسی طرح اگر کسی ریاست میں بدنظمی انتہا کو پہونچ گئی ہے اور امن وسکون قایم نہیں رہا ہے تو اس کا بھی لازمی نتیجہ وہی ریاست کی تباہی ہے۔ پھر جبکہ برطانوی حکومت ریاستوں کی بقا کی ذمہ دار ہوچکی ہے اور خود اس کے مصالح کا اقتضاء بھی یہی ہے کہ ریاستیں باقی رہیں تو وہ معاہدات کی لفظ بہ لفظ پابندی کرکے کیونکر یہ مقصود حاصل کرسکتی تھی اور اگر ایسی صورتوں میں وہ مداخلت کرتی ہے تو کس کو اعتراض کا حق حاصل ہو سکتا ہے

سیاسیات کے طالب علم سے یہ امر مخفی نہیں کہ تاج کی طرف سے ہمیشہ معاہدات کا احترام ملحوظ رکھنے پر زور دیا گیا ہے لیکن اسی کے ساتھ دوسری طرف معاہدات کے خلاف ریاستوں کے معاملات میں مداخلت بھی کی گئی ہے۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ ہر چند قانونی نقطۂ نظر سے قوت بالادست کو اس مداخلت کا کوئی حق حاصل نہیں، لیکن برطانوی ہند کے مصالح انتظامی، نیز خود ریاستوں کے بقا و تحفظ کے خیال سے، مداخلت ضروری تھی اور اس طرح ریاستوں کے اس [illegible] و معاہدات کا مسئلہ محض قانونی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق سیاسیات سے بھی ہے یعنی اگر ایک طرف برطانوی ہند کی سیاسی ضروریات کا خیال رکھنا پڑتا ہے تو دوسری طرف ریاستوں کی انفرادیت کو قایم رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے اور انھیں دونوں میں توازن رکھنا حکومت ہند کی سیاسیات کا وہ کارنامہ ہے جس کی عظمت کا اقرار کرنا پڑتا ہے

اس بیان سے واضح ہوگیا ہوگا کہ حکومت ہند کی ڈپلومیسی کی تاریخ کیا ہے اور ریاستوں کی آزادی، حکومت بالادست اور رئیسوں کے درمیان کیوں تقسیم ہوکر رہ گئی۔ بہر حال اب غور طلب یہ ہے کہ کیا ان حالات کے ماتحت ریاستوں کا اپنے موجودہ پوزیشن میں تبدیلی چاہنا یا وفاق میں شرکت کے لئے گفت و شنید کرنا کسی خود غرضی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔

وہ حضرات جو ہندوستان کے سیاسی نظام سے واقف نہیں ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ریاستوں کے لئے یہ اچھا موقعہ ہے کہ وہ گزشتہ ایک صدی کے حالات میں تبدیلی پیدا کرا سکیں چنانچہ وہ سوال کرتے ہیں کہ ریاستیں وفاق میں شریک ہوکر (علاوہ ان اختیارات کے جو از روئے معاہدات اب سے قبل حکومت برطانیہ کو تفویض کئے جا چکے ہیں) کیوں اور دوسرے معاملات برطانیہ کے سپرد کردیں۔ وہ وفاق میں شریک ہوکر وفاقی مسایل میں برطانیہ کی بیجا مداخلت کو کیوں قانونی حق میں تبدیل کردیں اور کیا وفاق کی شرکت سے ریاستوں کو اپنے حقوق کی قربانی اور زیادہ نہ کرنا پڑے گی

اس قسم کے اندیشوں کا سبب ان لوگوں کا محض جذبۂ ہمدردی نہیں جو ریاستوں کی خود مختاری کو محفوظ دیکھنا چاہتے ہیں، بلکہ اس کا دوسرا سبب یہ خوف بھی ہے کہ مبادا اس طرح حکومت برطانیہ کے سیاسی اثرات ریاستوں پر اور زیادہ قوی ہو جائیں اور رہی سہی آزادی بھی چھن جائے۔ حال ہی میں بعض اطراف سے یہ بے بنیاد شکایت بھی سننے میں آئی ہے کہ جب اسوقت بھی بعض ریاستیں پولٹکل افسران پر بہ نسبت اپنی رعایا کے زیادہ اعتماد کرتی ہیں تو شرکت وفاق کے بعد اس میں اور اضافہ ہو جائیگا اور اُن ریاستوں میں بھی یہ وبا پھیل جائے گی جو ابھی تک اس سے محفوظ ہیں اور

اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ریاستوں اور ان کی رعایا کے درمیان اتحاد عمل کی راہ بہت تنگ ہوجائے گی۔ اسی کے ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شرکتِ وفاق کے بعد اس کا بہت امکان ہے کہ برطانیہ ملک کی قومی پالیسی کو شکست دینے کے لئے ریاستوں کو اپنا آلۂ کار بنائے۔ کیونکہ ریاستوں کے نمایندے جو انتخاب شدہ نہ ہوں گے نامزد کردہ ہوں گے پولٹکل ڈپارٹمنٹ کے ہاتھ میں بالکل موم کی ناک ہونگے اور مقننۂ وفاق میں وہی کہیں گے جو پولٹکل ڈپارٹمنٹ کہلوائے گا۔ الغرض ریاستوں کی شرکت وفاق میں صرف یہ معنی رکھتی ہے کہ ملک کی قومی پالیسی کے خلاف برطانوی حکومت کے اقتدار کو ہندوستان میں اور زیادہ قوی بنایا جائے

لیکن حکومت برطانیہ اور ریاستوں کے تعلقات پر جو روشنی اس سے قبل ڈالی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خطرات بے بنیاد ہیں کیونکہ ہرچند معاہدات و اسناد کو دیکھتے ہوئے ریاستوں کی موجودہ خود مختاری بہت کم ہوگئی ہے، لیکن موجودہ ڈپلومیسی کا نظام، "معاہدات پر قایم ہی کب ہے"، اس کا تعلق تو اس طرزِ عمل سے ہے جس نے تاریخ کے ساتھ ساتھ رواج کی صورت اختیار کرلی ہے۔ پھر اگر کوئی شخص جو ریاستوں کی آزادی کامل کا طرفدار ہے محکمۂ سیاسیات کے تصرف و دستبرد کا شاکی ہے اور اس کو نادرست و ناجائز سمجھتا ہے تو وہ ایسا کرسکتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرسکتا کہ اگر محکمۂ سیاسیات کی یہ پالیسی نہ ہوتی تو آج بہت سی ریاستیں ختم ہوگئی ہوتیں۔ کیونکہ قوت بالادست ہی ایک ایسا عنصر ہے کہ اگر یہ نہ ہوتا تو نہ صرف یہ کہ ریاستوں کا بقاد شوار ہوجاتا بلکہ خود برطانوی ہند کا نظام حکومت بھی موجودہ صورت اختیار نہ کرسکتا یہ قوتِ بالادست ہی کے اختیارات تھے، جنھوں نے برطانوی ہند کے قومی مطالبات اور ریاستوں کے انفرادی وجود دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ شیر و شکر کردیا

اب رہا یہ کہنا کہ ریاستوں کو صرف وہی مسایل وفاقی حکومت کے سپرد کرنا چاہئے جو از روئے اسناد و معاہدات اس سے قبل سپرد ہوچکے ہیں، گویا اس بات کا مطالبہ کرنا ہے کہ ہندوستان پیچھے ہٹ کر اس زمانہ میں پہونچ جائے جب معاہدے کرنے کی رسم جاری تھی

وہ زمانہ وہ تھا جب برطانوی ہند برطانوی ہند نہ تھا، نہ کوئی قومی تحریک ملک میں پائی جاتی تھی اور نہ آل انڈیا تحریکات کا وجود یہاں نظر آتا تھا اس لئے اگر انصاف سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ معاہدات و اسناد کے خلاف ریاستوں کے اختیارات کی کمی نے ہندوستان کی ترقی میں کافی مدد دی اور ہرچند ریاستوں کے لئے یہ قربانی بہت قیمتی ثابت ہوئی اور بعض اوقات صرف یہ کہ نامناسب ذرایع سے حاصل کی گئی بلکہ خود رئیسوں سے بھی استمزاج نہیں کیا گیا تاہم اس میں کلام نہیں کہ "موجودہ ہند" کا نشوونما قوتِ بالادست کی اسی پالیسی کا مرہونِ منت ہے اور یہ کہ اگر یہ پالیسی اختیار نہ کی جاتی تو ریاستوں کا انفرادی وجود قطعًا باقی نہ رہتا

لیکن اس کا ایک رُخ اور بھی ہے، وہ یہ کہ قوت بالادست باوجود اسقدر مفید ہونے کے بسا اوقات واقعی

زیادتی کرنے والی ثابت ہوئی ہے۔ یعنی جب کوئی نزاع ریاستوں اور حکومت کے درمیان پیدا ہوئی تو وہی جج بنی اور اسی نے ریاستوں کے حقوق و مواجب کی تعیین و صراحت کی۔ پھر چونکہ فطرت انسانی کمزوریوں سے خالی نہیں ہے اسلئے بسا اوقات پولٹکل افسران کی طرف سے اختیارات کا غلط استعمال ہوا اور رفتہ رفتہ ان اختیارات کی وسعت کا یہ عالم ہوگیا کہ اب ریاستوں کے ایڈمنسٹریشن کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو قوت بالادست کی نگرانی و اقتدار سے باہر ہو

لیکن اس کا علاج نہ یہ ہے کہ قوت بالادست کے وجود ہی سے انکار کر دیا جائے نہ یہ کہ اس نے اسوقت تک جو کچھ کیا ہے اسے کالعدم قرار دیا جائے بلکہ صحیح طریق کار یہ ہے کہ آہستہ آہستہ قوت بالادست کے متصرفانہ طرز عمل کو دور کیا جائے تاکہ وہ کانسٹی ٹیوشن یا مخصوص ضابطہ کے اندر رہکر اپنے اختیارات صرف کرے اور فی الحقیقت یہی وہ خیال تھا جس کے تحت بہت سی ریاستوں نے اُن احکامات اصلاح پر غور کرنا شروع کیا جن کی وفاقی حکومت کے سلسلہ میں توقع کی جاسکتی ہے

یہ ریاستوں ہی کا اصرار و اثر تھا کہ گول میز کانفرنس میں وفاقی مرکزیت پر زور دیا گیا اور یہ اصرار اس لئے کیا گیا کہ نمایندگان ریاستہائے ہند کے نزدیک قوتِ بالادست کے متصرفانہ طرزِ عمل سے بچنے کی یہی ایک صورت تھی کہ یہاں ایک ذمہ دار وفاقی مرکزی حکومت قایم کردی جائے

وفاقی امور کے متعلق بعض لوگوں کا یہ خیال کہ اگر ریاستوں نے انھیں وفاقی حکومت کے سپرد کر دیا تو اس کے یہ معنے ہونگے کہ قوت بالادست کو ریاستوں میں اور زیادہ مداخلت کا قانونی حق دیدیا، درست نہیں۔ کیونکہ وفاقی امور کی فہرست دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اکثر ایسے ہیں جن پر اب بھی ریاستوں کو چون وچرا کا حق حاصل نہیں۔ بعض تو ایسے ہیں، جو کبھی ریاستوں کے اقتدار میں تھے ہی نہیں اور بعض ایسے ہیں جو عرصہ سے قوت بالادست کے اختیار میں ہیں۔ اس لئے ان اُمور کو وفاقی حکومت کے سپرد کرنے کے معنے یہ نہیں ہوسکتے کہ ریاستوں کے اندر اور زیادہ مداخلت کا موقع پیدا کر دیا گیا، بلکہ برخلاف اس کے معنے یہ ہونگے کہ حکومتِ بالادست کے غیر آئینی وسیع اختیارات سے نکال کر انھیں ایک آئینی طریق حکومت کے سپرد کر دیا گیا

یہ صحیح ہے کہ اسناد کی رو سے بعض اُمور میں ریاستوں کے اختیارات ضعیف ہوجائیں گے، لیکن سوال یہ ہے کہ اسناد و معاہدات کو دیکھتا ہی کون ہے اس وقت تک ان کا کیا لحاظ رکھا گیا ہے کہ آیندہ رکھا جائے گا اس لئے قدیم معاہدات کو سامنے رکھکر آیندہ کا نظام عمل سوچنا مناسب نہیں۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ پولٹکل ڈپارٹمنٹ کا عمل کیا رہا ہے اور اُسے اس سے باز رکھنے کی صورت اگر ہوسکتی ہے تو صرف یہ ہے کہ ابتدائی، ۴۷ امور جن میں سے اکثر پر اب بھی ریاستوں کا اقتدار نہیں ہے، مناسب تحفظات کے ساتھ وفاقی حکومت کے سپرد کردئے جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قوتِ بالادست کا تصرف جو اسوقت غیر محدود صورت اختیار کئے ہوئے ہے محدود ہوجائے گا اور اُن اُمور کے علاوہ جو وفاق کے سپرد کئے گئے ہیں، باقی تمام معاملات میں ریاستیں آزاد ہوجائینگی

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وفاق میں شریک ہونے کے بعد ریاستوں کی توجہ برطانوی ہند کی طرف زیادہ ہوجائے گی اور اپنی رعایا کی طرف سے کم ہوجائے گی، لیکن یہ خیال بھی بالکل بے بنیاد ہے۔ یہ صحیح ہے کہ شرکت وفاق کے بعد ریاستوں کے

نظم ونسق میں کچھ اُلجھنیں پیدا ہو جائیں گی، لیکن ان اُلجھنوں کے دور کرنے کے لئے انھیں قوت بالادست کا منھ نہ دیکھنا پڑیگا، کیونکہ وفاقی مسایل وفاقی حکومت ہی طے کرے گی اور اس لئے یہ صورت ہو جائے گی کہ جو ریاست انتظام کے لحاظ سے جتنی زیادہ مضبوط ہو گی اتنا ہی اس کا اثر آل انڈیا معاملات پر پڑے گا اور یہ ظاہر ہے کہ ایک ریاست کی مضبوطی کا انحصار اسی پر ہے کہ رعایا بھی اس کے ساتھ تعاون کرے۔ پھر یہ کہنا کہ شرکت وفاق کے بعد ریاستوں کی توجہ اپنی رعایا کی طرف کم ہو جائے گی، گویا یہ کہنا ہے کہ ریاستیں خود جان بوجھ کر اپنے اُس اثر کو کم کریں گی جو رعایا کے تعاون کے بعد ہی انھیں حاصل ہو سکتا ہے

اسی کے ساتھ ایک امر اور قابل غور ہے۔ ہرچند یہ صحیح ہے کہ وفاقی اُمور میں قوتِ بالادست مداخلت نہ کرے گی لیکن اور تمام معاملات میں وہ بدستور قایم رہے گی اور اسے قایم رہنا چاہئے ـــ شرکت وفاق کے بعد چونکہ ہندوستان کے نظام حکومت میں ریاستوں کو دخل ہو جائے گا اس لئے ان کے بقاء و تحفظ کو اس سے ضرور مدد ملے گی، لیکن جب تک ریاستوں کی انفرادی ملوکیت باقی ہے اور وہ برطانوی ہند کے صوبوں کا پوزیشن اختیار نہیں کرتیں، ظاہر ہے کہ شرکت وفاق کے بعد بھی بہت سے معاملات ایسے باقی رہیں گے جن کی وجہ سے قوت بالادست کا تعلق ریاستوں سے ضرور قایم رہے گا۔ ذاتی وخاندانی تعلقات کے علاوہ جو تاج اور ریاستوں کے درمیان قایم ہیں، بعض امور ایسے بھی ہیں جن کو ریاستیں اول اول وفاق کے سپرد نہ کریں گی اور اس سلسلہ میں ریاستوں اور صوبجاتی حکومتوں کے درمیان ضرور اختلاف ہوگا، پھر اگر قوتِ بالادست موجود نہ ہو اور وہ ریاستوں کی حفاظت و بقا کی ذمہ دار نہ بنے تو بڑی دشواری ہوگی۔ ہرچند فیڈرل کورٹ کا وجود بھی اس حفاظت کا ضامن ہے، لیکن کوئی جوڈیشل کورٹ کسی حکومت کے طرزِ عمل کی ضمانت نہیں کر سکتا اور اس لئے قوتِ بالادست کا وجود جو گورنر جنرل اور گورنروں کے ذریعہ سے اپنے اختیارات کا استعمال کر سکتی ہے بہت ضروری ہے ـــ یہ کہنا کہ شرکتِ وفاق کے بعد پولٹکل ڈپارٹمنٹ ریاستوں سے صرف یہ کام لیگا کہ قومی تحریکات کو اُن سے دبائے درست نہیں۔ کیونکہ دارالعوام میں اس کا اعلان ہو چکا ہے کہ ریاستیں اپنے انتظامی امور میں بالکل آزاد ہیں اور نظم ونسق کی تبدیلی میں قوت بالادست کے استمزاج کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قوت بالادست کا اثر شرکتِ وفاق کے بعد کم ہو جائے گا اور پولٹکل ڈپارٹمنٹ کبھی انھیں مجبور نہ کر سکے گا کہ وہ قومی تحریکات کے خلاف کوئی رائے دیں۔

اب رہا یہ اندیشہ کہ ریاستوں کے نمایندے پولٹکل محکمہ کا اثر قبول کریں گے، سو اسکے ماننے کی بھی کوئی وجہ نہیں جبکہ خود ان نمایندوں کی نیک نامی بھی اسی پر منحصر ہے کہ وہ اپنی ریاستوں کی پوزیشن کو قایم رکھیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ مرکزی وفاق کے نظام میں کوئی نقص نہیں ہے لیکن وہ نقایص کیا ہیں اور ان کے دور کرنے کی کیا صورت ہے اسکا صحیح علم اسوقت تک نہیں ہو سکتا جب تک ہم وفاق پر عمل نہ کریں۔ کیا صوبوں کے نظام میں نقایص نہیں بتائے جاتے تھے، لیکن جب اس پر عمل کیا گیا تو بہت سے اندیشے بے بنیاد ثابت ہوئے۔ ہو سکتا ہے کہ مرکزی حکومت کے متعلق یہ شبہات عمل کے بعد دور ہو جائیں ـــ بہر حال جب تک وفاق قایم نہ ہو اس کے حسن و قبح کے متعلق حکم لگانا قبل از وقت ہے اور چونکہ قیام وفاق کے لئے ریاستوں کی شرکت ضروری ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ اگر انھوں نے شرکت سے احتراز کیا تو کبھی ہم کو یہ معلوم کرنے کا موقعہ نہ ملیگا کہ وفاق کے نظام میں کیا نقایص ہیں اور وہ کیونکر دور کئے جا سکتے ہیں ـــ یہ درست ہے کہ شرکت وفاق کے بعد صوبجاتی حکومتوں کا اثر ریاستوں کی رعایا پر ضرور ہوگا لیکن کیا ریاستوں کے نظامِ حکومت کا اثر صوبجاتی حکومتوں پر نہ ہوگا۔ یقیناً ہوگا اور اتحادِ عمل کی یہی وہ صورت ہے جو جدید ہندوستان کی تعمیر میں مدد دیگی۔

ابوالکمال اُمید امیٹھوی

اسوقت لکھنؤ کی محافل شعروسخن کی رونق دو عناصر پر منقسم ہے۔ اُسوقت کا ذکر نہیں جب گرمی محفل کے لئے شمع محفل بھی موجود تھی بلکہ ذکر اس وقت کا ہے جب لکھنؤ میں "جانِ سخن" تو کوئی نہیں لیکن "ماتم گسارانِ سخن" بہت ہیں۔ مدعا یہ کہ میں اُس عہد کی باتیں نہیں کر رہا جب شعراء خود پیدا ہوتا تھا، بلکہ اس زمانہ کی باتیں کر رہا ہوں، جب شعروشاعری کا تعلق نہ داخلی محرکات سے ہے نہ خارجی موثرات سے، بلکہ صرف اس بات سے کہ "شعر نہ کہیں تو کیا کریں" یا یہ کہ "ہم شعر کہتے ہیں اس لئے کہ کہہ سکتے ہیں"۔ ہاں تو اس دور کی لکھنوی شاعری کے اجزار ترکیبی دو ہیں (حیدرآبادی زبان میں) ایک ملکی دوسرا غیر ملکی اور یہ کہنا غالبًا غلط نہ ہوگا کہ اس پیوند نے لکھنؤ کی موجودہ شاعری کو بہت فایدہ پہونچایا

اس وقت میں اس بحث میں پڑنا غیر ضروری سمجھتا ہوں کہ خالص لکھنوی شاعری کیا تھی اس کا عروج کب ہوا اور اسکے انحطاط کے اسباب کیا تھے، لیکن یہ ظاہر کردینا ضروری ہے کہ اسوقت کی لکھنوی شاعری یقینًا وہ شاعری نہیں، جو اب سے نصف صدی قبل پائی جاتی تھی اور جس میں شاہان اودھ کی رنگ رلیوں کے کچھ مٹے مٹے نشانات ڈھونڈھنے سے ملجاتے تھے

اس میں شک نہیں کہ "لکھنؤ" کی "لکھنویت" (خواہ اس میں شعریت رہی ہو یا نہ رہی ہو) اب بالکل مٹ گئی ہے لیکن اس کی شاعرانہ مرکزیت بدستور قایم ہے اور شاہانِ اودھ کے زمانہ سے جو سلسلہ باہر کے لوگوں کی آمدورفت کا قایم ہوگیا تھا وہ برابر جاری ہے یہاں تک کہ لکھنؤ کی ذہنی و دماغی ترقی کا کوئی درمیانی دور ایسا نہیں جس کی تاریخ ان "غیر ملکیوں" کا ذکر کئے بغیر لکھی جاسکے

چنانچہ دور متاخر کے ان لوگوں میں جو باہر سے یہاں آئے اور جنھوں نے یہاں کی محافل شعروسخن میں نمایاں حصہ لیا جناب امید امیٹھوی بھی ہیں۔ آپ امیٹھی ضلع سلطانپور کے رہنے والے ہیں جو اودھ ہی کا ایک حصہ ہے۔ آپ ۲۰ فروری ۱۸۸۰ء کو پیدا ہوئے۔ آپ نسبًا سید ہیں۔ سید محمد علی نام ہے اور امید تخلص۔ آپ کے مورث اعلےٰ حافظ سید رسول صاحب غزنی سے ہندوستان آئے اور رئیس پرتاب گڑھ کے ارادتمندانہ اخلاص سے مجبور ہو کر یہیں مقیم ہوگئے

یونتو آپ کی ابتدائی تعلیم عربی و فارسی کی امیٹھی میں ہوئی، لیکن اسکی تکمیل لکھنؤ میں ہوئی۔ جب آپ ۱۸۹۳ء میں یہاں پہونچے۔ اسوقت یہاں اُردو شاعری میں جلال کا طوطی بول رہا تھا اور فارسی میں خواجہ عزیزالدین کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی

ساتھ ہی ساتھ منشی سجاد حسین کے اودھ پنچ نے نثر میں ہنگامۂ ادب برپا کر رکھا تھا۔ چونکہ امید صاحب کو فطرتاً فارسی سے لگاؤ تھا اس لئے آپ نے ملا علی محمد شیرازی سے جو مٹیا برج سے لکھنؤ آ گئے تھے، اپنے اس ذوق کو پورا کیا، اور خواجہ عزیزالدین ہی کو اپنا فارسی کلام دکھاتے رہے۔ کچھ دنوں بعد آپ کو مشاعروں میں شرکت کا شوق پیدا ہوا اور اس طرح اُردو شاعری کی طرف بھی توجہ ہوئی۔ جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں، یہاں کے اساتذۂ سخن جلالؔ کو بڑی شہرت حاصل تھی اور اس میں شک نہیں کہ نہ صرف دورِ متاخرین بلکہ لکھنؤ کے تمام اُردو شعراء میں جلالؔ کو جو مرتبہ حاصل ہے وہ کسی شاعر کو حاصل نہیں ہوا۔ صحت لغت و زبان کے لحاظ سے وہ سند سمجھے جاتے تھے اور فن کی حیثیت سے بھی ان کا مرتبہ بہت بڑا تھا۔ چنانچہ امید صاحب نے بھی ان کے یہاں آمد و رفت شروع کی اور اپنا اُردو کلام دکھانے لگے۔ لیکن چونکہ جلالؔ صاف و سلیس زبان کے شاعر تھے اور امید صاحب اپنے ذوق کی بنا پر زیادہ تر فارسی ترکیبیں استعمال کرتے تھے اس لئے یہ اُستادی شاگردی زیادہ عرصہ تک قایم نہ رہ سکی اور آخر کار یہ اپنا فارسی و اُردو کلام ایک محمد حنیف صاحب رعبؔ کو دکھانے لگے جو شاہ آباد (پنجاب) کے رہنے والے تھے اور ۱۸۹۵ء میں (شاید تکمیل طب کی غرض سے) لکھنؤ آئے تھے۔ امید صاحب جناب رعبؔ کے مداح ہیں، لیکن جس حد تک شاعری کا تعلق ہے میں نے اُن کے کلیات میں (جو غالباً امید صاحب ہی کی کوشش سے چھپ چکا ہے) میں نے کوئی بات ایسی نہیں پائی جسے دور کا لگاؤ بھی شاعری سے ہو

امید صاحب اکثر غریب خانہ پر تشریف لاتے رہتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ فارسی کا ذوق نہایت پاکیزہ رکھتے ہیں۔ مطالعہ نہایت وسیع ہے اور اساتذۂ قدیم کے اشعار بہ کثرت مستحضر ہیں (جسے اشعار پریشاں کہنا زیادہ موزوں ہوگا، اور جو ابھی تک شایع نہیں ہوا)

آپ کا مجموعۂ کلام تمام اصنافِ سخن پر حاوی ہے، اور ہر رنگ میں آپ کی اُس دقت پسندانہ کاوش کا پتہ چلتا ہے جو فارسی ذوق کی وجہ سے آپ کی فطرت ثانیہ ہو گئی ہے اور جس کا پورا لطف آپ کے قصاید میں ملتا ہے۔ آپ کی شاعری میں فارسی ہو یا اُردو، اندازِ بیان کا تنوع زیادہ تر استعمال تراکیب کا ممنون ہے اور اس لئے وہی لوگ اس سے لطف اُٹھا سکتے ہیں، جو فارسی انشار کا ذوق رکھتے ہیں۔ لیکن خالص جذباتی رنگ بھی آپ کے یہاں پایا جاتا ہے اور کافی تیز۔

فارسی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

دلم خوں گشت و جانم بر لب آمد لیک اندوہت — نمیدانم کنوں دیگر چہ خواہد از دل و جانم

اے بیخبراں از خبرِ یار چہ گویم — زیں بیش خبر نیست کہ از وے خبرے ہست

ہر دیدۂ دل بر رخ تو وا نتواں کرد — مفت ست تماشا و تماشا نتواں کرد

کام جانِ عاشقانست گرچہ وصلِ دلبراں — لیکن اندر عاشقی ناکام بودن ہم خوش ست

زاہد مناز بر اثرِ ورزشِ سجود — ایں شیوہ ہم بطرز دگر داشتیم ما

ان اشعار سے جو "ایرانیت" ٹپک رہی ہے اس کا اندازہ ہر شخص کر سکتا ہے

اُردو میں بھی آپ کا کلام کافی مقدار میں پایا جاتا ہے اور اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ جو کچھ کہتے ہیں، بہت سوچ سمجھ کر کہتے ہیں اور زبان و فن کی غلطیوں سے بچنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

سمجھے نہ تھے کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا
ہنسنے پر اپنے آپ ہی رویا کریں گے ہم

کل تک تو ان کے وعدۂ فردا کا عذر تھا
اب آج کیا اجل سے بہانا کریں گے ہم

تو یہ کہتا ہے عبادت گر نہیں تو کچھ نہیں
میں یہ کہتا ہوں، محبت گر نہیں تو کچھ نہیں،

مختصر یہ ہے کہ اب تیرے سوا
مجھ کو ہر اک بات سے انکار ہے

چار دن کی تھی زندگی لیکن،،
یہ بھی ان کی خوشی نہیں، نہ سہی

کچھ نہیں اس کے سوا جلوہ گہ یار کا راز
کوئی حیران کرے اور کوئی حیراں ہو جائے

جیسے مرے پہلو میں کوئی ماہ جبیں ہے
وہ خواب میں دیکھا ہے جو قسمت میں نہیں ہے

کہنے کے لئے خضر و مسیحا کی بھی سن لو
لیکن غم ہستی کی دوا اور ہی کچھ ہے

یہ اس رنگ کے اشعار تھے، جو مجھے پسند ہیں۔ لیکن امید صاحب کا فطری میلان جس کی مثالیں ان کے دیوان میں بہت ملتی ہیں کچھ اور ہے، اس کی بھی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

برقِ حاصل سوز کا شکوہ، نہ گلچیں کا گلہ
جلوۂ گل خود بہار آشوب گلشن ہو گیا

مجھے ہوتا اگر ذوقِ نوائے تلخ پیمائی
میں آپ اپنے شکستِ شیشۂ دل کی صدا ہوتا

بھلا وارفتہ رفتہ پھر دیا تاب تماشا نے
ذرا پھر عشوہ فرمائے نگاہِ یار ہو جانا

ہنستا ہوں اپنے خندۂ زخمِ جگر پر آپ
اب پاسِ وضعِ دیدۂ گریاں نہیں رہا

وہی کمبخت دل پھر دلفریب آگہی نکلا،
جسے تونے اُٹھا کر رکھ دیا تھا طاقِ نسیاں پر

ابھی تک لے جنوں میں گلفروشِ داغِ حسرت ہوں
ابھی تک آستیں ہے دیدۂ خونابہ افشاں پر

غیر کا سر اور ترا خنجر کہاں
اعتبارِ دیدۂ جوہر کہاں،،

گلشن برنگِ خواہشِ افسردگی کہاں
صحرا بہ قدرِ وسعتِ دیوانگی نہیں

نہیں جب اعتبار ان کو مرے افسانۂ غم کا
یہ قصہ امتیاز آرائے ظرفِ رازداں کیوں ہو

جسے بیتاب کر دے اک نگاہِ ناز کی بجلی،
وہ دل رہنِ فریبِ مشقِ صبرِ رائگاں کیوں ہو

جسے اے جیب، دداماں ذوقِ عریانی میسر ہو
وہ کیوں منت کش دستِ جنونِ فتنہ پرور ہو

اُمید صاحب اس میں شک نہیں فارسی ترکیبیں بہت صحیح و شستہ استعمال کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ "توالیِ اضافات"

بھی ان کے کلام میں دل و دماغ پر بار نہیں ہوتی

امید صاحب کے قصاید بہت شاندار ہیں کیونکہ اس میدان میں ان کے ذوق وقت پسندی کو پوری طرح پھیلنے کا موقعہ ملتا ہے۔ نثر میں ان کا رحجان زیادہ تر پنچایانہ رنگ کی طرف ہے اسی لئے اپنے عنفوان شباب میں جو مضامین وہ اودھ پنچ میں لکھتے تھے ان پر بسا اوقات منشی سجاد حسین کے مضامین کا دھوکا ہوجاتا تھا

امید صاحب باوصف اس کے کہ اس وقت ان کی عمر ۶۰ سال کی ہے، نہ صرف صحیح و توانا ہیں بلکہ اپنی خوشدلی اور خوش طبعی کے لحاظ سے ابھی تک جوان معلوم ہوتے ہیں۔ ہر چند حال ہی میں ان کو اپنے ایک جوان اکلوتے بیٹے کی موت کا سخت صدمہ پہونچا ہے اور اس کی چھوڑی ہوئی اولاد کی وجہ سے ان کی معاشی الجھنیں بہت بڑھ گئی ہیں، لیکن انکی غیرت و خودداری اور صبر و شکر کا وہی عالم ہے اور ایک لمحہ کے لئے بھی کوئی شخص یہ معلوم نہیں کر سکتا کہ بات بات پر ہنس پڑنے والے انسان کا دل کتنا داغدار ہے

وضعداری اور اخلاق کے لحاظ سے وہ یقیناً اس دور کے انسان نہیں ہیں اور اسی لئے جب کبھی وہ مجھ سے آکر ملتے ہیں تو میری نگاہوں کے سامنے خلوص و محبت کا وہ دور آجاتا ہے، جس کی یادگار اسوقت تو خال خال کہیں نظر آجاتی ہے لیکن کچھ زمانہ کے بعد چراغ لیکر ڈھونڈھنے سے بھی کہیں نہ ملے گی

باب الاستفسار

بہزاد

(جناب سید طفیل احمد صاحب۔ رائے چور)

ایران کے مشہور نقاش بہزاد کے حالات اگر دستیاب ہوسکیں تو براہ کرم مطلع فرمائیے، نیز یہ کہ کن کن کتابوں سے اس کے مفصل واقعات زندگی معلوم ہو سکتے ہیں

(نگار) بہزاد کی صحیح تاریخ ولادت تو معلوم نہیں لیکن مورخین کا خیال ہے کہ وہ غالباً پندرھویں صدی عیسوی کے وسط میں پیدا ہوا تھا (یعنی سنہ ۱۴۵۰ء کے قریب) اور یہ خیال انھوں نے اس لئے قایم کیا ہے کہ اسکے جو ابتدائی نقوش دستیاب ہوئے ہیں ان پر سنہ ۱۴۷۹ء درج ہے۔ گویا ان کے نزدیک تقریباً ۳۰ سال کی عمر میں وہ اس قابل ہوا ہوگا کہ اس طرح کی نقاشی پیش کرسکے۔ مگر یہ صرف قیاس ہی قیاس ہے۔ ہوسکتا ہے اس نے اس سے کم عمر میں اتنی مشق حاصل کرلی ہو یا اور زیادہ معمر ہونے کے بعد اس مرتبہ پر پہونچا ہو

ایرانی مورخین نے اسے ہرآت کے مشہور نقاش امیر روح اللہ کا شاگرد بتایا ہے اور ایک ترکی مورخ نے پیر سید احمد تبریزی کا۔ تزک جہانگیری میں، جہانگیر نے لکھا ہے کہ وہ "خلیل مرزا" کی نقاشی کا متبع تھا۔ بہزاد کا سب سے پہلا سرپرست میر علی شیر نوائی تھا، اسی کے ذریعہ سے وہ حسین بیقرہ والی ہرآت کے دربار میں پہونچا جہاں اسوقت نوائی، جامی اور خوندمیر وغیرہ صاحبان فضل وکمال موجود تھے۔ جب اس خاندان کو محمد خاں شیبانی نے معزول کردیا تو بہزاد، ہرآت سے تبریز چلا آیا جو صفوی خاندان کا پایۂ تخت تھا، شاہ اسماعیل صفوی نے اس کی بڑی قدر کی اور شاہی کتاب خانہ کا افسر بنا کے تمام کاتب و نقاش اس کی ماتحتی میں کردئے۔ شاہ طہماسپ کے زمانہ میں بھی اس کی بڑی عزت تھی۔ سلطان محمد اور آقا میرک دو نقاش اور اس کے ساتھ دربار سے وابستہ تھے۔ بہزاد نے سنہ ۹۴۲ھ یا سنہ ۱۵۳۶ء میں انتقال کیا اور شیخ کمال خجندی (مشہور شاعر) کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ دوسری روایت کے مطابق اس کا انتقال سنہ ۱۵۳۳ء میں ہوا۔ ہرچند اسکے زمانہ کی تاریخوں سے اس کی نقاشی پر تفصیلی روشنی نہیں پڑتی، لیکن یہ سب نے لکھا ہے کہ وہ بہت بڑا صاحب فن تھا۔ خوندمیر نے لکھا ہے

کہ شبیہ کو اصل سے قریب تر بنانے میں اسے ید طولیٰ حاصل تھا۔ حیدر مرزا لکھتا ہے کہ وہ اُستاد آقا میرک سے کم نہ تھا اور دونوں میں یہ فرق تھا کہ آقا میرک کے نقش میں پختگی زیادہ ہوتی تھی اور بہزاد کے نقوش میں نزاکت۔ شاہ مظفر بھی اس زمانہ کا بہت بڑا نقاش تھا لیکن حیدر مرزا کا بیان ہے کہ بہزاد موقلم کے استعمال اور خطوط کے توازن میں اس سے بہتر تھا۔ بابر لکھتا ہے کہ بہزاد بہت نازک نقاشی کرتا تھا، خصوصیت کے ساتھ داڑھی رکھنے والا چہرہ خوب بناتا تھا۔ بابر کے جانشینوں نے بھی بہزاد کے نقوش کی بڑی قدر کی اور بڑی بڑی قیمتیں ادا کرکے ان کو جمع کیا۔ جہانگیر لکھتا ہے کہ بہزاد لڑائی کے مناظر دکھانے میں کمال رکھتا تھا۔ اہل مغرب نے ایران کے قدیم نقوش فراہم کرکے بہزاد کے نقوش کی تعیین میں بڑی کوشش کی ہے اور وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں انکا خیال ہے کہ وہ تیموری طرز کا نقاش تھا اور خود اس نے کوئی نئی بات پیدا نہیں کی تاہم چھوٹی چھوٹی تصاویر بنانے میں اس کو کمال حاصل تھا، اسی لئے وہ کتابوں کو مصوّر کرنے میں بہت کامیاب ہوا

انقلاب فرانس

(جناب مرزا محمد اسماعیل صاحب۔ سارن)

انقلاب فرانس پر بڑی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن اگر کوئی شخص آپ سے کہے کہ صرف دو صفحات میں اس کو بیان کر دیجئے تو آپ کیا کریں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُردو داں طبقہ کے لئے سخت ضرورت اس امر کی ہے کہ دنیا کے تمام اہم تاریخی واقعات اور علمی مسایل نہایت مختصر الفاظ میں ان کے سامنے بیان کئے جائیں اور اس طرح کا ایک سلسلہ کتابی صورت میں شایع کیا جائے۔ کسی فن میں اختصاصی درجہ کرنا ہر شخص کا کام نہیں، اس لئے پبلک کی عام معلومات بڑھانے کے لئے ایسی ہی کتابوں کی ضرورت ہے جو ایک طرح سے مفصل انڈکس کی حیثیت رکھتی ہوں۔ کیا آپ اس طرف توجہ فرمائیں گے

(نگار) آپ کا خیال بالکل درست ہے اور یقیناً پبلک کو ایسی ہی تصانیف کی ضرورت ہے، چنانچہ نگار میں استفسار و جواب کا سلسلہ اسی خیال سے جاری کیا گیا ہے۔ اسوقت تک تین جلدیں اس مجموعہ کی شایع ہو چکی ہیں اور آپ دیکھیں گے کہ اس میں سیکڑوں تاریخی، علمی، ادبی و سیاسی مسایل کو نہایت مختصر الفاظ میں سمیٹ لیا گیا ہے۔ "انقلاب فرانس" کی مختصر تاریخ نہایت مختصر عبارت میں درج ذیل ہے:۔ "انقلاب فرانس" نام اس تحریک کا ہے جو ۱۷۸۹ء میں فرانس کے اندر رونما ہوئی اور سارے یورپ میں ہلچل ڈال گئی۔ اس زمانہ میں فرانسیسی آبادی خصوصیت کے ساتھ دیہی آبادی بہت تباہ حال تھی اور حکومت کو مطلق پرواہ نہ تھی۔ بادشاہ اور اس کے امراء جو چاہتے تھے کرتے تھے اور مالی حالت اتنی خراب ہو گئی تھی کہ سارا ملک قحط زدہ سا ہو رہا تھا اتفاق سے اسی زمانہ میں وہاں والٹیر، روسو وغیرہ چند نفوس ایسے پیدا ہو گئے جنھوں نے لوگوں میں ذہنی انقلاب پیدا

کرنا شروع کیا، مثلاً والیٹر نے مذہبی پابندیوں اور رسم و رواج کی جکڑ بندی کے خلاف کہنا شروع کیا اور روسو نے حکومت کے خلاف نکتہ چینی کرکے لوگوں میں ہیجان پیدا کردیا۔ دنیا میں ہمیشہ یہی ہوا ہے کہ جب کسی قوم کی حالت انتہائی پست ہوجاتی ہے تو اس میں ردِ عمل کی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے اور اسوقت اگر کوئی شخص اس آگ کو بھڑکانے والا پیدا ہوجاتا ہے تو وہ لیڈر و رہنما یا نبی و پیغمبر کی حیثیت حاصل کرلیتا ہے۔ الغرض فرانس کی آبادی یونہی پہلے سے آمادۂ بغاوت تھی کہ والیٹر اور روسو نے اس میں اور قوت پیدا کردی۔ اس کا نتیجہ ہوا کہ (اسٹیٹس جنرل) یعنی پبلک کی وہ نمایندہ جماعت جو شاہ فرانس کے مشورہ کے لئے قایم تھی اور جسکا کوئی اجلاس ۱۶۱۴ء سے اس وقت تک نہ ہوا تھا، طلب کی گئی اور ایک قومی اسمبلی قایم کی گئی، لیکن جو ہیجان لوگوں میں پیدا ہوگیا تھا وہ یوں آسانی سے فرو نہ ہوسکتا تھا اس لئے ۱۴ جولائی ۱۷۸۹ء کو انھوں نے سب سے پہلے (Bastille) کو جاکر تباہ کیا۔ یہ ایک قید خانہ تھا جس میں ہر وہ شخص نظر بند کردیا جاتا تھا جس سے بادشاہ ناخوش ہو۔ اسی کے ساتھ ملک کے اور اطراف میں بھی بدامنی پھیل گئی اور انقلابیوں نے اپنا سہ رنگی جھنڈا بناکر جمہوریت کا مطالبہ شروع کیا — قومی اسمبلی نے یہ رنگ دیکھ کر فیصلہ کیا کہ امراء کو جو حقوق حاصل ہیں وہ ضبط کرلئے جائیں اور جدید کانسٹی ٹیوشن مرتب کیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ اس ہنگامہ کو دیکھ کر بہت سے امراء بھاگ کر انگلستان چلے گئے، اور بادشاہ کی حیثیت قیدی سے زیادہ نہ تھی تاہم شاہ پرست جماعت ابھی بالکل ختم نہ ہوئی تھی — اس کے دو سال بعد جون ۱۷۹۱ء میں بادشاہ (لوئی شانزدہم) پیرس سے بھاگا لیکن وارنیس سے پھر واپس لایا گیا۔ اب اسمبلی نے فیصلہ کیا کہ یہاں (Constitutional Monarchy) قایم کی جائے (اس سے مراد وہ طرزِ حکومت ہے جس میں بادشاہ کسی آئین کا پابند بنادیا جائے) لیکن اس پر عمل نہ ہوسکا چونکہ اب یہ آگ زیادہ پھیل گئی تھی اس لئے ملحقہ حکومتوں کو بھی تشویش پیدا ہوئی اور جو فرانسیسی امراء بھاگ کر ادھر ادھر چلے گئے تھے انھوں نے بھی دوسری سلطنتوں کو ابھارا خصوصیت کے ساتھ شاہ آسٹریا نے بہت گہری دلچسپی لی کیونکہ وہ لوئی شانزدہم کا سالہ تھا۔ اس نے فرانس سے مطالبہ کیا کہ وہ بادشاہ کو پھر تخت نشین کرے — ادھر فرانس میں جمہوریت پسندوں کی قوت بڑھتی جارہی تھی اس لئے غیر ملکوں کی مداخلت نے اور زیادہ ہیجان پیدا کردیا، یہاں تک کہ ۱۷۹۲ء میں آسٹریا کے خلاف اعلان جنگ کردیا۔ اب شاہ پروشیا بھی آسٹریا کے ساتھ ملگیا، لیکن نتیجہ فرانس کی کامیابی کی صورت میں نکلا، اسکے بعد ایک قومی مجلس یہاں قایم ہوگئی اور جس نے بعد کو جمہوریت کی شکل اختیار کرلی۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۱ جنوری ۱۷۹۳ء کو لوئی قتل کردیا گیا اور ہزاروں آدمی مقید کردئے گئے۔ اسکے بعد ۱۷۹۳ء میں ایک کمیٹی "حفاظت عامہ" کی غرض سے قایم ہوئی جس کا نام (Committee of Public Safety) تھا اور وہ ہنگامۂ دار و گیر شروع ہوا جسے "Reign of Terror" سے تعبیر کیا جاتا ہے سیکڑوں امراء اور سیاسی رہنما قتل کئے گئے یہانتک کہ لوئی کی بیوی میری انٹائی نٹ بھی ۶ اکتوبر ۱۷۹۳ء کو قتل کردی گئی۔ یہ ہنگامہ تقریباً دو سال تک قایم رہا۔ اسکے بعد یہاں اکتوبر ۱۷۹۵ء میں (Directory) کردیگئی (اس سے مراد پانچ آدمیوں کی وہ جماعت ہے جو سلطنت کے نظم و نسق کا پورا اختیار رکھتی تھی) اس ڈائرکٹری کے زمانہ میں نپولین کو عروج حاصل ہوا جس نے آخرکار ۹ نومبر ۱۷۹۹ء کو ڈائرکٹری کو بھی ختم کردیا اور کانسل کا لقب اختیار کرکے خود فرانس کا حکمراں بن گیا۔

مطبوعات موصولہ

فرہنگ عامرہ چھوٹے سائز کا لغت ہے جس میں عربی فارسی اور ترکی کے تقریباً ۴۰ ہزار الفاظ، صحیح تلفظ کے ساتھ یکجا کر دئے گئے ہیں اور جن کا عام فہم ترجمہ اُردو میں کیا گیا ہے۔ اس فرہنگ کی خصوصیات فاضل مؤلف نے یہ ظاہر کی ہیں کہ:۔

(۱) الفاظ کی ترتیب حروف تہجی کے لحاظ سے اس طرح رکھی گئی ہے کہ کسی لفظ کی جستجو میں دقت نہیں ہوتی

(۲) صحت تلفظ کے لئے یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ ہر لفظ کے آگے اس کے ٹکڑے کر دئے گئے ہیں اور ہر ٹکڑے پر اعراب دیدئے گئے ہیں۔ یہ وہی طریقہ ہے جو انگریزی زبان کے لغات میں رائج ہے

(۳) فارسی کی خلاف قیاس اور عربی کی مستعمل جمع اپنے صیغۂ مفرد کے ذیل درج کر دی گئی ہے اور کثیر الاستعمال صیغہائے جمع کو مستقل لغت کی حیثیت سے اس کی جگہ پر پھر دوبارہ دیدیا گیا ہے

(۴) کثیر الاستعمال فارع مصادر کے مفید ارعات اور سماعی و قیاسی مشتقات بھی دیدئے گئے ہیں، اسی کے ساتھ قلیل الاستعمال مصادر کی بڑی تعداد بھی شامل کر دی گئی ہے

(۵) فارسی میں اکثر حروف دوسرے حروف سے بدل دئے جاتے ہیں، اس کی صراحت بھی ہر حرف کی تقطیع کی ابتدا میں کر دی گئی ہے

(۶) دورِ حاضر کے بہت سے مفید معرّبات و مفرّسات اس میں شامل ہیں

(۷) اشیاء کی ماہیت و معانی بیان کرنے میں جدید تحقیقات کا خیال رکھا گیا ہے

(۸) اسماء الرجال کے سلسلہ میں افسانوی افراد اور تاریخی شخصیتوں کے درمیان حدِّ فاصل قایم کر دی گئی ہے

میں نے اس فرہنگ کو بغور دیکھا ہے اور میں نے یہ تمام خصوصیات اس میں پائی ہیں۔ ہماری زبان میں لغت کی کتابوں کی بہت کمی ہے اور خصوصیت کے ساتھ وہ جو جامع بھی ہوں اور مختصر بھی۔ اس لئے ملک کو جناب محمد عبداللہ خاں خویشگی کا ممنون ہونا چاہئے کہ انھوں نے سالہا سال کی محنت کے بعد یہ قابل قدر فرہنگ مرتب کی اور اچھے کاغذ پر مجلد شایع کر کے طلبہ کی بڑی ضرورت کو پورا کیا۔۔ یہ کتاب مولف سے "فیروز منزل خورجہ" کے پتہ سے دستیاب ہو سکتی ہے

فانوس خیال کلیات ہے سید جلال الدین توفیق حیدرآبادی کا جسے ان کے فرزند جناب سید امیر الدین توصیف نے نہایت حسنِ اہتمام کے ساتھ مجلد شایع کیا ہے

توفیق مرحوم حیدرآباد کے نہایت خوشگو شاعر تھے اور اپنی پختگی کلام کی وجہ سے اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔
توفیق ۱۲۸۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۳۹ھ میں انتقال کیا۔ ان کی ابتدائی تعلیم نہایت اچھی ہوئی اور تربیت اس سے زیادہ اچھی۔ آپ ہرچند قلیل المعاش تھے لیکن یہ دنیاوی تنگیاں آپ کی روحانی ترقیوں میں کبھی حارج نہیں ہوئیں اور آپ نے اپنی ساری عمر ایک بلند اخلاق والے انسان کی طرح بسر کی

اس مجموعہ میں غزلیں، رباعیاں، قطعے، قصیدے، مرثیے اور مثنویاں وغیرہ تمام اصناف سخن پائے جاتے ہیں اور بقدر مشترک جو خصوصیت ان کے ہر رنگ سے ظاہر ہوتی ہے یہ ہے کہ آپ لکھے پڑھے شاعر تھے۔ کلام سے نہ صرف پختگی بلکہ دقت نظر اور کاوش فکر بھی نمایاں ہے، چنانچہ بہت سے اشعار آپ نے مرزا نوشہ کے رنگ میں بھی لکھے ہیں۔ زبان کی صحت اور انداز بیان کی سلاست کا بھی آپ کو بہت خیال تھا، ہرچند آپ جذباتی شاعر نہ تھے، اور رعایت لفظی وصنعت جو اس زمانہ کی خصوصیت تھی بہ کثرت آپ کے کلام میں پائی جاتی ہے، لیکن بدسلیقگی کے ساتھ نہیں۔ اس کلیات کی قیمت تین روپیہ ہے اور دکن بک اینڈ اسٹیشنری مارٹ عابد بلڈنگ حیدرآباد دکن سے ملسکتا ہے

ہندوستان کا نیا دورِ حکومت جناب پنڈت کشن پرشاد کول نے ہندوستان کے نئے دستورِ حکومت کا خلاصہ اس کتاب میں پیش کیا ہے اور ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد نے اسے شایع کیا ہے

پہلے دیباچہ میں یہ بتایا ہے کہ آئینی اصلاحات کا آغاز کیونکر ہوا اور اس کے بعد اصلاحات کے درمیانی منزلوں کا ذکر کرتے ہوئے موجودہ منزل تک کے واقعات کو مختصر و جامع الفاظ میں بیان کر دیا ہے

دیباچہ کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے جس میں صوبوں کی خود مختار حکومت پر روشنی ڈالی ہو اور کونسلوں کی ساخت، ایوان اعلیٰ و ادنیٰ کے اختیارات اور مقننہ و عاملہ کے اُصول کار سے بحث کی ہے

دوسرے باب میں مرکزی حکومت یا بالفاظ دیگر وفاقی حکومت کی تشکیل پر نظر ڈالی ہے اور ساتھ ہی ساتھ فنانس وفاقی عدالت اور رزرو بنک کے متعلق بھی کافی معلومات فراہم کردی ہیں۔ اس کتاب میں دستورِ جدید پر کوئی انتقادی نگاہ نہیں ڈالی گئی ہے بلکہ دستور جدید کی قانونی حیثیت کو بلاکم و کاست پیش کر دیا گیا ہے

جدید ایکٹ اس وقت کی انجیل ہے۔ ہندوستان کے ہر باشندہ کا فرض ہے کہ وہ اسے سمجھے اور دیکھے کہ اس قانون میں کیا ہے اور کیا نہیں۔ پنڈت جی نے اس پیچیدہ آئین کو بہت صاف وسلیس اُردو میں پیش کیا ہے اور ملک کو ان کا ممنون ہونا چاہئے

اصطلاحات کا ترجمہ کہیں کہیں تو کیا گیا ہے لیکن اکثر جگہ چھوڑ دیا گیا ہے اور انگریزی کا اصل لفظ رکھ دیا ہے

اس صورت میں زیادہ مناسب یہ تھا کہ ان اصطلاحات کا مفہوم فٹ نوٹ کے ذریعہ سے علحدہ بتا دیا جاتا۔ بہرحال کتاب مفید و برمحل ہے اور ہر اُردو داں کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ قیمت ایک روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد۔

حسین کا پیغام ۴۴ صفحات کا مختصر سا رسالہ ہے جس میں مولانا سید علی نقی صاحب نے خود حسین کی زبان سے ظاہر کیا ہے کہ حسین کس شخصیت کے انسان تھے اور ان پر پے درپے کیا مصائب نازل ہوئے، ساتھ ہی ساتھ یزید کی خلافت کا ذکر کرتے ہوئے واقعۂ کربلا پر اس پیام کو ختم کر دیا ہے۔ یہ رسالہ امامیہ مشن لکھنؤ نے شایع کیا ہے۔ قیمت ایک آنہ ہے

شہداء کربلا حصۂ دوم یہ رسالہ بھی امامیہ مشن لکھنؤ نے شایع کیا ہے اور مولانا سید علی نقی صاحب کی تحقیق کا نتیجہ ہے۔ اس کا حصۂ اول، اب سے بہت پہلے شایع ہو چکا ہے، لیکن چونکہ اس میں تمام شہداء کربلا کا ذکر نہ ہو سکا تھا اس لئے دوسرے حصہ کی اشاعت ضروری سمجھی گئی اس میں ۵۲ شہداء کی شہادت کا بیان کیا گیا ہے اور جس حد تک استناد و حوالہ کا تعلق ہے، روایات پر اعتبار کر لینے والا انسان ان تمام جزئیات و تفصیلات پر یقین کر لینے کے لئے مجبور ہے، جو اس میں درج ہیں، لیکن جیسا کہ میں اس سے قبل کسی وقت ظاہر کر چکا ہوں، یہ بات میری سمجھ میں آج تک نہیں آئی کہ ہنگامۂ کربلا کے متعلق ایسی موشگافیاں ممکن بھی تھیں یا نہیں۔

یہ اور بات ہے کہ فسانہ کی حیثیت سے ہم ان واقعات کو پڑھ لیں، لیکن تاریخی حیثیت سے ان کی اہمیت بہت کم ہے اس کی قیمت ۵۰ر ہے اور ملنے کا پتہ امامیہ مشن لکھنؤ

ماہ عرب اس رسالہ میں سید محمد ہادی ہیڈ ماسٹر انجمن اسلام ہائی اسکول احمد آباد نے رسول اللہ کے مختصر حالات بچوں کے پڑھنے کے لئے یکجا کر دئے ہیں۔ عبارت بہت صاف و سلیس ہے اور انداز بیان شگفتہ۔ سب سے زیادہ مسرت مجھے یہ دیکھ کر ہوئی کہ اس میں شق صدر، شق قمر وغیرہ ایسے واقعات کے اظہار سے گریز کیا گیا ہے اور رسول اللہ کے کسی معجزہ کا ذکر نہیں کیا گیا۔ بچوں کے سامنے ایسی باتیں پیش کرنا جو ابتدا ہی سے ان کے دل و دماغ کو ماؤف بنا دیں اور توہمات پر یقین کرنا سکھائیں، سخت اُصولی غلطی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سید محمد ہادی صاحب نے اسی نیت سے ان باتوں کے بیان سے احتراز کیا ہے اور یہ احتیاط ان کی لایق ستایش ہے۔ اس رسالہ کی قیمت ۲ر ہے اور مولف موصوف سے ملسکتا ہے۔

شارستان قدس پانچ چھوٹی چھوٹی فارسی مثنویوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے مصنف جناب محوی بدایونی ہیں۔ ان مثنویوں میں تعلیمات اسلامی کو شاعرانہ لیکن موثر لب و لہجہ میں بیان کیا گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ جناب محوی مرزا عبدالقادر بیدل اور حکیم سنائی کے فلسفہ سے بہت متاثر ہیں۔ زبان و انداز بیان کے لحاظ سے بھی یہ مثنویاں خوب ہیں۔ قیمت ۸ر ہے اور ملنے کا پتہ نظامی پریس بدایوں

لطایف غالب اس دو جزو کے رسالہ میں ایم۔ اے۔ شاہ نے غالب کے وہ لطایف جو غالب کے مکاتیب یا تذکروں میں ان کو اچھے معلوم ہوئے یکجا کر دئے ہیں، کتابت وطباعت اچھی ہے اور کاغذ بھی قیمتی استعمال کیا گیا ہے، قیمت ۴ر ہے اور ملنے کا پتہ مکتبہ پنجاب ریلوے روڈ لاہور

قرآن پاک مولوی عبد الواحد صاحب سندھی نے اس رسالہ میں تمام وہ ضروری معلومات یکجا کر دئے ہیں جو قرآن پاک کے متعلق بچوں کو معلوم ہونا چاہئے۔ یہ کتاب گویا قرآن کی تاریخ ہے نہایت سلیس انداز میں اور ایسے الفاظ میں کہ بچے انھیں آسانی سے پڑھ سکیں اور سمجھ سکیں، مکتبۂ جامعۂ دہلی نے اسے شایع کیا ہے اور ۶ر اس کی قیمت ہے۔ یہ کتاب غالباً جامعہ کے نصاب میں داخل ہو گی، لیکن جامعہ کی اور تمام کتابوں کی طرح اسے بھی جامعہ کے حدود سے باہر ہر مسلمان بچہ کے مطالعہ میں آنا چاہئے

جامعۂ ملیہ کی تین اور کتابیں بچوں کے لئے جنگو کی بلی۔ انعامی مقابلہ۔ پوری جو کڑھائی سے نکل بھاگی مکتبۂ جامعہ نے بچوں کے لئے دلچسپ کہانیوں کا سلسلہ عرصہ سے شروع کر رکھا ہے جو پیام تعلیم میں چھپتی رہتی ہیں، یہ تینوں کہانیاں بھی اسی سلسلہ کی ہیں اور خوب ہیں۔ ضرورت ہے کہ چھوٹے بچوں کے سامنے ایسی ہی کہانیاں پیش کی جائیں جو زبان کے لحاظ سے غلطی سے پاک ہوں اور نتیجہ کے لحاظ سے سبق آموز ہوں۔ یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ اسوقت ہندوستان میں کوئی ادارہ ایسا نہیں جو جامعہ ملیہ سے بہتر اس خدمت کو انجام دے رہا ہو۔ ان کی قیمت علی الترتیب ۴ر - ۳ر، اور ۲ر ہے

غزل :

اعجاز اکبر آبادی

برہم نگاہیوں سے تماشا نہ کیجئے
تنظیمِ دل تہ و بالا نہ کیجئے

وہ حاصلِ حیات ہیں، وہ مرکزِ امید
کیا کیجئے جو اُن کی تمنا نہ کیجئے

وابستہ ہر خلش سے رہے یاد آپ کی،
اچھا ہے دردِ دل کا مداوا نہ کیجئے

غم اور وہ کبھی پھر غمِ الفت نہ ہے نصیب
یہ اور بات ہے کہ گوارا نہ کیجئے

آپ اور مجھ سے ترکِ تعلق، نہیں نہیں
کچھ کیجئے، مگر یہ ارادہ نہ کیجئے

کونین بھی کوئی اگر اس کے صلے میں دے
اعجاز شرحِ راز گوارا نہ کیجئے

دیوار کے اُس طرف

اُس طرف ہر رُخ پر افشاں جلوۂ رنگِ جمال
اِس طرف ہر چہرہ فرطِ ناتوانی سے نڈھال

اُس طرف چشمِ مسرت میں رعونت کا خمار
اِس طرف ہے غازۂ رخ رنج و محنت کا غبار

اُس طرف گھنٹے، گھڑی، گھڑیال ہیں اوقات ساز
اِس طرف دنیا ہے قیدِ وقت سے بھی بے نیاز

اُس طرف نازک کفِ دولت میں پھولوں کی چھڑی
اِس طرف افلاس کے ہاتھوں میں بھاری ہتکڑی

اُس طرف ہے کاروبارِ زر پہ گھنٹوں گفتگو
اِس طرف بیتاب کن یک پارہ ناں کی جستجو

اُس طرف کوٹھی پہ "بیگم" کو قناعت ہی نہیں
اِس طرف چھپر میں پورا گھر کا گھر عزلت نشیں

اُس طرف سینے میں اک پتھر کا ٹکڑا جائے دل
اِس طرف ہستی سراپا درد و یکسر پا بگل

اُس طرف ہیں کاہلی اور کسل سے ماتھے پہ بل
اِس طرف محنت کے باعث مرد کے بازو ہیں شل

اُس طرف انفاس عالم ہیں مئے عشرت میں غرق
اِس طرف انساں سراپا گرد از پا تا بہ فرق

اُس طرف حاصل ہوائے گرم میں خس اور گلاب
اِس طرف ہے تشنگی اور روئے صحرا کا سراب

اُس طرف سرگوشیاں کرتے ہیں برقی قمقمے
اِس طرف لڑتے ہیں تاریکی سے مٹی کے دیئے

اُس طرف ہے خوبصورت جسم پر ہر جامہ تنگ
اِس طرف صحت کے گر جانے سے منہ کا زرد رنگ

اُس طرف ہے ریڈیو پر نغمۂ نو کی تلاش
اِس طرف ٹوٹا ہوا دل اور مسلسل ارتعاش

اُس طرف روشن ہیں تعلیم و تمدن کے چراغ
اِس طرف کچلا ہوا ہے جہل و پستی سے دماغ

اُس طرف ہے جادۂ ہستی، بساطِ کہکشاں
اِس طرف دم گھونٹ دینے والا زہریلا دھواں

حل طلب ہے مدتوں سے ہمنشیں یہ مسئلہ
اُس طرف تو ہے خدا، کیا اِس طرف بھی ہے خدا؟

فضل الدین اشرف

خودشناس اقبالؔ

دیدۂ دل باز کر، شمعِ حقیقت سے دیکھ
زندہ ہو اقبالؔ ابھی چشمِ بصیرت سے دیکھ

تیغِ محبت کا زخم بھر نہیں سکتا کبھی
عشق کا مارا ہوا، مر نہیں سکتا کبھی

نشۂ جامِ خودی، چڑھ کے اُترتا نہیں
حق نگر و خودشناس مر کے بھی مرتا نہیں

رابطۂ جسم و جاں راز ہے اک طرفہ راز
گاہ صدا ساز میں گاہ صدا میں ہو ساز

کل تک آواز تھی زیر و بمِ ساز میں
آج ہے خود ساز گم اپنی ہی آواز میں

یعنی متاعِ وجود ہو گئی صرفِ خودی
اتنی فروزاں ہوئی شمع کہ خود جل بجھی

سرمست تمکین

بہکی بہکی باتیں

ہم سخن ہم نوا نہیں ملتا
زندگی میں مزہ نہیں ملتا

ایسی منزل پہ آگیا ہے شباب
سامنے راستہ نہیں ملتا

فطرت میں رنگ بھرنے کی ہمت نہ کر سکے
مرنا ہی تھا جینے کی حسرت نہ کر سکے

مجبوریوں کے جبر کا کیا دیجئے جواب
ہم چاہتے تھے اور محبت نہ کر سکے

نجبت (امراوتی)

غزل

خانصاحب مرزا جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی

اور انداز ترا حسرتِ منزل ہو جائے
دل جو لذت کشِ محرومیِ حاصل ہو جائے

ہاں چمن زارِ محبت میں بہار آتی ہے
نام اک نکہتِ برباد کا جب دل ہو جائے

دل صد پارہ سے یوں اُلجھی ہے وہ شوخ نگاہ
جیسے سورج کی کرن پھول پہ مائل ہو جائے

اپنے بسمل کے تڑپنے کا تماشا تو دیکھ
تو سہی تُو بھی جو بے درد نہ بسمل ہو جائے

ایک اُچٹتی سی نگہ پر ہے یہ بیتابیِ دل
حال پوچھے کوئی اسوقت تو مشکل ہو جائے

ہائے کس لطف سے یہ عمرِ دو روزہ گزرے
تھوڑی مستی بھی اگر ہوش میں شامل ہو جائے

امتحاں طاقتِ دیدار کا جائز ہے، مگر
جب نظارہ بھی دھڑکتا ہوا اک دل ہو جائے

مجھ کو الزام نہ دے، آپ کو بدنام نہ کر
دعوۂ عشق غلط کیوں ہو، جو باطل ہو جائے

مان جائے بھی اگر حسنِ تماشا دشمن
شوقِ بیتاب سراپردۂ محمل ہو جائے

ہوشمندوں سے کہیں معرکے سر ہوتے ہیں
کاش دیوانہ کوئی رہبرِ منزل ہو جائے

ناخدا سے یہ کہے کون، کہ ہمت ہو اگر
موجِ طوفانِ بلا، دامنِ ساحل ہو جائے

کیا کرے کوئی گلہ اُن کے تغافل کا اثرؔ
شوق جب آپ تمناؤں کا قاتل ہو جائے

علاءالدین کے عہد میں اس قدر مسجدیں، خانقاہیں، حوض، مینار اور حصار طیار ہوئے کہ کسی اور بادشاہ کو نصیب نہیں ہوئے۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ:۔ علاؤالدین کے شاگرد پیشہ کی تعداد ۰، ہزار تھی جن میں سات ہزار صرف معمار و گلکار تھے جو بڑی سی بڑی عمارت کو چند ہفتوں میں طیار کر دیتے تھے۔ تمام سلطنت میں سڑکیں کثرت سے بن گئی تھیں اور نہایت عمدہ حالت میں تھیں

جب سلطان قطب الدین مبارک شاہ (علاؤالدین کے بیٹے اور جانشین) نے دہلی سے دولت آباد تک کا سفر کیا ہے تو اسوقت کا حال ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ "دہلی سے دولت آباد (دیوگرھ) تک چالیس دن کا سفر تھا اور ان دونوں شہروں کے درمیان جو سڑک تھی اس کے دونوں جانب بید وغیرہ کے درخت لگے ہوئے تھے ایک مسافر ایسا محسوس کرتا تھا کہ گویا وہ کسی باغ کی روش پر چل رہا ہے۔ ہر میل پر ڈاک کی چوکی تھی اور راستہ میں ہر جگہ اس کو تمام ضرورت کی چیزیں اس قدر فراوانی سے دستیاب ہوتی تھیں گویا بازار لگا ہوا ہے۔

یہاں سے اور سڑکیں ۶ مہینہ کی راہ کی معبر اور تلنگانہ تک بنی ہوئی تھیں۔ ہر منزل پر بادشاہ اور دیگر مسافروں کے قیام کے لئے مکانات بنے ہوئے تھے۔ مفلس مسافروں کو زاد راہ کی مطلق فکر نہیں ہوتی تھی اور ان کو تمام چیزیں مفت ملتی تھیں"

سب سے پہلے جو شخص ہاتھی پر عماری رکھ کر سوار ہوا علاءالدین خلجی تھا۔ چنانچہ امیر خسرو فرماتے ہیں:۔

کسے در شاہی وانگہ سواری
جز او ننہاد بر فیلان عماری

سلطان علاؤالدین اپنے عزم و جبروت، اپنی سطوت و سیاست کے لحاظ سے تاریخ ہندوستان کا عجیب و غریب بادشاہ ہوا ہے، اس کے عہد کی چند خصوصیات کو ضیاء برنی نے ایک جگہ حسب ذیل لکھا ہے:۔

۱۔ غلہ۔ کپڑا اور دیگر اشیاء کی ارزانی
۲۔ مسلسل فتوحات اور دولت کا بیشمار انبار
۳۔ بڑی فوج کا قیام قلیل خرچ سے
۴۔ باغیوں کی سرکوبی اور تمام راجاؤں اور ماتحت فرمانرواؤں کا اطاعت شعار رہنا
۵۔ مغلوں کی تباہی
۶۔ ملک کے تمام راستوں کی حفاظت
۷۔ بازاری لوگوں کا ایماندار ہوجانا
۸۔ مسجدوں، میناروں، قلعوں، تالابوں وغیرہ کا کثرت سے تعمیر کیا جانا

خضر خاں اور دیول رانی

۹۔ آخری دس سال کے اندر مسلمانوں کا عام طور سے دیانت و امانت عدل و انصاف پسندی کی طرف مائل ہو جانا عہد علائی کے خاص واقعات میں، خضر خاں (اس کے بیٹے) اور دیول رانی (راجہ رائے کرن کی بیٹی) کا واقعہ عشق و محبت ہے۔ لیکن تاریخ فیروز شاہی میں جو اس عہد کی نہایت مستند تاریخ ہے اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اسی طرح

علاؤالدین اور پدمنی

خود علاؤالدین کا راجہ چتوڑ گڈھ کی رانی پدمنی کے حسن و جمال کا شہرہ سنکر اس پر عاشق ہونا اور پدمنی کا آگ میں جلکر جان دینا بھی کہیں ضیاء برنی نے تحریر نہیں کیا۔ حالانکہ وہ اک متعصب مزاج تھا اور اس نے تمام وہ باتیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر درج کی ہیں جن سے علاؤالدین پر کوئی الزام عاید ہو سکتا ہے۔ لیکن اس نے یہ واقعہ درج نہیں کیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ رہا خضر خاں اور دیول دیوی کا افسانۂ عشق سو اس کو امیر خسرو نے ضرور ایک مثنوی کی صورت میں درج کیا ہے۔ لیکن اس کی صورت یہ تھی کہ خضر خاں نے امیر صاحب کو طلب کیا اور چند مسودات دیکر کہا کہ انمیں میرے اور دیول دیوی کے واقعات عشق و محبت درج ہیں ان کو نظم کر دیجئے چنانچہ آپ نے تعمیل ارشاد کردی[1]

دکن کی فتوحات

جب علاؤالدین اصلاحات سے فارغ ہوا تو اس نے توسیع سلطنت کی طرف پھر توجہ کی۔ چونکہ رنتھبور اور چتوڑ کو وہ اس سے قبل فتح کر چکا تھا اس لئے پھر اس نے دکن کو اپنی تاخت کا جولانگاہ بنانا پسند کیا

ملک کافور دیوگیر میں

چنانچہ اس نے ملک کافور ہزار دیناری کو (جو ایک خوبصورت خواجہ سرا اور بادشاہ کا محبوب غلام تھا) ۷۰۶ھ میں دیوگڈھ کی جانب روانہ کیا، جہاں کے راجہ نے خراج دینا بند کر دیا تھا اس مہم میں ملک کافور کامیاب ہوا اور علاوہ بہت سے مال غنیمت کے وہاں کے راجہ رام دیو کو معہ اس کے بیٹوں کے دہلی لے آیا۔ بادشاہ نے راجہ کی بہت عزت کی اور ایک لاکھ تنکہ دیکر پھر حکومت دیوگیر اس کے سپرد کردی

ملک کافور ورنگل میں

دوسرے سال ملک کافور تلنگانہ کی طرف روانہ کیا گیا۔ (اس سے قبل ۷۰۳ھ میں بادشاہ نے تلنگانہ پر حملہ کیا تھا لیکن ناکامیاب رہا تھا) اس جنگ میں ورنگل مفتوح ہوا اور راجہ نے خراج دینا منظور کیا۔ اس مہم میں ایک سو ہاتھی سات ہزار گھوڑے اور بہت سے جواہرات ہاتھ آئے

۷۱۰ھ میں ملک کافور ساحل ملابار گیا اور وہاں کے قدیم دارالحکومت، دوارسمندر کو فتح کر کے میسور تک بڑھ گیا اور معبر کے مشہور مندر کو مسمار کیا۔ اس تاخت میں ۶۱۲ ہاتھی، بیس ہزار گھوڑے جواہرات کے بہت سے صندوق، ۹۶ ہزار من سونا (جو موجودہ حساب سے ۲۹۰۰ ٹن کے برابر ہوا) ہاتھ آیا۔ جس وقت یہ دولت دہلی میں بادشاہ کے سامنے پیش کی گئی تو اس نے منوں کے حساب سے سونا لوگوں کو تقسیم کیا

ملک کافور نے دکن کے تمام شمالی حصہ کو سلطنت دہلی کا باجگذار بنا دیا۔ اور یہ زمانہ علاؤالدین کے انتہائی عروج کا سمجھنا چاہئے البتہ آخر وقت میں ملک کافور کے اقتدار کی وجہ سے امراء میں برہمی پھیل گئی تھی اور نظام حکومت میں تزلزل واقع ہو گیا تھا۔ علاؤالدین اس کو محسوس کرتا تھا لیکن قوار مضمحل ہو جانے کی وجہ سے وہ بیدست وپا ہو رہا تھا۔

---

[1] عشقیہ یا عشیقہ (امیر خسرو) ایلیٹ ج ۳ ص ۵۴۴ تا ۵۵۱۔

علاؤالدین کا انتقال

حسب روایت فرشتہ سلطان علاؤالدین نے ۶ شوال ۷۱۶ھ (جنوری ۱۳۱۵ء یا ۱۳۱۶ء) کو بعارضہ استسقا انتقال کیا۔ بدایونی، امیر خسرو و برنی نے سنہ وفات ۷۱۵ھ تحریر کیا ہے اور یہی درست معلوم ہوتا ہے۔ اس نے بیس سال اور چند ماہ تک سلطنت کی

شہاب الدین بن علاؤالدین خلجی

۷۱۵ھ جنوری ۱۳۱۵ء / ۱۳۱۶ء — ۷۱۶ھ ۱۳۱۶ء

سلطان قطب الدین مبارک شاہ بن علاؤالدین خلجی

۷۱۶ھ ۱۳۱۶ء — ۷۲۰ھ ۱۳۲۰ء

ناصر الدین خسرو شاہ

۷۲۰ھ ۱۳۲۰ء

خضر خاں کی ولی عہدی

سلطان علاؤالدین[1] نے وقت آخر میں خضر خاں اپنے بڑے بیٹے کو ولی عہد بنانا چاہا اور قلعہ گوالیار سے اُسے طلب کرنے کا حکم دیا لیکن چونکہ ملک کافور کے مصالح کا اقتضاء یہ نہ تھا کہ وہ تخت نشین ہو اس لئے وہ ٹالتا رہا حتےٰ کہ علاؤالدین کا انتقال ہوگیا اور اس کے دوسرے دن ایک نوشتۂ سلطانی اس مضمون کا پیش کر کے کہ خضر خاں کی ولی عہدی منسوخ

---

[1] ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ:۔ علاؤالدین کے پانچ بیٹے تھے خضر خاں[1]۔ شادی خاں[2]۔ ابوبکر خاں[3]۔ مبارک خاں[4]۔ شہاب الدین[5]۔ سلطان علاؤالدین مبارک خاں کی طرف زیادہ متوجہ نہ تھا۔ اپنے اور بیٹوں کو اس نے طبل و علم دیگر شاہانہ اعزاز سے سرفراز کر رکھا تھا لیکن اس کی طرف سے بے خبر تھا ایک دن علاؤالدین نے اس کو بلا کر کہا کہ میں تمھیں بھی وہی عزت دینا چاہتا ہوں جو تمھارے اور بھائیوں کو حاصل ہے اس نے جواب دیا کہ صرف خدا عزت دینے والا ہے اس جواب سے سلطان علاؤالدین بہت برہم ہو گیا

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۹۰ پر ملاحظہ ہو)

کی جاتی ہے، شہاب الدین کو جو سب سے چھوٹا لڑکا علاؤالدین کا تھا اور اس کی عمر اس وقت صرف ۶ سال کی تھی تخت نشین کرکے تمام انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لئے اور خاندان علاؤالدین کے تمام افراد کو تباہ کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ شادی خاں اور ابوبکر خاں کو اندھا کرا کے گوالیار بھیجدیا اور وہیں خضر خاں کی بھی آنکھیں نکلوالیں۔ اب صرف ایک مبارک خاں رہ گیا تھا تو اسکو بھی قید کرلیا اور چند سپاہی قتل کرنے کے لئے روانہ کئے لیکن جب یہ سپاہی مبارک خاں کے پاس پہونچے تو اس نے ملائے مروارید ان کے سامنے ڈالدیا اور اپنے باپ کے حقوق یاد دلائے اس سے یہ لوگ متاثر ہوکر واپس آگئے اور اپنے افسران مبشر و بشیر سے سارا حال بیان کیا چنانچہ انھوں نے اسی رات ملک کافور کو قتل کردیا اور اس طرح ۸ محرم ۷۱۶ھ[1] کو مبارک شاہ سلطان قطب الدین لقب اختیار کرکے تخت نشین ہوا

اول اول اس نے حد درجہ خوش خلقی کا ثبوت پیش کیا یعنی سترہ ہزار قیدی رہا کئے۔ جلاوطنوں کو وطن واپس آنے کی اجازت دی اور فوج کو ۶ ماہ کی تنخواہ یکمشت دیگئی امرا و ملوک کی جاگیریں اور منصب بڑھائے گئے۔ تمام سخت محصول منسوخ کردئے۔ بازار کے جو انتظامات علاؤالدین نے قایم کئے تھے یک قلم موقوف ہوگئے۔ علماء و صلحاء کے وظایف میں اضافہ کردیا انعام و اکرام کی چاروں طرف سے بارش ہونے لگی لیکن ظاہر ہے کہ جن اصول کے اوپر علاؤالدین نے سلطنت قایم کی تھی انکا دفعۃً اٹھا دینا کبھی مفید نہ ہوسکتا تھا چنانچہ نتیجہ وہی ہوا کہ رعایا کا طبقہ تباہ ہونے لگا۔ امراء وغیرہ کا اقتدار بڑھ گیا اور رفتہ رفتہ جو نقایص دولت کے بیجا استعمال سے رونما ہونے لگتے ہیں وہ سلطنت میں ظاہر ہونے لگے۔ جس طرح علاؤالدین نے ملک کافور کو ادنے درجہ سے وزارت کے عہدہ تک پہونچا دیا، اسی طرح قطب الدین مبارک شاہ بھی ایک نومسلم پردارزادہ پر فریفتہ ہوگیا۔ اس کا نام حسن تھا اور پہلوزاں گجرات میں تھا۔ مبارک شاہ نے اس کو خسرو کا خطاب دیکر سارے انتظام کا مختار واحد بنادیا

چونکہ حسن پہلے ہندو تھا اس لئے جب اس کا اقتدار قایم ہوگیا تو اس نے علانیہ ہندوؤں کو ترقی دینی شروع کی اور

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۸۹)

خضر خاں سب سے بڑا بیٹا تھا اور بادشاہ اس سے خوش بھی تھا لیکن اسکے ماموں سنجر نے علاؤالدین کی حیات ہی میں خضر خاں کو تخت نشین کرنے کی سازش کی جس کا پتہ ملک کافور کو لگ گیا اور اس نے بادشاہ کی اجازت سے سنجر کو قتل اور خضر خاں کو قلعۂ گوالیار میں قید کرادیا۔ وقت آخر میں سلطان علاؤالدین نے ملک کافور کو حکم دیا کہ خضر خاں کو بلاکر اس کی ولی عہدی کا اعلان کردیا جائے لیکن ملک کافور ٹالتا رہا یہاں تک کہ علاؤالدین مرگیا ملک کافور نے ابوبکر خاں اور شادی خاں کو اندھا کرا کے گوالیار بھیجدیا اور خضر خاں کی آنکھیں جو پہلے ہی سے گوالیار کے قلعہ میں محبوس تھا نکلوالیں اس کا مقصود یہ تھا کہ سب سے چھوٹے لڑکے شہاب الدین کو تخت نشین کرکے سلطنت اپنے ہاتھ میں لیلے

[1] صاحب طبقات اکبری، فرشتہ اور ضیاء برنی نے ۷۱۶ھ تحریر کیا ہے لیکن امیر خسرو مثنوی نہ سپہر میں ۷۱۶ھ لکھتے ہیں۔

مسلمانوں کی ذلت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی

آخر کار خسرو خاں نے سنہ ۷۲۰ھ میں مبارک شاہ اپنے محسن کو قتل کر دیا اور خود تخت نشین ہو گیا۔ اس وقت تمام مسلمان امرا و ملوک سخت پریشان تھے۔ خسرو خاں علاؤالدین کے تمام افراد کو تہ تیغ کر کے خاتونانِ حرم کی ہر ممکن توہین کر رہا تھا (یہاں تک کہ اس نے مرحوم بادشاہ کی ملکہ سے بجبر شادی بھی کر لی) علانیہ مذہب اسلام کی توہین شروع کر دی تھی۔ تمام بڑے بڑے عہدے ہندوؤں کو دئے جا رہے تھے اور جو چند مسلمان عامل و صوبہ دار رہ گئے تھے ان کو بھی خسرو خاں قتل کر دینا چاہتا تھا

اس وقت غازی ملک دیبال پور کا حاکم تھا اور ان حالات کو سُن سُن کر مضطرب ہو رہا تھا۔ بارہا اس نے ارادہ کیا کہ خسرو خاں کا مقابلہ کرے لیکن چونکہ اس کا بیٹا ملک فخرالدین جونا خاں۔ خسرو خاں کے قبضہ میں تھا اس لئے خاموش رہ جاتا تھا۔ آخر کار جب جونا خاں خفیہ طور سے اپنی جان بچا کر دہلی سے بھاگ نکلا اور اپنے باپ کے پاس پہونچ گیا تو غازی ملک نے خسرو خاں کے خلاف فوجکشی کی اور سنہ ۷۲۰ھ[1] (۱۳۲۰ع) میں خسرو خاں قتل کیا گیا

خسرو خاں کا قتل

جب غازی ملک اس جنگ سے فارغ ہوا اور خسرو خاں قتل ہوا تو اس نے تمام امراء کو بلا کر کہا کہ خدا کے فضل و کرم سے میں نے اپنے ولی نعمت کا انتقام لے لیا اب تم لوگ جس کو مناسب سمجھو تخت نشین کر دو

غازی ملک کی تخت نشینی

چونکہ خاندان خلجی میں اب کوئی شخص باقی نہ رہا تھا اس لئے سب نے بالاتفاق غازی ملک کا ہاتھ پکڑ کر تخت سلطنت پر بٹھا دیا اور غیاث الدین تغلق کا خطاب دیا[2]

سلطان قطب الدین نے بارہ سال اور چار ماہ تک حکومت کی اور خسرو خاں کچھ دن کم پانچ ماہ تک حکمراں رہا

---

[1] فرشتہ نے سنہ ۷۲۱ھ تحریر کیا ہے۔ بدایونی۔ صاحب طبقات اور ضیاء برنی نے سنہ ۷۲۰ھ درج کیا ہے

[2] فرشتہ ۱۲۳-۱۳۰۔ تاریخ فیروز شاہی ۲۱۱-۲۲۹۔ بدایونی ۵۲-۵۰۔ برنی (الیٹ) ۳۔ طبقات اکبری ۸۶-۹۵۔
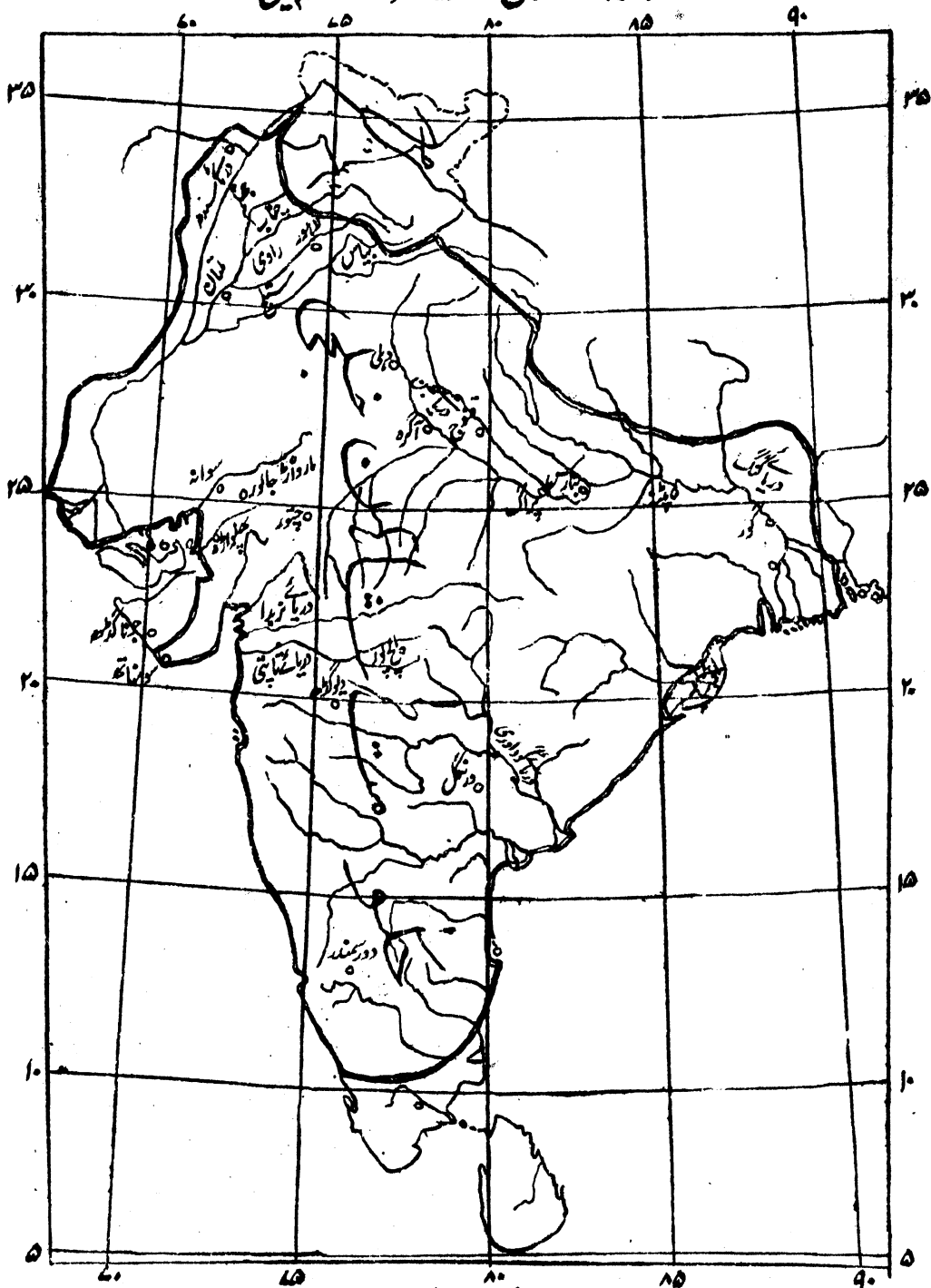
ہندوستان ۷۱۸ھ (۱۳۱۸ء) میں
۷۰
۷۵
۸۰
۸۵
۹۰
۳۵
۳۰
۲۵
۲۰
۱۵
۱۰
۵
ملتان
راوی
لاہور
دہلی
آگرہ
سوانہ
مارواڑ جالورہ
چتور
دریائے نربدا
دریائے تاپتی
دیوگڑھ
ورنگل
دریائے گوداوری
دوارسمند
سومناتھ
دریائے گنگ
خاندان خلجی کا رقبۂ حکومت
انگریزی میل
۲۰۰
۴۰۰

باب دہم

خاندان تغلق

(غیاث الدین تغلق ۲۰ء۷۲۰ھ تا ۱۳۲۰ء - ۷۲۵ھ تا ۱۳۲۵ء)

غیاث الدین خاندان "تغلق"[۱] کا پہلا بادشاہ تھا۔ اور اس میں کلام نہیں کہ خسرو خاں کے بعد اس کا بادشاہ ہو جانا لوگوں کے لئے حد درجہ باعث سکون و مسرت ثابت ہوا۔ اس نے حسن انتظام و تلافی مافات میں کوئی دقیقہ کوشش کا اُٹھا نہیں رکھا۔ بہ حیثیت ایک آزمودہ کار افسر ہونے کے جو شہرت اس نے صوبۂ پنجاب (دیبال پور) میں حاصل کی تھی،

۱؎ لفظ تغلق کے متعلق اکثر مورخین نے سکوت اختیار کیا ہے۔ فرشتہ کو عہد جہانگیری میں لاہور کے بعض محققین کے ذریعہ سے یہ معلوم ہوا تھا کہ غیاث الدین کا باپ تغلق، غلامانِ غیاث الدین بلبن میں سے تھا اور اس نے ایک جاٹنی سے شادی کر لی تھی، جس سے غیاث الدین پیدا ہوا۔ صاحب خلاصۃ التواریخ نے بھی غیاث الدین کے نسب کے متعلق یہی تحریر کیا ہے۔ اب رہا لفظ تغلق، سو اس کی نسبت ملحقات کے حوالہ سے فرشتہ لکھتا ہے کہ "تغلق"، اصل میں "قتلغ"، تھا۔ قتلغ، ترکی لفظ ہے جو ہندوستان میں بگڑ کر "تغلق"، ہو گیا

مارکوپولو مشہور سیاح ظاہر کرتا ہے کہ "قرونیہ" ترکی زبان میں مخلوط النسل کو کہتے ہیں چونکہ تاتاریوں کی ایک جماعت نے ہندوستانی عورتوں سے شادی کر کے یہیں قیام کر لیا تھا اس لئے ان کی نسل کو "قرونیہ" (مخلوط النسل) کہنے لگے۔ شمس سراج عفیف نے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں لکھا ہے کہ "میں نے اپنی تصنیف "مناقب سلطان تغلق" میں غیاث الدین کے سلسلۂ نسب سے پوری بحث کی ہے لیکن افسوس ہے کہ یہ تصنیف آج بالکل معدوم ہے۔ وصاف نے لکھا ہے کہ:۔ قرونیہ اس جماعت کا نام بھی تھا جو خراسان کے چغتائی فوج کے توپ خانہ سے متعلق تھی، ممکن ہے غیاث الدین کا سلسلۂ نسب اسی جماعت سے ملتا ہو اور اسی بنا پر اسے قرونیہ ترک کہا گیا ہو۔ (بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۹۴ پر ملاحظہ کیجئے)

اور قبل بادشاہ ہونے کے جس پامردی وقابلیت کے ساتھ وہ تاتاری فتنہ کو ہندوستان سے دور کرنے میں کامیاب ہوا تھا[1]۔ وہ عنان سلطنت ہاتھ میں لینے کے بعد بھی باقی رہی اور اس نے اپنی دیانت وامانت، محنت وجفاکشی، حزم واحتیاط عقل وفراست سے کام لے کر اس تمام تزلزل کو جو آخری سلاطین خلجی اور خسرو خاں کے عہد حکومت میں پیدا ہو گیا، دور کر کے مملکت ہند کو اپنی اصلی حالت پر لے آیا

اس نے عہد علائی کے تمام معزول وتباہ شدہ امرا کو طلب کر کے، اُن کے مواجب وانعامات بحال کئے، خاندان علائی کے بقیۃ السیف افراد کی حد درجہ عزت کی اور خواتین خلجیہ کا احترام کرنے میں اس نے اپنی ساری کوشش صرف کر دی۔ الغرض ملک کا نظام حکومت جو بہت ابتر ہو گیا تھا اس کو ایک ہفتہ کے اندر اصلی حالت پر لے آیا۔ مستحقین کے حقوق ادا کئے اور ظالموں کی دار وگیر شروع کی

وہ حد درجہ معتدل مزاج تھا اور افراط وتفریط سے ہٹکر ایک مناسب رائے تمام امور میں قایم کیا کرتا تھا۔ کام کرنے والے لوگوں کی اس نے قدر کی اور ناکارہ لوگوں کو اپنے دربار سے خارج کر دیا

اس نے خراج کے اُصول از سر نو منضبط کئے اور پیداوار کے دسویں یا گیارھویں حصہ سے زیادہ محصول لینے کی سخت ممانعت کر دی۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ ہر سال رقبۂ زراعت بڑھتا جائے اور مقدم وچودھری کاشتکاران پر جبر نہ کر سکیں جن امراء وملوک کے پاس جاگیریں تھیں ان کی انتظامی حالت کی بھی نگرانی کرتا اور جبر وتعدی پر سخت باز پرس کرتا۔ خسرو خاں نے جن لوگوں کو خزانۂ شاہی سے بیجا انعامات دئے تھے وہ سب وصول کر کے خزانہ میں داخل کئے

(انعام واکرام)

جب کوئی فتح یا کامیابی کی خبر اس کو ملتی، بیٹا پیدا ہوتا، یا شاہزادوں کی شادی وغیرہ ہوتی تو تمام اکابر وعلماء کو طلب کرتا اور حسب حیثیت انعامات سے سرفراز کرتا جو مشایخ وصوفیہ خلوت نشین ہوتے اُن کے پاس تحایف ونذرانے دیں بھیجتا۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۹۳)

ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ مجھ سے امام شیخ رکن الدین نے ملتان میں بیان کیا تھا کہ سلطان تغلق اتراک قرونیہ میں سے تھا جو سندھ اور تاتار کے درمیانی سلسلۂ کوہستانی میں رہتے ہیں، سلطان تغلق پہلے بہت معمولی شخص تھا اور ایک سوداگر کے ساتھ بہ حیثیت ایک سائیس ہونے کے سندھ میں آیا تھا اسوقت علاؤالدین خلجی بادشاہ تھا اور اس کا بھائی سندھ کا گورنر تھا۔ تغلق سپاہیوں میں ملازم ہو گیا اور رفتہ رفتہ اپنی قابلیت سے سوار اور میر آخور ہو گیا۔ اسکے بعد جب اس کا اقتدار اور اثر زیادہ ہوا تو امراء کبار میں داخل ہو گیا اور آخر میں ملک غازی کے خطاب سے سرفراز ہوا۔ (ابن بطوطہ) الیٹ ۳-۶۰۶

[1] ابن بطوطہ سے شیخ امام رکن الدین ملتانی نے بیان کیا تھا کہ۔ انھوں نے خود اس مسجد کو دیکھا تھا جو غازی ملک (غیاث الدین) نے ملتان میں طیار کرائی تھی۔ اس کے ایک کتبہ میں درج تھا کہ "میں نے ۲۹ بار تاتاریوں کا مقابلہ کر کے ان کو شکست دی۔ اسی بنا پر مجھے ملک غازی" کہا جاتا ہے"۔ ابن بطوطہ (الیٹ) ۳-۶۰۶

چاہتا تھا کہ جو مسرت مجھے حاصل ہو، اس میں ساری رعایا شریک ہو، چنانچہ وہ سب کو کچھ نہ کچھ دیتا اور اکثر ایسی داد و دہش کے بہانے پیدا کرتا رہتا۔ اس کا مقصودِ سلطنت یہ تھا کہ سارا ملک فراغت و اطمینان سے زندگی بسر کرے رعایا خوش حال ہو جائے لوگ گدائی چھوڑ دیں اور حلال کی کمائی حاصل کریں۔ اسی خیال کے زیر اثر اس نے مزدوری و اجرت میں ۲۵ فی صد اضافہ کر دیا۔ کاشتکاروں اور ہندوؤں کی حالت میں جو تمدنی انحطاط عارضی اسباب کی وجہ سے ہو گیا تھا دور ہو گیا اور پھر وہ آزادی کے ساتھ اپنے اپنے مشاغل میں مصروف ہو گئے

جس سپاہ کو خسرو خاں نے مواجب سے زیادہ روپیہ تقسیم کر دیا تھا وہ آہستہ آہستہ اس نے وصول کیا اور فوج کے باب میں جو قواعد علاؤ الدین خلجی نے مقرر کئے تھے (حلیہ، امتحان، داغ اور تعیین قیمت وغیرہ) وہ سب بدستور جاری رکھے البتہ اس کی احتیاط ضرور کی کہ کوئی افسر یا امیر سپاہیوں کو ذلیل نہ سمجھے اور اُن کے کوڑے نہ مارے

مطالبات کے وصول کرنے میں بھی وہ بہت نرمی سے کام لیتا لاکھوں کے مطالبہ میں اگر ہزاروں بھی وصول ہو جاتے تو غنیمت سمجھتا اور حد درجہ نرمی و آشتی سے کام لیکر معاملات کو طے کرتا۔ وہ نہ معمولی باتوں پر کسی کو حد سے زیادہ انعام دیتا اور نہ ضرورت سے زیادہ سختی عمل میں لاتا۔ میانہ روی اس کی خصوصیت تھی اور عدل و انصاف اس کی حکومت کا تنہا نصب العین

انھیں باتوں کے ساتھ اس نے مغلوں کی طرف سے بھی ہندوستان کو مطمئن کر دیا اور ایسی سخت ناکہ بندی کر دی کہ اسکے عہد میں ان کو حدودِ ہند کی طرف آنے کی جرأت ہی نہ ہوئی

اس نے نہریں کثرت سے کھدوائیں، باغات تعمیر کرائے ویرانوں کو آباد کیا، بنجر زمین کو تردد سے قابل کاشت کیا اور متعدد عمارات قایم کرا دیں۔ حصارِ تغلق آباد[1] اس بادشاہ کی یادگار ہے

غیاث الدین صوم و صلوٰۃ کا بھی پابند تھا وہ ہمیشہ باجماعت نماز ادا کرتا اور تراویح کے ساتھ روزہ رکھتا۔ وہ اکثر باوضو رہتا اور شراب نہ خود پیتا اور نہ کسی کو پینے دیتا۔ کبر و غرور اس میں نام کو نہ تھا۔ مکر و فریب سے وہ بالکل ناآشنا تھا اور سادگی اس کی فطری خصوصیت تھی

فتوحات کے لحاظ سے بھی اس کا عہد کامیاب ثابت ہوا اور بنگال و دکن کی طرف عساکرِ سلطانی نے کافی کامیابیاں حاصل کیں۔ ۷۲۱ھ میں جب تلنگانہ اور ورنگل کے راجہ نے خراج دینے میں تامل کیا، تو غیاث الدین تغلق نے اپنے بیٹے جونا خاں کو (جسے اب الغ خاں کا خطاب عطا ہو گیا تھا) اس کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا اور ہر چند ایک بار بعض مفسدین

فتوحات - غیاث الدین کی مذہبی زندگی - نہریں اور عمارات - [illegible]

[1] غیاث الدین نے سکونتِ دہلی ترک کر کے دس بارہ میل کے فاصلہ پر تغلق آباد۔ آباد کیا اور یہیں قیام رکھا۔ اب بھی یہاں کی شکستہ عمارتیں سیاحوں کے لئے جاذبِ نظر ہیں ۱۲

کے اغواسے لشکر میں برہمی پیدا ہوگئی، لیکن دوسرے بار کامیابی حاصل ہوئی، ورنگل فتح ہوا اور اس کا نام سلطانپور رکھا گیا

بنگال کی اطاعت

اسی طرح جب سنہ ۷۲۴ھ میں لکھنوتی (بنگال) اور سنارگاؤں (ڈھاکہ) کی طرف سے جبر وظلم کی شکایت موصول ہوئی تو غیاث الدین نے اپنے بیٹے کو ورنگل سے طلب کرکے دارالسلطنت کا انتظام سپرد کیا، اور خود لشکر عظیم لے کر لکھنوتی کی طرف کوچ کیا۔ غیاث الدین کی سطوت وجبروت سے اس وقت سارا ہندوستان آگاہ تھا، اس لئے ناصر الدین[1] فرمانروائے لکھنوتی تحایف وغیرہ لے کر خود حاضر ہوا اور بہادر شاہ کو جو سنارگاؤں کا فرمانروا تھا اور بہت متکبر ومغرور ہوگیا تھا، گرفتار کرکے حضور میں پیش کیا۔ سلطان غیاث الدین نے ازراہ لطف وعنایت ناصر الدین کو "چتر و دورباش" عنایت کرکے نہ صرف لکھنوتی کا فرمانروا تسلیم کیا بلکہ سنارگاؤں کو بھی اس کے سپرد کردیا اور قلعہ ترہت فتح کرتا ہوا، دارالحکومت کی طرف واپس آیا اور ایک اتفاقی حادثہ سے مرگیا

وفات غیاث الدین تغلق کا مسئلہ اور اس کی تحقیق

وفات غیاث الدین کے متعلق فرشتہ اور تمام مورخین نے تفصیلی حالات لکھے ہیں اور بعض نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جونا خاں (الغ خاں) اس کے بیٹے نے ہلاک کیا، لیکن حالات سے اس کی تکذیب ہوتی ہے۔ واقعات یہ ہیں کہ جب غیاث الدین بنگال کی طرف سے کامیاب واپس ہوا تو الغ خاں نے افغان پور کے قریب جلدی جلدی ایک قصر طیار کرایا تاکہ غیاث الدین وہاں شب کو قیام کرکے، صبح شاہانہ جلوس کے ساتھ دارالسلطنت میں داخل ہو۔ چونکہ بادشاہ نے وہاں قیام کرنا پسند نہیں کیا، اسلئے کھانے سے فارغ ہوکر الغ خاں معہ تمام امراء کے جلدی سے باہر آگیا کہ سفر کی طیاری کی جائے اور اُسی وقت اتفاق سے قصر کی چھت گر پڑی اور سلطان معہ پانچ آدمیوں کے جن میں اس کا چھوٹا بیٹا محمود بھی تھا مرگیا۔ بعض مورخین نے خیال کیا ہے کہ یہ عمارت قصداً اسی غرض سے بنائی گئی تھی اور ابن بطوطہ[2] بھی یہی بیان کرتا ہے لیکن ابن بطوطہ اسوقت ہندوستان نہ آیا تھا اس لئے ظاہر ہے کہ یہ واقعات اس نے بعد کو سنے ہوں گے

لیکن ضیاء برنی نے، جو اس عہد کا مورخ ہے، اس کا کہیں ذکر نہیں کیا، اور اگر اس کی نسبت یہ خیال کیا جائے کہ اس نے رعایت کی تو بھی بقول فرشتہ "یہ کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ الغ خاں نے کس کرامت سے کام لیکر قصر سے باہر

---

[1] ناصر الدین، غیاث الدین بلبن کا بیٹا تھا۔ عہد خلجی میں بھی اس کے حال سے کوئی تعرض نہ کیا گیا، کیونکہ اس کے انتظام کی طرف سے کوئی شکایت نہ تھی اور لکھنوتی کے ایک گوشہ میں پڑا ہوا، چالیس سال سے حکومت کر رہا تھا۔

[2] ابن بطوطہ کا نام شیخ ابو عبداللہ محمد ابن عبداللہ ابن محمد ابن ابراہیم الطنجی ہے۔ افریقہ کے ایک مقام طنجہ کا رہنے والا تھا۔ اس نے ایشیاء کے بہت سے ملکوں میں سیاحت کی اور ہندوستان بھی آیا۔ یہ سنہ ۷۳۴ھ میں بعہد سلطان محمد تغلق دریائے سندھ تک پہونچا اور وہاں سے پایۂ تخت دہلی کی طرف سفر اختیار کیا۔ جسوقت یہ دہلی پہونچا تو سلطان موجود نہ تھا اس کی ماں نے نہایت عزت کے ساتھ اس کو ٹھہرایا اور دو ہزار دینار نقد دیکر ایک مکان بھی قیام کے لئے مرحمت کیا۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۹۷ پر ملاحظہ ہو)

آتے ہی چھت کو گرا دیا" اگر چھت کی ساخت قصداً اس قسم کی رکھی گئی تھی کہ وہ ایک وقت مقررہ پر گر جائے تو ظاہر ہے کہ الغ خاں کا پروگرام یہ نہ تھا کہ بادشاہ اسی وقت روانہ ہو جائے۔ بلکہ رات کو قیام کرے اور صبح کو روانہ ہو۔ پھر اس کے لئے بہتر وقت رات کا ہو سکتا تھا۔ جب بادشاہ اپنی خواب گاہ میں تنہا سوتا ہوتا نہ کہ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد۔ فرشتہ اور تمام صائب الرائے مورخین نے اس سے انکار کیا ہے اور اس کی وجہ سوائے اس کے اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ عمارت صرف تین دن کے اندر طیار ہوئی تھی، چھت کمزور تھی، بادشاہ کے ساتھ بڑا لشکر موجود تھا۔ گھوڑوں اور ہاتھیوں کے دوڑنے سے جو دھمک پہونچی اس نے چھت کو گرا دیا اور اگر یہ سبب نہ تھا تو پھر حاجی محمد قندھاری کا بیان صحیح ہوگا کہ گرج کی آواز سے چھت گر پڑی، جس کو ضیاء برنی نے بھی اختیار کیا ہے۔ عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں لکھا ہے کہ بعض لوگ غیاث الدین کی وفات کا یہ سبب قرار دیتے ہیں کہ وہ سلطان المشائخ (حضرت نظام الدین اولیاء) سے برہم تھا، چنانچہ اس نے لکھنوتی سے واپس آتے ہوئے یہ پیغام کہلا بھیجا کہ دہلی سے کہیں چلے جائیے۔ اس کو سن کر حضرت سلطان المشائخ نے فرمایا کہ "ہنوز دہلی دور است" اور اسی وقت سے یہ ضرب المثل عام ہو گئی ہے۔ لیکن ابن بطوطہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلطان المشائخ کا انتقال اس سے قبل ہو چکا تھا

عہدِ غیاث الدین تغلق کی خصوصیت

بہر حال غیاث الدین کے مرنے کے جو اسباب بھی ہوں، اس میں کلام نہیں کہ وہ بہترین فرمانروا تھا اور اگر وہ چند دن اور حکومت کرتا تو جو اسلوب حکمرانی اس نے اختیار کیا تھا وہ زیادہ مستحکم ہو جاتا

یہ صحیح ہے کہ اس کے جانشین محمد تغلق کو ابتدا میں کثرت سے کامیابیاں حاصل ہوئیں اور سلطنت بہت زیادہ وسیع ہو گئی۔ لیکن چونکہ اس کے عہد میں بغاوتیں شروع ہو کر طوائف الملوکی کی بھی بنیاد پڑ گئی تھی، اس لئے سلاطین دہلی میں یہ امتیاز صرف غیاث الدین ہی کو حاصل ہے کہ بحیثیت فرمانروائے ہندوستان ہونے کے سب سے زیادہ وسیع مملکت

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۹۶)

جب سلطان واپس آیا تو اس نے اور زیادہ عزت کی۔ پانچ ہزار دینار سالانہ آمدنی کے دیہات اس کی جاگیر میں دئے اور علاوہ اس کے دس کنیزیں ....۵ ہزار دینار نقد اور ایک آراستہ گھوڑا خاص اصطبل شاہی کا عنایت کیا۔ سلطان محمد نے اس کی بارہ ہزار سالانہ تنخواہ مقرر کر کے دہلی کا قاضی کر دیا اور ایک سال کی تنخواہ پیشگی دیدی۔ ایک بار یہ ۵۴ ہزار دینار کا مقروض ہو گیا اور سلطان محمد تغلق نے یہ بھی ادا کیا۔ الغرض سلطان محمد تغلق نے حد درجہ عزت و احترام کے ساتھ اس کو رکھا اور شاہ چین کے پاس ایک سفارت بھی اس کی سرکردگی میں روانہ کی۔ جب ابن بطوطہ اپنے وطن واپس گیا تو سفرنامہ مرتب کیا۔ اور اس میں اکثر سلاطین دہلی کے حالات درج کئے۔ سلطان محمد تغلق کے حالات اس نے نہایت تفصیل سے درج کئے ہیں اور اس وقت کی جو کیفیت دہلی اور دربار کی تھی مفصل تحریر کی ہے جس سے اصل کتاب میں کہیں کہیں مدد لی گئی ہے۔

اس کی زیر نگیں تھی اور آخر تک وہ اس پر قابض بھی رہا

غیاث الدین کا زمانۂ حکومت صرف چار سال اور چند ماہ رہا۔ ۷۲۵ھ میں اس نے انتقال کیا اور الغ خاں کو اپنا جانشین چھوڑ گیا

امیر خسرو کی آخری تصنیف تغلق نامہ، غیاث الدین ہی کے حکم سے ہوئی تھی جو اب کمیاب ہے۔ امیر خسرو نے بھی اسی سال انتقال کیا۔

محمد بن تغلق شاہ

(۷۲۵ھ / ۱۳۲۵ء — ۷۵۲ھ / ۱۳۵۱ء)

محمد تغلق کی تخت نشینی

غیاث الدین تغلق کی وفات پر شاہزادہ جونا جسے الغ خاں بھی کہتے ہیں "سلطان المجاہد محمد بن تغلق" کا لقب اختیار کر کے ۷۲۵ھ میں تخت نشین ہوا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ قرونیہ خاندان کو دنیا میں غیر فانی بنا دینے کے لئے جو کوششیں اس بادشاہ نے کیں وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے نظیر نہیں رکھتیں

یہ عجیب بات ہے کہ ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں ہندوستان پر تین خاندانوں نے حکومت کی اور ان میں ایک نہ ایک ہستی ضرور ایسی پیدا ہوئی جو اپنی خصوصیات کی نہایت اہم نقوش صفحۂ تاریخ پر چھوڑ گئی

غلاموں میں بلبن جو نہ صرف اپنے عزم وارادہ بلکہ تمام شاہانہ خصایص کے لحاظ سے ایک ممتاز درجہ رکھتا ہے جس طرح خلجیوں میں علاؤالدین انتظام، آئین سازی اور سیاست دانی میں نظیر نہ رکھتا تھا، اسی طرح قرونیہ یا تغلق خاندان کے مرقع میں محمد تغلق کی تصویر نمایاں نظر آتی ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ علاؤالدین جاہل تھا (ہر چند اس نے بعد کو کچھ لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا) اس لئے اس کے عزایم و تدابیر میں وہ شائستگی نہ تھی، جو ایک قابل حکمراں کی طرف سے ظاہر ہوتی ہے اور برخلاف اس کے محمد تغلق کے عزایم و خیالات ایک ایسے شخص کے عزایم تھے جن سے ذہانت و فراست کا پتہ چلتا ہے

محمد تغلق کی خصوصیات

محمد تغلق نہایت شیریں بیان اور فصیح مقرر تھا عربی و فارسی میں فی البدیہ ایسے مراسلات تحریر کرا دیتا تھا کہ بڑے بڑے ماہرین فن متحیر ہو جاتے تھے۔ ذہانت و فراست کا یہ عالم تھا کہ ایک شخص کو دیکھتے ہی اس کے تمام محاسن و معایب سے اس طرح آگاہ ہو جاتا جیسے کہ برسوں کے تجربہ کا نتیجہ ہو۔ علم تاریخ میں وہ مہارت حاصل تھی کہ مشکل سے اسکے سامنے کسی کو گفتگو کی جرأت ہوتی، حافظہ اس بلا کا تھا کہ جو ایک بار دیکھ یا سُن لیا پھر وہ نقش کالحجر ہو جاتا۔ حکمت، نجوم، ریاضی و منطق میں تبحر کی یہ کیفیت تھی کہ دقیق ترین مسایل علمیہ بات کی بات میں حل کر دیتا فن شعر میں بھی اس کی جامعیت مشہور ہے

نہایت ضروری اعلان

گزشتہ جنوری سے اڈیٹر کے قلم کی دو کتابیں مسلسل نگار میں شایع ہو رہی ہیں۔ ایک "اسلامی ہند کی تاریخ" جو تاریخی حیثیت سے بے مثل چیز ہے اور دوسری "نغمۂ کارواں" جو اپنی ادبیت کے لحاظ سے خاص مرتبہ رکھتی ہے۔
جو حضرات شروع سال (یعنی جنوری ۳۸ء) سے رسالہ کے خریدار نہیں ہیں، ان کے لئے اب بھی وقت ہے کہ وہ جنوری سے اسوقت تک کے تمام مسلسل پرچے طلب کر کے شروع سال سے اپنی خریداری محسوب کریں، ورنہ پھر بعد کو یہ دونوں کتابیں کسی قیمت پر بھی انھیں نہیں مل سکتیں۔
منیجر نگار لکھنؤ

شمار (۲)	فہرست مضامین اگست ۱۹۳۸ء	جلد (۳۴)

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد- ۳۴	اگست ۱۹۳۸ء	شمار- ۲

ملاحظات

کانگرسی وزارتوں کی ناکامیاں

اس میں شک نہیں کہ زمانہ کے ساتھ ساتھ حکومت کا معیار بھی بدلتا رہتا ہے، لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ملک کے احساس کو کسی حکومت نے نظرانداز کر دیا ہو اور وہ زیادہ عرصہ تک قایم رہ سکی ہو۔ چنگیز و ہلاکو، نیرو اور کالیگولا کی حکومتوں کا ذکر نہیں، بنوامیہ و بنوعباس کو دیکھئے کہ علویین کی جماعت ان کے مقابلہ میں کیا تھی لیکن پھر بھی اس نے شیرازۂ حکومت منتشر کر ہی دیا۔ نہ اقلیت و اکثریت کی جنگ کوئی نئی چیز ہے اور نہ بڑی بڑی سلطنتوں کا ذرا سی غلطی سے تباہ ہو جانا کوئی نیا واقعہ لیکن اسباب و نتایج پر غور کرنے والوں کے لئے یہ بات ضرور حیرت میں ڈالدینے والی ہے کہ ایک حکمراں جماعت اعتماد پیدا کرنے سے قبل ہی اپنا اعتماد کھو بیٹھے۔ پھر اور صوبوں کے متعلق تو میں نہیں کہہ سکتا لیکن یوپی کی حکومت کی نسبت ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس نے یہی حیرت میں ڈالدینے والی حرکت کی ہے اور بجائے سنبھلنے کے اسکی حالت روز بروز بگڑتی ہی جا رہی ہے

اول اول جب کانگرسی وزراء نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لی تو اہلِ صوبہ کی بڑھی ہوئی توقعات کا یہ عالم تھا کہ ہر متنفس

بلاتفریقِ نسل و قوم یہی یقین رکھتا تھا کہ حکومت اب اُسی کی ہے اور اس کے عجز و درماندگی کا زمانہ گزر گیا ہے، لیکن جوں جوں دن گزرتے گئے یہ یقین شک میں تبدیل ہوتا رہا یہاں تک کہ رفتہ رفتہ سال ختم ہونے سے پہلے ہی یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ جس چیز کو ہم نے سونا سمجھا تھا وہ صرف ملمع تھا اور جس کیفیت کو ہم نے خلوص و صداقت سے تعبیر کیا تھا اس کا تعلق دل سے نہیں بلکہ صرف زبان سے تھا

کانگرس کی بین الاقوامی اہمیت کا راز صرف یہ تھا کہ وہ ہندوستان کی جماعتوں کی نمایندہ تھی۔ اس کی یہی مرکزیت تھی جس کے توڑنے کی ہمیشہ کوشش کی گئی اور اس کا یہی متحدہ محاذ تھا جس نے اتنی کامیابی حاصل کی پھر اب کہ کانگرس رفتہ رفتہ اپنی اس خصوصیت کو کھوتی جارہی ہے کیا وہ صرف اکثریت کی نمایندہ ہوکر اپنی اس اہمیت کو باقی رکھ سکتی ہے یہ وہ سوال ہے جو اکثریت نہیں بلکہ اقلیت کے زاویۂ نگاہ سے غور کرنے کے قابل ہے، اگر سی وزارت پر نہیں بلکہ اس سے نیچے اُتر کر توجہ کئے جانے کا مستحق ہے

یو۔پی کی حکومت محکمۂ جات میں بداخلاقی و بددیانتی کے انسداد کے لئے ایک افسر کا تعین تو کرتی ہے، لیکن خود اپنے تئیں بھول جاتی ہے، حالانکہ سب سے پہلے اسے اپنی ہی نیت کا احتساب کرنا چاہئے اور اقلیت کے دل سے یہ اندیشہ دور کردینا چاہئے کہ "انسدادِ بددیانتی" کے بہانہ سے جس گمشدہ انصاف و دیانت کی جستجو کی جارہی ہے اس کا مقصود کہیں اقلیت ہی کی جانِ ناتواں کا خون کرنا تو نہیں ہے

میں اس سے قبل کی اشاعتوں میں بھی ظاہر کرچکا ہوں اور اب پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ نہ دفتری کارروائی کوئی چیز ہے نہ محکمۂ جات کے اعداد و شمار بلکہ اصل چیز حقیقی معنے میں اعتماد پیدا کرنا ہے اور یہ ممکن نہیں جب تک ہندو جماعت کے اکابر اپنی نیت میں خلوص و صداقت اور اخلاق میں بلندی پیدا نہ کریں

یہ بالکل صحیح ہے کہ اگر تمام ملازمتیں بجائے ہندوؤں کے مسلمانوں کو دیدی جائیں، تو بھی مسلمانوں کی اقتصادی دشواریاں دور نہیں ہوسکتیں اور نہ کوئی قوم محض نوکری کی بنا پر ترقی کرسکتی ہے، لیکن اس کے معنے یہ نہیں کہ جو چند افراد اس ذریعہ سے فایدہ اُٹھا سکتے ہیں ان کو بھی اس سے محروم کردیا جائے، بلکہ اس کا اقتضا، یہ ہونا چاہئے کہ تناسب آبادی کے سوال کو قطع نظر کرکے زیادہ سے زیادہ جو کچھ ان کی حالت سنبھالنے کے لئے کیا جاسکتا ہے، کیا جائے ۔۔ تناسب آبادی کے لحاظ سے حصہ کی تقسیم میری سمجھ میں کبھی نہیں آئی۔ حکومت کو زندگی کا ایک معیار مقرر کرکے صرف یہ دیکھنا چاہئے کہ ملک میں کونسی قوم اس معیار سے گری ہوئی ہے، اور پھر ہر تدبیر سے اُسے اس معیار تک لانے کی کوشش کرنا چاہئے لیکن حکومت کے اس معیار کی توقع ہم کانگرسی وزارت سے کیا کرسکتے ہیں، جبکہ بقالانہ تقسیم کے لحاظ سے بھی وہ ڈنڈی مارنے سے باز نہیں آتی

حال ہی میں سینٹری انسپکٹری کے درجہ کے لئے ۸ امیدواروں کی ضرورت تھی اور تناسب آبادی کے لحاظ سے

۱۲ جگہیں مسلمانوں کے لئے مخصوص تھیں، لیکن اخیر وقت میں وزیر متعلقہ نے امیدواروں کی فہرست میں بیس نام ہندوؤں کے اور اضافہ کردئے۔ ڈائرکٹر پبلک ہیلتھ نے جو اتفاق سے مسلمان ہیں، وزیر متعلقہ سے کہا کہ تیرہ نام مسلمانوں کے تو نکل نہیں سکتے اس لئے ان کو علٰحدہ رکھ کر اب آپ ہی ۲۷ ہندوؤں کا انتخاب کرکے باقی ۲۰ نام کاٹ دیجئے۔ یہ سنکر وزیر متلقہ نے جس برہمی کا اظہار کیا وہ ہرچند خلوت کی بات ہے، لیکن اتنا ظاہر کردینے میں کوئی مضایقہ نہیں کہ انکی تکلیف کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ ان کے نزدیک ڈائرکٹر کی گفتگو فرقہ وارانہ کیفیت رکھتی تھی اور یہی وہ چیز ہے جسے کانگرس کی اتحاد پسند، اور منصف مزاج وزارت کبھی برداشت نہیں کرسکتی۔ پھر اب کون ہے جو آنریبل وزیر صحتِ عامہ سے پوچھ سکے کہ کیا بیس ہندوؤں کے ناموں کا اضافہ کرنا فرقہ وارانہ جذبہ سے علٰحدہ کوئی چیز تھا اور کیا اتحاد پسندی و انصاف کا تقاضہ یہ نہ تھا کہ ان ناموں کے ساتھ چند مسلمانوں کا بھی اور اضافہ کردیا جاتا اور کیا مسلمانوں کی اقتصادی حالت کو دیکھتے ہوئے یہ مناسب نہ تھا کہ تناسب آبادی کے سوال کو قطع نظر کرکے مسلمان بجائے تیرہ کے چودہ لے لئے جاتے؟

اس سے مقصود کسی خاص واقعہ کی طرف ملک کو متوجہ کرنا نہیں بلکہ صرف یہ دکھانا مدنظر ہے کہ ارباب کانگرس کی یہ ذہنیت کیا ہوتی جارہی ہے اور اس ذہنیت کے ہوتے ہوئے ہندو مسلم اتحاد کی توقع کیونکر ممکن ہے

زبان اور رسم خط کے متعلق میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں اور اب پھر وہی بات زبان پر آتی ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان سب سے بڑی خلیج جس چیز نے حایل کردی ہے وہ ہندی اُردو کا جھگڑا ہے۔ حیرت ہے کہ پنڈت جواہر لال ایسا شخص اس مسئلہ کو درجۂ دوم کا مسئلہ قرار دیتا ہے اور اس کے خطرناک نتایج کی طرف سے آنکھ بند کئے ہوئے ہے۔

اس میں شک نہیں کہ کانگرس کا فیصلہ اس باب میں بہت مناسب ہے اور ملک میں ایک مشترک زبان پیدا کرنے کی صورت وہی ہوسکتی ہے جو اس نے بتائی ہے، لیکن کیا کانگرس کا فرض صرف اسی جگہ ختم ہوجاتا ہے کہ وہ ایک رزولیوشن پاس کردے یا کوئی تجویز پیش کرکے خاموش ہوجائے۔ میری رائے میں اس کو دیکھنا چاہئے کہ اس کی تجاویز پر عمل بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ شمالی ہند، ہندوستان کا وہ حصہ ہے جہاں نہ صرف ہندوستانی بلکہ نہایت فصیح و بلیغ اُردو بولی اور سمجھی جاتی ہے یہاں تک کہ تمام معزز ہندو گھرانوں میں عام طور پر وہی زبان استعمال کی جاتی ہے جس میں ہمارے عزیز دوست پنڈت انند نرائن ملا شاعری کرتے ہیں، لیکن اگر مولانا ابوالکلام (جو کانگرس پارلیمنٹری بورڈ کے ممبر ہیں اور جن کے فرایض میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ کانگرسی نقطۂ نظر سے وزارتوں کا احتساب کریں) تکلیف فرماکر ایک بار یہاں کی کونسل میں شریک ہوں اور اُن تقریروں کو سنیں جو ہندو ممبران اور ہندو وزراء کی زبان سے ادا ہوتی ہیں، تو مجھے یقین ہے کہ وہ بھی ضبط نہ کرسکیں گے اور بے اختیار فارسی یا عربی میں تقریر کرنے کھڑے ہوجائیں گے

یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ہم بیسویں صدی کے کسی جلسہ میں شریک ہیں، بلکہ چندر گپت اور اشوک کے دربار کا منظر سامنے آجاتا ہے اور مسلمان تو مسلمان ہندو پبلک بھی پچاس فی صدی ان تقریروں کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہتی ہے

پھر یہ بدعت کونسل ہال اور دفاتر وزارت ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا اثر عام ہوتا جارہا ہے چنانچہ ڈسٹرکٹ بورڈوں کی کارروائیاں بھی اب زیادہ تر اسی زبان، اسی رسم خط میں قلمبند کی جاتی ہیں، اور مسلمانوں کی دلچسپی کو ہر شعبہ سے کم کیا جارہا ہے۔ یہاں کی ڈسٹرکٹ کانگرس کمیٹی سے بعض مسلمان صرف اس لئے استعفا دینے پر مجبور ہوئے کہ دفتر کانگرس سے جو اطلاع اور جو اعلان شایع ہوتا ہے وہ ہندی میں ہوتا ہے درآنحالیکہ لکھنؤ کا ہر ہندو اُردو زبان اور اُردو رسم خط سے واقف ہے اور اگر کہا جاتا ہے کہ کیوں نہ اُردو ہندی دونوں زبانوں میں اعلانات شایع کئے جائیں تو کہا جاتا ہے کہ اس میں مصارف زیادہ ہیں، اس کے معنے صرف یہ ہیں کہ جسوقت سوال کسی اقتصادی یا سیاسی مصلحت کا آئے گا تو سب سے پہلے اس چیز کو محو کیا جائے گا جو مسلمانوں کی قومی کلچر کی سب سے بڑی امانت دار ہے

یہ وہ تدابیر ہیں جو منظم طور پر کھلم کھلا ہر جگہ مسلمانوں کی اہمیت کو کم کرنے کے لئے اختیار کی جارہی ہیں اور اسی کے ساتھ عام اخلاقی حیثیت سے بھی مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک کیا جارہا ہے، ان کی تفصیل کے لئے تو ایک دفتر چاہئے۔

یو۔پی کے وزیر تعلیم جو سوشلسٹ جماعت کے تنہا نمایندہ ہیں اور جن کو سب سے زیادہ آزاد خیال ہونا چاہئے۔ ان کے اخلاق کا فسانہ بھی سُن لیجئے۔ ایک مسلمان ٹیچر جس نے اُردو زبان سیکھنے کا کوئی آسان طریقہ ایجاد کیا ہے، ان سے ملنا چاہتا ہے اور وقت مقرر ہو جاتا ہے، لیکن جب وہ تاریخ موعودہ پر دولتکدۂ وزارت پر پہونچتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ سرکار دیرہ دون تشریف لے گئے ہیں اور وہیں یاد فرمایا ہے۔ یہ غریب جس کی تنخواہ اس کی ضروریات زندگی کے لئے بھی کافی نہیں ہوتی، کسی نہ کسی طرح دیرہ دون پہونچتا ہے، لیکن وہاں پہونچکر یہ خبر سنتا ہے کہ حضور پھر لکھنؤ واپس تشریف لے گئے اور اسے وہیں حاضر ہونا چاہئے، یہ لکھنؤ واپس آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فیض آباد میں تشریف فرما ہیں!۔ معلوم نہیں اس فرار و تعاقب کا نتیجہ کیا ہوا، لیکن خیال یہی ہے کہ وہ غریب تھک کر بیٹھ رہا ہوگا۔ پھر ہو سکتا ہے کہ مسلمان کے بجائے کوئی ہندو ہوتا تو اس کے ساتھ بھی یہی صبر آزما سلوک کیا جاتا، لیکن کیا اس صورت میں جبکہ سوال ہندو وزیر تعلیم اور مسلمان ٹیچر کا ہے قدرتاً مسلمانوں کو یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ تعزیر دوا دوش محض اس لئے تھی کہ وہ ہندو نہ تھا اور ان تمام باتوں سے قطع نظر میں یہ پوچھتا ہوں کہ کیا ایک وزیر جو خوش قسمتی یا بد قسمتی سے مرد بھی ہے، وعدے کر کرکے ٹالی جانا اور کسی حرماں نصیب کو یوں ستانا، کیا کوئی بڑی شاعرانہ بات ہے!

اس قول و فعل کا اختلاف اور اس ظاہر و باطن کے تضاد کا فسانہ کہاں تک کوئی بیان کر سکتا ہے۔ وہی رکن کانگرس ہے کہ وزیر ہونے سے قبل اپنے مکان پر عہد قدیم کی سادگی کا مجسمہ نظر آتا ہے لیکن عنان وزارت ہاتھ میں لینے کے بعد وہ رہنے کے لئے شہر کی بڑی سی بڑی کوٹھی کا انتخاب کرتا ہے، سواری کے لئے بیش قیمت موٹر اس کے لئے خریدا جاتا ہے اور شان وزارت قایم رکھنے کے لئے قوم کے روپیہ سے تمام اُن بیدردانہ مصارف کو جو اس کے ماہوار مشاہرہ سے سہ چند اور چہار چند زیادہ ہوتے ہیں، گوارا کرلئے جاتے ہیں

درانحالیکہ جس حد تک کلچر کا تعلق ہے، عہدۂ وزارت نہ ٹوپی اور دھوتی میں کسی اُجلے پن کا اضافہ کرسکتا ہے اور نہ اُن آلودہ پتوں اور ٹوٹے گندے گھڑوں میں کوئی کمی، جن پر کونسل چیمبر کے گوشوں میں ہر وقت مکھیاں بھنکتی نظر آتی ہیں، جن صوبوں میں کانگرسی وزارت قایم ہے وہاں اقتصادی دشواریوں کے دور کرنے اور کاشتکاروں کے اُبھارنے کے لئے جو کچھ بھی ہوا ہو، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ ہندو مسلم اختلافات زیادہ پیدا ہوگئے ہیں اور اس کا سبب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ہندوؤں کی مہاسبھائی ذہنیت زیادہ قوی ہوتی جارہی ہے چنانچہ دیکھئے صوبۂ بہار میں ذبیحۂ گاؤ روکنے کے متعلق کیا کیا اہتمامات ہو رہے ہیں اور خود یوپی کے بعض دیہات میں ہندوؤں نے کس زیاتی سے کام لیا

میرا مقصود اس سے نہ کانگرس کی مخالفت ہے اور نہ اس کے اُصول سے انحراف، بلکہ صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ وہ لوگ جو آج کل کانگرس کے روح و رواں بنے ہوئے ہیں وہ حقیقتاً کس ذہنیت کے انسان ہیں اور یہ کہ ذہنی تنگ نظری کو دیکھتے ہوئے قطعاً کوئی امید نہیں کہ مسلمانوں میں شرکت کانگرس کا ولولہ پیدا ہوسکے، یہ میں نے اس بات کو سامنے رکھ کر کہا کہ ہندو جماعت مسلمانوں کو شرکتِ کانگرس کی دعوت دے رہی ہے، ورنہ میں جانتا ہوں کہ کہاں کی دعوت اور کیسی اجازت۔ اگر کانگرس کا مقصود واقعی ملک کو آزاد کرانا ہے تو ایک مسلمان کا فطری حق ہے کہ اس کو اپنی چیز سمجھے اور اگر ہندو اس سے کم پر سودا کرنے کے لئے طیار ہیں تو ان کو کانگرس سے علٰحدہ کردے

ہندوؤں میں سوشلسٹ جماعت ہی ایک ایسی جماعت تھی جس سے ہمیں خستگی کی داد پانے کی کچھ توقع ہوسکتی تھی، لیکن گاندھی جی کی ڈکٹیٹر شپ نے اس کو بھی معطل کر دیا ہے، یہاں تک کہ جواہر لال ایسا زبردست اشتراکی بھی اسی نیچی سطح پر اُتر آیا ہے جس سے زیادہ بلندی پر ایک غیر اشتراکی ہندو جا ہی نہیں سکتا۔ پھر جس طرح اسوقت مسلمانوں کے سامنے ان کے تحفظ کا مسئلہ ہے، اسی طرح ہندوؤں کے لئے ایک سخت گتھی یہ موجود ہے کہ آیا مسلمانوں سے علٰحدہ ہوکر وہ اپنا مقصد حاصل کرسکتے ہیں اور اگر نہیں تو پھر ان دونوں کے اتحاد کی کیا صورت ہے

نواب سر اکبر حیدری اور ہندو مسلم اتحاد

اس میں کلام نہیں کہ ان دونوں جماعتوں کے ذی فہم افراد یہی چاہتے ہیں کہ باہمدگر صلح و آشتی کی صورت پیدا ہوجائے، لیکن اسوقت تک کوئی یقینی تدبیر کسی کے ذہن میں نہیں آئی۔ نواب سر اکبر حیدری نے، جامعۂ ڈھاکہ کے جلسۂ تقسیم اسناد میں اپنا فاضلانہ خطبۂ صدارت دیتے وقت اس مسئلہ پر بھی نہایت مدبرانہ تبصرہ فرمایا ہے اور اس میں شک نہیں کہ جو تدابیر موصوف نے بتائی ہیں وہ پوری توجہ کی مستحق ہیں۔ آپ نے پہلی تدبیر تو یہ بتائی ہے کہ فریقین میں سے ہر ایک کو فرقہ وارانہ تحریکیں قطعاً بند کر دینا چاہئے، اسی کے ساتھ دوسری تدبیر یہ پیش کی ہے کہ " دونوں فریق کو اپنے اپنے تاریخی لٹریچر سے نفرت پیدا کرنے والے حصے الگ کر دینا " اور سب سے آخری لیکن سب سے زیادہ اہم و مفید تدبیر یہ بتائی ہے کہ " مذہب کا مفہوم سمجھنے کی کوشش صرف تصوف و روحانیات کی وساطت سے کرنا چاہئے اور ظواہر و مراسم کو مذہب نہ سمجھنا چاہئے"

ان تینوں تدبیروں میں پہلی اور تیسری تدبیر ایک دوسرے سے دست وگریباں ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ پہلی تدبیر پر اسوقت تک عمل ممکن نہیں، جب تک تیسری متعین نہ ہو جائے

فرقہ وارانہ تحریکوں کا ذمہ دار صرف مذہب ہے اور چونکہ مذہب نام رکھیا ہے صرف گائے کا گوشت کھانے یا نہ کھانے کا دھوتی پہننے یا نہ پہننے کا، سر پر چوٹی رکھنے یا نہ رکھنے کا، اس لئے ناممکن ہے کہ ہندو مسلمان کو گائے کا گوشت کھانے کی وجہ سے ملکش نہ سمجھے اور ایک مسلمان، ہندو کو اس کی دھوتی اور چوٹی کی وجہ سے اسے کافر نہ کہے۔ سب سے بڑی مصیبت یہی ہے کہ کلچر کے اختلاف کو دین کا اختلاف سمجھ لیا گیا ہے اور دونوں فریق کے مذہبی پیشوا اسی اختلاف کو سامنے رکھ کر آپس میں جذبۂ منافرت پیدا کرتے رہتے ہیں، اس لئے نواب سر اکبر حیدری کی بتائی ہوئی تدبیروں پر تو اسی وقت عمل ہوسکتا ہے، جب سب سے پہلے مولویوں اور پنڈتوں کو سوسائٹی سے علیحدہ کر دیا جائے اگر انھیں ہم ملک سے باہر نہیں نکال سکتے اور چونکہ یہ اسوقت تک ممکن نہیں جب تک ملک میں تعلیم عام ہو کر خود پبلک کو اس جماعت سے نفرت نہ ہو جائے، اس لئے فوری تدبیر ہندو مسلم اختلاف دور کرنے کی اگر کوئی ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ کانگرس اپنے کھوئے ہوئے اعتماد کو قایم کرے اور واقعی خلوص و رواداری سے کام لیکر مسلمانوں کے تمام مطالبات کو تسلیم کرے، لیکن ہم جانتے ہیں کہ ہندو اس پر کبھی طیار نہ ہوں گے اور یہ جھگڑا کبھی ختم نہ ہوگا

کانگرسی وزارت کی وہ ذہنیت جس کا ذکر ابھی میں کر چکا ہوں ہر جگہ یکساں ہے، چنانچہ صوبۂ متوسط و برار کو دیکھئے کہ وہاں کے وزراء، تو باوجود کانگرسی ہونے کے کھلم کھلا مہاسبھائی ہیں جس کا ادنی ثبوت یہ ہے کہ جسوقت مسٹر ساورکر (جنھیں مہاسبھائیوں میں وہی خصوصیت حاصل ہے جو سانپوں میں کالے ناگ کو) ناگپور پہونچتے ہیں تو تمام ارکانِ وزارت اس طرف ڈھل پڑتے ہیں اور جلسہ میں وہ سب کچھ ہوتا ہے جو ہندو راج کی اسکیم کو سامنے رکھ کر ہونا چاہئے وہاں کی وزارت مدرسہ یا اسکول کو اپا ودیا مندر، کہنا پسند کرتی ہے۔ سی۔پی یا صوبۂ متوسط کے بجائے "مہاکوشل" کا نام تجویز کرتی ہے، برار کا لفظ بھی ان کو گوارا نہیں اور یہ تحریک کہ آیندہ تعلیم بالکل ہندی زبان کے ذریعہ سے دیجائے اس میں تو خیر تمام کانگرسی صوبے شامل ہیں

سی پی وزارت کی طرف سے کچھ عرصہ ہوا ایک بیان شایع ہوا تھا کہ مسلمان طلبہ اور طالبات کو کتنے وظایف وہاں کی حکومت نے دئے ہیں اور آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے بھی اس پروپاگنڈا میں کافی حصہ لیا تھا حالانکہ ان میں ایک وظیفہ بھی ایسا نہیں جو کانگرسی حکومت کی یادگار ہو، اور کوئی مدرسہ ایسا نہیں جو مسلمانوں کے لئے اس نے جاری کیا ہو، بلکہ ضلع بیتول کا واحد اُردو مدرسہ بھی ختم کر دیا گیا۔ سی۔پی میں اس وقت امدادی مدارس کو تین لاکھ سے زیادہ کی مدد دیجا رہی ہے لیکن اُردو مدارس کا حصہ اس میں صرف ۲۵ ہزار ہے

سرکاری مدارس سوائے ایک دو کے سب ہندی اور مرہٹی کے طلبہ کے لئے مخصوص ہیں، یہاں تک کہ

جبلپور اور ناگپور ایسے مرکزی مقامات کے سرکاری مدارس میں بھی جہاں مسلمانوں کی تعداد کافی ہے، اُردو کا نام و نشان نہیں پایا جاتا

جسوقت مسٹر جینا نے اُردو زبان کے متعلق اپنا بیان شایع کیا، تو مولانا ابوالکلام آزاد نے سختی سے اسکی تردید کی تھی اور کانگرس کے حسنِ نیت کی تائید، لیکن افسوس ہے کہ مولانا کے حسنِ ظن کے اسباب و دلائل آج تک ہمکو معلوم نہ ہوسکے۔ خود مہاتما گاندھی کو دیکھئے کہ وہ کس زبان میں تقریر کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ مولانا کے وجدان کو مطمئن کرنے والی ہو، لیکن اور تمام مسلمانوں کے نزدیک وہ اسی قسم کی ہندوستانی ہے، جو پنڈت ملاجی اور رمہاشے پرمانند ہی کی زبان سے اچھی معلوم ہوتی ہے — قہر تو یہ ہے کہ وہ زبان کے مسئلہ کو نہایت معمولی مسئلہ بتاتے ہیں، حالانکہ ہندو مسلم نزاع کا اصل سبب یہی مسئلہ ہے اور اسی نے مسلمانوں کو باور کرایا ہے کہ ہندو ملک کی آزادی کو اتنا عزیز نہیں سمجھتے جتنا ہندی کے رواج کو، کیونکہ ان کا اصل مقصود (یعنی آریہ ورت سے مسلمانوں کے وجود کو محو کرنا) اسی طرح حاصل ہوسکتا ہے کہ پہلے مسلمانوں کے اس لٹریچر کو تباہ کیا جائے جو ان کے کلچر کا حامل ہے اور اس کے بعد پھر اس قوم کا مٹا دینا کیا مشکل ہے جو اپنے کلچر کو برباد کر چکی ہے

پھر جب حالات یہ ہیں تو مسلمانوں کو غور کرنا چاہئے کہ انھیں کیا کرنا ہے۔ مُسلم لیگ کی طرف سے تو کوئی توقع پیدا کرنا بیکار ہے۔ وہ اس بات پر تو لڑ سکتی ہے کہ کانگرسی جھنڈے میں سبز رنگ جو مسلمانوں کا رنگ ہے نیچے کیوں رکھا گیا، فلاں عمارت پر مسلم لیگ کا جھنڈا کیوں نہ نصب کیا گیا، بندے ماترم کے ساتھ مُسلم لیگ کا ترانہ کیوں نہ پڑھا گیا، لیکن کسی ٹھوس تعمیری اُصول پر کام کرکے کوئی انقلابی تحریک پیدا کرنا اس کے بس کی بات نہیں

اگر مسلمانوں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ اجتماعی حیثیت سے کانگرس میں شریک ہوکر ہندؤں کے زور کو نہیں توڑ سکتے تو پھر ان کے لئے چارۂ کار سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ بالکل اشتراکیت کے اُصول پر اپنی جماعت کی تنظیم کریں اور قربانی کے لئے طیار ہوکر باہر نکل پڑیں

جینا اینڈ کمپنی سوائے اس کے کچھ نہیں کرسکتی کہ وہ مطالبات کی فہرست بناتی رہے، وہ اس سے زیادہ کی ہمت کرکے اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالنا پسند نہیں کرسکتی، اس لئے مسلمانوں کو ان کا دامن چھوڑ دینا چاہئے اور ہر متنفس کو اپنی مدد کے لئے خود کمربستہ ہوجانا چاہئے

شیر شو، شیرانہ در صحرائے شیراں پائے نہ
مرد شو، مردانہ پند ناصحاں را گوش گیر

مسئلۂ خلافت و امامت

(مسلسل)

فاضل مضمون نگار کے قلم سے تحریف قرآن کے متعلق شیعوں پر جو الزام عائد کیا گیا ہے اب میں اس کی تحقیق پر توجہ کرتا ہوں۔

ان کا قیاس ہے کہ شیعہ حضرات جب قرآن سے عقیدہ خلافت الٰہیہ ثابت نہ کر سکے تو تحریف قرآن کی آڑ پکڑی اور شیعی مجتہدین نے اپنے مشکک مریدوں کو یہ کہکر مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ سنیوں نے وہ آیات حذف کر دیں جن میں بتصریح امامت کے متعلق احکام مذکور تھے

لیکن فاضل مضمون نگار نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ عام طور پر شیعہ تحریف قرآن کے قایل نہیں ہیں (شکریہ) پھر جب شیعوں کی عمومی حالت معلوم ہو گئی تو تحریف قرآن کا ذکر نہ جانے کس قسم کی منطق ہے

طبعاً سوال ہوتا ہے کہ شیعوں میں تو روایات تحریف کی بنا پر مشکک مریدوں کو تسلی دی گئی لیکن کتب سنیہ میں جو ان کا طومار پایا جاتا ہے اس کا سبب کیا ہے۔ کبھی اس طرف توجہ فرمائی گئی ہے۔ ہاں میں عرض کرتا ہوں

یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ جامعین قرآن نے اس ترتیب کو باقی نہیں رکھا جو ہونی چاہئے تھی۔ پھر جن جن ترکیبوں سے قرآن جمع ہوا ہے وہ ترکیبیں بھی سامنے موجود ہیں۔ عہد ثالث میں جو قرآن جلائے گئے وہ تاریخ کے ایک معمولی متعلم سے بھی مخفی نہیں ان کے جلانے کی اس کے سوا اور کیا وجہ ہو سکتی تھی کہ وہ قرآن کی اس ترتیب کو پسند نہ کرتے تھے اور موجودہ ترتیب کے حامی تھے۔ پھر میں ارباب عقل سے پوچھتا ہوں کہ ایک آیت کہیں سے اٹھا کر کہیں رکھ دی جائے اور دوسری آیت اس کے مقام میں آجائے۔ کیا اسے "یحرفون الکلم عن مواضعہ" (وہ کلمات کو ان مقام سے تحریف کرتے ہیں) نہیں کہہ سکتے

اب یہ اعتراض باقی ہے کہ "عقیدہ خلافت الٰہیہ قرآن میں بالتصریح مذکور نہیں" میں نہیں سمجھ سکا کہ صراحت سے کیا مراد ہے۔ کیا اس سے یہ مراد ہے کہ علی کا نام صراحت کے ساتھ مذکور نہیں ہوا۔ لیکن ادنیٰ غور سے یہ معمہ حل ہو سکتا ہے کہ دعوت قرآن، صاحب عقل اور صاحب تفکر کے لئے ہے

نام اگر صراحت کے ساتھ ہوتا تو اسی طرح ہو سکتا تھا کہ "اے رسول تیرے بعد تیرا خلیفہ علی ہے" لیکن اس کی کیا ضمانت

کہ لوگ اس قول پر سکوت کر لیتے۔ نہایت آسان امر تھا یہ کہنا کہ "علی" نام نہیں ہے بلکہ خلیفہ کی صفت ہے۔ یعنی اسے رسول تیرے بعد تیرا خلیفہ بلند مرتبہ والا ہے۔

تعجب نہ کیجئے۔ حدیث مدینہ مشہور حدیث ہے۔ محدثین اہل سنت اس حدیث کو باب فضائل علوی میں نقل کرتے ہیں۔ مگر آج اس کے معنی نکالے جاتے ہیں کہ "میں شہر علم ہوں جس کا دروازہ بلند ہے"۔

اگر اسم علی اس حیثیت سے درج قرآن ہوتا یقیناً یہی حشر ہوتا۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تمام آئمہ کے نام کھلم کھلا درج کئے جاتے۔ مثلاً "ثم الحسن ثم الحسین"۔ اہل بصیرت جانتے ہیں کہ یہ قرآن ہے جسکا نام حکما کی اصطلاح میں عقل اجمالی ہے اور صاحبان عقل وہ ہیں جو اجمال میں تفصیل کا مشاہدہ کرتے ہیں

عام فہم اور سادہ زبان میں یوں سمجھنا چاہئے کہ قرآن کی بنیاد ایجاز و اختصار پر رکھی گئی ہے اور یہی اس کا حسن ہے اگر اس طرح نام درج کئے جاتے تو اچھا خاصہ شجرہ بن جاتا۔ اس ایجاز کی مثالیں قرآن میں کافی موجود ہیں۔ مثلاً خدا نے اصطفائے آل ابراہیم کا ذکر کیا ہے۔ اس میں مختلف صورتیں ہوتی ہیں:۔

(۱) تنہا بنو اسحق مراد ہیں ؟ اور پھر ان میں بھی کل یا بعض

(۲) فقط بنو اسمٰعیل مراد ہیں ؟ اور وہ بھی کلاً یا بعضاً ؟

(۳) دونوں مراد ہیں ؟ اور پھر بہ حیثیت کل یا بہ حیثیت بعض ؟

پس ان سوالات کا سمجھنا اور حقیقت تک رسائی حاصل کرنا ہمارا کام ہے۔ اسی طرح قرآن نے بیان کر دیا "اہل البیت" اب یہ معلوم کرنا ہمارا فریضہ ہے کہ اہل بیت مطہرین کون ہیں ؟

الغرض تصریح و صراحت کے متعلق جو شکوک پیش کئے جاتے ہیں وہ اہل عقل کے لئے قابل توجہ نہیں ہیں۔ آخر میں ایک اور پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کو ختم کیا جاتا ہے۔ معلوم ہے کہ حضرات اہل سنت نہایت اطمینان سے فتویٰ دیتے ہیں کہ شیعوں کے پاس خلافت الٰہیہ کے لئے کوئی قرآنی دلیل نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ شیعوں کو ان کی حالت پر چھوڑ دیا جائے لیکن ان حضرات نے کبھی خلافت اجماعی و شوریٰ پر بھی نظر ڈالی ہے کہ یہ طریقہ خلافت اصول قرآنی کے مطابق ہے یا نہیں۔

اہل سنت کے پاس اس بارے میں بس ایک آیت ہے جس سے وہ تمسک کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی

"وامرہم شوریٰ بینہم"

مشورہ کے بہتر ہونے میں کسی عاقل کو کلام نہیں۔ بہت سے امور ایسے ہیں جن میں انسان کو مشورے کی ضرورت پڑتی ہے علاوہ ازیں مشورے سے باہمی ارتباط اور تعلقات بھی محکم ہوتے ہیں۔ رسول اللہ سے ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

"فبما رحمۃ من اللہ لنت لہم ولو کنت فظاً غلیظ القلب لانفضوا من حولک فاعف عنہم واستغفر لہم و شاورہم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ ان اللہ یحب المتوکلین" (آل عمران)

(ترجمہ) اس رحمت کے سبب سے جو تیرا حصہ ہے تو ان کے ساتھ نرمی سے پیش آیا۔ اور اگر تو بد خو اور سنگدل ہوتا تو یہ تیرے پاس سے متفرق ہو جاتے۔ پس ان سے درگزر کر۔ ان کے لئے استغفار کر اور ان سے مشورہ کر اور جب تو عزم کر چکا تو اللہ پر توکل کر۔ بالتحقیق کہ اللہ توکل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے،،

اس سے ظاہر ہے کہ تالیف قلوب کے لئے دوسروں کی غلطیوں سے درگزر کرنا ان کے لئے استغفار کرنا اور ان سے مشورہ کرنا نہایت مفید چیزیں ہیں۔ علی مرتضٰی کا ارشاد ہے۔ " الاستشارۃ عین الہدایہ وقد خاطر من استغنی برایہ " مشورہ لینا عین ہدایت ہے اور اپنی رائے پر بھروسہ کرنے والا خطرے میں ہے

ان امور کو مدنظر رکھتے ہوئے آیت کا مفہوم صرف اتنا ہے کہ جب کسی کو کوئی اہم کام درپیش ہو تو وہ ضرور مشورہ کرے کہ عین فلاح یہی ہے۔ میں اس مقام پر صاحبان عقل سلیم سے پوچھتا ہوں کہ اس آیت سے کیونکر یہ مفہوم پیدا ہو سکتا ہے کہ چند انسان اغراض خاص کے ماتحت ایک جگہ مل کر بیٹھیں اور باہر آکر کہدیں کہ ہم نے فلاں شخص کو تمہارا حاکم بنا دیا

اس تمام بحث کے علاوہ لفظ " امرہم " واقع ہوا ہے یعنی " ان کا امر " اور پہلی بحث تو یہی ہے کہ خلافت الٰہیہ " امر اللہ " ہے یا " امر الناس " اس بحث کو طے کرنے کے بعد اس مسئلہ کو آیت کے زیر سایہ لانے کی کوشش ہو سکتی ہے ورنہ بیکار ہے

خیالات کی نیرنگیاں ہر رنگ میں حیرت افزا ہیں۔ خلافت ثانیہ میں تو مشورہ کو دخل نہیں دیا گیا۔ صرف جانے والے کا حکم تھا۔ دوسرے لفظوں میں ولی عہدی۔ پھر یہاں کیا ہوگا۔ الغرض آیۂ شوریٰ حضرات اہل سنت کے مان لئے ہوئے معنی کو محیط نہیں ہے اور نہ خلافت کی تنصیب کے لئے اسے استدلالاً پیش کیا جا سکتا ہے

خلفائے راشدین

یہ وہ بحث ہے جسے لکھ کر بخیال خود دنیائے تشیع پر وہ بار رکھدیا گیا ہے کہ گویا قیامت تک سبکدوشی نہیں ہو سکتی مگر پہلا سوال اس مسئلہ میں یہ ہے کہ " خلفاء " کے ساتھ " راشدین " کی نسبت کہاں سے آئی۔ خدا سے ؟ رسول سے ؟ یا خود ساختہ ؟

اس لفظ پر ایراد کرنے سے میرا مطلب یہ ہے کہ خلافت کے متعلق اسلام میں دو ہی نظریئے پائے جاتے ہیں یعنے (۱) خلافت من اللہ اور (۲) خلافت من الناس۔ ان میں پہلا عقیدہ تو گویا ہئی نہیں۔ لامحالہ دوسرا نظریہ پسندیدہ قرار پائے گا۔ اب اگر کوئی شخص پہلے عقیدے کو چھوڑ دے جو بخیال حضرات موہوم ہے تو دوسرے موہوم میں تو مبتلا نہیں ہوگا وہ صریحًا دیکھے گا کہ جتنے سلاطین معہ خلفاء، اسلام میں گزرے ہیں وہ سب انھیں اصول کے تحت میں ہیں جو تمام دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا کسی کو خلیفہ کہنا اور کسی کو سلطان۔ یہ افتراق بے معنی ہے۔ پھر طرہ یہ کہ کچھ لوگوں کو راشدین سے ملقب کرنا اور کچھ لوگوں کو غیر راشدین قرار دینا بالکل بے ربط ہے۔ اگر خلفاء کہنے میں کوئی خاص بات ہے

توسب کو خلیفہ کہئے اور راشدین کہنے کو جی چاہتا ہے تو سب کو راشدین کہیے "یک بام و دو ہوا" ایک قسم کا تمسخر ہے اب رہا یہ امر کہ کسی کی نیکیاں زیادہ ہیں کسی کی کم ہیں۔ ہوا کریں ہمیں کیا ؟ اپنی اپنی گور اور اپنا اپنا عمل۔

میں اس کی مزید توسیع کئے دیتا ہوں کہ عنوان کے تحت میں جن حضرات کی سیرت نگاری کی جاتی ہے مطلب صرف یہی ہے نا ؟ کہ اس تجلی سے اعتقاد آبائی کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کی جائے۔ اسے آزادی خیال نہیں کہتے۔ استدلال کا ایک جھونکا اس ساری تعمیر کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک سکتا ہے۔ ان حضرات کے محاسن لاکھ گنوائے جائیں بہرحال وہ منصوص من اللہ تو نہیں ہیں۔ انسان ہی کے مقرر کردہ ہیں۔ اس لئے لوگوں پر ایمان لانا ضروری نہیں۔ اس مقام میں ایک شیعہ کے نزدیک علی کی بھی کوئی خصوصیت نہیں اس لئے کہ شیعہ جو حضرت علی کو مان رہے ہیں وہ صرف اس لئے کہ منصوص من اللہ ہیں اور جب یہ عقیدہ ہی اُڑ گیا تو پھر علی بھی یکے از دیگراں ہیں۔ وہ کسی جماعت میں شامل ہوں یا نہوں۔ یہ ان کا ایک ذاتی فعل ہو گا۔ جو قطعاً کسی کے لئے حجت نہیں۔ خلاصہ یہ کہ یہ "راشدین" کا ضمیمہ لفظ "خلفاء" کے ساتھ محض ایک خوش اعتقادی ہے

اب میں اس طرف متوجہ ہوتا ہوں کہ حضرات خلفاء کے ساتھ علی مرتضیٰ کا سلوک ایک شیعہ کی نگاہ میں کیا معنی رکھتا ہے

واضح ہو کہ شیعہ خلافت الٰہیہ کے جس عقیدے کو دل میں جگہ دئے ہوئے ہیں اس عقیدے کی رو سے صرف حضرت علی ہی امام نہیں ہیں بلکہ دوسرے حضرات آئمہ بھی ہیں اور اس عقیدے کی بنا پر ان میں اور حضرت علی میں کوئی فرق نہیں ہے اور یہ ایک دوسرے کے قول و فعل کے شارح ہیں۔ ان دوسرے بزرگواروں نے اپنے زمانے کی حکومتوں کے مقابل صلح و آشتی ہی کو اپنا طریقہ قرار دیا لیکن ان بزرگواروں کے اس صلح و آشتی کو مدنظر رکھتے ہوئے ان حکومتوں کو شیعوں نے کبھی حکومت حقہ تسلیم نہیں کیا اور نہ خود ان بزرگواروں کا کوئی ایسا ارشاد یا ہدایت ہے بلکہ اس کے خلاف ان کے اقوال موجود ہیں۔ آئمہ اہل بیت کا یہ عمل ہمارے نزدیک علی مرتضیٰ کے فعل اور عمل کا شارح ہے۔ جس طرح وقتی مصلحتوں کی بنا پر علی مرتضیٰ نے حکومت وقت کے ساتھ صلح و آشتی کے ساتھ گزاری اسی طرح دیگر ائمہ نے بھی پس جس طرح ائمہ کا یہ فعل حکومت وقت کی حقانیت کی دلیل نہیں ہے اسی طرح علی مرتضیٰ کی مصالحت سے عند الشیعہ حقانیت حکومت وقت پر استدلال نہیں ہو سکتا۔

شیعہ اگر خلافت الٰہیہ کے نظرئے کا حامی ہے تو اس کا یہی اصولی جواب ہے جو عرض کیا گیا۔ پھر کیا حق ہے دنیا کو کسی کے معتقدات کو نہ سمجھتے ہوئے اس پر وہ بار رکھے جس کا وہ اصولاً منکر ہے اور اگر شیعہ اس عقیدے سے دست بردار ہو کر اس دائرے سے نکل رہا ہے تو پھر اس کی آزادی خیال کے سامنے امتیازات کی کوئی دیوار حائل نہ ہونی چاہئے۔ کس کے راشدین اور کس کے غیر راشدین :-

خوش نباشد جامہ نیمے اطلس و نیمے پلاس

اس بحث میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ "اگر میں شیعہ حضرات کی مستند احادیث سے اپنے قول کو ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاؤں تو غالباً میں اپنی ذمہ داری سے باحسن الوجوہ عہدہ برآ ہو جاؤں گا"

خواب نہایت اچھا ہے۔ تعبیر ناظرین کے سامنے آجائے گی۔ میرے کہنے کی ضرورت نہیں اور یہ بھی اندازہ ہو سکیگا کہ کسی سطحی مناظر کی تصنیف پر اعتماد کر کے حوالے اور عبارتیں لکھ دی گئی ہیں۔ اصل کتاب کے مطالعہ کی نوبت نہیں آئی۔ کتابوں کے نام تک صحیح نہیں ہیں۔ مثلاً لکھا گیا ہے شیعوں کی مشہور کتاب حدیث "کلینی"! میں عرض کردوں گا کہ شیعوں کے ہاں اس نام کی کوئی کتاب نہیں ہے۔ البتہ ایک کتاب حدیث "کافی" ہے۔ اس کے مصنف کا نام ہے محمد بن یعقوب کلینی (کلین کے رہنے والے) ایسی دلچسپیاں بہت ہیں۔ ناظرین عنقریب ملاحظہ کریں گے

ہاں اس عنوان "خلفاء راشدین" کے متعلق میں مجملاً کہہ آیا ہوں۔ لیکن ناانصافی ہوگی اگر مندرجۂ ذیل خیال کے متعلق معروضہ نہ کیا جائے

"اگر خلفائے ثلٰثہ کا زمانہ واقعی غاصبانہ دور خلافت ہوتا تو حضرت علی جیسا جلیل القدر مسلمان اپنی عمر کا بڑا حصہ اس غیر اسلامی زمانے کا ساتھ دینے میں بسر نہ کرتا اور پوری طاقت کے ساتھ صدائے احتجاج بلند کر کے خدا اور رسول کے منشا کو پورا کرنے کی کوشش کرتا جس کے بعد یا تو وہ اعلاء کلمۃ الحق میں کامیاب ہو کر مسندِ خلافت پر متمکن ہو جاتے اور یا حسین کی طرح میدان کارزار میں تڑپتے نظر آتے"

صلح و آشتی کی پالیسی کے متعلق تو میں کہہ چکا ہوں [illegible] کے متعلق شیعی نمایندہ کا جواب جو درج کیا گیا ہے معقولیت پر مبنی ہے۔ ہاں یہ آخری مطلوب پر [illegible]

یہ خیال جو آخر میں ظاہر کیا گیا ہے کوئی [illegible] ہمیشہ دہرایا گیا ہے اور غالباً جب تک دنیا باقی ہے دُہرایا ہی جائے گا

بہت خوب! علیؑ قتل ہو جائے۔ قتل ہو جانا کوئی اہمیت نہیں رکھتا مگر نتیجہ؟ شہادت حسینؑ سے جو نتیجہ مترتب ہوا وہ علیؑ کے قتل پر ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ ہر فعل کی تاثیر میں زمانے کو بھی بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں قتل علیؑ کے معنے یہ تھے کہ حسنین بھی قتل ہو جاتے۔ بلکہ تمام عائد بنی ہاشم موت کے گھاٹ اُترتے۔ نتیجہ کیا ہوتا؟ صاف ظاہر ہے کہ حکومت بے کھٹکے اغیار کے ہاتھوں میں کھیلتی اور یہی خواہان حکومت کی طرف سے بیرونی دنیا کے لئے جو تاریخی مواد پیش کیا جاتا۔ ظاہر ہے وہ کیسا ہوتا

تاریخی واقعہ ہے کہ مالک ابن نویرہ نے زکوٰۃ بھیجنے میں عذر کیا کہ رسول اللہ نے حکومت وقت کے لئے کوئی وصیت نہیں کی بلکہ وصیت کسی اور کے لئے ہے۔ فوراً فوج بھیجی گئی۔ اس قبیلہ پر کامل بربریت کے ساتھ حملہ کیا گیا بالآخر اس قبیلہ کا نام "مرتدین" کی فہرست میں لکھ دیا گیا۔ کیا قتل ہو جانے کے بعد علیؑ اور دیگر بنو ہاشم کا نام اس فہرست میں آتا

اور کیوں نہ آتا؟ البتہ یہ موقعہ علی نے نہیں دیا

علاوہ ازیں علی کے قتل ہوجانے پر یہ بھی ممکن نہ تھا کہ بنو تیم اور بنو عدی اس حکومت پر رہ سکیں۔ بنو امیہ موقعہ کی تاک میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ابوسفیان زندہ تھا۔ بنو ہاشم ہی تھے جن کو وہ اپنی ٹکر کا سمجھتا تھا۔ ان کے بعد میدان صاف تھا باقی بنو تیم اور بنو عدی اس کی ایک دھمکی سے خانہ نشین ہوجاتے۔ ابتدا سے ہی بنو امیہ سریر سلطنت پر آتے اور وہیں سے۔

ولعبت ہاشم بالملک لا
خبر جاء ولا وحی نزل،

کے ترانے بلند ہوجاتے

تاریخ بتاتی ہے کہ جسوقت حضرت ابوبکر خلیفہ ہوئے تو ابوسفیان نے علی سے آکر کہا کہ اُٹھو۔ مدینہ کو سوار اور پیادوں سے بھر دوں گا اگر علی اس کے دم میں آجاتے تو عین میدان کارزار میں مخالفین سے ملکر بنو ہاشم کا خاتمہ کرا دیتے اور ان کے بعد پھر دوسرے تھے ہی کیا۔ لیکن علی اس راز سے واقف تھے اس نے جو نقشہ ڈالا تھا اسے سمجھتے تھے۔ لہذا جھڑک دیا اور صاف کہا کہ تو منافق ہے

یہ ہیں وہ اندرونی ریشہ دوانیاں جن پر نظر کرتے ہوئے اہل بصیرت نے ہمیشہ سے کہا ہے کہ اسوقت مدینہ میں جنگ داخلی کا واقع ہوجانا نفس اسلام کے لئے مضر تھا اور ایسا مضر کہ ابتدائے بعثت میں جو نتیجہ حضرت پیغمبر کی شہادت سے نکلتا وہی ابتدائے خلافت میں حضرت علی کے قتل ہوجانے سے برآمد ہوتا

اب اس کے علاوہ فتح یاب ہوکر تخت سلطنت پر متمکن ہوجانے میں علی کی حیثیت بادی النظر میں اسی بادشاہ کی سی ہوتی جو اپنے مخالفین کو تہ تیغ کرکے سریر سلطنت پر قدم رکھا کرتا ہے اسی لئے ارشاد ہوا ہے "فصبرت علی طول المدۃ وشدۃ المحنۃ" اس طویل مدت اور رنج والم کی شدت پر میں نے صبر کیا

حقیقت یہ ہے کہ اغراض ذاتی کا قدم اگر درمیان میں ہوتا تو شاید علی یہی کر گزرتے لیکن وہ اس سطح سے بلند ہیں

ایں زمیں را آسمانے دیگر است

اب میں ان منقولات پر نظر ڈالنا چاہتا ہوں جو فاضل مضمون نگار کو خدا جانے کتنی زحمت سے دستیاب ہوئے ہیں:-

(۱) ایک خط کا مضمون رقم کیا گیا جو حضرت علی نے حاکم شام کو جنگ صفین کے دوران میں لکھا ہے۔ اس میں حضرات شیخین کی تمجید کی گئی ہے

"کتاب الفتوح" "ابن عاصم کوفی" اور "شرح نہج البلاغۃ" کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس مقام پر یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ "ابن عاصم" میرے خیال میں صحیح نہیں بلکہ صحیح لفظ "ابن اعثم" ہے۔ لیکن وہ "ابن عاصم" ہو یا "ابن اعثم" اس کو شیعہ ظاہر کرنا ایک دلچسپ تحقیق کی ابتدا کرنا ہے

شرح نہج البلاغۃ کا حوالہ بھی مشکوک ہے۔ نہج البلاغۃ کی شرحیں کئی ہیں۔ فارسی بھی عربی بھی۔ علیٰ ہذا شارح شیعہ بھی ہیں اور سُنّی بھی۔ اگر بالفرض شیعہ کی شرح ہو تو بھی اس پر حجت قائم نہیں ہو سکتی

حضرت امیر کا وہ خط جسے " محاسن کتب " سے تعبیر کرتے ہیں خود نہج البلاغۃ میں موجود ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مخالف کی تحریر کا کیا مضمون ہوگا۔ اس کے چند فقرات درج کر دیتا ہوں :۔

"وزعمت ان افضل الناس فی الاسلام فلاں وفلاں امراً ان تم اعتزلک کلہ وان نقص لم یلحقک ثلمتہ"

ارباب نظر جانتے ہیں کہ امیر شام نے اپنے دعوے کی بنیاد خون عثمان پر رکھی تھی اور جہاں عرب اور خصوصاً شام میں اس دعوے کی حقانیت کے لئے کافی پروپیگنڈہ کیا گیا تھا۔ یہ بھی معلوم ہے کہ حضرت عثمان۔ حضرات شیخین ہی کے سلسلہ کی ایک کڑی ہیں، وہ چاہتا تھا کہ علی کے ہاتھ کی ہی لکھی ہوئی کوئی ایسی تحریر مل جائے جسے مخالفت شیخین پر محمول کیا جا سکے اور دنیا کو بتایا جا سکے کہ علی اس خلافت کے ابتدا ہی سے مخالف ہیں اور وہ شیخین کو اپنے مکتوبات میں بُرا کہہ رہے ہیں۔ انکے وقت میں وہ کچھ نہ کر سکے۔ لیکن عثمان کے وقت میں انھیں موقعہ مل گیا اور چونکہ عثمان شیخین کے قائم مقام تھے اور سیرت شیخین پر عمل کرنا ان کا شعار تھا لہذا انھیں قتل کیا اور وہ اس خون میں قطعاً شریک ہیں۔ مگر علی کی طرف سے جو جواب ملتا تھا وہ ایسا ہوتا تھا کہ سوائے مایوسی کچھ اس کے ہاتھ نہ آتا تھا۔ چنانچہ اس خط میں فرماتے ہیں :۔

"وزعمت انی لکل الخلفاء حسدت وعلی کلھم بغیت فان یکن ذلک کذلک فلیس الجنایۃ علیک فیکون العذر الیک"

"تیرا یہ گمان ہے کہ میں نے تمام خلفا سے حسد کیا اور سب پر بغاوت کی۔ اگر یہ معاملہ ایسا ہی ہے تو تیری تو کوئی خطا نہیں کیگئی کہ تیرے سامنے اس کا عذر کرنے کی ضرورت ہو۔ (تجھے کوئی حق مداخلت حاصل نہیں)"

اس کے بعد ایک طعن اور بھی تیز ہے اور اس کا جواب بھی مرقوم ہے۔ اسی سے علی کی روحانی عظمت ان کے مخالفین کی ذہنی پستی معلوم ہو جاتی ہے۔ فرماتے ہیں :۔

" تو نے کہا ہے کہ میں بیعت کے لئے اس طرح لایا گیا جیسے اونٹ کو نکیل سے کھینچتے ہوئے لاتے ہیں یہاں تک کہ میں بیعت کروں۔ خدا کی قسم تو نے میری مذمت کا ارادہ کیا مگر میری مدح کر گیا تو نے مجھے فضیحت کرنا چاہا مگر خود رسوا ہو گیا اس لئے کہ مظلوم ہونے میں مسلم کا کوئی نقصان نہیں جب تک وہ اپنے دین میں شک کرنے والا اور اپنے یقین کو شک سے نہ بدلنے والا ہو"

اس خطبہ کے الفاظ سے حقیقت امر واضح ہو جاتی ہے اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ علی کی بیعت کس طرح حاصل کی گئی۔ معاویہ اس پر طعن کرتا ہے۔ علی اس واقعہ کا انکار نہیں کرتے بلکہ اس کی وہ توجیہ کرتے ہیں جو علی ہی سے مخصوص ہے۔ اب غیر جانبدارانہ فیصلہ اہل انصاف کے ہاتھ ہے

(۲) التواق الحمایۃ۔ یحییٰ بن حمزہ شیعہ زیدی کی تصانیف بتائی گئی ہے اور اس کی ایک روایت سے جس کے راوی

سوید بن غفلہ ہیں اور جس سے شیخین کی کامل مدح ظاہر ہوتی ہے استدلال کیا گیا ہے یہ انواق الحمایۃ مجھے مجاج السالکین کی بہن معلوم ہوتی ہے اگر بالفرض یہ کتاب وجود خارجی بھی رکھتی ہو تب بھی کوئی حرج نہیں لیکن جب تک صحیح عبارت نہ دیکھ لی جائے اس پر کسی رائے کا اظہار نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے خود زید ابن علی کا ایک واقعہ یاد آتا ہے کہ جب اموی فوج سے مقابلہ ہوا تو عین کارزار میں ایک شخص نے سوال کیا کہ شیخین کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں۔ اس سوال کا مطلب ظاہر ہے کہ اس موقعہ پر اس کا ذکر کیا معنی رکھتا ہے چنانچہ جناب زید نے ٹال دیا اور کہا کہ اس کا جواب پھر دیا جائے گا۔ لڑائی شروع ہوئی۔ عین جنگ میں ایک تیر زید کی پیشانی پر لگا وہ گھوڑے سے گر پڑے۔ کچھ لوگ گرد جمع ہو گئے پوچھا وہ سائل کہاں ہے۔ وہ بھی آ گیا۔ اس سے کہا کہ دیکھ انھیں کے سبب سے مجھے یہ حالت دیکھنی پڑی۔

غرض علی یا بنو علی سے یہ توقع رکھنا کہ شیخین کی کوئی خاص عظمت ان کے دل میں ہو ایک غلط توقع ہے۔

(۳) تفسیر قمی کے حوالے سے سورۃ تو [illegible] میں حضرت صادق سے ایک روایت نقل ہوئی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ روایت موجود [illegible] اس سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ نے حضرت ابوبکر کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا اور انھوں نے [illegible] اور ان اصحاب کو سمندر میں دیکھ لیا اور عرض کی یا رسول اللہ آپ صدیق ہیں

اب کوئی بتائے کہ اس میں شیعوں کے خلاف کیا بات نکلی۔ یہ معجزہ اگر ہے تو رسول اللہ کا ہے۔ شیعہ کب اس امر سے منکر ہیں کہ رسول اللہ کے ہمراہ حضرت ابوبکر غار میں نہ تھے یقیناً تھے مگر محزون و ملول تھے۔ ممکن ہے حضرت نے اس طرح ان کو سکون دینا چاہا ہو

دوسری روایت اسی واقعہ کے متعلق جو تفاسیر شیعہ میں مروی ہے۔ میں اسے نقل نہیں کرتا اس سے یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ حضرت ابوبکر نے اس واقعہ سے کیا اثر لیا

اہل انصاف صرف اتنا دیکھ لیں کہ اگر ایسی ہی کوئی روایت علی کا استحقاق جتانے کے لئے شیعوں کی طرف سے پیش ہوتی تو ان کو "سفیہ" بنانے کے لئے کوئی لغت باقی نہ رکھا جاتا

(۴) سورۂ نور کی آیت "ان الارض یرثہا عبادی الصالحین" کے متعلق ایک مضمون تفسیر خلاصۃ المنہج سے نقل ہوا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ یہ وعدہ خلفاء کے عہد میں پورا ہوا

اس میں پہلی غلطی یہ ہے کہ یہ آیت سورۂ نور میں نہیں بلکہ سورۂ انبیاء میں ہے دوسرا امر یہ ہے کہ "صالحین" نہیں ہے بلکہ "صالحون" ہے۔ یہ صفت ہے عباد کی اور عباد از روئے قانون عربیت مقام رفع میں ہے

ان غلطیوں سے چشم پوشی کرتے ہوئے اور بغیر اصل کتاب کی طرف رجوع کئے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ تفسیر عامہ میں یہ مضمون موجود ہے اور حسب عادت اہل علم مفسر نے اس قول کو بھی نقل کیا ہوگا۔ باقی تفسیر خاصہ میں اس آیت کے متعلق

جو کچھ آئمہ سے نقل ہوا ہے اس سے قطعاً مطابقت نہیں رکھتا

(۵-۶) ان دو نمبروں میں کشف الغمہ کے حوالے سے دو عجیب و غریب روایتیں نقل ہوئی ہیں:-

(۱) علی کا قول ہے کہ جو ابوبکر کو صدیق نہ کہے۔ خدا اس کی عاقبت خراب کرے

(۲) حضرت ابوبکر کی وفات پر حضرت علی بہت روئے اور کہا "آج نبوت کی خلافت منقطع ہوگئی"

اہل علم سے گزارش ہے کہ کتاب "کشف الغمہ" موجود ہے۔ شیعی عالم کی تالیف ہے۔ کتاب کا پورا نام ہے "کشف الغمہ فی مناقب الآئمہ" نام ہی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ موضوع کتاب کیا ہے؟ حضرت رسول اللہ سے لیکر امام دوازدہم تک کے مناقب و فضائل بیان ہوئے ہیں۔ التزام یہ کیا ہے کہ ہر دو فریق کی روایات بہ سلسلۂ مناقب و فضایل میں درج کر دی جائیں اہل عقل خود انصاف فرمائیں کہ مولف کتاب ہر دو روایات مندرجۂ بالا کو درج کتاب کر کے اپنے موضوع کو کونسی قوت پہونچا سکتا تھا اگر پھر بھی میں نے حالات حضرت امیر غور سے پڑھے اور افسوس ہے کہ مجھے ان دونوں روائتوں کا کہیں اشارہ بھی نہ ملا۔ اس کے برعکس مولف کتاب کسی اور شے کو درج کر رہا ہے جو قابل ملاحظہ ہے

"فی ذکر الصدیقین۔ من مناقب ابن المغازلی عن ابن عباس"۔ اس روایت کا ماحصل یہ ہے کہ تحت آیت "السابقون السابقون" ابن عباس سے مروی ہے کہ یوشع ابن نون نے موسیٰ کی طرف سبقت کی اور صاحب "آل یسین" نے عیسےٰ کی طرف اور علی ابن ابی طالب نے محمد ابن عبداللہ کی طرف اور وہ ان سے افضل ہے

دوسری روایت مسند امام بن حنبل سے نقل کی ہے ابن عباس کہتے ہیں کہ میں نے خود علی کی زبان سے سنا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اس کے رسول کا بھائی ہوں اور میں صدیق اکبر ہوں اور میرے سوا جو کوئی بھی اس کا قائل ہو وہ مفتری و کاذب ہے۔ میں نے تمام لوگوں سے سات برس قبل نماز پڑھی ہے۔

یہی مضمون صدیقیت البویلی سے نقل ہوا ہے۔ اس کے بعد کتاب شیعہ بصائر الدرجات سے ایک حدیث اس بارے میں نقل ہوئی ہے اور یہ مضمون دیگر کتب شیعہ میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ خود مولف کتاب نے بحث القاب میں حضرت علی کا لقب صدیق اکبر تحریر کیا ہے۔ اب بتایا جائے وہ حدیث کس گوشے میں چھپی ہوئی ہے جس سے استدلال فرمایا گیا ہے اور یہ حدیث ختم خلافت نبوت تو اور بھی مزیدار ہے

(۷) "فصول امامیہ" سے ایک حدیث حضرت باقر سے درج کی گئی ہے روایت کا سلسلہ کیا ہے؟ خدا ہی جانے۔

لیکن اس نام کی کوئی کتاب شیعی تصنیفات میں نہیں ہے مجھے حیرت تھی کہ یہ فصول امامیہ کونسی کتاب ہے اور کس فن میں ہے۔ کم ازکم میرے علم میں تو نہیں لیکن ظاہر ہے کہ میرا محدود علم حجت نہیں ہے لہذا ایک عراقی بزرگوار سے رجوع کی گئی جو ایک وسیع نظر کے مالک ہیں۔ انھوں نے بھی کانوں پر ہاتھ رکھے۔ آخر سوچتے سوچتے خیال ہوا کہ عجب نہیں "فصول المہمہ" مراد ہو جو ابن صباغ مالکی کی تالیف ہے اور چونکہ یہ کتاب مناقب آئمہ اہل بیت میں ہے لہذا مصنف کو شیعہ ظاہر کر دینے کے لئے

بہت کافی ہے۔ اسی شبہ پر " فصول المہمہ فی معرفت الآئمہ" کو دیکھا گیا۔ حضرت باقر کے حالات میں تلاش کی گئی کہ یہ حدیث یا روایت جو کچھ بھی ہے وہیں ملنی چاہئے۔ کئی گھنٹے خراب کئے اور نتیجہ کچھ نہ ہوا۔ میں نہ سمجھ سکا کہ اس قسم کے غلط حوالوں کا مطلب کیا ہے؟ تحقیق حق؟ یا مخاطب کو پریشان کرنا۔ مذہب کی حمایت جب ایسے حیلے حوالوں پر منحصر رہ جائے تو یہ وقت اس مذہب کے لئے نہایت بیکسی کا وقت ہوتا ہے

یہ تو حوالے کی حالت ہے۔ اب رہی حدیث اس کے متعلق چند الفاظ کہنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے

فاضل مضمون نگار نے احادیث کے متعلق یہ رائے ظاہر فرمائی ہے:۔

" احادیث میں اتنا اختلاف ہے کہ سعی و کوشش کے تمام مراحل طے کرنے کے باوجود بھی کسی شخص کو اس ذریعہ سے مطمئن کر دینا محال نہیں تو ناممکن ضرور ہے"

یہ گویا عذر فرمایا گیا ہے اس امر کا کہ شیعہ متکلمین جو احادیث کتب اہل سنت سے پیش کرتے ہیں وہ قابل استناد نہیں ہیں سوال یہ ہے کہ آیا یہی حق شیعوں کو بھی حاصل ہے یا نہیں اور نہیں تو کیوں؟ اگر شیعہ استدلال کریں تو ہر مشہور کتاب ہر مقبول راوی ناقابل اعتبار اور اگر حضرات اہل سنت استدلال کریں تو شیعوں کا فرض ہے کہ مجہول روایت اور ہر نامعلوم کتاب کو مستند تسلیم کر لیں - ایں چہ بوالعجبی است

اب میں دیکھتا ہوں نفس مضمون حدیث کو جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خلفاء ثلثہ کے بارے میں ان لوگوں کو خوض کرنے سے منع کیا گیا

معلوم ہے کہ حضرت باقر کا زمانہ بنو امیہ کے شباب کا زمانہ ہے اور بنو امیہ کی نگاہیں اہل بیت کی طرف کیسی تھیں۔ اسکا جواب تاریخ دے سکتی ہے اور آپ خود بھی واقف ہیں یہ بھی ظاہر ہے کہ بنو امیہ کی خلافت کی بنیادیں خلافت شیخین پر قائم ہوئی تھیں اور حضرات ثلثہ یا ان کی حکومتوں پر تنقید کرنا حکومت وقت کو برا کہنا تھا۔ ایسے وقت میں ان عوام کو جو گزرگاہ پر بیٹھ کر یہ تذکرے کرتے تھے اگر حضرت نے سختی کے ساتھ روکا تو اس میں تعجب کیا ہے؟

حضرت باقر علیہ السلام کی محتاط زندگی ہمارے سامنے موجود ہے۔ جابر ابن یزید کو ایک کتاب دیجاتی ہے کہ اسے حفظ کرو لیکن جب تک بنو امیہ کی حکومت ہے اس کتاب کا ایک لفظ ظاہر نہ کرو[1]

اگر جناب باقر کے ان اشاروں پر جو بہ نظر مصلحت تھے آپ استدلال کر رہے ہیں تو حضرت کے دوسرے ارشادات پر بھی آپ کو نظر فرمانی چاہئے

---

[1] شیعہ مسئلہ تقیہ کو مانتے ہیں۔ فاضل مضمون نگار نے طنزاً حاشیہ پر اشارہ بھی کیا ہے میں عرض کرتا ہوں کہ " دل میں بت۔ زبان پر خدا" اسے نفاق کہتے ہیں اور " دل میں خدا زبان پر بت" تقیہ ہے وہ بھی عند الضرورت۔ پڑھئے سورۂ نحل کی یہ آیت " من کفر باللہ من بعد ایمانہ الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان"

(۸) ہاں نہج البلاغۃ میں یہ خطبہ مذکور ہے۔ حضرت امیر نے جناب خلیفہ دوئم کو میدان میں جانے سے روکا ہے۔ بہتر ہو کہ مناظرین اہل سنت اس خطبہ کو درمیان میں لانے سے اجتناب فرمائیں، کیونکہ اس صورت میں سب سے پہلے حضرت خلیفہ دوئم کی مہارت جنگ پر ایک تنقیدی نظر ڈالنے کی ضرورت ہوگی۔ یہاں صرف اس قدر وضاحت کافی ہے کہ علی کے زمانہ میں جتنی لڑائیاں ہوئیں۔ علی بنفس نفیس ان میں شریک تھے۔ اس سے بڑھکر یہ کہ غزوات میں خود رسول اللہ شریک ہوتے تھے گویا غزوات میں خود شریک ہونا سنت پیغمبر ہے۔ پھر حضرت خلیفۂ دوئم کو اس سنت رسول سے کیوں روکا گیا؟ بات یہ ہے کہ رسول اللہ کا یا علی مرتضیٰ کا لشکر کے ساتھ ہونا ہر جہت سے مفید تھا اور حضرت ممدوح کی ہمراہی جنگی نقطۂ نگاہ سے لشکر کے لئے مضر تھی اور علی جانتے تھے کہ اس مضرت کا اثر اسلام کی عمومی حالت پر اچھا نہ پڑے گا لہذا تالیف قلب کے ساتھ روکدیا۔

(۹) "جلاء العیون" کے باب الوصایا سے حضرت علی کی وصیت نقل کی گئی ہے:۔

"اصحاب رسول کی رعایت کرو کہ انھوں نے خدا کے دین میں کوئی نئی بات جاری نہیں کی اور نہ بدعتی کو اپنے پاس آنے دیا"

یہ حوالہ صحیح ہے مگر بغیر کتاب دیکھے ہوئے نقل ہوا ہے، میں عین عبارت نقل کرتا ہوں:۔

"از خدا بترسید در باب اصحاب پیغمبر خود و رعایت نمائید آنہارا کہ در دین خدا بدعتے نکردہ اند وصاحب بدعتے را پناہ ندادہ اند بدرستیکہ حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وصیت فرمود درحق ایں گروہ از صحابہ خود ولعنت کرد برکسیکہ بدعتی کند از صحابہ وغیر صحابہ کسے راکہ صاحب بدعتی را پناہ دہد ویاری کند۔"

ترجمہ:۔ اپنے پیغمبر کے ان اصحاب کے بارے میں خدا سے ڈرو کہ جنھوں نے دین خدا میں کوئی بدعت نہیں کی اور صاحب بدعت کو پناہ نہیں دی۔ بدرستیکہ حضرت رسول نے اپنے اصحاب سے اس گروہ کے بارے میں وصیت کی ہے اور لعنت کی ہے اس شخص پر جو بدعت کرے۔ وہ صحابہ سے ہو یا غیر صحابہ سے اور اس پر جو کسی بدعتی کو پناہ دے اور اس کی مدد کرے۔"

شکر ہے کہ ابھی ہندوستان میں پڑھے لکھے لوگ موجود ہیں۔ وہ دیکھیں کہ عبارت کتاب کیا کہتی ہے اور مفہوم کیا لیا گیا ہے۔ مجھے کہنا پڑتا ہے کہ تحریف معنوی کی اتنی دلچسپ مثالیں وقت ہی سے دستیاب ہوتی ہیں۔

روایت کا آخری ٹکڑا بتا رہا ہے کہ وصیت ان اصحاب کے بارے میں کی گئی ہے جو بدعتی نہوں اور بدعتی کو پناہ دینے والے نہوں اور جو بدعتی ہوں خواہ وہ صحابی ہوں یا غیر صحابی ان پر تو لعنت کی گئی ہے۔ مترجم نے پہلی سطر کو دیکھ کر دھوکہ کھایا ہے اور "آنہارا" کو پہلے جملے سے متعلق کرکے جملہ ختم کردیا ہے اور اس طرح عبارت اپنے آخر جزو سے نامربوط ہوکر رہ گئی ہے۔ اس کو مفید سمجھا ہے اور اسی پر اکتفا فرمائی گئی ہے

"الوہی خلافت"

ابتک جسقدر توضیح کی گئی ہے اس کے لحاظ سے اہل نظر غالباً شیعی عقیدۂ خلافت کو سمجھ گئے ہوں گے اور یہ بھی معلوم ہوا ہوگا کہ وہ جو کچھ کہتے اور سمجھتے ہیں اس کی صحیح ترجمانی نہیں کی جاتی

اب اس عنوان کے تحت فاضل مضمون نگار کے اعتراضوں کا جواب بھی پیش کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس میں بیشتر وہی امور ہیں جن کی تفصیل کی جا چکی ہے

تحریف قرآن کے متعلق حیات القلوب کی عبارت "ثلث قرآن در فضائل اہل بیت و ثلثے در مثالب دشمنان ایشان است" کے سمجھنے میں اشتباہ ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہی قرآن جو اسوقت موجود ہے اور مسلمانوں کے تمام فرقوں کی مسلم الثبوت کتاب ہے اس کا ثلث حصہ مناقب اہل بیت پر اور ثلث مثالب دشمنان اہل بیت پر مشتمل ہے۔ اس کا وہ مفہوم ہرگز نہیں جسے فاضل مقالہ نگار ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح وہ روایتیں جو کتب شیعہ سے پیش کی گئی ہیں اور جو عدم نص امامت علوی پر (بخیال مضمون نگار) دلالت کرتی ہیں۔ لائق غور ہیں

(۱) اہل تشیع کے مشہور مجتہد بحرانی نے شرح نہج البلاغۃ (مطبوعہ طہران) میں یہ روایت نقل کی ہے۔ خلاصہ روایت یہ ہے کہ حضرت رسول اللہ نے حضرت حفصہ کو خبر دی کہ میرے بعد ابوبکر خلیفہ ہوگا اور اس کے بعد تیرا باپ۔ حضرت حفصہ نے یہ راز حضرت عائشہ سے کہدیا" الخ

یہ مضمون دوسری روایات میں بھی موجود ہے اور یہ چیزیں ہمیشہ سے شیعوں کے پیش نظر رہی ہیں۔ شیعہ نظریہ ان روایات کے متعلق ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ اگر کوئی پیشین گوئی کیجائے تو پیشین گوئی کسی واقعہ کی حقانیت یا عدم حقانیت کی دلیل نہیں ہوسکتی۔ فرض کیجئے آج یہودی فلسطین یا اس کے کسی حصہ پر قابض ہیں اور اس کے متعلق کوئی پیشین گوئی کسی کتاب سماوی میں پائی جائے تو کیا اس سے یہود کی حقانیت پر دلیل لائی جاسکتی ہے

حضرت رسول اللہ نے حضرت علی کو وصیتیں کرتے ہوئے خبر دی ہے کہ میرے بعد یہ امور ظہور میں آئیں گے جس پر علی نے پوچھا کہ میرا رویہ کیا ہونا چاہئے۔ فرمایا "صبر" یہی وہ راز باطنی ہے جس پر اہل دل حیرت کرتے ہیں اور اہل دنیا کوئی طعنہ اٹھا نہیں رکھتے ــــ الغرض یہ پیشین گوئی حضرات خلفاء کی حقیت کو ثابت نہیں کرتی

(۲) جلاء العیون میں لکھا ہے کہ حضرت رسول پر جب مرض کا غلبہ شدید ہوا تو آپ نے چاہا کہ اپنی میراث و جانشینی اپنے چچا حضرت عباس کے سپرد کر دیں۔ حضرت عباس نے کہا یہ کام مجھ سے نہ ہوگا۔ میری بجائے حضرت علی کے سپرد کر دیا جائے" نتیجہ یہ نکالا گیا ہے کہ رسول کریم اپنی وفات کے بعد صرف حضرت علی ہی کو خلافت کا حقدار تصور نہ کرتے تھے

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اصل عبارت نقل کردوں تاکہ مبصر کو مطلب سمجھنے میں آسانی ہوجائے

"اے عم پیغمبر قبول کن وصیت مرا و در اہل من و در زنان من و دیگیر میراث مرا و اداکن دین مرا و وعدہ ہائے مرا بعمل بیاور و ذمۂ من بری بگردان ـــ عباس گفت یا رسول اللہ من مرد پیر عیال دارم و تو از ابر بہاری بخشندہ تری و ال من وفا نمی کند بوعدہ ہائے تو و بخششہائے تو ایں را از من بگردان بسوئے کسے کہ طاقتش از من بیشتر باشد حضرت سہ مرتبہ ایں سخن را اعادہ کرد و در ہر مرتبہ او چنیں جواب گفت پس حضرت فرمود کہ میراث خود را بکسے دہم کہ قبول کند آں را کہ حق قبول کردنی

است و سزاوار آں باشد و چنانچہ تو گفتی جواب نگوید پس با حضرت امیر المومنین خطاب کرد و فرمود یا علی تو بگیر میراث مرا کہ مخصوص
تست و کسے را با تو نزاعے نیست و قبول کن وصیت مرا و عمل بیاور وعدہ ہائے مرا و ادا کن قرضہائے مرا یا علی خلیفہ من باش
در اہل من و تبلیغ رسالات من بعد از من بمردم بکن"

(ترجمہ) "اے چچا میرے اہل کے بارے میں اور میری عورتوں کے بارے میں میری وصیت کو قبول کرو اور میری میراث لے لو۔ میرا قرض ادا کرو اور میرے وعدوں کو عمل میں لاؤ اور مجھے بری الذمہ کر دو۔ عباس نے کہا یا رسول اللہ میں بوڑھا آدمی ہوں عیال دار ہوں آپ ابر بہاری سے بڑھ کر بخشش کرنے والے۔ میرا مال آپ کے وعدوں اور آپ کی بخششوں کے لئے وفا نہیں کر سکتا۔ اس وصیت و میراث کو اس کی طرف پلٹائے جس کی طاقت مجھ سے بیشتر ہو حضرت نے تین مرتبہ اسی ارشاد کو دوہرایا اور ہر مرتبہ عباس نے یہی جواب دیا پس حضرت نے فرمایا کہ اپنی میراث ایسے کو دونگا کہ جو اسے اس طرح قبول کرے جو قبول کرنے کا حق ہوتا ہے اور وہ اس کے لئے سزاوار ہو اور جس طرح تو نے کہا اس طرح جواب نہ دے پس حضرت امیر المومنین سے خطاب کیا اور فرمایا یا علی تو میری میراث لے کہ تجھ ہی سے مخصوص ہے اور کسی کو تجھ سے نزاع کا حق نہیں میری وصیت قبول کر۔ میرے وعدوں کو عمل میں لا۔ میرے قرضوں کو ادا کر اور اے علی میرے اہل میں میرا خلیفہ ہو۔ اور لوگوں پر میرے پیغاموں کی تبلیغ کر" یہ ہے عین عبارت اور اس کا ترجمہ۔ میں اس روایت پر از روئے روایت کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا۔ صرف نفس مضمون کے متعلق عرض کرتا ہوں کہ اس روایت میں میراث کا تذکرہ ہے۔ حضرت رسول اپنے چچا سے فرماتے ہیں کہ اگر میری میراث لینی چاہتے ہو تو ان شرائط کے تحت لے سکتے ہو۔ عباس اپنے افلاس کا عذر کرتے ہیں۔ تین مرتبہ یہی بات دھرائی جاتی ہے تاکہ عباس کے لئے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے اور آخر یہ شئے علی مرتضی کو تفویض ہوتی ہے۔ نزاکت کلام یہ بھی ہے کہ عباس سے فرماتے ہیں "قبول کن وصیت من در اہل من و در زنان من" اور علی سے فرماتے ہیں "علی خلیفہ من باش در اہل من و تبلیغ رسالات من بعد از من بمردم کن" رسول اللہ کے اس ارشاد اور وصیت کا مطلب کیا تھا وہ اس جواب سے ظاہر ہے "یا رسول اللہ من مرد پیر و عیال دارم" ظاہر ہے کچھ خرچ کا معاملہ تھا اور اہل رسول و زنان رسول کی خبر گیری کا بار پڑتا تھا اس لئے انکار کر دیا

میں نہ سمجھ سکا کہ خلافت و امامت سے اسے ربط کونسا ہے۔ واقعاً عباس کے خیال میں بھی یہ بات نہ گزری تھی جو معترض نے پیدا کی اور علی کو بھی جو اس مقام میں خلافت دی گئی ہے وہ خلافت خاصہ ہے یعنی اہل رسول و زنان رسول کے مثل رسول محافظ و نگراں رہیں اور ان کا حکم مثل رسول ان پر جاری ہو۔ غرض معترض کے پیش کردہ نتیجہ سے اس روایت کو کوئی تعلق نہیں

(۳) ملا باقر مجتہد نے حضرت امام جعفر صادق سے روایت کی ہے کہ ایک بار نبی کریم نے بارگاہ ایزدی سے ہزار حاجتیں طلب کیں۔ خدا تعالے نے سب روا کر دیں آخر شب میں حضرت علی بھی مسجد میں تشریف لائے۔ رسول خدا نے فرمایا اے

علی تمہاری خلافت وامامت کے واسطے ہم نے جو دعا کی وہ بارگاہ خداوندی سے منظور نہیں ہوئی۔ (حیات القلوب جلد ۳)

فاضل مقالہ نگار نے اس مقام پر یہ فخریہ عبارت بھی تحریر فرمائی ہے کہ اگر میں حدیث گڑھنے پر آتا تب بھی اس سے زیادہ صاف۔ واضح اور غیر مبہم حدیث گڑھنے میں شاید مشکل کامیاب ہو سکتا۔

اب ذرا اصل عبارت ملاحظہ ہو:۔

"حضرت رسول شبے در مسجد ماند چوں نزدیک صبح شد حضرت امیرالمومنین داخل مسجد شد پس حضرت رسول او را ندا کرد کہ یا علی گفت لبیک فرمود بیا بسوئے من چوں نزدیک شد حضرت فرمود تمام ایں شب را دیدی در اینجا بسر آوردم و ہزار حاجت خود را از خدا سوال کردم و ہمہ را بر آورد و مثل آنہا را نیز برائے تو سوال کردم و باز ہمہ عطا کرد و سوال کردم از برائے تو کہ ہمہ امت را مجتمع گرداند برائے تو کہ ہمہ اقرار کنند بخلافت تو، قبول نکرد و ایں آیات را فرستاد " الم احسب الناس ان یترکوا ان یقولوآمنا وہم لایفتنون ولقد فتنا من قبلہم فلیعلمن اللہ الذین صدقوا ولیعلمن الکاذبین"

(ترجمہ) ایک شب رسول نے مسجد میں قیام فرمایا جب صبح نزدیک ہوئی تو حضرت امیرالمومنین داخل مسجد ہوئے پس حضرت رسول نے آواز دی یا علی، عرض کی لبیک۔ فرمایا میرے پاس آؤ۔ جب نزدیک آئے فرمایا تم نے دیکھا کہ یہ رات میں نے یہیں بسر کی ہے اپنی ہزار حاجتیں خدا سے طلب کیں۔ خدا نے انھیں پورا کیا اور انھیں کی مانند (ہزار حاجتیں) تیرے لئے بھی سوال کیا۔ وہ تمام سوال بھی پورے ہے اور میں نے سوال کیا کہ تمام امت کو تیرے واسطے جمع کردے کہ سب تیری خلافت کا اقرار کریں اور سب تیرے تابع ہوں۔ یہ سوال قبول نہ ہوا اور یہ آیت بھیجی گئیں۔ آلم۔ کیا لوگوں نے گمان کرلیا ہے کہ اتنا کہدینے پر کہ ہم ایمان لے آئے چھوڑ دئے جائیں گے اور ان کی آزمائش نہ کی جائے گی اور البتہ ہم نے ان کو بھی آزمالیا ہے جو ان سے پہلے گزر چکے اور البتہ خدا جانتا ہے جو سچے ہیں اور البتہ خدا خوب جانتا ہے انھیں جو جھوٹے ہیں"

اہل بصیرت جانتے ہیں کہ منزل وحی نے حقایق کو نہایت سادہ زبان میں بیان فرمایا ہے۔ علی کو بتایا جارہا ہے کہ مشیت الہی کسی کو کسی فعل پر مجبور نہیں کرتی۔ لہذا ایسا نہیں ہوگا کہ تمام لوگوں کو خداوند عالم مجبور کرکے تیری خلافت پر مجتمع کرے اور جبر سے کام لیکر انھیں تیرا تابع بنائے۔ بلکہ ایک شان اختیاری کے ساتھ انھیں معرض امتحان میں رکھا گیا ہے اور تو انکے لئے وجہ امتحان ہے۔ اور یہ آیات سورۂ عنکبوت اس مسئلہ پر روشنی ڈال رہی ہیں"

یہ ہے وہ مطلب جو اہل عقل اس حدیث سے اخذ کرتے ہیں۔ اب کیا اہل انصاف میری طرف سے دریافت کرسکتے ہیں کہ فاضل مضمون نگار نے یہ مفہوم کہاں سے پیدا کیا ہے اور " اے علی ہم نے تمہاری ولایت وخلافت کے واسطے دعا مانگی وہ نامنظور ہوئی" یہ کونسی عبارت کا ترجمہ ہے

(۴) ایک روایت عیون الاخبار سے نقل فرمائی گئی ہے کہ حضرت خضر نے علی مرتضیٰ کو رابع الخلفا کہکر سلام کیا

فاضل مناظر نے عیون الاخبار تو نہیں دیکھی۔ اس کا تو یقین ہے لیکن خیر اس امر سے قطع نظر کرتے ہوئے عرض

کرتا ہوں کہ یہ مضمون شیعوں میں مشہور ہے اور معمولی معمولی اہل ممبر بھی اسے بیان کرتے ہیں۔ یہ ایک اصطلاحی جملہ ہے جسکی توضیح یہ ہے کہ خلفائے اربعہ شیعوں کے نزدیک حسب ذیل ہیں :۔

(۱) حضرت آدم (۲) حضرت داؤد (۳) حضرت ہارون (۴) حضرت علی، کہا جائے گا کہ یہ تاویل ہے اور خدا جانے کیا ہے میں عرض کروں گا کہ جس قوم کی اصطلاح ہو وہی اس کی تشریح کی حقدار ہوتی ہے عقلا کبھی اس پر ایراد نہیں کرتے۔ تمام علوم و فنون میں یہی قاعدہ جاری ہے

(۵) نہج البلاغۃ کے حوالے سے یہ عبارت نقل ہوئی ہے :۔

"ان امیر المومنین قال الناس جماعتا و ید اللہ علیہم غضب اللہ علی من خالف الجماعۃ انا و اللہ اہل السنۃ و الجماعۃ"

امیر المومنین نے فرمایا کہ لوگ جماعت ہیں اور جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے اور جو شخص جماعت کی مخالفت کرتا ہے۔ خدا اسپر غضبناک ہوتا ہے۔ خدا کی قسم میں اہل سنت و الجماعت ہوں (یعنی سنت رسول کا پابند ہوں اور مسلمانوں کی مجموعی جماعت کا فرد ہوں)

آخر کلام میں افتخاراً ارشاد ہوا ہے کہ ان روایات کو پیش کر دینے کے بعد غالباً مجھے مزید توضیح کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

اہل علم جانتے ہیں کہ عبارتوں سے جو مطالب وضع کئے جاتے ہیں ان کی حجت پر یقین کرنے کی ایک میزان ہے جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مفہوم صحیح ہے یا غلط اسی معیار پر پیش کردہ عبارت کے مفہوم کو جانچنا چاہتا ہوں۔ ملاحظہ ہو :۔

(۱) لوگ جماعت ہیں (۲) اور جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے (نتیجہ) پس لوگوں پر اللہ کا ہاتھ۔ (مفہوم اول)

(۲) لوگ جماعت ہیں (۲) اور جماعت کی شان یہ ہے کہ اس کی مخالفت سے اللہ غضبناک ہوتا ہے (نتیجہ) پس لوگوں کی مخالفت سے اللہ غضبناک ہوتا ہے (مفہوم ثانی) ماشاء اللہ کیا خوب عبارت اور کیا خوب مفہوم۔

"انا و اللہ اھل السنۃ و الجماعۃ" یہ تو معلوم ہے کہ اصطلاحی معنوں میں تو یہ کلمہ "اھل السنۃ و الجماعۃ" استعمال نہیں ہوا کیونکہ یہ اصطلاح مولد ہے اور بعد کو وضع کی گئی ہے اسی لئے ترجمے میں بھی اس کی توجیہ فرمائی گئی اب معلوم نہیں ہوتا کہ اس جملہ سے کیا فایدہ اٹھانے کی توقع کی گئی ہے

اس کے علاوہ یہ دریافت کرنے کا حق رکھتا ہوں کہ نہج البلاغۃ کے کس خطبہ میں یہ عبارت مرقوم ہے۔ آیا خطبات میں ہے؟ فرامین میں ہے۔ کلمات مختصرہ میں ہے؟ کہاں ہے؟

ارباب علم ہرگز تعجب نہ فرمائیں۔ مذہب عمومی کی بنیاد انھیں دلچسپ صداقتوں پر اٹھائی جاتی ہے اور عوام کو قابو میں رکھنے کے لئے ہمیشہ سے یہی نسخہ استعمال ہوا ہے

سیاسی اختلاف

اس عنوان کے ماتحت اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ مذہب شیعہ کی ابتدا عبد اللہ بن سبا ایک نومسلم یہودی سے ہوئی۔

میں پہلے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ عبداللہ بن سبا کو "نو مسلم" کہنا درست نہیں اس لئے کہ اسوقت جو لوگ مسلمان ہوئے وہ مشرکین قریش ہوں یا غیر قریش۔ یہودی ہوں یا نصرانی۔ سب کے سب نو مسلم تھے۔ سوائے ایک مخصوص خانوادہ کے مخصوص افراد کے کہ ملت ابراہیمی جن کے سینوں میں بطور امانت چلی آرہی تھی۔ اس کے بعد فاضل استرآبادی کی تحریر سے استدلال کیا گیا ہے اور یہ تحریر پیش کی گئی ہے:-

"وکان (عبداللہ بن سبا) اول من شرع بالقول الفریضۃ امامۃ علی"

"عبداللہ بن سبا پہلا شخص تھا جس نے یہ بات نکالی کہ حضرت علی کی امامت مذہبی فریضہ ہے"

اب ارباب نظر انصاف کی آنکھوں سے اس دعوے کو ملاحظہ فرمائیں میں فاضل مضمون نگار کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انکی بدولت کتب رجال کی ورق گردانی کا موقعہ ملا۔ فاضل استرآبادی کا پورا نام ہے "مرزا محمد بن علی بن ابراہیم استرآبادی" کتاب کا نام ہے "تلخیص المقال فی اسماء الرجال" اس کتاب کی عبارت یہ ہے:-

"عبداللہ بن سبا غال ملعون، کان یزعم ان علیا الہ وانہ نبی لعنہ اللہ"

بس عبداللہ بن سبا کے ترجمے میں بھی دو تین سطریں اس کتاب میں مرقوم ہیں۔ اس سے زیادہ ایک حرف نہیں یعنی عبداللہ بن سبا "غالی ہے ملعون ہے۔ وہ گمان کرتا تھا کہ علی خدا ہے اور وہ خود نبی ہے خدا اس پر لعنت کرے"

اگر اس زمین کے اوپر اور اس آسمان کے نیچے کہیں انصاف ہے تو اس علمی خیانت کو دیکھئے اور عبرت حاصل کیجئے۔ مزید توضیح کے لئے علامۂ بہبہانی کا قول بھی نقل کئے دیتا ہوں کہ:-

"عبداللہ بن سبا اصحاب امیر المومنین سے تھا جو کفر کی طرف پلٹ گیا اور جس غلو کا اظہار کیا۔ حضرت صادق سے منقول ہے کہ عبداللہ بن سبا نبوت کا مدعی تھا اور گمان کرتا تھا کہ امیر المومنین خدا ہے۔ یہ خبر امیر المومنین کو پہونچی۔ آپ نے اسے بلایا اور پوچھا اس نے اقرار کیا اور کہا تو ہی خدا ہے اور میرے دل میں یہ بات ڈالی گئی ہے کہ تو خدا ہے اور میں نبی ہوں امیر المومنین نے اس سے فرمایا کہ تجھے شیطان نے مسخرہ بنایا ہے۔ اس قول سے رجوع کر تیری ماں تیرے ماتم میں بیٹھے۔ آپ نے اصرار کیا اور اس نے انکار۔ حضرت نے اسے تین دن قید رکھا اور چاہا کہ توبہ کرے مگر اس نے توبہ نہ کی اسے قید خانہ سے نکالا اور آگ میں جلا دیا"

ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ عندالشیعہ "عبداللہ بن سبا" کی کیا ہستی ہے۔

اب یہیں سے عین اللہ و یداللہ وغیرہ کی بابت سن لیجئے اگر بروایت صحیحہ یہ کلمات علی کی زبان سے یا کسی دوسرے معصوم کی زبان سے نکلے ہوئے ثابت ہو جائیں تو بیشک ان پر گفتگو ہو سکتی ہے گو یہ بھی شیعی معتقدات کے آسمانی تخیل کو متاثر نہیں کر سکتے۔ البتہ علمائے سنت والجماعت میں بہ کثرت ایسے حضرات مل سکتے ہیں جنھوں نے اس سے بھی بڑھ کر کچھ کہا ہو پھر ان کے متعلق کیا رائے ہے؟

علامہ مجلسی کا قول حضرت امام حسین کی بابت جو نقل کیا گیا ہے کہ وہ زندہ آسمان پر اٹھا لئے گئے یہ ایک گروہ کا قول نقل ہوا ہے اس سے شیعی اصول مذہب کا کیا تعلق اور کسی طائفہ گمنام کا قول نقل کر دینا کس جرم میں داخل ہے؟

شیخ ابو جعفر طوسی سے جو روایت نقل کی گئی ہے اس کی صحت بھی اگر تسلیم کر لی جائے تو اس کے معنی یہ ہیں "کہ محبت اہل بیت تمام اعمال کی روح ہے"۔ یہ عقیدہ شیعہ ہے۔ حضرات اہل سنت نہیں مانتے نہ مانیں۔

اب رہا دوست دشمن کے متعلق ارشاد علوی۔ اس کے متعلق "کلینی" اور "مسدی" کا بے تکا جوڑ ملانے کی ضرورت نہیں۔ یہ قول نہج البلاغۃ میں موجود ہے:۔ " **ھلک فی رجلان محب غال و مبغض قال**"۔ میرے بارے میں دو شخص ہلاک ہوئے۔ وہ دوست جو غلو کرے اور وہ بغض رکھنے والا جو میرے مرتبہ میں کلام کرے

غلو کی حالت تو معلوم ہو گئی اب یہ مراتب علویہ میں کلام کرنے والا کون ہے؟ ارباب نظر اس کی تنقید فرمائیں منقولات کے متعلق انتہائی اختصار کے ساتھ مجھے جو لکھنا تھا لکھ چکا۔ اس تحریر میں میرا نقطۂ نگاہ اس مجیب کا سا ہے جس نے صرف دفع ایراد کے لئے قلم اٹھایا ہو۔ ورنہ اثبات مطلب کے لئے میدان دوسرا ہے

آخر میں یہ سوال ضرور کرنا چاہتا ہوں کہ "عبداللہ بن سبا" کے واقعہ کو سیاسیات سے کیا تعلق ہے۔ ایک شخص اسلام لایا پھر کفر اختیار کیا۔ علی کو خدا کہنے لگا۔ اسے جلا دیا گیا، اس میں کونسا سیاسی پہلو ہے اگر کہا جائے کہ وہ اصحاب علی میں سے تھا تو اس سے ذات علی یا دیگر اصحاب علی یا تشیع پر کیا الزام؟ بات دور جاتی ہے اور میں اس عنوان کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔

اب میں اس ایراد کی طرف توجہ کرتا ہوں جسے طرح طرح کی رنگ آمیزیوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور کیا جا رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ شیعہ مسلک کی بنیاد دوسروں سے نفرت پر قایم ہوئی ہے

قارئین کرام کی خدمت میں التماس ہے کہ مذہب شیعہ کے اصول یہ ہیں:۔ (۱) خدا کو واحد و یکتا ماننا (۲) خدا کو عادل ماننا (۳) نبوت خاتم النبیین پر ایمان لانا اور انبیا کو معصوم سمجھنا (۴) خلافت و امامت کو من اللہ قبول کرنا (۵) روز جزا پر اسی حیثیت سے ایمان لانا جس حیثیت سے پیغمبر نے تعلیم دی ہے

ان اجزا پر نظر کرتے ہوئے مجھے نہیں معلوم ہوتا کہ کس جزو کی بنا پر مذکورۂ بالا الزام درست ہو سکتا ہے

ہاں خلافت کے معاملے میں وہ لوگ جو دنیوی حیثیت سے مسلمانوں کے حاکم بنے، شیعوں کے نزدیک انھیں مذہبا کوئی اہمیت نہیں دی جاتی اور ایسے چند اشخاص کے خلاف جو مبعوث یا منصوص من اللہ ہیں وہ اپنے نقطۂ نظر سے مخالفانہ اظہار خیال پر مجبور ہیں

یہ ایک فطرت انسانی ہے کہ انسان جس شے کو اچھا نہیں سمجھتا۔ اس سے اظہار برأت کر ہی دیتا ہے۔ اگر انبیاء کا فعل قابل اقتدا ہے تو سورۂ توبہ کی اس آیت کو پڑھئے:۔ " **وما کان استغفار ابراہیم لابیہ الاعن موعدۃ**

وعدھا ایاہ فلما تبین لہ انہ عدو للہ تبرا منہ ان ابراہیم لاواہ حلیم ؕ

اس سے پتہ چلتا ہے کہ جو شخص اپنے دوست کا دشمن ہو اس سے اظہار برات کرنا علم کے خلاف نہیں ہے۔

اس مسئلہ کی نظری حیثیت اتنی ہی ہے۔ اب رہا دوسروں کے جذبات کا احترام البتہ یہ ضروری شے ہے لیکن مثل مشہور ہے کہ "اکرم تکرم" اکرام کرو تمھارا بھی اکرام کیا جائے گا۔ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ اگر کوئی طبقہ اپنی کثرت کے اعتبار پر خود جس طرح چاہے عمل کرے اور قلت سے اپنے جذبات کے احترام کا متمنی رہے تو یہ نباہ کی باتیں نہیں ہیں۔

ذاکر حسین

غالب پھر اس دُنیا میں

(پروفیسر فراق گورکھپوری کی تقریر جو ۲۳ جون کو لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے نشر کی گئی)

جب میں اس دنیا میں تھا تو بے چین ہو کر ایک بار میں نے کہا تھا:-

موت کا ایک دن معین ہے		نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آج موت کی گہری نیند پھر اُچٹ گئی - کیا نیند، کیا موت، دونوں میں کسی کا اعتبار نہیں - جب زندہ تھے تو زندگی کا رونا تھا اور موت کی تمنا تھی - میں نے کہا تھا:-

قیدِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج		شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

شمع اور سحر کا کیا ذکر ہے - میں نے تو کھلی کھلی بات کہدی تھی - ہاں ایک اور شعر یاد آگیا:-

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجئے		ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

لیکن ذوقؔ نے اس سے بھی زیادہ لگتی ہوئی بات کہی تھی - وہ نہ جانے یہ شعر کیسے کہہ گئے تھے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے		مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

ہاں تو میں کہاں ہوں - ابھی میرے حواس درست نہیں - لیکن یہ زمین اور یہ آسمان تو کچھ جانے بوجھے معلوم ہوتے ہیں - لوگوں کو ایک طرف بڑھتا ہوا دیکھ رہا ہوں میں بھی انھیں کے ساتھ ہو لوں - "پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں"

اب ان راستوں پر پالکیاں جاتی ہوئی نظر نہیں آتیں - گھوڑوں کی گاڑیاں چل رہی ہیں - لیکن ان کی شکل و صورت بالکل بدلی ہوئی ہے - آنکھوں کے سامنے بیسیوں ایسی گاڑیاں بھی گزر گئیں جن میں کوئی جانور جُتا ہوا نہیں تھا - سُن رہا ہوں کہ لوگ انھیں موٹر کار کہتے ہیں - ان کل پرزوں سے چلنے والی گاڑیوں میں تیزی اور بھڑک تو بہت ہے لیکن پرانی سواریوں کی بات ان میں کہاں - خیر یہ تو ہونا تھا - آج سے نہ جانے کتنے برس پہلے جب میں اس دنیا میں تھا زمانہ کروٹ بدل چکا تھا - یہ کایا پلٹ آنکھوں کے لئے نئی چیز ہو اور دل و دماغ کو بھی حیرت میں ڈالدے، لیکن میری آنکھوں نے تو اسی وقت جب پچھلی زندگی باقی تھی وہ وہ انقلاب دیکھے تھے کہ اب کیا کہوں، حیرت کیا کروں اور کس بات پر کروں - بچپن اور جوانی میں قلعے کے رنگ ڈھنگ کو دیکھا

تھا۔ مغل دربار کی جھلملاتی ہوئی شمع "داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی" پھر بھی ایک نیا رنگ پیدا کر رہی تھی۔ شہر کے شریفوں اور رئیسوں کی زندگیاں دیکھی تھیں۔ دور دور تک کا سفر گھوڑوں پر، بہلیوں پر، پالکیوں پر اور ڈاک گاڑیوں پر طے کیا تھا پھر ۱۸۵۷ء کا غدر ہوا، غدر کیا، ہوا قیامت آگئی۔ اس کے بعد پچھلی ہی زندگی میں ریل کی سواری پر دلی سے کلکتہ کا لمبا سفر پورا کیا۔ معلوم نہیں کلکتہ کی شان اب کہاں سے کہاں پہونچ گئی ہوگی۔ اُسی وقت یہ شہر دلہن بنا ہوا تھا۔ جس کی یاد سے اب بھی تڑپ اُٹھتا ہوں:۔

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں، ایک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

اور یوں تو نہ کچھ رونق میں رکھا ہے نہ اُجڑی حالت میں رکھا ہے۔ نہ آبادی میں نہ ویرانے میں۔ پھر بھی جو کچھ ہے اور جیسا کچھ ہے غنیمت ہے:۔

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانئے بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

انسان جب زندگی کی مصیبتوں سے پریشان ہو جاتا ہے تو اُسے دُنیا چھوڑنے کی سوجھتی ہے۔ اپنے کو دھوکا دینے اور غلط راستہ پر چلنے کو اکثر لوگ خدا کی تلاش یا سچائی کا پا جانا سمجھتے ہیں۔ لیکن اس سچائی کی بھی سچائی مجھے معلوم ہے:۔

ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت جب پا نہ سکے اُسکو تو آپ اپنے کو کھو آئے

دنیا کو چھوڑ کر تو پیغمبر بھی کچھ نہیں ہوتا

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

میں اپنے خیالات کی دھن میں کہاں نکل آیا۔ یہ تمام چیزیں یہ مکانات اور یہ آبادی نئی بھی معلوم ہوتی ہیں اور پرانی بھی۔ اجنبی بھی اور مانوس بھی۔ وہ سامنے دھندلے سے لال قلعہ نظر آرہا ہے کچھ دور پر جامع مسجد کے برج اور مینار نظر آرہے ہیں۔ میں دلی ہی میں ہوں۔ ہائے دلی! وائے دلی!!

اس بازار کی شان تو دیکھنے کی چیز ہے۔ چاندنی چوک! اچھا یہ وہی پرانا چاندنی چوک ہے جو بار بار لٹا اور بار بار آباد ہوا۔ اُجڑا اور بسا۔ اس کا نام تک نہیں بدلا۔ یہاں تو نئی زندگی کے شور و پکار میں بھی یہاں کی نئی آوازوں میں بھی پرانے نام کان میں پڑ رہے ہیں۔ کوچہ چیلان کوچہ بلیماراں ان دو محلوں میں برسوں میرا قیام رہا ہے۔ بہار آتی ہے اور چلی جاتی ہے لیکن باغ وہی رہتا ہے

اس بازار میں اُس دوسری دنیا سے پلٹ کر کیا خریدیں۔ جب زندہ تھے تبھی یہ حال تھا کہ:۔

درم و دام اپنے پاس کہاں چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

لیکن اس طرف کچھ کتاب بیچنے والوں کی دوکانیں ہیں۔ کتابوں کی دنیا مردوں اور زندوں دونوں کے بیچ کی دنیا ہے یہاں ہر شخص کہہ سکتا ہے کہ "ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں" چلیں ذرا کتابوں کی اس خیالی دنیا کی سیر کریں۔ وہ

ایک طرف الماری میں کوئی نہایت اچھی اور قیمتی کتاب رکھی ہوئی ہے۔ جلد تو دیکھو کیسی خوبصورت ہے۔ سنہرے حرفوں سے کچھ لکھا ہوا بھی ہے۔ اُس کے برابر چھوٹی چھوٹی کتابیں دیکھنے میں کیسی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔" ارے بھئی ذرا یہ سامنے لگی ہوئی کتابیں تو اُٹھا دینا وہی جو سامنے کے تختے پر الماری میں لگی ہوئی ہیں۔ چھپائی اور لکھائی کے یہ کھیل پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے دیوان غالب، دیوان غالب، دیوان غالب۔ مرقع چغتائی!! میری آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں۔ برلن اور ہندوستان کے کئی شہروں سے یہ کتابیں نکلی ہیں۔ کیوں بھئی ذوق اور مومن، ناسخ اور آتش، میر اور سودا یہ سب کے سب غالب سے زیادہ مشہور تھے ان کے کلام تو اور ٹھاٹ سے چھپے ہوں گے۔ ذرا انھیں بھی دیکھوں۔ کیا کہا؟ صرف غالب کے دیوان اس اہتمام سے نکلے ہیں۔ پھر کیا کہا؟ آج غالب کی کہی ہوئی باتوں کا سارے ہندوستان میں شور ہے غالب پر کتابیں اور غالب پر مضامین کثرت سے نکل رہے ہیں۔ اچھا یہ کہنا بھی کسی ڈاکٹر بجنوری کا ملک میں مشہور ہے کہ ہندوستان کی دو بڑی کتابیں ہیں ایک وید مقدس اور دوسری دیوان غالب۔ تو صرف رہنا سہنا ہی اس ملک کا نہیں بدلا ہے بلکہ مذاق شاعری کی بھی کایا پلٹ گئی ہے۔ ہاں اب آپ دوسرے گاہکوں کی طرف متوجہ ہوں۔ شکریہ۔ اب میں اپنے اس شعر کو کیا کہوں۔

ہوں خفائی کے مقابل میں ظہوری غالب میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

پہلی زندگی میں دوسروں کی شہرت کے کھیل دیکھے تھے۔ مرنے کے بعد اپنی شہرت کے کھیل دیکھ رہا ہوں وہ زندگی کی چھیڑ تھی یہ موت کی ہے

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا،
ہم نے مانا کہ کچھ نہیں غالب مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

اس مرقع چغتائی کو کیا کہوں۔ اگر میرے اشعار تصویر کے نیچے نہ لکھے ہوتے تو میں بھی ان تصویروں کو نہ سمجھتا خیر تو ان لکیروں اور رنگوں سے میرے شعروں کا مطلب سمجھایا گیا ہے۔ نہ دیوان غالب ہوتا نہ تصویر بنانے والا اپنا یہ کمال دکھا سکتا۔ کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

بہر حال غزل کے مطلب کو تصویر کے پردوں سے ظاہر کرنے کی ادا کو میں کچھ سمجھا کچھ نہیں سمجھا۔ زیادہ تر تصویریں بے لباس ہیں

ق ہر رنگ رقیب سرو ساماں نکلا قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

خیر اتنا تو ہوا کہ "چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط" ایک جگہ کر دئے گئے۔ حسینوں کے خط یعنی ان کی شوخ طبیعت اُن کے چنچل مزاج کی وہ تصویریں جو میرے اشعار میں اکثر دکھائی دیتی ہیں اور یوں تو حسینوں کے خطوط بھی معلوم۔

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں ہم جانتے ہیں جو وہ لکھیں گے جواب میں

خیر مشہور ہوئے تو کیا اور نہ ہوئے تو کیا۔ میرا وہ فارسی کلام جس کا ہندوستان میں جواب نہیں تھا وہ اس دوکان

میں نظر نہیں آتا۔ میرے چند اشعار سے اگلے وقتوں کے لوگوں کو اور ممکن ہے آج کل کے لوگوں کو بھی یہ دھوکا ہو کہ میں نے اپنی شہرت کی ساری وجہ اپنے فارسی کلام کو جانتا تھا اور اُردو کی بڑائی کو میں نہیں سمجھا تھا۔ یہ ایک مزیدار دھوکا ہے۔ اُردو آگے بڑھ کر کیا کچھ ہونے والی تھی۔ اسی کی جھلک میں دیکھ چکا تھا۔ میرے اُردو کلام کے چند شعر جن میں فارسی زیادہ تھی۔ لوگ لے اُڑے تھے اور یہ نہ دیکھ سکے تھے کہ میں نے غزل کو کتنی چنچل، کتنی ٹکسالی، کتنی چٹیلی، کتنی جیتی جاگتی، بولتی چالتی چیز بنا دی تھی۔ اگر میں اُردو کی اہمیت کو نہ سمجھتا تو اپنے ان خطوط کو جن میں میں نے چٹھی کو بات چیت بنا دیا تھا اس احتیاط اور اس اہتمام سے بچا کر نہ رکھتا۔ قریب قریب سب سے چھوٹا اُردو دیوان میں نے چھوڑا تھا اور مجھے یقین تھا کہ سب سے زیادہ میرے ہی اشعار لوگوں کی زبان پر ہوں گے۔ اب یہاں مجھے بہت دیر ہو چکی۔ کتاب بیچنے والا بھی اپنے دل میں کیا کہتا ہوگا۔ یہ ایک اخبار رکھا ہوا ہے۔ کیوں بھئی اس پر آج ہی کی تاریخ ہے نا؟ اچھا تو آج ۲۴ جون ۱۹۳۸ء ہے مجھے کچھ یاد آتا ہے کہ میں ۱۸۶۹ء تک زندہ تھا۔ اُس کے بعد دوسری دنیا کی زندگی تھی اور اُس میں ماہ و سال کہاں، آج اس دنیا سے گئے ہوئے ستر برس ہونے کو آئے۔ اتنے بڑے عرصہ میں، میں محض اپنی شہرت اور کامیابی کا حال جان کر خیر، ایک طرح خوش تو ہوں۔ لیکن یہ جاننے کے لئے بے چین ہوں کہ ہندوستان میں اب کیسی شاعری ہو رہی ہے۔ کوئی کتب خانہ تو پاس ہوگا۔ لوگ کسی ہارڈنگ لائبریری کا پتہ دے رہے ہیں۔ اچھا دیکھوں یہاں کیا ہے۔ داغ، امیر، حالی، اکبر، اقبال، حسرت موہانی، جگر، اصغر، شاد عظیم آبادی، عزیز، جوش اور دوسرے شعراء کے مجموعے یہاں نظر آرہے ہیں، اُن میں داغ اور امیر کو تو میں پچھلی زندگی ہی میں جانتا تھا۔ حالی تو میرے سب سے ہونہار شاگردوں میں تھے اکبر سے بیسیوں برس پہلے اس دوسری دنیا میں ملا تھا جہاں سے خود آیا ہوں اور جہاں تمام مرے ہوئے شعرائے کے ساتھ یہ سب بزم سخن کی رونق بن گئے ہیں۔ وہاں اکبر کا ساتھ چھوڑنے کو تو جی نہیں چاہتا تھا اور اقبال تو ابھی ابھی وہاں پہونچے ہیں۔ اس شخص کی شہرت وہاں برسوں پہلے پہونچ چکی تھی اور فرشتوں کی زبانوں پر اقبال کے نغمے برسوں پہلے سے تھے۔ میں نے اُردو میں جس طرح کی شاعری کی داغ بیل ڈالی تھی، شاعری کو جو عظمت دینا چاہی تھی۔ میری یہ کوشش اقبال ہی کے ہاتھوں پروان چڑھی۔ حسرت موہانی کا کلام دیکھا۔ مومن، جرأت، مصحفی ... کا رنگ ... چمک گیا۔ جگر، اصغر، شاد، عزیز، چکبست، اور سرور جہاں آبادی ان ... ہے لیکن ... نہیں روک تھام اور گہری نظر کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ دیکھوں یہ یاس یگانہ کون شخص ہے اور ... کی آیات ... میں کیا ہے۔ شعر تو جاندار ہیں بیان کا طریقہ بھی کہیں کہیں اُستادانہ ہے۔ آتش کی گرماگرمی اور تیزی بھی مل جاتی ہے لیکن غالب کا نام اس شخص پر بھوت کی طرح سوار ہے خیر۔ "وہ کہیں اور سنا کرے کوئی"۔ مرزا قتیل کی یاد تازہ ہو گئی۔ غالب نہ جانے کتنے شاعروں کی دکھتی ہوئی رگ ہے۔ میں اُردو میں مسلسل نظم کی ترقی دیکھ کر خوش ہوں

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل — کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے

غزل ہو یا نظم سنجیدگی، مذاق کی پاکیزگی اور گری ہوئی باتوں سے بچنا بھی وہ خوبیاں ہیں جو شاعری کو پیغمبری کا درجہ دیتی ہیں ہاں کچھ عجیب اور غلط باتیں بھی میرے بعد کی شاعری میں نظر آتی ہیں۔ ایک صاحب غالب کی جانشینی کا دعوی یوں کرتے ہیں کہ جس طرح میر کے ستاسی برس بعد غالب کا زمانہ آیا اسی طرح غالب کے ستاسی برس بعد وہ پیدا ہوئے۔ حالانکہ ہر وقت اور میرے زمانہ کے ۸۷ برس بعد بھی بیوقوف دنیا میں پیدا ہو سکتے ہیں اپنے کچھ اچھے کچھ بُرے اشعار کو لوگ الہام بھی بتانے لگے ہیں۔ اپنی غلط اور بے ڈھنگی نقالی بھی دیکھتا ہوں بہت ہو رہی ہے۔ جہل فارسی ترکیبیں ایک نئی قسم کی مشکل پسندی، لفظ پرستی اور شعریت سے معرا بلند آہنگی اور اظہار علمیت یہاں تک کہ غیر موزوں کلام کو بھی شاعری کہا جاتا ہے یہ سب باتیں بھی آج کل کے شعراء میں آگئی ہیں۔ میں اردو نثر اور اردو رسالوں اور اخباروں کی کثرت اور آب و تاب کو دیکھکر بھی خوش ہوں۔ رقعات غالب گویا اس بات کی پیشین گوئی تھے ـــ یہ سب صحیح، لیکن دلی کی پچھلی صحبتیں یاد آگئیں اور دل کو تڑپا گئیں۔ اب نہ ذوق ہیں نہ مومن نہ شیفتہ نہ حالی نہ داغ نہ مجروح نہ انور۔ خیر شعر و شاعری ہی تو ساری زندگی نہیں ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ ملک پھر جاگ رہا ہے۔ اس کی تمام قومیں ملکر ایک نئی زندگی پیدا کرنے کی کوشش میں ہیں۔ اپنا شعر مجھے یاد آیا

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

میری نظر یہ بھی دیکھ کر خوش ہیں کہ انگریزوں کی تہذیب انکے علم و فن سے فایدہ اُٹھاتے ہوئے بھی ہندوستان اپنی تہذیب کو پھر سے زندہ کرنا چاہتا ہے

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

اب شام ہو رہی ہے۔ میں صرف ایک پل کے لئے اس دنیا میں آیا تھا۔ شاید مجھے آئے ابھی کچھ وقت نہیں ہوا اور پل مارتے میں نے یہ سب کچھ دیکھ لیا۔ دوسری دنیا کا ایک پل اس دنیا کی ایک صدی کے برابر ہوتا ہے۔ ہم اہل عدم ایک پل میں جو کچھ دیکھ لیتے ہیں دنیا میں اُسکے لئے اک عمر چاہئے۔ اب نہ وہ دلی ہے نہ ستر برس پہلے کا زمانہ۔ نہ مرزا ہرگوپال تفتہ ہیں کہ اس بے سر و سامانی میں میری پیاس بجھائیں۔ اب تو قرض کی بھی نہیں پی سکتے۔ اخباروں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اب شراب اس ملک میں بند ہونے والی ہے

مے بہ زہاد مکن عرض کہ این جوہر ناب
پیش این قوم بہ شورابۂ زمزم نرسد

ہندوستان بہت بدل چکا ہے۔ لیکن اگلے وقتوں کے لوگ معلوم ہوتا ہے ابھی باقی ہیں

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

خیر شراب سے نشاط اور خوشی کس کافر کو درکار ہے

یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے ـــ اور وہ بیخودی مجھ پر چھا چکی ہے۔ دنیا کے حسن کے کرشمے دیکھ چکا ـــ میں اسی تماشہ کو قیامت کہتا ہوں۔ میں خاک ہو چکا تھا

بجز پرواز نازِ شوق کیا باقی رہا ہوگا
قیامت اک ہوائے تند ہے خاکِ شہیداں پر

پھر آنکھ کھل گئی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی ،

ریاستوں کے مطالبات آزادی

اور

آئینِ وفاق

آئینِ وفاق کے نفاذ کی راہ میں ہم کو اسوقت سب سے بڑے دو پتھر حایل نظر آتے ہیں۔ ایک برطانوی ہند کا یہ مطالبہ کہ جب تک جدید ایکٹ میں بعض معقول تبدیلیاں نہ کی جائیں وہ اس کے قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتا اور دوسرا ریاستوں کا یہ اصرار کہ جب تک ان کی آزادی و خود مختاری کا فیصلہ نہ ہو جائے وہ شرکت کے لئے طیار نہیں ہو سکتیں

برطانوی ہند میں جس جماعت کی طرف سے شدید اختلاف ظاہر کیا جا رہا ہے وہ کانگرس ہے اور اس لحاظ سے کہ ملک میں اکثریت اسی جماعت کی ہے، یہ اختلاف آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا، لیکن چونکہ یہ راز غالباً اب راز نہیں رہا کہ اس اختلاف کی اخلاقی و معنوی حیثیت بہت کمزور ہے اور اگر گاندھی جی اعلانِ وفاق کے وقت تک زندہ رہے (اور بظاہر ان کے زندہ نہ رہنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی) تو آخر آخر کانگرس ضرور شرکتِ وفاق کے لئے آمادہ ہو جائے گی اس لئے حکومت کو اس طرف سے اطمینان ہو گیا ہے، رہ گیا رئیسوں اور ریاستوں کا معاملہ سو اس کا فیصلہ بھی آخر کار وہی ہوگا جو حکومت چاہتی ہو یہ اور بات ہے کہ آزادی و محکومی کی جو غیر ضروری بحث اسوقت چھڑ گئی ہے اس سے وفاق کے نفاذ میں کچھ تاخیر پیدا ہو جائے۔

ہندوستانی ریاستیں آج سے نہیں بلکہ بہت قدیم زمانہ سے یہاں پائی جاتی ہیں۔ اشوک کے زمانے میں بھی یہاں بہت سے چھوٹے چھوٹے راجہ پائے جاتے تھے اور چندر گپتا کے عہد حکومت میں بھی، ہرش کا سیاسی نظام بھی ریاستوں کے وجود سے خالی نہ تھا اور جب چینی سیاح یوانگ شنگ یہاں آیا تو اسوقت بھی ریاستیں یہاں موجود تھیں۔ لیکن صحیح معنے میں آزادی یا خود مختاری جس چیز کا نام ہے وہ ریاستوں کو اسوقت بھی حاصل نہ تھی۔ جب مسلمانوں کی حکومت شروع ہوئی تو اسوقت بھی یہاں کے رؤساء فرمانروایان اسلام کو اپنا بادشاہ تسلیم کرتے تھے، خصوصیت کے ساتھ مغلوں کے زمانہ میں کہ اُسوقت تو مرکزی حکومت کا دباؤ ان پر تقریباً اتنا ہی پایا جاتا تھا، جتنا اسوقت۔ ان کی خود مختاری کو کبھی تسلیم نہیں کیا گیا چنانچہ کوئی رئیس اپنا جانشین بھی بغیر بادشاہ کی اجازت کے مقرر نہیں کر سکتا تھا

جب دولت مغلیہ پر زوال آیا تو رئیسوں نے اپنے آپ کو آزاد سمجھنا شروع کیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی عملداری تک تقریباً سب کے سب خود مختار ہوگئے، لیکن اس آزادی و خود مختاری کی عمر بہت تھوڑی ثابت ہوئی، کیونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کے ساتھ ساتھ ریاستوں کی آزادی بھی کم ہوتی گئی اور باہمدگر جو معاہدے ہوئے ان میں ریاستوں کی محکومیت ہی کا پلہ جھکا ہوا ہوتا تھا مثلاً سنہ ۱۸۱۹ء کے معاہدۂ اُدے پور کی رو سے راجہ، کمپنی کا محکوم ہوگیا اور سنہ ۱۸۴۴ء میں ہولکر کی گدی کے لئے گود لینے کا سوال اس شرط پر منظور کیا گیا کہ وہ حکومت برطانیہ کو اپنا حاکم سمجھتا رہے

تاریخی حیثیت سے ریاستوں کے نشوونما پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب چارلس دوم کے زمانہ میں کمپنی کو غیر عیسائی طاقتوں سے صلح و جنگ کا اختیار دیا گیا تو کمپنی نے سب سے پہلے سنہ ۱۷۲۳ء میں راجہ ٹراونکور سے معاہدہ کیا، اس کی رو سے کمپنی نے سامان جنگ رکھنے کے لئے ایک قلعہ تعمیر کرایا۔ دوسرا معاہدہ سنہ ۱۷۳۰ء میں (Savantavadi) سے ہوا جو (Angria) کے بحری قزاقوں کے استیصال کے لئے عمل میں آیا تھا، اسی طرح کا ایک معاہدہ سنہ ۱۷۳۳ء میں ریاست جنجیرا سے ہوا۔ لیکن یہ تمام معاہدے چھوٹے چھوٹے سرداروں سے ہوئے تھے جنھیں کوئی سیاسی اہمیت حاصل نہ تھی جنگ پلاسی کے بعد کمپنی اور حیدرآباد کے معاہدہ نے جو سنہ ۱۷۵۹ء میں ہوا تھا، کمپنی کے اختیارات میں بہت اضافہ کردیا۔ اسوقت کمپنی کو مرہٹوں، فرانسیسیوں اور آصف جاہ کی طرف سے حملہ کا اندیشہ تھا، اس لئے اس نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ ان ریاستوں سے جو کمپنی کے علاقہ سے متصل تھیں (Subsidiary Alliance) کرے۔ چنانچہ صحیح معنے میں سب سے پہلا معاہدہ اس قسم کا نواب اودھ سے ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزی فوجیں لکھنؤ میں فاتحانہ داخل ہوچکی تھیں اور اگر کمپنی چاہتی تو لکھنؤ کو اپنے قبضہ میں کرلیتی، لیکن مالی مشکلات کی وجہ سے کمپنی نے ایسا نہ کیا اور شجاع الدولہ کو اودھ کے تخت پر اس شرط کے ساتھ بحال رکھا کہ نواب اُس فوج کے مصارف برداشت کرے گا جو کمپنی کو اس کی مدد کے لئے رکھنا پڑے گی

اس معاہدہ کی رو سے نواب وزیر اودھ اندرونی معاملات میں خود مختار تھا، لیکن جوں جوں کمپنی کی طاقت میں اضافہ ہوتا گیا، اس کی حیثیت محکوم کی سی ہوتی گئی، یہاں تک کہ ہیسٹنگز کے زمانہ میں وزیر پورے طور پر انگریزی حکومت کا تابع ہوگیا اور اس نے کمپنی کو معاہدوں میں ردوبدل کا پورا اختیار دیدیا۔ اس کے بعد بنارس کے معاہدہ کی رو سے اودھ کی حیثیت ایک صوبہ کی سی ہوگئی اور پھر کارنوالس اور جان شور کے بعد نواب کے اختیارات بالکل سلب ہوگئے۔ اس کے بعد جب مارکوئس ولزلی گورنر جنرل ہوکر آئے تو وزیر سے دوآبہ کا علاقہ چھین کر کمپنی کی حکومت میں شامل کرلیا گیا اور گورنر جنرل کو نواب کے اندرونی معاملات میں بھی دخل دینے کا حق حاصل ہوگیا

کرناٹک کی تاریخ بھی ایسی ہی ہے۔ نواب ارکاٹ کو کمپنی کی نگرانی میں گدی پر بٹھایا گیا اور اندرونی معاملات میں اس کو بالکل آزاد کیا گیا یہاں تک کہ شاہ انگلستان کی طرف سے ایک ایلچی وہاں رہا کرتا تھا، لیکن بعد کو میسور کی طاقت کا خاتمہ

ہونے کے بعد کرناٹک پر بھی قبضہ کر لیا گیا

ولزلی کے زمانہ میں اعانتی عہدناموں (Subsdiary Alliance) کی طرف زیادہ توجہ کی گئی اور یہی مناسب سمجھا گیا کہ دیسی ریاستوں کے بقا سے انگریزی حکومت کو بہت مدد ملے گی، چنانچہ نظام، پیشوا، ہولکر اور راجپوتانہ کی بعض ریاستوں سے اسی طرزِ عمل کے تحت معاہدے کئے گئے۔ ۱۷۶۶ء میں نظام کا معاہدہ اور اس کے بعد سندھیا اور بھونسلا کا معاہدہ اور پھر ۱۸۰۱ء میں گیکوار کا معاہدہ سب اسی قسم کے اعانتی معاہدے تھے

ان تمام عہدناموں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حیثیت بظاہر ایسی ہی تھی جیسی خودمختار حکومتوں کے معاہدے کی ہونی چاہئے لیکن یہ عہد و پیمان زیادہ دیرپا ثابت نہ ہوا۔

ولزلی کے زمانہ تک تو حالات میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی، کیونکہ وہ اس پالیسی کے خلاف تھا کہ ریاستوں کے اندرونی نظم و نسق میں مداخلت کر کے ان کو کمزور بنا دیا جائے لیکن اس کے بعد بارلو اور کارنوالس کے زمانہ میں یہ پالیسی بالکل بدل گئی اور پھر ولزلی کے زمانہ کے عہدناموں کو تقریباً کالعدم کر دیا گیا

اس کے بعد ہیسٹنگز کا زمانہ آیا۔ یہ چاہتا تھا کہ ہندوستان میں بالکل برطانوی ملوکیت قایم ہو جائے، اس لئے تمام قدیم معاہدوں کو بدل کر رکھ دیا اور اعانتی عہدناموں سے جو پوزیشن ریاستوں کا قایم ہو چکا تھا اس کی جگہ (Feudalary system) نے لے لی اور کمپنی تمام ہندوستان کی حاکم مطلق بن گئی۔ اب چونکہ کمپنی طاقتور ہو گئی تھی اور اسے ان ریاستوں کی مدد کی ضرورت نہ تھی اس لئے اس وقت کے تمام معاہدے محض برطانیہ کے وقار کو دوبالا کرنے کے لئے تھے۔ چنانچہ راجپوتانہ کی ریاستوں سے اسوقت جتنے معاہدے ہوئے ان سب کا مقصود ریاستوں کا محکوم بنانا تھا نہ کہ ان سے اتحاد پیدا کرنا۔ یہی حال وسط ہند کی ریاستوں کا ہوا کہ سوائے اورچھا، دتیا اور سمتھر کے باقی سب کو اسناد، معافیاں یا اقرارناموں سے ٹال دیا گیا۔

الغرض اس طرح ۱۴۵ ریاستیں کمپنی کی محکوم ہو گئیں

کاٹھیاوار کی ریاستوں سے براہ راست معاہدے نہیں کئے گئے بلکہ گیکوار کی ریاست کی وساطت سے کئے گئے اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بالکل برطانوی حکومت کے تحت میں آگئیں۔ اس کے بعد پنجاب کی چھوٹی ریاستوں کے اختیارات محدود کر کے ان کو جاگیردارانہ حیثیت دیدی گئی

کشمیر کی حکومت گلاب سنگھ کے ہاتھ فروخت کی گئی لیکن شرط یہ تھی کہ اس کے ورثا نرینہ میں سے کوئی تخت نشین ہوا کرے گا اور اس کا فیصلہ انگریزی حکومت کرے گی۔ اس طرح گویا کشمیر کو بھی اپنا محکوم بنا لیا۔ اس کے بعد لارڈ ڈلہاوزی نے تو کھلم کھلا ریاستوں کو انگریزی حکومت میں شامل کرنا شروع کر دیا اور کسی نہ کسی بہانہ سے تمام ان چھوٹی ریاستوں کو جن کا انتظام خراب تھا ضبط کر لیا

الغرض یہ واقعہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں بھی معاہدوں کا لحاظ نہیں کیا گیا اور کمپنی کے ٹوٹنے کے بعد

جب ہندوستان تاج برطانیہ سے متعلق ہوگیا، ہمیشہ معاہدات کا مفہوم، حکومت ہند کے مصالح سیاسی کے لحاظ سے بدلتا رہا اور رفتہ رفتہ رئیسوں کی آزادی محدود ہوتی گئی

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کی ریاستیں اپنی جغرافی، مالی و سیاسی حیثیت سے مختلف مدارج رکھتی ہیں اور یہ بھی درست ہے کہ بعض اہم ریاستوں کے معاہدات اپنے مفہوم کے لحاظ سے اب بھی کافی اہمیت رکھتے ہیں اور اُن کی بنا پر رئیسوں کو آزادی کے مطالبہ کا حق پہونچتا ہے، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ علی نقطۂ نظر سے معاہدات کا مفہوم ہمیشہ حکومت کی پالیسی کے لحاظ سے بدلتا رہا ہے اور اس سے قبل کبھی کسی ریاست کو ہمت نہیں ہوئی کہ وہ قوتِ بالادست کو معاہدوں کی طرف متوجہ کر سکتی، کیونکہ یہ بالکل بے نتیجہ بات تھی

پھر جب معاہدوں کی ترمیم و تنسیخ، ان کے مفہوم کا تغیر و تبدل کمپنی کے زمانہ سے لیکر اسوقت تک تاریخی حقیقت بھی رکھتا ہے اور سیاسی واقعیت بھی، تو پھر اب آئین جدید کے نفاذ کے وقت ریاستوں کا یہ مطالبہ کہ اُن کی خود مختاری و آزادی کو بحال رکھا جائے کوئی معنے نہیں رکھتا، اس سے قبل ہی وہ کب آزاد و خود مختار تھے کہ وفاقی طرزِ حکومت میں اس کا سوال اُٹھایا جائے

میں ریاستوں کے اس اصرار یا انکار کو جب اس نقطۂ نظر سے دیکھتا ہوں کہ اگر قوتِ بالادست آج یہ فیصلہ کرے کہ ریاستوں کو مٹا کر برطانوی ہند کے صوبوں سے ان کے علاقوں کو ملا دینا چاہئے، تو ریاستیں کیا کریں گی کیا وہ متفقہ قوت کے ساتھ قوتِ بالادست سے جنگ کریں گی اور کیا اس جنگ میں وہ کامیاب ہو جائیں گی۔ ریاستوں کا مسئلہ ایسا مسئلہ ہے کہ اس میں برطانوی ہند کی آبادی کو بھی کوئی خاص ہمدردی ان سے نہیں ہے بلکہ وہ خود یہ چاہتی ہے کہ کسی طرح ریاستوں کا وجود ختم ہو جائے، اس لئے ملک بھی ریاستوں کا طرفدار نہیں ہو سکتا اور قوتِ بالادست پر کوئی دباؤ ایسا نہیں پہونچ سکتا جو اسے ریاستوں کی بقا کا طرفدار بنا دے

پھر جب حالات یہ ہیں تو ریاستوں کے تمام موجودہ مطالبات محض اس لئے کہ قوتِ بالادست کو برطانوی ہند کے مقابلہ میں اپنا پہلو قوی بنانے کے لئے ان کو ساتھ رکھنے کی ضرورت ہے، بالکل کچے دھاگے کا سہارا ہے

برطانوی پالیسی وقت و حالات کے سانچہ میں ڈھل جایا کرتی ہے اور ہمیشہ اس مطالبہ کے سامنے سر جھکا دیتی ہے جس کی پشت پر کوئی انقلابی تحریک کام کر رہی ہے۔ پھر اگر ہندوستان اسوقت ستعمراتی آزادی پر قناعت کے لئے طیار ہے تو یہ یقیناً برطانیہ کے اس اندیشہ سے بہت کم ہے، جس کے لئے وہ اس سے بھی کچھ زیادہ دینے کے لئے طیار ہو سکتا تھا جو اسوقت دیا جا رہا ہے اور بالکل ممکن ہے کہ اس سودے میں ریاستیں بالکل ختم ہی ہو جائیں۔ بہر حال موجودہ حالات میں ریاستوں کو سمجھنا چاہئے کہ وفاقی حکومت میں جس نوع کی آزادی انھیں مل رہی ہے وہ نہ صرف یہ کہ غنیمت ہے بلکہ حالات کے اقتضا کو دیکھتے ہوئے بہت زیادہ ہے

اس سے قبل ریاستیں جس چیز کو خود مختاری سے تعبیر کیا کرتی تھیں وہ حکومت ہند کے محکمۂ سیاسیات کے نظر نیک سے زیادہ کچھ نہ تھی - نہ وہاں معاہدات کو کوئی پوچھتا تھا، نہ خدمات وفاداری کو - معاملہ - نہ بزور و نہ بہ زاری نہ بہ زرمی آید - کا تھا - وفاقی حکومت میں محکمۂ سیاسیات کی اس گرفت سے ریاستوں کو چھٹکارا مل رہا ہے اور براہ راست نمایندۂ تاج سے تعلق پیدا ہو رہا ہے اور یہ اتنی بڑی نعمت ہے کہ ریاستوں کو اس پر وفاق کا ممنون ہونا چاہئے اور اگر بعض مسایل میں وفاقی حکومت کو ریاستوں کے اندر درخور حاصل ہو جائے تو بھی اس کو گوارا کر لینا چاہئے

کمپنی کے زمانہ میں ڈائرکٹروں اور پھر گورنر جنرلوں کی مرضی کے مطابق ریاستوں کی حالت بدلتی رہی، اس کے بعد بھی ملکی مطالبات و ضروریات کے لحاظ سے ویسرائے نے اپنی پالیسی ریاستوں کے ساتھ جداگانہ مقرر کی، اس لئے اب کہ حکومت کی نوعیت ہی بالکل بدل رہی ہے، ریاستیں کیونکر یہ توقع کر سکتی ہیں کہ ان کے حالات میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی - جدید حکومت اپنی ضروریات کے لحاظ سے مجبور ہے کہ وہ ایک آل انڈیا نظامِ حکومت اختیار کرے جس میں ریاستوں کی شرکت ضروری ہو پھر اب یہ ریاستوں کی مرضی ہے خواہ وہ خوشی سے ان شرایط کو منظور کر لیں جو یقیناً انکے لئے کسی طرح مضرت رساں نہیں ہیں، یا جبر و اکراہ کے ساتھ - پہلی صورت میں برطانوی ہند کی ہمدردیاں حاصل کرنے کا امکان ہے اور دوسری صورت میں یہ بھی نہیں -

---

"نگار" کے پُرانے پرچے

نگار کے مندرجۂ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں جن کی دو دو تین تین کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت ہو طلب کر لیں - قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں :-

(سنہ ۲۲ء) ستمبر ۴ر - (سنہ ۲۶ء) جنوری، جون، نومبر ۵ر فی پرچہ - (سنہ ۲۷ء) اپریل، مئی و جون ۴ر فی پرچہ (سنہ ۲۹ء) دسمبر ۵ر - (سنہ ۳۰ء) مئی ۴ر - (سنہ ۳۱ء) جولائی تا دسمبر ۴ر فی پرچہ - (سنہ ۳۲ء) فروری تا دسمبر (علاوہ اپریل) ۴ر فی پرچہ - (سنہ ۳۳ء) فروری، جولائی و اکتوبر ۴ر فی پرچہ - (سنہ ۳۴ء) مارچ ۴ر (سنہ ۳۵ء) نومبر ۵ر (سنہ ۳۶ء) فروری، مارچ، اپریل، جون، نومبر، دسمبر ۵ر فی پرچہ - (سنہ ۳۷ء) مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست - اکتوبر، نومبر و دسمبر ۸ر فی پرچہ -

منیجر نگار لکھنؤ

اُردو ادب اور مقالہ نگاری[1]

اُردو نثر اگر اپنی پیدائش کے لئے نہیں تو اپنے ارتقاء اور نشوونما کے لئے ضرور انگریزی ادب کی مرہونِ منت ہے گو محققین نے اب اُردو نثر کی بنیاد دکن میں چودھویں صدی عیسوی سے رکھی ہے اور ثبوت کے لئے دکن کی قدیم نثر کے نمونے پیش کئے جاتے ہیں اور اس سے پیشتر کی تحقیقات نے بتایا تھا کہ نثر کی ابتداء ۱۷۳۲ء سے شمالی ہند میں فضلی کے مقدمہ دہ مجلس سے ہوئی تھی لیکن حقیقتاً اُردو نثر کی صحیح پیدائش فورٹ ولیم کالج اور گلکرائسٹ کے دم سے وابستہ ہے اور اسی ماحول کے زیر اثر میر امن نے وہ باغ لگایا اور وہ بہار دکھائی کہ "جو اس کو پڑھیگا گویا باغ کی سیر کرے گا بلکہ باغ کو آفت خزاں بھی ہے اور اس کو نہیں یہ ہمیشہ سر سبز رہیگا"

اپنے بچپن کے ماحول سے نکلکر اُردو نثر مختلف ماحول اور مختلف فضاؤں میں پلتی بڑھتی رہی۔ لکھنؤ میں سرور کے ہاتھوں انتہا سے زیادہ مسجع ومقفیٰ ہوئی۔ غالب نے اسکو سادہ وشوخ بنا دیا۔ سرشار کے یہاں اس کے حسن میں نکھار پیدا ہوا۔ سرسید، آزاد، حالی، نذیر، ذکاءاللہ، شبلی کی محبت بھری آغوش میں شباب کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگی اور پھر رسوا، نیاز، پریم چند، حسن نظامی، ابوالکلام، عبدالحق، سروری، زور، چغتائی وغیرہ کی تیز نفسیوں اور گرم گرم صحبتوں نے تو اس کو سراپا شباب بنا دیا۔ پھر یہ سب کچھ ہوا۔ اس کی فضا اس کے ساز، اس کے نغمے سب ہندوستانی اور "اُردو" ہی کے رہے مگر پھر بھی ان نغمات کی لے انگریزی ادب کی "نشر کردہ تیز تیز" برقی شعاؤں سے برابر متاثر رہی۔ اسی لئے اُردو نے گو ان تاثرات کے ماتحت نثر کی کوئی صنف بغیر خامہ فرسائی کے نہ چھوڑی مگر وہ اصناف جن میں ادب مستقلاً طور پر قایم ہے، مقالہ نگاری۔ تاریخ۔ ڈرامہ اور تنقید ہی ہیں۔

ہمارے یہاں "مقالہ"، کے مفہوم میں مختلف اقسام کے مضامین شامل کرلئے جاتے ہیں لیکن حقیقتاً وہ مضامین جن کو ہم مقالہ کے صحیح مفہوم میں کچھ کھینچ تان کر اور کسی حد تک ایمانداری کے ساتھ لا سکتے ہیں، زیادہ تر انگریزی مقالوں کے ترجمے ہیں۔ اور یجنل مقالوں میں، چراغ علی، محسن الملک۔ حالی۔ سرسید وغیرہ کے وہ مضامین شامل ہیں جو

[1] انگریزی لفظ (Essay) کا ترجمہ ہے۔

تہذیب الاخلاق، میں وقتاً فوقتاً چھپتے رہتے تھے (اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ تہذیب الاخلاق نے اس لحاظ سے اُردو کے لئے وہی کام کیا جو انگریزی کے لئے (Spectator & Tatler) نے ایک خاص وقت میں کیا تھا) نذیر احمد و سرسید کے لکچر بھی ایک مقالہ ہی کی حیثیت رکھتے ہیں اور آزاد۔ سرسید۔ حالی۔ نواب محسن الملک کے مختلف مذہبی، ادبی اور فلسفیانہ مضامین اور دلگداز۔ مخزن۔ ادیب۔ اُردو۔ نگار اور ہمایوں وغیرہ کے مختلف مضامین بھی اسی زمرہ میں شمار کئے جا سکتے ہیں

موجودہ دور میں عام رجحان صحافت۔ افسانہ اور تنقیدی مضامین کی طرف زیادہ ہے تنقیدی یا تاریخی مضامین لکھنے والوں کے موضوعات گوناگوں مسایل پر حاوی ہوتے ہیں مثلاً سائنس۔ سینما۔ فلسفہ۔ سیاسیات وغیرہ اور انھیں کو عام طور پر "مقالہ" سمجھا جاتا ہے

قبل اس کے کہ ہم اُردو کے ان مضامین پر تنقید کریں، دیکھنا چاہئے کہ دراصل مقالہ (Essay) کیا چیز ہے؟ انگریزی ادب میں جہاں سے یہ چیز آئی ہے، اس کا رتبہ اور معیار کیا ہے؟ اور اس صنف میں شروع سے اب تک زمانہ کے ساتھ ساتھ کیا تغیرات ہوئے اور اس کا قدیم و جدید مفہوم کیا ہے؟

کہا جاتا ہے کہ انگریزی زبان میں غالباً بجز لفظ (Gentleman) کسی لفظ کا بھی اتنا ناموزوں اور لامحدود استعمال نہیں ہوا جتنا کہ لفظ (Essay) کا!! ایک مشہور فلاسفر کی کتاب کے لئے یہی لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور ایک طالب علم کی مشقی تحریر کے لئے بھی یہی شاید صحیح ہے کہ دونوں جگہ یہ لفظ ایک "کوشش و فکر" کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے اور شاید اس کے لغوی معنی ہیں بھی یہی۔ لیکن حقیقتاً اس لفظ کو استعمال کرتے وقت یہ مفہوم ہمارے ذہن میں نہیں ہوتا (Essay) لکھنے کی قابلیت عمر کی پختگی کے ساتھ پیدا ہوتی ہے محض ادبی ذوق یا زبان پر قابو حاصل کر لینا کافی نہیں

مثال کے طور پر بیکن کو لیجئے، وہ انگریزی کے ابتدائی دور کے ادبی کمالات کا نمونۂ مجسم تھا۔ ایک خاص طریقۂ اظہار خیال اور فلاسفی کا ناخدا تھا۔ لاجواب امثال استعمال کرتا تھا۔ سب کچھ تھا اور اب بھی ہے۔ مگر بحیثیت مقالہ نگار (Essayist) اب اس پر (Addison & Lamb) وغیرہ کو ترجیح دیجاتی ہے۔ آخر کیوں؟ گو اس کو فنی کمال حاصل تھا۔ دنیا کا تجربہ بھی تھا۔ فلسفیانہ دماغ بھی تھا مگر اس کے پاس وہ ذہنیت نہ تھی جو مقالہ نگاری کے لئے ضروری ہے

زندگی کی پیچیدگیوں اور رازوں کو سمجھنا اور اس کو ظاہر کر سکنا یہ ہے اصل میں معیارِ "مقالہ نگاری" کا اور یہ اہلیت بغیر پختگی عمر کے پیدا ہو سکتی ہے اور نہ اس میں اُستواری آتی ہے

مقالہ نگاری در اصل عمر، تجربہ، اور مشاہدہ کا نچوڑ ہے جو صرف انسانی عمر کے ہیجان انگیز حصہ کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے

گویہ صاف اور شفاف پانی کی طرح چمکتا ہے پھر بھی اس میں انسانی زندگی لہراتی رہتی ہے اس میں ایک خاص مہک ہوتی ہے، ایک خاص مزہ ہوتا ہے۔ اس کے پڑھنے سے سوئی ہوئی یا بھولی ہوئی باتیں یاد آجاتی ہیں اس کی خوشبو کی لپٹیں دل کو گرما دیتی ہیں ایک خاص دماغی کیف حاصل ہوتا ہے اور سوئے ہوئے خیالات بیدار ہو جاتے ہیں کسی نے سچ کہا ہے کہ مقالہ نگاری ایک سکون آمیز لطیف شے ہے لیکن قبل اس کے کہ کوئی انسان اس سکون آمیز شراب کو خود کسی اور کو پلائے اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کو پہلے خود حاصل کرے۔ دنیا میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو چالیس سال کی عمر سے قبل اس قسم کا سکون حاصل کر سکیں۔ بہت سے تو عمر بھر محروم رہتے ہیں مگر جو حاصل کر لیتا ہے اور دوسروں کو دیتا ہے وہی درحقیقت مقالہ نگار کہلاتا ہے

انسان کی عمر میں شباب کا ہیجان انگیز دور گزر جانے کے بعد وہ دور آتا ہے جب وہ کسی نظریہ کو پہلے سے اپنے دماغ میں قایم کر کے اس پر بحث و مناظرہ نہیں کرتا اور نہ کسی موضوع کو بغیر اچھی طرح سمجھے ہوئے اس پر گفتگو کرتا ہے بلکہ وہ اس ہنگامۂ عالم میں بغیر اپنے پارٹ کی فکر کئے ہوئے ایک تماشہ دیکھنے والے کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اس کا سبب یہ نہیں کہ اس کا جوش زندگی کم ہو جاتا ہے بلکہ اب وہ زندگی کی ولولہ انگیزیوں کو سمجھنا چاہتا ہے اور اس طرح رفتہ رفتہ زندگی کے سربستہ راز اس پر افشا ہونے لگتے ہیں اور وہ صرف "خود" نہیں رہ جاتا بلکہ "دنیا" بن جاتا ہے "شخصیت" کے اس پھیلاؤ کی وجہ سے اس کے مزاج میں قوت برداشت حلم اور خطا پوشی کی صفت پیدا ہو جاتی ہے، صبر و سکون کی ابدی مسرتیں اسکو حاصل ہو جاتی ہیں اور ہر چیز کے متعلق آزادانہ بات چیت کرنے کے لئے تیار ہوتا ہے

انگریزی ادب کے بہترین مضمون نگار مثلاً لیمب۔ ایڈیسن۔ کاڈلے اور موجودہ دور میں چسٹرٹن اور ماکس بربیم وغیرہ سب کی زندگی پر یہ قول صادق آتا ہے

انگریزی ادب میں مقالہ نگاری کے ارتقا و ترقی پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ مقالہ نگاری کا یہ مفہوم مختلف درمیانی منزلوں سے گزرنے کے بعد متعین ہوا ہے

طوالت کے خوف سے اس کو واضح کرنے کے لئے تمام تبدیلیاں نہیں دکھائی جا سکتیں۔ مگر پھر بھی اتنا کہے بغیر کام نہیں چلیگا کہ پندرھویں صدی کے اختتام اور سولھویں صدی کے آغاز میں بیکن اگرچہ (Essay) کو (Montaign) کے نمونہ پر لانا چاہتا تھا مگر پھر بھی اس کے زمانہ میں (Essay) کو "تصویر پریشاں" (Dispersed Meditation) کہا جاتا تھا۔ بیکن اور اس کے متبعین نے زیادہ تر خارجی انداز بیان اختیار کیا جسے (Impersonal note) کہتے ہیں

سترھویں صدی میں (Sir Thomas Brown) نے مضمون میں نفس مضمون پر کم اور اسٹائل پر زیادہ زور دیا اور اس صدی کے اختتام پر (Cowley) نے داخلی انداز بیان (Personal note) پیدا کر دیا اور

ڈرائیڈن نے تنقید بھی شروع کر دی
اٹھارھویں صدی میں ایڈیسن اور اسٹیل نے مضمون میں داخلی پہلو پیدا کر دیا۔ مگر طرز تحریر اور موضوع میں تبدیلی آگئی۔ سوشل مسایل بھی اس میں شامل کئے گئے اور طنزیہ انداز بھی۔ گولڈ اسمتھ نے سوانح اور تنقید کو ملا دیا۔ اسی زمانہ میں ہیوم نے مضامین میں سنجیدگی۔ خیال آفرینی پیدا کر دی
میکالے نے مضامین میں تاریخ، تنقید اور سوانح تینوں کو ملا دیا۔ کارلائل نے "شخصیت نوازی" شروع کر دی۔
اُنیسویں صدی میں (Lockhart, Leigh Hunt, De Quincey) نے مضامین کو ٹھوس اور عالمانہ بنا دیا لیکن اس زمانہ کے شعراء نے جو مضمون نگار بھی تھے۔ اس کو کلاسزم اور مشکل پسندی کے قیود سے آزاد کر دیا خصوصاً (Lamb) نے داخلی اور ذاتی انداز بیان کو بہت نمایاں کر دیا اور اپنی تحریروں میں باوجود اپنی و نیز اپنی بہن کی پُر درد اور مصیبت زدہ زندگی کے اپنی ذاتی خوبیوں کے وہ مرقعے اپنے مضامین میں پیش کئے جن کا جواب آج تک انگریزی ادب پیش نہ کر سکا۔ چنانچہ اسی وقت سے کہا جاتا ہے کہ "The style is the man" Hazlitt وغیرہ نے لیمب کی اس سادگی۔ صفائی، فطرت شناسی اور اپنے ذاتی تاثرات سے کام لینے کے طریقہ کو قائم رکھا
اُنیسویں صدی کے اختتام سے اب تک اس قسم کے مضامین کو بڑی ہردلعزیزی حاصل ہوئی اور لاتعداد مقالہ نگار پیدا ہوئے۔ موجودہ زمانہ میں (Belloc, Max Burbhom, Chesterton, Lucas) اور (E. V. Lucas) سب سے زیادہ مشہور ہیں
موجودہ دور میں خاص طور پر (Personal Essay) کا دور دورہ ہے (Impersonal essay) کو صرف ناپسند ہی نہیں کیا جاتا بلکہ لوگ اس کو اب (Essay) کہنا بھی گوارا نہیں کرتے (Impersonal essay) کیا ہے؟ "ایک خوبصورت پیرائے میں مفہوم کو ایک مقررہ قانون، قاعدہ اور منطق کے ساتھ وسعت دینا اور اپنے آپ کو پس پشت ڈال دینا تاکہ ذاتی تاثرات و جذبات اس میں شامل نہ ہو سکیں
(Personal essay) اس کے بالکل متضاد ہے: "اسی میں مضمون نگار مضمون کا تابع نہیں رہتا بلکہ اس کو اپنا تابع رکھتا ہے وہ اس کو جس طرح چاہتا ہے پیش کر دیتا ہے۔ وہ اپنے موضوع کے ساتھ کھیلتا ہے اور اس میں سے جتنا چاہتا ہے منتخب کر کے اپنے کیفیات و احساسات کے مطابق پیش کر دیتا ہے"
اس قسم کے مقالہ نگاروں کا مقصد اپنے مقالہ کو نہیں بلکہ اپنی ذات کو نمایاں کرنا ہوتا ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ جب کوئی ہمارا محبوب ہم سے گفتگو کرتا ہے تو ہم اس کی باتیں موضوع کے لحاظ سے نہیں سنتے بلکہ اس لئے کہ وہ ہمارا عزیز ہے اور ہم کو اس کی ذات سے وابستگی ہے۔ ممکن ہے کہ ہم اس کی رائے سے موافقت نہ کریں لیکن ہمیں اس کی آواز، اسکے خیال اور محسوسات کے علم سے ایک خاص لطف حاصل ہوتا ہے

اسی لئے مقالہ نگار کا کام یہ ہے کہ جو کچھ کہے اچھوتے پیرایہ میں اور نئے انداز سے کہے۔ ہماری توجہ کو ہماری زندگی اور دنیا کی ان باتوں کی طرف مبذول کرے، جن کو ہم کسی وجہ سے نظر انداز کر چکے ہیں۔ زندگی کے معمولی معمولی واقعات میں اثر اور سوز و گداز پیدا کرے اور ہم کو بتائے کہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی اپنے اندر خاص لطف رکھتی ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ ممکن نہیں جب تک مقالہ نگار کو خود ان سب چیزوں سے پوری واقفیت اور دلچسپی نہ ہو اس کے لئے اس کی قوتِ مشاہدہ اور احساس کو بہت تیز ہونا چاہئے۔ دنیا کی ہر شے میں اسکی نگاہوں کو ایک خاص کیف۔ دلچسپی اور حسن کی تلاش ہونی چاہئے اور جہاں یہ ملجائے اس سے پوری طرح متاثر ہونا چاہئے۔ اپنے تاثر کو خیالات میں تبدیل کرنا چاہئے اور پھر ان کو الفاظ میں، الغرض مقالہ نگاری کے لئے قوتِ احساس اور غور و فکر بہت ضروری ہے۔ آج کل دنیا کے بڑے بڑے مقالہ نگار ایسے موضوع لیتے ہیں جو بظاہر نہایت حقیر۔ معمولی۔ بھدے اور مضحکہ انگیز معلوم ہوتے ہیں۔ مگر وہ اپنے دماغ و قلم کی سحر کاری سے زور۔ تاثیر۔ مزاح اور سوز و گداز کا ایک ایسا خوشنما جال پھیلا دیتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے یہی کمال ہے (Personal essay) کا!!

اس معیار کو حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ:۔

(۱) اس میں تصنع و آورد کی جھلک نہ آنے پائے۔ نہ صرف اسٹائیل سادہ اور نیچرل بلکہ دماغی کیفیت بھی پر سکون اور خاموش ہونا چاہئے۔ (۲) اس میں کسی چیز کے لئے کاوش، کا شائبہ نہ آنے پائے نہ زیادہ جوش ہو نہ زیادہ زور اور نہ زیادہ جستجو۔ (۳) ہلکی ہلکی شوخی، و مزاح نگاری بھی ہو اور انسانی ہمدردی کی جھلک بھی۔ (۴) دنیا کو مکمل طور پر سمجھنے کے لئے مقالہ نگار کو یاد رکھنا چاہئے کہ دنیا میں غم و نشاط۔ اشک و تبسم۔ قنوطیت و رجائیت دونوں لازم و ملزوم ہیں مقالہ نگار کا کام اصلاح یا دنیا کی از سرِ نو تعمیر کرنا نہیں، اس کا کام دنیا کی موجودہ حالت کا جایزہ لینا اور ہر بات سے متاثر ہونا ہے

اس اُصول کو سامنے رکھ کر اگر ہم اُردو کے مقالوں کو دیکھیں تو ہم کو کہنا پڑے گا کہ ایسے مقالے ہمارے یہاں اگر مفقود نہیں تو کم ضرور ہیں۔ تہذیب الاخلاق اور اس کے مقالہ نگاروں کا مدعا زیادہ تر قوم کی گری ہوئی مذہبی، تمدنی اور سیاسی حالت کو سنبھالنا تھا۔ ان کی ہر کوشش مسلمانوں کی بیداری کے لئے ہوتی تھی۔ ایسے مضامین زیادہ ہوتے تھے جن سے پُرانی باتوں اور قیود سے آزادی کا سبق پڑھانا مقصود ہوتا تھا اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ مقالہ نگار کا مقصد اصلاح نہیں ہونا چاہئے اس میں کسی قسم کا پروپیگنڈا یا جوش یا مطلب براری کے لئے جد و جہد نہیں ہونا چاہئے۔ اس میں ہلکا سا مزاح۔ سکون، سادگی، اور بے لوث تنقید زندگی ہونی چاہئے۔ کیا ان لوگوں کے مضامین میں یہ سب باتیں تھیں ؟ شاید نہیں

موجودہ زمانہ میں لوگ افسانہ تنقیدی مضامین اور صحافت کی طرف زیادہ مائل ہیں، مقالہ نگاری کی طرف سے سب غافل ہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ہمارے ادیب عام طور پر مقالہ نگاری کے صحیح مفہوم سے ناآشنا ہیں تو غالباً بیجا نہ ہوگا۔

شریف (بی۔ اے)

سیاسیات یوروپ

(۶)

اسپین کی خانہ جنگی

۱۸ جولائی ۳۶ء کو اسپین میں خانہ جنگی کا آغاز ہوا اور صورت یہ ہوئی کہ بعض فوجی افسران نے جو وہاں کی جمہوری حکومت کے خلاف اور فاسسٹی خیال کے موافق تھے، بغاوت کردی اور دفعتًا سارے جزیرہ نمائے اسپین میں یہ آگ بھڑک اٹھی۔ جرمنی اور اٹلی نے باغی فوج کی مدد کی اور روس نے حکومت اسپین کی (لیکن کچھ دنوں بعد اور وہ بھی بہت کم)

اس جنگ میں خونریزی کے جو مناظر دیکھنے میں آئے ان کی مثال دور حاضر کی کسی جنگ میں اسوقت تک نظر نہیں آئی، یوں سمجھئے کہ پہلے ہی سال ۵ لاکھ آدمی جان سے مارے گئے اور متعدد شہر خاک سیاہ کردئے گئے۔ چونکہ جرمنی اور اٹلی کھلم کھلا مداخلت کررہے تھے اور بحر روم میں باغی فوج کی آبدوز کشتیاں بے تعلق حکومتوں کے تجارتی جہازوں کو بھی تباہ کرنے سے باز نہ آتی تھیں، اس لئے عالمگیر جنگ کا خطرہ سامنے تھا اور سارا یورپ نہایت تشویشناک انداز سے ان تمام حالات کا مطالعہ کررہا تھا

جن اختلافات نے اس جنگ کو رونما کیا اس کے عناصر متعدد تھے۔ یہ جنگ گویا لڑائی تھی غریبوں کی امراء کے ساتھ مزدوروں کی فوجوں کے ساتھ، کسانوں کی زمینداروں کے ساتھ اور جمہوریت کی فاسسزم کے ساتھ۔ جنرل فرانکو کے طرفداروں میں ہم کو افسران، جاگیرداران، شاہ پسند جماعت، سرمایہ دار اور فاسسٹ نظر آتے ہیں اور ان کی عسکری قوت مشتمل ہے جرمن، اطالوی اور ریف و مراکش کے سپاہیوں پر۔ حکومت کے طرفداروں میں جمہوریت پسند، سوشلسٹ، کمیونسٹ انارکسٹ اور تمام طبقہ متوسط شامل ہے اور اس کی فوج میں سوائے عوام کے اور کوئی نہیں ہے یہ جنگ گویا حکومت اسپین کے دست راست و دست چپ کی لڑائی ہے جس میں دست راست والی جماعت جنرل فرانکو کی ہے اور دست چپ والی عوام کی

اسپین اپنی شخصی حکومت کے دوران میں حد درجہ پست حالت میں تھا (بالکل ویسا ہی جیسے روس زار کے زمانہ میں) اور یورپ بھر میں پرتگال چھوڑ کر جہل کا اوسط (۴۵ فی صدی) سب سے زیادہ یہیں تھا بیسویں صدی میں یہاں کی ملوکیت

الفانسو سیز دہم کے ہاتھ میں تھی جس کی تین جماعتیں طرفدار تھیں، ایک طبقہ امراء کا، دوسرا فوج کا، تیسرا اہل کلیسا کا۔ اسپین کی آبادی ۷۰ فی صدی زراعت پیشہ ہے، لیکن ان میں شاید پندرہ بیس ہزار کاشتکاروں کے پاس کچھ زمین ہو تو ہو، ورنہ سب زمینداروں کے قبضہ میں تھی، چنانچہ نواب آلبا، بلجیم کے برابر حصۂ زمین کا مالک تھا۔ پھر ان زمینداروں کی حالت یہ تھی کہ وہ کاشتکاروں سے لگان تو ایک ایک کوڑی وصول کر لیتے تھے، لیکن زمین کے تردد پر ایک پیسہ صرف نہ کرتے تھے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی قابل کاشت زمین چراگاہ میں تبدیل ہو گئی اور زرعی حصہ بھی صرف یک فصلی ہو کر رہ گیا

اب اسی کے ساتھ اس کے فوجی مصارف کو دیکھئے۔ یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ الفانسو کے زمانہ میں اسپین پر جتنا بار فوج کا تھا، دنیا کے کسی ملک پر نہیں تھا۔ ۶۵۳ تو صرف جنرلوں کی تعداد تھی اور ۱۲ ہزار افسران کی (حالانکہ ۱۹۱۴ء میں جب جرمنی نے جنگ شروع کی ہے اس کی فوج میں بھی ۱۲ ہزار افسر نہ تھے) فوج کو اقطاعی حقوق حاصل تھے اور فوجی عدالتوں ہی میں ملکی معاملات کا فیصلہ ہوتا تھا۔ یہ تھا ناقابل برداشت بوجھ اسپین کی فوج کا جس نے ۱۶۴۰ء کے بعد سے اسوقت تک کوئی کارنمایاں انجام نہ دیا تھا

اب اہل کلیسہ کی قوت کو دیکھئے۔ وہاں ۸۰ ہزار پادری تھے جن میں سے ہر ایک کی معقول تنخواہ مقرر تھی۔ یہ سب امراء اور افسران فوج سے ملے ہوئے تھے اور وہاں کی تجارت اور کاروبار پر چھائے ہوئے تھے، سیاسی معاملات میں بھی ان کا اثر بڑا زبردست تھا اور مکاری، دسیسہ کاری اور اخلاقی انحطاط کی نہایت شرمناک صورتیں اس جماعت کی وجہ سے ملک بھر میں پیدا ہو گئی تھیں۔ آخر کار ۱۹۳۱ء میں اسپین کی ملوکیت خود اپنے بوجھ سے دبکر فنا ہو گئی اور وہ خاندان جو پانچ صدی سے یہاں حکمراں چلا آرہا تھا ہمیشہ کے لئے معزول کر دیا گیا۔ دنیا کی تاریخ میں صرف اسپین ہی کا یہ انقلاب ایسا انقلاب تھا جس میں ایک قطرہ خون کسی کا ضایع نہ ہوا اور چشم زدن میں بساط ملوکیت اُلٹ کر رکھدی گئی

زوال ملوکیت کے بعد اسپین میں جمہوریت قایم ہوئی، جو اوسط طبقہ کے اہل علم پر مشتمل تھی یعنی اب سیاست اہل کلیسہ یا فوجی افسران کے ہاتھ میں نہ تھی، بلکہ مصنفوں، انشاپردازوں، ڈاکٹروں اور پروفیسروں کے ہاتھ میں تھی۔ انھوں نے جس جدید کانسٹی ٹیوشن کو مرتب کیا اس کا نصب العین یہ تھا کہ حکومت کو کلیسہ سے علٰحدہ کر لیا جائے، ابتدائی تعلیم لازم کر دیجائے عورتوں کو رائے دینے کا حق دیا جائے اور مزدوروں اور کاشتکاروں کی اصلاح کی طرف توجہ کی جائے اور ہر شخص کو نہایت آزادی سے نکتہ چینی کا موقعہ دیا جائے، لیکن چونکہ ان لوگوں کو نظم و نسق کا تجربہ نہ تھا اور عملی سیاست سے بیگانہ تھے، اسلئے نظریوں کے لحاظ سے تو سب کچھ ہوا لیکن عملاً بہت کم۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امراء، اہل کلیسہ اور افسران فوج، مخالفین جمہوریت کا استیصال نہ ہو سکا اور ان کی قوت باقی رہی

۱۹۳۲ء میں جنرل سنجر جو نے امراء کی سفارش سے جمہوریت کے خلاف بغاوت کی اور جب یہ بغاوت دبا دی گئی تو حکومت نے تمام امراء کی جایدادیں ضبط کرنے کا حکم صادر کیا، لیکن یہ حکم کاغذ ہی تک محدود رہا اور اس کی تعمیل نہ ہو سکی۔

اہلِ کلیسہ کے قبضہ میں اس وقت دس کروڑ پونڈ قیمت کی جایداد تھی اور یہ سب جایداد ضبط بھی کرلی گئی لیکن قبضہ بدستور اہلِ کلیسہ کا رہا۔ فوجی اصلاح کے سلسلہ میں بجز اس کے کہ دس ہزار افسروں کو پنشن دیدی گئی اور کچھ نہ کیا گیا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب اذانہ برسرِ اقتدار تھا۔ ۳۳ء میں یہ اپنے عہدے سے علحدہ کردیا گیا اور اس طرح دست چپ کی جمہوریت ڈھائی سال کے بعد ختم ہوگئی اور دستِ راست کی جماعتیں برسرِ اقتدار ہوگئیں۔ یہ بھی جمہوریت کے موافق تھیں لیکن صرف نظریوں کی حد تک اور سوشلسٹ کی مخالف۔ اکتوبر ۳۴ء میں سوشلسٹ جماعت نے بغاوت کردی اور شدید خونریزی کے بعد تقریباً ۳ ہزار سوشلسٹ جیل بھیجدئے گئے۔

دست راست کی حکومت کو جب تین سال ہوچکے انتخاب کا زمانہ آیا، لیکن چونکہ لوگوں کے دلوں سے دست چپ کی حکومت کی یاد محو نہ ہوئی جو ۳۱ء سے لیکر ۳۳ء تک برسرِ اقتدار رہی تھی، اس لئے کثرت رائے سے پھر دستِ چپ کی حکومت کو اقتدار حاصل ہوگیا۔ یہ واقعہ فروری ۳۶ء کا ہے۔ لیکن چھ مہینے کے بعد ہی جولائی ۳۶ء میں جنرل فرانکو نے بغاوت کردی اور وہ خانہ جنگی شروع ہوگئی جس کی نظیر تاریخ یوروپ میں نہیں ملتی۔

جیسا کہ ابھی ہم نے ظاہر کیا ہے کثرت رائے سے دستِ چپ کی جماعتیں برسرِ اقتدار ضرور ہوگئی تھیں، لیکن ملک میں امن وسکون مفقود تھا، چنانچہ ۶ ماہ کے اندر سیکڑوں سیاسی افراد قتل ہوگئے اور اس میں شک نہیں کہ فاسسٹ جماعت نے بدامنی پیدا کرنے میں زیادہ حصہ لیا۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں دستِ چپ کا ایک فوجی افسر مارا گیا اور ادھر سے جواب میں دستِ راست کے ایک لیڈر کو قتل کردیا گیا اس قتل کا ہونا تھا کہ دفعتاً آگ بھڑک اُٹھی اور ۱۸ جولائی کو فوجوں نے بغاوت کردی۔ جنرل فرانکو جو اس وقت جزایر کناری کا گورنر تھا فوراً مراکش پہونچا اور اطالیہ کے ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے وہاں سے عربوں کی فوج لے آیا جو چاروں طرف اسپین پر چھا گئی۔ ہم اس جگہ جنگ کے واقعات سے بحث کرنا نہیں چاہتے کیونکہ انکا علم سب کو ہے، لیکن یوروپ کے دیگر ممالک نے اس جنگ کو کس نگاہ سے دیکھا اس کا بیان ضروری ہے ۔۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اطالیہ اور جرمنی کا ہاتھ اس جنگ میں شامل ہے اور یہ خیال بالکل درست ہے، جنگ سے پہلے ہی اطالیہ کے متعدد ہوائی جہاز مراکش پہونچ گئے اور جب جنگ شروع ہوئی تو ۱۰ ہوائی جہاز اور روانہ ہوئے ۔ اس کے دوسرے مہینے جرمن طیارے، جرمن آبدوز اور جرمن شباہ کن کشتیاں سب جنرل فرانکو کی مدد کو پہونچ گئے اور رفتہ رفتہ ان دونوں ملکوں نے سامان حرب، طیارہ شکن توپوں اور فوجوں سے کھلم کھلا فرانکو کی مدد شروع کردی۔

جنرل فرانکو اس مدد کے قبول کرنے پر اس لئے مجبور تھا کہ اسپین کی آبادی سے وہ کوئی سپاہی بھرتی نہ کرسکتا تھا اور اطالیہ وجرمنی اس لئے مدد کر رہے تھے کہ جنرل فرانکو کی کامیابی فاسسٹ جماعت کی کامیابی تھی گویا یہ جنگ فاسزم اور اشتراکیت کی جنگ تھی ۔۔ علاوہ اس کے اطالیہ اور جرمنی یوں بھی عرصہ سے اسپین میں اپنے اثرات قایم کرنے کی فکر میں تھے تاکہ یہاں کی معدنیات وپیداوار سے فایدہ اُٹھایا جاسکے، چنانچہ آغاز جنگ سے ۶ ماہ قبل ہی تانبہ اور لوہا بکثرت جرمنی بھیجا جا رہا تھا تاکہ وہ وقت پر مدد دے۔ اطالیہ اور جرمنی نے جنرل فرانکو کی جتنی مدد کی اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ تقریباً دس ہزار جرمن ماہرین فن اور

ستر ہزار اطالوی سپاہی ۳۷ء میں جنرل فرانکو کے شریک کار تھے۔ روس اور فرانس، حالات کو دیکھ کر جل رہے تھے لیکن وہ کچھ کر نہ سکے روس نے کچھ ہوائی جہاز حکومت اسپین کی مدد کیلئے ضرور روانہ کئے لیکن وہ زیادہ مفید ثابت نہ ہوئے، فرانس اتنا بھی نہ کرسکا۔ بین الاقوامی قانون یہ ہے کہ اگر کسی ملک میں بغاوت ہوجائے تو حکومت بغاوت فرو کرنے کے لئے آزادی سے اسلحہ وسامانِ حرب خرید سکتی ہے، لیکن حکومت اسپین اس قانون سے فایدہ نہ اُٹھاسکی۔ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ جنرل فرانکو نے ناکہ بندی کر رکھی تھی اور دوسرا یہ کہ دول یورپ نے "عدم مداخلت" کا معاہدہ کرلیا اور حکومت بیرونی امداد سے بالکل محروم ہوگئی۔ پھر اس عدم مداخلت کا اثر جنرل فرانکو پر بھی پڑتا جارہا ہے لیکن اول تو جرمنی واطالیہ اس معاہدہ سے قبل ہی کافی مدد کرچکے تھے، دوسرے انھوں نے اس معاہدہ کی کوئی پرواہ نہیں کی اور بعد کو بھی امداد کا سلسلہ جاری رکھا۔ عدم مداخلت کی تحریک فرانس اور برطانیہ نے ملکر تجویز کی تھی تاکہ لڑائی جلد ختم ہوجائے، لیکن اس تجویز نے سات مہینے گفت وشنود میں لے لئے کیونکہ جرمنی، اطالیہ اور پرتگال اسکے مخالف تھے، آخر کار اپریل میں جاکر مشکل سے بین الاقوامی بحری ناکہ بندی کی تجویز پر ۲۶ ملکوں نے دستخط کئے۔ فرانس کبھی فرانکو کی کامیابی کو پسند نہیں کرسکتا کیونکہ اسپین میں فاسسٹی جماعت کی کامیابی کے معنے یہ ہیں کہ اگر کبھی اطالیہ یا جرمنی سے اس کی لڑائی ہو تو اسے ایک تیسرا محاذ قایم کرنا پڑے، علاوہ اس کے فرانس یہ بھی سمجھتا ہے کہ اگر اسپین میں نازی یا فاسسٹی حکومت قایم ہوگئی تو اسکے مقبوضات افریقہ خطرہ میں پڑجائیں گے اور وہاں کی فوجوں کو وہ آسانی سے فرانس نہ لاسکے گا۔ جنرل فرانکو کی کامیابی سے فرانس کی طرح انگریزوں کو بھی خطرہ ہے کیونکہ اس طرح بحر روم میں فاسسٹی اقتدار بڑھ جائے گا اور ان کے استحکامات جبرالٹر ضعیف ہوجائیں گے، لیکن ساتھ ہی ساتھ چونکہ وہ یہ بھی پسند نہیں کرتے کہ اسپین میں اشتراکیت یا بالشویت قایم ہوکر سرمایہ داری کو نقصان پہونچے اس لئے وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ جنرل فرانکو جیت جائے تو اچھا ہے۔ برطانیہ کی یہی دورُخی پالیسی تھی جس کی وجہ سے "عدم مداخلت" کی تجویز کو اس نے عرصہ تک جھلائے رکھا اور اب بھی جرمنی واطالیہ کی زیادتیوں اور گستاخیوں کو برابر برداشت کرتا چلا آرہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عالمگیر جنگ کے خیال سے برطانیہ بہت گھبراتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اگر وہ اُلجھ گیا تو پھر سوال صرف بحر روم کی حفاظت واقتدار کا نہ ہوگا، بلکہ بحر ہند کا بھی ہوگا اور ہوسکتا ہے کہ کوئی زبردست انقلاب خود اندرونِ ملک بھی ایسا رونما ہو جو اس کو نہ مغرب کا رکھے نہ مشرق کا۔ اطالیہ اور جرمنی سواحل اسپین پر برطانیہ کی جتنی توہین کررہے ہیں کسی سے مخفی نہیں، جہاز پر جہاز ان کے ڈبوتے چلے جارہے ہیں، لیکن دنیا کی اس سب سے بڑی طاقت کے سر پر جوں تک نہیں رینگتی، اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ وہ کمزور ہے یا دشمن کا جواب ترکی بہ ترکی نہیں دے سکتا، بلکہ صرف یہ کہ اس آغاز کا انجام اسے بہت تاریک نظر آتا ہے

مسٹر چیمبرلین وزیر اعظم برطانیہ کی اس نرم پالیسی کے خلاف سخت نکتہ چینیاں ہورہی ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالات میں اس کی یہی پالیسی انگلستان کو اس طوفان سے محفوظ رکھ سکتی ہے جو روم اور برلن سے گزر کر اسوقت تمام وسط یورپ کے پہاڑوں سے ٹکرا رہا ہے۔

مولانا نسبتی واسطی تھانیسری

(۱)

ادب فارسی کے ایک گم شدہ مقدس صحیفہ کی بازیافت

پیش لفظ جس طرح اکثر اہم و مفید معلومات اتفاقاً حاصل ہو جاتی ہیں اسی طرح کلام نسبتی کی بازیافت بھی محض اتفاقی امر ہے۔ میں کھڈڑ کے کتب خانہ مولوی صاحب کی فہرست مخطوطات مرتب کر رہا تھا کہ یہ نایاب کلیات میرے ہاتھ لگا۔ جس وقت میں نے اس کو دیکھا تو نسبتی کا نام پڑھ کر میں سوچنے لگا کہ یہ غیر شاعرانہ تخلص کس کا ہے۔ میں نے اپنے دماغ پر زور دیا، شعر العجم میخانۂ عبد النبی قزوینی۔ سخندانِ پارس۔ نگارستان پارس اور تذکرۃ الشعراء دولت شاہ سمرقندی ایک ایک کو دیکھا لیکن نسبتی کا نام کہیں نظر نہ آیا، میں نے سوچا کہ خود کلیات سے پتہ چلانا چاہئے۔ اسوقت اس کام کے لئے میرے پاس پندرہ بیس منٹ تھے اس مختصر سے عرصہ میں خود نسبتی کے متعلق تو خیر کیا معلوم ہو سکتا تھا لیکن اشعار نے جو اثر دل پر پیدا کیا اسے کبھی نہیں بھول سکتا

اس کے بعد ایک مضمون لکھنے کے سلسلہ میں کلیاتِ سودا دیکھ رہا تھا کہ رسالہ عبرۃ الغافلین کی تمہید میں فیضی۔ غنی۔ نسبتی۔ ناصر علی۔ بیدل۔ خانِ آرزو اور میر شمس الدین فقیر کے اسمائے گرامی نظر آئے۔ مرزا رفیع نے انھیں فارسی گو ہندی شعراء لکھا تھا۔ اتنا معلوم ہو جانے کے بعد میں نے مناسب سمجھا کہ مولانا نیاز کی خدمت میں عریضہ لکھوں۔ جب آپ سے عرض کی تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ مجموعۂ استفسارات و جوابات جلد اول دیکھئے۔ خوشی خوشی مجموعہ لیا۔ اس میں تذکرہ روز روشن کی مدد سے نسبتی کے مختصر سوانح حیات درج تھے۔ ساتھ ہی یہ بھی تحریر تھا کہ "کلام نسبتی" اب نایاب ہے۔ یہ پڑھ کر اور اپنے پاس کلیاتِ نسبتی دیکھ کر میں پھولا نہ سمایا اور اس خیال سے کہ اس کی اشاعت کر سکوں۔ لاہور گیا، وہاں کے عمائد علم و ادب سے ملا۔ کلام نسبتی دکھایا مگر کامیابی نہ ہوئی، اہلِ مطابع نے کہا کہ "اب ایسی چیزوں کی مانگ نہیں" اور علماء نے کہا کہ فارسی پڑھنے والے ہندوستان میں ہیں کتنے؟۔ آخر کار جب اشاعت کا کوئی بندوبست نہ ہو سکا تو مایوس ہو کر میں نے نگار و نیاز کے دامن میں پناہ لی۔ اس بات کا ظاہر نہ کرنا کفرانِ نعمت ہوگا۔ کہ اس زمانہ میں جب کہ فارسی زبان دم توڑتی نظر آتی ہے۔ اگر فارسی ادب و شعر کا ملجا و ماوا کوئی ہے تو وہ صرف نگار اور نیاز کی ذات ستودہ صفات ہے۔ ان کی ذرہ نوازی نے مجھے اس قابل بنایا ہے کہ نسبتی کو ناظرین نگار سے روشناس کرانے کی جرأت کرتا ہوں۔

نام ونسب

نام دار دگرچہ درگم گشتگی عنقا دلے
ننگ ونام وشہرتِ او ہیچو نام من کجا
(نسبتی)

تذکرہ لکھنے کا رواج بہت قدیم ہے۔لیکن ان تذکروں کا عام انداز یہ ہوتا ہے کہ شاعر کے سوانح حیات کے متعلق چند معمولی باتیں بیان کردیجاتی ہیں اور پھر انتخاب اشعار دیدیا جاتا ہے۔ ورق پر ورق اُلٹتے چلے جایئے تاریخی اہمیت رکھنے والی ابیات بھی نظر نہ آئے گی۔ درحقیقت ان کتابوں کے لکھنے کا مقصود کسی شاعر کے سوانح حیات قلمبند کرنا نہ ہوتا تھا، بلکہ تذکرہ کے پردہ میں خود اپنی انشاپردازی کا کمال دکھایا جاتا تھا۔مصنف کس پایہ کا نثر نویس ہے۔یہی وجہ ہے کہ عام تذکروں میں شعراء کے اشعار زیادہ اور حالات زندگی بہت کم ملتے ہیں اگر کوئی بات ہوتی بھی ہے تو اس کی حیثیت اضافی یا ثانوی ہوتی ہے حقیقی نہیں

مولٰنا نسبتی کا ذکر۔عمل صالح مصنفۂ محمد صالح کنبوہ۔کلمات الشعرا محمد افضل سرخوش۔مجمع النفائس خانِ آرزو۔ مخزن الغرائب احمد علی سندیلوی۔شمع انجمن نواب صدیق حسن خاں بھوپال۔سفینۂ بے خبر میر عظمت اللہ بیخبر بلگرامی۔گلِ رعنا شفیق اورنگ آبادی اور روزِ روشن مظفر حسین صبا میں ملتا ہے۔مگر بجز روزِ روشن اور کسی میں ان کا نام درج نہیں سب نے تخلص پر اکتفا کیا ہے

روزِ روشن میں جو ۱۲۹۶ھ کی تصنیف ہے۔یوں مرقوم ہے:۔

نسبتی۔ شاہ محمد صالح متوطن قصبۂ تھانیسر از سادات عالی درجات ۔۔۔بود۔ درعہدِ جہانگیر بادشاہ از بطون بشہود رسیدہ	شاہ محمد صالح نسبتی تھانیسر کے رہنے والے عالی مقام سید تھے آپ جہانگیر بادشاہ کے زمانہ میں کتمِ عدم سے عالمِ وجود میں آئے

مگر معلوم نہیں، صبا کی تحقیقات کی بنیاد کیا ہے۔کیونکہ ماخذ کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔اوپر جن کتابوں کا ذکر کیا جاچکا ہے وہ سب روزِ روشن سے پہلے کی تصانیف ہیں۔ اور اپنی قدامت کے لحاظ سے روزِ روشن پر فوقیت رکھتی ہیں خان آرزو نے اپنے تذکرہ میں نسبتی کے حالات ان کے بھتیجے عزت سے دریافت کرکے درج کئے تھے۔چنانچہ فرماتے ہیں:۔

برادر زادۂ او عزت تخلص می کرد۔ بافقیر آشنا بود می گفت مولٰنا از سادات است پدرش از ولایت آمدہ در قصبۂ کہور (تھانیسر) تمدن اختیار نمود	مجھ سے اور اُن کے بھتیجے عزت سے راہ ورسم تھی۔وہ کہتا تھا۔مولٰنا سید ہیں۔ان کے والد نے ولایت سے آکر تھانیسر میں بود و باش اختیار کی

محمد صالح کنبوہ نے (۱۰۶۲ھ مطابق ۱۶۵۱ء) میں خود نسبتی سے ملاقات کی۔سرخوش آرزو کا معاصر تھا اور اس کا تذکرہ کلمات الشعرا۔مجمع النفائس سے قدیم ہے۔ یہ سب لوگ نسبتی کے نام کے متعلق خاموش ہیں۔بہرحال، صبا نے ان کا نام محمد صالح لکھا ہے

وطن خان آرزو کے بیان کے مطابق نسبتی کے والد ایران سے آئے۔ اور نسبتی تھانیسر میں پیدا ہوئے نہیں پہلے ہوئے

پروان چڑھے اور سپرد خاک ہوئے

مجمع الغرائب۔ گل رعنا۔ سفینۂ بے خبر۔ شمع انجمن۔ کلمات الشعرا۔ عمل صالح اور روز روشن میں انھیں تھانیسری لکھا ہے۔ مرزا سودا بھی انھیں ہندی نژاد کہتے ہیں۔ مگر خود نسبتی کو اس سے انکار ہے، فرماتے ہیں:۔

دُر از دریا بر آمد۔ لعل از کان
ز واسط نسبتی۔ طالب ز آمل
اگرچہ نسبتی از واسطم من
دل من طالب آمل فتاد است

اس اندرونی شہادت کی موجودگی میں کوئی اور بیان تسلیم کرنے کو جی نہیں چاہتا، رہ گئی یہ بات کہ انھیں تھانیسری کیوں کہتے ہیں۔ سو اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ چونکہ نسبتی نے اپنی ساری زندگی تھانیسر میں بسر کی اس لئے وہ اسی جگہ سے منسوب ہوگئے یہاں واسط کے متعلق جو نسبتی کا وطن اصلی ہے چند سطریں لکھنا غالباً بے محل نہ ہوگا۔

"اخبار الدول و آثار الاول" میں لکھا ہے کہ "واسط" بصرہ اور کوفہ کے درمیان ایک شہر ہے، جسے حجاج بن یوسف نے ۸۴ھ میں آباد کیا۔ صاحب قاموس نے واسط نام کے کئی شہروں کا ذکر کیا ہے مثلاً وادی نخلہ میں مکہ کے قریب ایک شہر کا نام "واسط" ہے۔ مضافات بلخ میں ایک شہر واسط ہے۔ جہاں کے دو محدث محمد بن محمد اور بشر بن میمون مشہور ہیں۔ عراق میں ایک شہر ہے جسے حجاج نے دو سال کی مدت میں آباد کرایا وغیرہ وغیرہ" مولانا ہوش بلگرامی اپنے ایک مضمون میں جو نگار محرم ۱۹۲۵ء کی اشاعت دسمبر میں شایع ہوا، تحریر فرماتے ہیں:۔

"واسطی النسل مسلمان ہندوستان میں دو مقامات پر پھیلے۔ ایک نے بارہہ (مظفر نگر) کو بسایا اور دوسرے نے بلگرام (ہردوئی) کو۔ دونوں ایک ہی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ اور سید ابو الفرح واسطی کی اولاد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سید ابو الفرح کے لئے جب واسط میں عرصۂ حیات تنگ ہو گیا۔ تو اپنے چاروں بیٹوں کو لے کر پہلے غزنین میں پناہ لی۔ غزنین میں جب جی نہ لگا تو اپنے چھوٹے صاحبزادے سید معز الدین کو ساتھ لے کر واسط لوٹ گئے۔"

مولانا نسبتی بھی اسی واسط کے رہنے والے معلوم دیتے ہیں۔ جو نواح بلخ میں خراسان کا ایک شہر ہے۔ اور جہاں کی دو چیزیں "نیزۂ واسطی" اور "قلم واسطی" بہت مشہور ہیں۔

تعلیم | اگرچہ آپ کی تعلیم کا حال معلوم نہیں۔ مگر قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ آپ رسمی علوم سے کماحقہ واقف تھے کیونکہ تمام تذکرہ نویسوں نے آپ کو ملا نسبتی اور مولانا نسبتی لکھا ہے۔ آپ جس زمانہ کے بزرگ ہیں۔ اس میں "ملا" فاضل شخص ہی کو کہا جاتا تھا۔ مثلاً ملا عبد اللہ سلطان پوری (مخدوم الملک)۔ ملا مبارک اللہ (ابو الفضل کا والد) ملا عبد القادر بدایونی۔ ملا فیضی

مذہب

صاحب تذکرۂ روز روشن لکھتے ہیں :۔

صوفی و صافی مشرب درویش پاکیزہ مذہب بود بعد سنِ شعور بفقر و درویشی میل نمودہ و تکیۂ بکنارہ تھانیسر بکمال نزہت و صفا ترتیب دادہ، ہمانجا بطاعت و ریاضت مشغول می ماند

بے تعصب، صوفی، مرنجاں مرنج اور پاکیزہ مذہب درویش تھے جوانی کے دنوں ہی میں فقر و درویشی کا شوق پیدا ہوا تھانیسر سے باہر ایک کنارہ پر نہایت پاکیزہ اور لطیف تکیہ بنا کر اسی میں طاعت و ریاضت میں مشغول رہا کرتے تھے

آپ کے کلام سے جہاں آپ کی آزادمنشی اور درویشی کی شہادت ملتی ہے وہاں یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ غالباً مائل بہ تشیع تھے ۔ ایک قصیدہ کی تشبیب میں جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی منقبت میں کہا ہے فرماتے ہیں :۔

چار سُو ایست ایں جہانِ خراب
یک قدم چار راہ نتواں رفت

نہایت لطیف پیرائے میں اپنی شیعیت کا اظہار کرتے ہوئے اہلِ تسنن پر چوٹ کر گئے ہیں ۔ کبھی کبھی وہ غزل میں بھی بے اختیارانہ حضرت علی کی تعریف شروع کر دیتے ہیں ۔ اس میں ان کے قصد و ارادہ کا دخل مطلق معلوم نہیں ہوتا ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر آپ شیعہ نہ تھے تو مائل بہ تشیع ضرور تھے

امرائے وقت سے تعلقات

متقدمین و متاخرین خواہ صوفیائے کرام ہوں یا شعرائے عظام اپنے اپنے عہد کے اربابِ دول سے کسی نہ کسی رنگ میں ضرور متعلق ہوتے تھے لیکن سبقتی ہمیشہ آزاد رہے ۔ شاہزادہ داراشکوہ ولی عہد شاہجہاں نے، جسے صوفیوں سے دلی محبت تھی اور یہی تصوف پرستی اس کی جان لیکر رہی، آپ کو بلوایا تو آپ نے جواب دیا کہ :۔

بروں نیامدہ ام ہیچ گہ زخانۂ خویش
سفر چہ داند عنقا ز آشیانۂ خویش
نمی پرم بہ پر و بالِ عاریت چوں تیر
نشستہ ام چو کماں روز و شب بخانۂ خویش

اس غزل کے باقی اشعار بھی لطف سے خالی نہیں ؂

ہزار شکر کہ بارے بکامِ خود نزدیم
گزشت عمر دریں کہنہ آشیانۂ خویش

دگر بدامِ ہوا و ہوس نمی اُفتم
کہ سیر خوردہ ام از آبِ خویش و دانۂ خویش

صاحب روزِ روشن کا بیان ہے کہ :۔

بحدے استغنا بر مزاجش مستولی بود کہ شاہزادہ داراشکوہ...

ان کے مزاج پر استغنا اور بے پرواہی کا غلبہ اس قدر تھا

...ہرچند طلب فرمود۔ وے انگشتِ اجابت بر دیدۂ قبول نگذاشت | کہ دارا شکوہ نے بارہا بلوایا۔ مگر آپ نے اس بات کو قبول نہ کیا۔

مولانا کے ضخیم دیوان میں ایک لفظ تک کسی دنیادار کی تعریف میں نہیں جس سے سعدی ایسے معلم اخلاق دامن ملوث ہوئے بغیر نہ رہ سکا

ایسے بڑے شاعر کا اور اس زمانہ میں جبکہ شعرا کو سونے چاندی سے تولا جاتا تھا، اہلِ دنیا سے الگ تھلگ رہنا حیرتناک امر ہے۔ شاعر بھی وہ جس کو ولی دشتی، بیاضی کے بعد فارسی کا میر تقی میر کہہ سکتے ہیں اور جس کے کلام پر میرزا صائب کا ایسا شاعر عاشق ہو[1]

مرزا صائب درحینِ توجہ از بکشمیر بمنزلش رفتہ باہم صحبتے داشتہ خیلے بایک دگر خوش بر آمد بعدازاں کہ مرزا بایران رفت۔ ہر کہ از می رفت از وے می پرسید برائے ما چہ تحفہ از ہند آوردہ آں کس می گفت۔ چہ تحفہ می خواہی۔ مرزا می فرمود اشعارِ مولانا نسبتی، (مخزن الغرائب)

مرزا صائب کشمیر جاتے ہوئے ان کے یہاں گئے دونوں خوب گھل مل گئے۔ کئی دنوں تک یہ صحبت گرم رہی بعد ازاں جب مرزا ایران چلے گئے تو جب کبھی کوئی شخص ہندوستان سے ایران جاتا اس سے کہتے میرے لئے کیا تحفہ لائے ہو۔ پوچھتا کیا؟ فرماتے۔ ! مولانا نسبتی کے اشعار، (احمد علی سندیلوی)

[1] دیوان غنی کے شارح نے مجمع النفائس کے حوالہ سے لکھا ہے کہ'' حالِ مصنف کہ شارح در مقدمہ ثانیہ شرح از چند اساتذۂ معتبرہ رحمہم اللہ تعالیٰ نگاشتہ۔ سراج الدین علی خاں آرزو تخلص گوالیاری در تذکرۃ الشعرا مسمیٰ بمجمع النفائس می آرد کہ ملا طاہر غنی کشمیری شاگرد شیخ محسن فانی است گویند چوں کسے از ہند وارد ایران می شد مرحومی مرزا صائب می فرمود کہ برائے ما تحفۂ از ہند آوردۂ ؟ و آں عبارتست از اشعارِ غنی''

جب میں نے یہ بیان پڑھا۔ تو ادب فارسی کے مشہور محقق علامۂ دوراں حافظ محمود خاں صاحب شیرانی لکچرار پنجاب یونیورسٹی لاہور کی خدمت میں ایک عریضہ لکھ کر رفعِ التباس کی درخواست کی۔ آپ نے تحریر فرمایا کہ:۔ ''میں نے مجمع النفائس از سراج الدین علیخاں آرزو الماری میں سے نکلوا کر دیکھا۔ اس میں عیناً وہی عبارت درج ہے۔ جو آپ کہتے ہیں۔ خان آرزو اور احمد علی سندیلوی میں خان آرزو زیادہ ثقہ اور قابلِ اعتبار ہیں جس طرح کہ قدیم بھی ہیں۔ آپ خانِ آرزو کے بیان کو صحیح تسلیم کیجئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ احمد علی کو سہو ہو گیا ہے اور انہوں نے صائب کا جو بیان غنی کے حق میں تھا، نسبتی کی طرف منتقل کر دیا''

نسبتی اور صائب۔ غنی اور صائب کا ہم عصر ہونا۔ باہمی ملاقاتیں اور کشمیر کی آمد و رفت تذکروں سے ثابت ہے۔ صائب دوسرے اکابر شعرا کا نام جس ادب سے لیتا تھا۔ وہ بھی معلوم ہے۔ اس لئے یہ امر قرین قیاس ہے کہ صائب نے نسبتی کے متعلق بھی ایسا ہی فرمایا ہو جیسا کہ غنی کے متعلق۔

البتہ مرزا احسن اللہ[1] مخاطب بہ ظفر خاں احسن تخلص مرزا صائب کے ممدوح سے مولانا کو ضرور تعلق تھا۔ مگر وہ تعلق ایسا تھا جیسے ایک مرشد اور ہادیِ طریقت کو اپنے مرید سے ہوتا ہے " مرزا ظفر خاں احسن بادے نسبتِ راسخہ داشتہ ازیں رو اکثر بہ کشمیر ہم اقامت کردہ" (روز روشن)

شفیق اورنگ آبادی لکھتے ہیں۔ " مولانا نسبتی در فقر صاحب نسبتِ تام است ۔ ظفر خاں صوبہ دار کشمیر با وے سلوک معتقدانہ داشت (گل رعنا)

اس کے سوا کسی امیر سے ان کا تعلق ثابت نہیں۔ باوجودیکہ مولانا کو ظفر خاں سے گونہ تعلق تھا لیکن اسکی مدح سے زبان قلم کو کبھی آسودہ ہونے نہ دیا

اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ ظفر خاں اُن سے اس طرح ملتا تھا جیسے کوئی اپنے مرشد سے ملتا ہے۔ ان کے تعلق کی ایک اور وجہ بھی دل میں آتی ہے۔ مولانا فنا فی الشعر تھے اور ظفر خاں " ناقدِ سخن" علامہ شبلی مرحوم شعر العجم جلد سوم

---

[1] مرزا احسن اللہ مخاطب بہ ظفر خاں رکن السلطنت اور خواجہ ابوالحسن قزوینی کا (پروفیسر آزاد مرحوم نگارستان میں سبزواری لکھتے ہیں) کا بیٹا تھا۔ خواجہ ابوالحسن اکبر کے زمانہ میں ہندوستان آکر شاہزادہ دانیال کا وزیر اور دکن کا دیوان مقرر ہوا۔ جب جہانگیر برسرِ آرائے سلطنت ہوا تو اسے وزارتِ عظمیٰ کا قلمدان اور منصب پنج ہزاری تفویض ہوا ۱۰۳۳ھ میں کابل کی حکومت بھی وزارتِ عظمیٰ سے متعلق کرا دی گئی اور ظفر خاں باپ کی نیابت میں صوبہ دارِ کابل بنایا گیا۔ شاہ جہاں نے ۱۰۴۲ھ میں ابوالحسن کو کشمیر کا صوبہ دار مقرر کیا۔ جہاں وہ اسی سال دنیا سے کوچ کر گیا۔ خواجہ کی وفات کے بعد ظفر خاں کو مستقل طور پر کشمیر کی صوبہ داری، سہ ہزاری منصب۔ علم اور نقارہ مرحمت ہوا۔ اس نے اپنے ایام حکومت میں تبت فتح کیا۔ علاوہ ازیں کابل کا گورنر رہا۔ شاہجہاں کے ہمراہ دکن کی یلغاروں (۱۰۳۳ھ تا ۱۰۴۱ھ) میں بھی شامل رہا۔ اپنے زمانہ کے چوٹی کے امرا میں شمار ہوتا تھا۔ عالی دماغ۔ بلند فطرت۔ صاحب جوہر اور جوہر شناس عالم تھا۔ نہایت فیاض قدر دانِ علم و فن اور شاعری کا نباض تھا۔ علامہ شبلی مآثر الامرا کے حوالہ سے لکھتے ہیں " ذرہا بمردم ایران می داد۔ خصوصاً در حقِ شعرا طرفہ بذل و کرم می فرمود " الغرض ارباب کمال کی پرورش کرنا فرض سمجھتا تھا ہمیشہ اس کے دربار میں علما۔ اُدبا اور شعرا کا جمگھٹا رہتا تھا۔ خود شاعر تھا۔ احسن تخلص کرتا تھا۔ علاوہ ازیں شعر کا زبردست نقاد تھا۔ صائب کو صائب بنانا اسی کے فیضِ تربیت کا نتیجہ ہے۔ اس نے شعرا کا ایک عجیب و غریب تذکرہ مرتب کرایا تھا جس میں اپنے ہمعصر شعرا کے سوانح حیات اور منتخب کلام خود شاعر کے اپنے ہاتھ سے لکھوائے تھے۔ ساتھ ہی ہر شاعر کی تصویر تیار کرا کر لگا دی تھی۔ (مآثر الامرا) محمد افضل سرخوش نے اس دلچسپ کتاب کا ایک ورق دیکھا تھا جس پر کلیم کی تصویر تھی۔ آہ۔ یہ نادر کتاب جو بڑے اہتمام سے لکھوائی گئی تھی دست بردِ حوادث کی نذر ہو گئی۔ اگر مل جاتی تو بڑے کام کی چیز تھی (کلمات الشعرا) مرزا صائب جب بسلسلۂ تجارت ہندوستان آیا اور شاہجہاں کے دربار میں حاضر ہوا یہاں ہی ظفر خاں سے واقفیت پیدا ہوئی۔ پھر یہ تعلقات اس قدر بڑھے کہ اب ظفر خاں اور صائب دونوں کے نام اکٹھے لئے جاتے ہیں

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۵۲ پر ملاحظہ ہو)

کے صفحہ ۱۳ پر لکھتے ہیں "ظفر خاں صوبہ دار کشمیر اس رتبہ کا شخص تھا کہ کلیم اور مرزا صائب کو اس کی اُستادی کا اعتراف ہے صائب ایک مدت تک اس کے دربار میں رہا اور اس کی بدولت شاعری میں ترقی کی۔ ظفر خاں اس کے کلام میں موقع بہ موقع دخل اور تصرف کرتا تھا"۔ نسبتی کے دیوان میں صرف ذیل کے دو شعروں میں ظفر خاں کا نام آیا ہے

نسبتی ما ہم زباتی با ظفر خاں کردہ ایم
گفتگوئے ایں غزل زاں او سراپا نازک است

من و دل ہیچ از شوق افغاں کنیم ظفر خاں -- ظفر خاں - ظفر خاں کنیم

ممکن ہے ان کے کلام کے صفحۂ عالم سے محو ہونے کی بڑی وجہ یہی بے نیازی - استغنا - زاویہ نشینی اور عزلت گزینی ہو --

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۵۱)

صائب نے اس کی تعریف میں پرزور قصاید لکھے - احسن کو بھی اس سے بڑی محبت تھی - اپنی غزلوں کے اکثر مقطعوں میں صائب کو یاد کرتا ہے ؎

طرز یاراں پیش احسن بعد ازیں مقبول نیست
تازہ گوئی ہائے او از فیضِ طبعِ صائب است

صائب اُسے اپنا اُستاد سمجھتا ہے

حقوقِ تربیت را کہ در ترقی باد زباں کجاست کہ در حضرتت فروخوانم
توہاں ز دخل بجا مصرعہ مرادادی تو در فصاحت دادی خطاب سحبانم
ز دقتِ تو بمعنی چناں شدم باریک کہ می تواں بدلِ مور کرد پنہانم
چوں زلفِ سنبلِ ابیاتِ من پریشاں بود نہ داشت طرۂ شیرازہ روئے دیوانم

تو غنچہ ساختی اوراق باد بردۂ من
دگر نہ خار نمی ماند از گلستانم

جب والد کی محبت صائب کو کشاں کشاں ایران لے گئی۔ تو وہ وہاں جاتے ہی شاہ عباس ثانی کے دربار میں ملک الشعرا بن گیا۔ مگر ہندوستان کی قدردانی کب بھولنے والی تھی۔ ظفر خاں کی تعریف میں وہاں سے بھی اشعار بھیجا کرتا۔ ایک دفعہ ایک شعر لکھ بھیجا ؎

دور دستاں را باحساں یاد کردن ہمت است
ورنہ ہر نخلے بپائے خود ثمر می افگند

تو ظفر خاں نے پانچ ہزار روپیہ اور بقولِ بعض پانچ ہزار اشرفی بھجوائیں۔ مولانا آزاد نگارستان میں یہ واقعہ ظفر خاں سے منسوب کرتے ہیں۔ مگر مولانا شبلی نے خزانۂ عامرہ کی روایت سے اسے نواب جعفر خاں وزیر اعظم عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب کیا ہے۔ مگر قرینِ قیاس یہی ہے کہ وہ سخی مرد ظفر خاں احسن ہی ہوگا

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۵۳ پر ملاحظہ ہو)

تاریخ شاہد ہے کہ اکثر نااہل متعلق بہ دربار شاہی ہونے کے باعث مشہور ہوئے (گوان کی شہرت چشمک شرار سے زیادہ نہ تھی) اور فضلائے بے مثال اپنی آزادمنشی کے باعث "لالۂ صحرا" بنے رہے۔ مجدالدین ہمگر شیخ کے معاصر اور اس دربار سے تعلق رکھتے تھے

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۵۲)

اس کی وفات بقول علامہ شبلی ۱۰۵۱ھ میں ہوئی اور خانصاحب مولوی عبدالمقتدر بانی پور پٹنہ کی خدابخش لائبریری کی عربی فارسی مخطوطات کی فہرست کے مؤلف ۱۰۷۳ھ بتاتے ہیں لیکن سرآج کے خیال میں ظفرخاں کی وفات ۱۰۸۱ھ یا ۱۰۸۳ھ میں واقع ہوئی۔

اس نے ۱۰۳۲ھ میں شعر کہنا شروع کیا ۱۰۳۵ھ میں جب وہ شاہجہاں کے ہمراہ دکن گیا تو ایک دیوان مرتب کیا جس کا ایک نسخہ بوڈلین لائبریری میں موجود ہے جس کے شروع میں ایک مفصل دیباچہ نثر میں ہے۔ اس نسخہ پر ۱۲ شعبان ۱۰۳۵ھ درج ہے۔ گویہ دیوان احسن کا ابتدائی کلام ہوگا۔ علامہ حافظ محمود خاں صاحب شیرانی کے ذاتی کتب خانہ میں بھی ایک نسخہ دیوان احسن کا موجود ہے جسے میں قلت وقت کے باعث دیکھ نہ سکا۔ آپ نے تو میری خاطر الماریاں کھلوا دی تھیں اگر قصور ہے تو میرا۔ اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ دیوان وہی ابتدائی مجموعۂ سخن ہے یا ظفرخاں کے عہد پختگی کا سرمایہ شعر و شاعری۔ علامہ فرماتے تھے دیوان احسن اکثر کتب خانوں میں موجود ہے۔ سرخوش لکھتا ہے کہ ایک دیوان نگین جس میں چند مثنویاں بھی ہیں اس سے یادگار ہے۔ نواب صدیق حسن خاں صاحب مصنف شمع انجمن نے بھی ان کا ایک دیوان مختصر دیکھا تھا۔ بانکی پور لائبریری میں بھی اس کا ایک نسخہ محفوظ ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

دلم بکوئے تو امید وار می آید	نگاہ دار کہ روزے بکار می آید
در گوشۂ میخانہ ہمیں گفت و شنیدا ست	یاراں برسانید دماغ شب عید است
شادم بہ دل شکستگی خود کہ پیش من	قدر دل شکستہ چو زلف شکستہ است
گوشۂ چشمے اگر ساقی بمن دارد بجاست	عمرہا در گوشۂ میخانہ خدمت کردہ ایم
بہ تیغ بے نیازی تا توانی قطع ہستی کن	فلک تا افگند از پا ترا خود پیش دستی کن
بہر کجا کہ روم وصف دوستاں گویم	برائے یار فروشی دکاں نمی باید
ز بہر مستیم کے کار با جام و شراب افتد	مرا از گفتگوئے بادہ سرخوش می تواں کردن
بسکہ بر خاک درش با صبیہ سودیم احسن	آیۂ سجدہ تواں خواند ز پیشانی ما

ظفرخاں کا بیٹا محمد طاہر مخاطب بہ عنایت خاں المتخلص آشنا ایک دلچسپ نوجوان تھا۔ اسے انشا پردازی میں کامل دسترس حاصل تھی۔ شاہجہاں نامہ کے مصنفین میں سے ایک ہے اس نے شاہجہاں کے وقایع حکومت ملا حمید وغیرہ کی نسبت زیادہ شگفتہ اور فصیح لکھے ہیں۔ اس نے اپنا دیوان بھی زندگی ہی میں مدون کر لیا تھا شعر میں دقت آفرینی اور مشکل پسندی اسے پسند نہ تھی چنانچہ اس کا قول ہے کہ جو شعر ایک دفعہ پڑھنے سے سمجھ میں نہ آئے اور جس کو سمجھنے کے لئے دماغ پر بوجھ ڈالنا پڑے وہ بے معنی ہے۔ اس کی وفات ۱۰۷۷ھ میں ہوئی۔ خدابخش لائبریری پٹنہ میں اس کا دیوان محفوظ ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

درد و درماں راہ ہر گز عرض عشق او بما	زخم بر داریم و بگذاریم مرہم را بجا
ناقصاں ہم بر درش چشم طمع دوختہ اند	کور پیوستہ نظر جانب بالا دارد
بہ نشیں بہ گوشۂ اگر آزادۂ ز خلق	پائے شکستہ تو بجائے ترفتہ است

جس سے شیخ تھا۔ آج تو کوئی ان کا نام بھی نہیں جانتا۔ لیکن اسی زمانہ میں فارسی کی ملک الشعرائی جو سعدی کا حق تھا قسمت نے ان کو عنایت کیا تھا

سعد بن ابوبکر سعد زنگی، ان کی تعظیم و تکریم شیخ سے زیادہ کرتا تھا۔ اسی زمانہ میں آ آمی ایک شاعر تھے زمانہ کی بے بصری نے ان کو بھی شیخ کا حریف بنا دیا تھا۔" (شعر العجم جلد دوم صفحہ) ۔ بیسوں ایسی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جنھیں بخوف طوالت نظر انداز کیا جاتا ہے ۔ زمانہ لاکھ مٹائے حق ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہندوستان کی ادبی محفلوں میں نسبتی کا نام ضرور گونجتا رہا۔ بحالیکہ ان کا کلام نایاب ہو گیا۔ آخر وہ وقت بھی آ گیا جب کہ زمانہ کی سنت جاریہ کے مطابق ان کا گم گشتہ دیوان پھر سے مل گیا۔

معلوم ہوتا ہے ایک شخص سعادت خاں سے (جس کا حال معلوم نہیں ہو سکا) مولانا نسبتی کو قلبی لگاؤ تھا۔ ایک درد آمیز غزل میں اپنی لگاوٹ کا اظہار کرتے ہیں :۔۔

مگو از ما سعادت خانِ ما را — کہ از نے بشنود افغانِ ما را

خورد چوں بادہ و خواہد کبابے — بیاد آرد دلِ بریانِ ما را

بگو گوشے نہد بر صوتِ بلبل — کہ با گل می زند دستانِ ما را

بہا کن شیوۂ بلبل۔ کہ دانی — بقدرے قیمتِ افغانِ ما را

بجانت می خورم سوگند جاناں — کہ جاں داد است درد جانِ ما را

چہ شد اکنوں کہ تاثیرے ندارد — اثر ہا بودہ ات افغانِ ما را

چکد چوں آب زہراب جدائی — بیفشاری اگر دامانِ ما را

سرے شوریدہ و جانِ خرابے — چہ می پرسی سرو سامانِ ما را

مگواے پند گو ما را ملامت
ملامت کن دلِ نادانِ ما را

نہ دست و پا۔ نہ بال و پر۔ نہ پرواز — چہ پرسی شوقِ بے سامانِ ما را

نماند نسبتی در چشم تر آب
بخوں شاداب کن مژگانِ ما را

وفات نواب صدیق حسن خاں شمع انجمن کے صفحہ 459 پر لکھتے ہیں " در اواسط ۱۱۵۵ھ بدار البقا آرامید" " روز روشن "، جو اس سے تین سال بعد کی تصنیف ہے اس کی تصدیق کرتا ہے ۔ مولانا نیاز فتحپوری مجموعۂ استفسارات و جوابات جلد اول کے صفحہ 429 پر تحریر فرماتے ہیں " گیارھویں صدی ہجری کے وسط میں آپ کا انتقال ہوا "۔ خانصاحب مولوی عبد المقتدر عربی فارسی مخطوطات کی فہرست جلد سوم میں طاہر نصیر آبادی کے تذکرۃ الشعراکے

حوالہ سے (جو سنہ ۱۰۶۳ھ) کی تصنیف ہے یوں رقم طراز ہیں "نسبتی نے اسوقت وفات پائی جب ظفر خاں احسن ناظم کابل تھا۔

اگر ان سب بیانات پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ طاہر نصیر آبادی کا قول غلط ہے کیونکہ ظفر خاں سنہ ۱۰۳۳ھ میں اپنے باپ کی طرف سے کابل کا ناظم تھا۔ پھر سنہ ۱۰۴۲ھ میں شاہجہاں نے اسے کشمیر کا گورنر مقرر کیا۔ اس طرح اس کی نظامت کابل کا زمانہ سنہ ۱۰۳۹ھ سے پہلے ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ سنہ ۱۰۳۹ھ میں شاہجہاں کے ساتھ دکن چلا گیا اور واپسی پر (سنہ ۱۰۴۲ھ) کشمیر کا حاکم بنایا گیا ہے صائب نے کشمیر جاتے ہوئے نسبتی سے ملاقات کی تھی۔ یہ تو معلوم ہوا ہے کہ صائب کشمیر سے ہی ایران چلا گیا تھا۔ پھر واپس نہیں آیا۔ صائب کی ملاقات بھی سنہ ۱۰۴۱-۱۰۴۲ھ کے بعد ہی کا واقعہ ہے۔ مگر گیا نسبتی گیارھویں صدی ہجری کے وسط میں فوت ہو گئے؟

مولانا نیاز کے بیان کی بنیاد روزِ روشن کے قول پر قایم ہے۔ جس کی اصل عبارت یوں ہے "وفاتش در اواسط ماتہ حادی عشر واقع شد" آپ کو دھوکا ہو گیا اور سنہ ۱۰۱۱ھ کے بجائے گیارھویں صدی ہجری لکھ گئے۔ مصنف شمع انجمن نے انھیں شعرائے عالمگیری میں شمار کیا ہے، عالمگیر کا عہد حکومت سنہ ۱۰۶۸ھ سے شروع ہوتا ہے۔ اس لئے نہ تو ان کی وفات گیارھویں صدی ہجری کے وسط میں تسلیم کی جا سکتی ہے۔ نہ سنہ ۱۰۳۳ھ اور سنہ ۱۰۴۲ھ کے درمیان طاہر نصیر آبادی کے قول کے مطابق

طاہر کے بیان کی تردید ایک اور چشم دید شہادت سے بھی ہوتی ہے۔ محمد صالح کنبوہ مصنف عمل صالح (شاہجہاں نامہ) اپنی کتاب کی دوسری جلد کے صفحہ ۷۴۳ پر لکھتے ہیں کہ "میں نے سنہ ۱۰۶۲ھ مطابق سنہ ۱۶۵۱ع میں نسبتی سے تھانیسر کے مقام پہ ملاقات کی جب کہ میں لاہور سے واپس ہو رہا تھا" اتنا تو یقینی طور پر معلوم ہو گیا کہ سنہ ۱۰۶۲ھ تک نسبتی زندہ تھے۔ نواب صدیق حسن خاں کا بیان "وسط سنہ ۱۱۵۵ھ" میں وفات پانا اس لئے غلط ہے کہ طاہر نصیر آبادی نے اپنا تذکرہ (بقول علامہ شبلی) سنہ ۱۰۸۳ھ میں مکمل کیا۔ ہو سکتا ہے کہ اُس نے تاریخ وفاتِ نسبتی کے متعلق کسی روایت کو بلا تحقیق لے لیا ہو۔ لیکن اس غلطی کا امکان قطعاً ناممکن ہے کہ وہ زندہ نسبتی کو مردہ نسبتی لکھتا۔

لہذا ان کی وفات کا زمانہ سنہ ۱۰۶۲ھ اور سنہ ۱۰۸۳ھ کے درمیان قرار پاتا ہے اگر یہ قیاس کر لیا جائے کہ مرزا طاہر نے غلطی سے ظفر خاں کی "حکومت کشمیر" کی جگہ "حکومت کابل" لکھ دی تو پھر نسبتی کی وفات کم از کم سنہ ۱۰۶۲ھ اور سنہ ۱۰۷۳ھ کے درمیان واقع ہوئی ہوگی۔ مگر اس میں بھی تو اختلاف ہے کہ ظفر خاں کب فوت ہوئے۔ مولوی عبدالمقتدر سنہ ۱۰۷۳ھ۔ سراج سنہ ۱۰۸۱ھ یا سنہ ۱۰۸۳ھ اور علامہ شبلی سنہ ۱۰۷۳ھ لکھتے ہیں۔ علامہ شبلی نے ظفر خاں کا حال مآثر الامراء کے حوالہ سے لکھا ہے۔ اس لئے میں ان کا قول مرجح سمجھتا ہوں۔ پس اس عاجز کے خیال میں نسبتی کی وفات عہد عالمگیر کے ابتدائی ایام کا حادثہ ہے یعنی سنہ ۱۰۶۹ھ اور سنہ ۱۰۷۳ھ کے درمیان

مرزا صائب جب ایران گئے تو جاتے ہی دربار ایران میں ملک الشعرا بن گئے۔ ان کا مشہور شعر:

"دور دستاں را بہ احساں یاد کردن ـ ـ ـ ـ" عہد عالمگیر میں ہندوستان آیا۔ اس لئے قیاس یہ چاہتا ہے کہ صائب

کا ایران جانا اور شعر کا بھیجنا یہ سب باتیں ایک دو سال کے اندر وقوع پذیر ہوئی ہوں گی۔ اگر "جعفر خاں" اور "ظفر خاں" کو کتابت کی غلطی کہا جائے تو نسبتی کی وفات کم از کم ۱۰۶۸ھ اور ۱۰۷۰ھ کے درمیانی سالوں میں ہوئی ہوگی۔ میرے پاس تذکرۃ الشعراء نصیر آبادی ہے نہ مآثر الامراء۔ ممکن ہے اگر ان دو کتب کا بدقت نظر مطالعہ کیا جائے اور زیادہ تفحص سے کام لیں تو کوئی صحیح تر اور مفید طلب بات معلوم ہو سکے۔ اس بارہ میں شاہجہاں اور عالمگیر اعظم کے عہد حکومت کی تاریخی کتب سے بھی مدد لی جا سکتی ہے۔ آیندہ قسط میں ان کا کلام پیش کیا جائے گا

(باقی) فضل حسین تبسم

(نگار) جناب فضل حسین تبسم نے نسبتی پر یہ مقالہ لکھ کر، اس میں شک نہیں بڑا کام کیا ہے۔ اول اول جب تبسم صاحب نے مجھے اطلاع دی کہ کلیات نسبتی دستیاب ہو گیا ہے، تو مجھے بڑی خوشی ہوئی، کیونکہ دو چار اشعار نسبتی کے جو مجھے یاد تھے۔ اُن سے میں نے اندازہ کیا تھا کہ نسبتی کا معیار تغزل وہی ہے جو سعدی کا تھا اور یہ مسلّم ہے کہ سعدی سے بہتر غزل کسی نے نہیں کہی

تبسم صاحب نے جس محنت و شوق سے اس کام کو انجام دیا ہے، اس کی داد زمانہ سے ملنا تو مشکل ہے کیونکہ فارسی کا ذوق اب تقریباً معدوم ہو چکا ہے، لیکن خود تبسم صاحب کا یہ احساس کہ انھوں نے نسبتی کو دوبارہ زندہ کر دیا، بجائے خود اتنی بڑی داد ہے کہ اس سے زیادہ کی تمنا کوئی معنی نہیں رکھتی

اگر کلیات نسبتی انھوں نے میرے پاس بھیج دیا، جیسا کہ انھوں نے وعدہ کیا ہے تو میں خود بھی اختتام مقالہ پر اپنی رائے پیش کروں گا اگر اس کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کلیات نسبتی کا ایک نسخہ رامپور کے کتاب خانہ میں بھی ہے جس کا ذکر مولانا عرشی ناظم کتاب خانہ نے خود مجھ سے کیا تھا، اگر کبھی رامپور گیا تو دیکھوں گا کہ تبسم صاحب کے دریافت کئے ہوئے نسخے سے وہ کس حد تک مطابق ہے۔ اس مقالہ کی آیندہ قسط جس میں نسبتی کی غزلگوئی سے بحث کی گئی ہے، دیکھنے کے قابل ہوگی، کیونکہ وہی اس مضمون کی جان ہے (نیاز)

اُسے نہ صرف قدماء کے کلام پر عبور حاصل تھا بلکہ خود بھی نہایت پاکیزہ شعر کہتا۔ فنِ طب کا ایسا مجتہدانہ ذوق رکھتا تھا کہ خود مریضوں کا علاج کرتا۔ فنِ کتابت میں ایسا ملکہ اُسے حاصل تھا کہ بڑے بڑے خوشنویس اس سے شرماتے تھے۔ مذہب کا حد درجہ احترام کرتا اور فرائض کے علاوہ نوافل و مستحبات بھی کبھی اس سے ترک نہ ہوتے تھے۔ شراب کو اس نے کبھی منھ نہیں لگایا اور دیگر مشاغل لہو و لعب جو امراء و سلاطین کے ساتھ مخصوص ہیں اس نے کبھی اختیار نہیں کیے۔ بخشش و کرم کی یہ کیفیت تھی کہ اگر کسی درویش کو خزانہ بھی اُٹھا کر دیدیتا تو یہی سمجھتا کہ میں نے کچھ نہیں دیا۔ ممکن نہیں تھا کہ کسی بیوہ یا غریب و ضعیف کی فریاد اس تک پہونچ جائے اور وہ اُسے مالامال نہ کردے۔ عراق و خراسان، ماوراء النہر و ترکستان، روم و عربستان، کے علماء، فضلاء، ماہرین فنون اس کے دربار میں کھنچے ہوئے چلے آرہے تھے اور وہ دونوں ہاتھوں سے زر و جواہر کی بارش ان پر کررہا تھا

تاتار خاں والی سنارگاؤں کو جب اس نے بہرام خاں کا خطاب دیا تو اس کے ساتھ ایک ہی دن میں سو ہاتھی، ہزار گھوڑے اور ایک کروڑ تنکہ سُرخ (اشرفی) بھی مرحمت فرمایا

ملک سنجر بدخشانی کو اسّی لاکھ تنکہ۔ ملک عماد الدین کو ستّر لاکھ تنکہ اور مولانا ظہیر الدین اپنے اُستاد کو چالیس لاکھ تنکہ ایک دن میں اُٹھا کر دیدیا۔ اسی طرح مولانا ناصر الدین اور ملک غازی کو جو ایک فاضل شاعر تھا سالانہ لاکھوں تنکے انعام میں دیدیتا[1]

پھر اس کے ساتھ جرأت و بہادری، علوئے حوصلہ، پختگی عزم، رسوخ تدابیر کو بھی شامل کیجیے اور اس کے بعد غور کیجیے کہ ان صفات کا بادشاہ کیا چیز ہوسکتا ہے اور اس کو کتنا کامیاب ہونا چاہیئے

صاحب مسالک الابصار[2] نے سراج الدین ابوالفتح عمر (جو اودھ کا رہنے والا اور محمد تغلق کے دربار سے عرصہ تک متعلق رہا تھا) اور شیخ مبارک کی روایت سے مفصل حالات اس عہد کے لکھے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد تغلق کس

دولت آباد اور دہلی کی کیفیت

---

[1] فرشتہ ۱۳۳ طبقات اکبری ۹۹ - ۱۰۰ - [2] "مسالک الابصار فی ممالک الامصار"، کا مصنف شہاب الدین ابوالعباس احمد دمشقی تھا۔ یہ ۶۹۷ھ/۱۲۹۷ء میں پیدا ہوا اور ۷۴۹ھ/۱۳۴۸ء میں بمقام دمشق مرگیا مصنف نے اپنے اور اپنے خاندان کے حالات بالکل نہیں لکھے، البتہ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اور اُسکا خاندان سلاطین مصر سے وابستہ تھا اس کا باپ قاضی محی الدین دمشق میں صیغۂ راز کا سکریٹری تھا۔ جب وہ یہاں سے علٰحدہ ہوگیا تو اس کے چند دن بعد اسی خدمت پر مصر میں مامور ہوگیا۔ شہاب الدین دونوں جگہ اپنے باپ کا معاون رہا۔ لیکن آخرکار وہ دمشق چلا آیا اور یہیں اپنی عمر گزار دی

شہاب الدین بڑا فاضل شخص تھا اس نے تمام علوم متداولہ میں تبحر تام حاصل کیا تھا اور بہت سی کتابیں اس نے تصنیف کیں جو آج بالکل مفقود ہیں مسالک الابصار بیس جلدوں میں تمام کی لیکن اب صرف ۵ جلدیں نظر آتی ہیں اور وہ بھی یوروپ کے کتب خانوں میں۔ ہندوستان میں اسکا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے —— شہاب الدین نے عہد محمد تغلق کے حالات نہایت معتبر ذرائع سے فراہم کرکے لکھے ہیں اور تحقیق و جستجو اس کی تمام تصانیف کی خصوصیت بتائی جاتی ہے مصنف نزہت القلوب نے بھی اپنی تصنیف میں شہاب الدین کی تصانیف کا حوالہ دیا ہے

شوکت وجبروت کا بادشاہ تھا اس کے دربار کا کیا آئین تھا اور اس کے زمانہ میں دہلی اور دیوگیر (دولت آباد) کی رونق کا کیا عالم تھا۔ دولت آباد کا نام اس نے قبتہ الاسلام رکھا تھا اور کثرت سے عمارتیں بنوا کر مخصوص جماعتوں کے قیام کے لئے شہر کو وقف کردیا تھا۔ علماء، فقراء، مشائخ، امراء، ملوک، خواتین، فوج، وزراء، تجار، پیشہ ور لوگ، انگریز، نجار، حداد وغیرہ کے لئے الگ الگ محلے مقرر کئے اور وہاں ان کے لئے مسجدیں، بازار، حمام، بھٹیاں اور ضرورت کی تمام عمارتیں قائم کرادیں۔ ہر محلہ گویا ایک مستقل قصبہ تھا اور اپنی ضروریات کے لحاظ سے دوسرے محلہ کا محتاج نہ تھا

آبادی کے لئے خاص اصول

دہلی کا یہ حال تھا کہ یہاں چھوٹے بڑے مدارس ایک ہزار کے قریب تھے، اور ستر ہسپتال (دارالشفاء) تھے جن میں غرباء کا علاج ہوتا تھا۔ ...۲ مسجدیں تھیں اور خانقاہوں اور حماموں کا کوئی شمار نہ تھا۔ کنوئیں کثرت سے موجود تھے

افسران ریاست درجہ بدرجہ خان، ملک، امیر، سپہ سالار اور جند کہلاتے تھے۔ اور سواروں کی تعداد نو لاکھ تھی جن میں ترک، ایرانی اور ہندوستانی لوگ شامل تھے ان کے گھوڑے عمدہ، وردی نفیس، اور اسلحہ کی حالت بغایت پسندیدہ تھی۔

افسران سلطنت کی تقسیم

ایک خان کی ماتحتی میں دس ہزار سوار اور ایک ملک کی ماتحتی میں ایک ہزار سوار ہوتے تھے۔ امیر سو سواروں کے دستہ کا افسر تھا اور سپہ سالار اس سے کم درجہ کا۔ سپہ سالار بادشاہ کی حضوری میں نہیں جا سکتا تھا۔ ان کی تنخواہوں کے عوض میں جاگیریں مقرر تھیں جن میں کبھی کمی نہ ہوتی تھی۔ ہر خان کو دو لاکھ تنکہ (ہر تنکہ آٹھ درم کے برابر) ہر ملک کو پچاس ہزار اور ساٹھ ہزار تنکہ کے درمیان ہر امیر کو تیس اور چالیس ہزار تنکہ کے درمیان اور سپہ سالار کو بیس ہزار تنکہ کی جاگیر اس کے ذاتی مصارف کے لئے مقرر تھی۔ سپاہیوں اور مملوکوں کی تنخواہ علاوہ خوراک، لباس اور مصارف اسپ کے ...۵ تنکہ مقرر تھی، جو خزانہ شاہی سے نقد ملتی تھی

غلاموں کو دس تنکہ ماہوار تنخواہ دی جاتی تھی اور چار جوڑے کپڑے ہر سال مرحمت ہوتے۔ اس کے علاوہ ماہوار دو من گیہوں اور چاول اور روزانہ تین سیر گوشت معہ ضروری سامان گھی اور مسالہ وغیرہ کے ہر غلام کے لئے مقرر تھا

سلطان کا ایک ذاتی کارخانہ کپڑا بننے کا تھا جس میں چار سو آدمی ہر قسم کا ریشمی کپڑا بنا کرتے تھے۔ اس کارخانہ میں جو کپڑے طیار ہوتے، ان سے خلعت وغیرہ بھی طیار کئے جاتے۔ سلطان ہر سال موسم بہار میں ایک لاکھ اور موسم خزاں میں ایک لاکھ خلعت تقسیم کرتا۔ موسم بہار کی خلعتیں اسکندریہ کے ریشمی کپڑوں کی ہوتیں اور موسم خزاں کے خلعت دہلی یا چین و عراق کے کپڑے کی طیار کی جاتیں۔ خلعتیں، خانقاہوں میں مشائخ و علماء وغیرہ کو بھی تقسیم کی جاتی تھیں

پارچہ بافی کا ذاتی کارخانہ، خلعتوں کی تقسیم

صرف سلطان کے ذاتی کارخانے زردوزی اور کارچوب کے ۵۰۰ تھے جن میں خواتین حرم و دیگر معزز خواتین کے لئے ہر وقت کام ہوتا رہتا تھا

سلطان ہر سال دس ہزار عربی گھوڑے نہایت اچھی نسل کے معہ ساز دیراق کے امراء کو تقسیم کرتا تھا اور معمولی گھوڑوں کا تو کوئی شمار نہ تھا

سلطان کے ۵۰۰ ذاتی کارخانے

نائب السلطنۃ اور اسکے ماتحت افسروں کے مواجب

سلطان کا ایک نائب بھی ہوتا تھا جو خوانین سے منتخب کیا جاتا تھا۔ اس کی جاگیر کا رقبہ صوبۂ عراق سے کم نہ تھا اسی طرح ایک وزیر بھی ہوتا تھا وزیر کی ماتحتی میں چار اس کے معاون ہوتے تھے۔ جن کی جاگیریں بیس ہزار اور چالیس ہزار تنکہ کے درمیان ہوتی تھی۔ علاوہ ان کے چار دبیر (یا میر منشی) بھی ہوتے تھے۔ بعض محرروں کی جاگیر بھی تھی اور نقد تنخواہ بھی

صدر جہاں اور شیخ الاسلام کے فرائض

ایک عہدہ قاضی القضاہ کا بھی ہوتا تھا جسے صدر جہاں[1] اور صدر اسلام بھی کہتے تھے۔ اس کی جاگیر میں دس قصبات ہوتے تھے جن کی آمدنی ساٹھ ہزار تنکہ سے کم نہ ہوتی تھی۔ ایک شخص شیخ الاسلام بھی ہوتا تھا اور اس کی جاگیر بھی اسی قدر ہوتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ صدر جہاں کا کام مقدمات کی سماعت اور احکام سزا وغیرہ دینا تھا، اور شیخ الاسلام صرف قاضی تھا جو شرع کے مطابق مسائل عامہ طے کیا کرتا تھا۔ ایک عہدہ محتسب (کوتوال) کا بھی تھا اسکی تنخواہ ۸۰۰۰ تنکہ تھی ـــ سلطان کے دربار میں ۱۲۰۰ طبیب تھے اور دس ہزار شکاری جو گھوڑوں پر سوار ہو کر ہاتھوں پر باز اور شاہین بٹھائے ہوئے نکلتے تھے۔ ۳۰۰۰ ہانکہ کرنے والے بھی نوکر تھے اور علاوہ ان کے تین ہزار ایسے لوگ بھی تھے جو اس شکار کے تمام اور ضروریات کو مہیا کرتے تھے

نایک اور شعراء

سلطان کے دسترخوان پر ۵۰۰ امراء کھانے میں شریک ہوتے، اور ۱۲۰۰ مغنی ہر وقت حاضر رہتے اس میں ان ایک ہزار مغنیوں کی تعداد شامل نہیں ہے جو موسیقی کی تعلیم دینے کے لئے قصر شاہی کے اندر رہتے تھے ایکہزار شاعر بھی دربار سے متعلق تھے جن میں سے بعض عربی بعض فارسی اور بعض ہندی زبان میں شاعری کرتے۔ ان مغنیوں اور شعراء میں بعض کی بڑی بڑی جاگیریں مقرر تھیں اور بعض نقد تنخواہیں بیس ہزار سے ۴۰ ہزار تنکہ تک پاتے تھے۔ انعام و اکرام اس کے علاوہ تھا

آئین دربار و طعام

شیخ مبارک کا بیان ہے کہ سلطان روزانہ صبح و شام دربار کرتا تھا اور اس کے بعد کھانا ہوتا تھا جس میں بیس ہزار خوانین و ملوک، امراء و اراکین شامل ہوتے تھے خاص بادشاہ کے دسترخوان پر بڑے بڑے علماء (جن کی تعداد ۲۰۰ تھی) بیٹھتے تھے اور بادشاہ کھانے کے دوران میں ان سے علمی مباحث پر گفتگو کیا کرتا تھا

مطبخ کے مصارف

شیخ ابوبکر بن خلال کا بیان ہے کہ شاہی مطبخ کے لئے روزانہ ۲۵۰۰ بیل یا گائے اور ۲۰۰۰ بکریاں ذبح ہوتی تھیں چڑیوں کا تو کوئی شمار نہ تھا

فوج اور رعایا کا انتظام نائب السلطان کے سپرد تھا۔ علماء و فقہاء ہندی ہوں یا اجنبی سب کا تعلق صدر جہاں سے تھا۔ اسی طرح مشایخ و فقراء کا معاملہ شیخ الاسلام کی وساطت سے طے ہوتا تھا۔ سیاحین و سفراء۔ شعراء و دیگر اہل کمال دبیروں (سکریٹریوں) سے متعلق تھے

---

[1] جس زمانہ کا ذکر صاحب مسالک الابصار نے لکھا ہے اس وقت کمال الدین ابن برہان الدین اس عہدہ پر ممتاز تھا

جب بادشاہ شکار کو جاتا تو ایک لاکھ سوار اور ۲۰۰ ہاتھی اس کے جلو میں ہوتے۔ لکڑی کے سفری مکان دو دو منزل کے ساتھ ہوتے جنھیں دو سو اونٹ کھینچتے خیمے اور قناتیں وغیرہ بھی کثرت سے ساتھ ہوتیں

جب بادشاہ ایک مقام سے کسی دوسرے مقام پر کسی غرض سے سفر کرتا تو تیس ہزار سوار ۲۰۰ ہاتھی اور ایک ہزار کوتل گھوڑے جواہر کار ساز و یراق سے آراستہ ہمراہ ہوتے

بادشاہ بہت منکسر مزاج تھا۔ ابو الصفا عمر و بن اسحاق کا بیان ہے کہ خود اس نے بادشاہ کو ایک فقیر کے جنازہ کو کاندھا دیتے ہوئے دیکھا تھا وہ کلام مجید کا حافظ تھا اور شرعِ حنفی کی تمام کتابوں پر اس کو پورا عبور تھا۔ وہ علماء کبار سے برابر مسائل علمیہ میں مباحثہ کرتا شعر و شاعری میں حد درجہ پاکیزہ مذاق رکھتا اور فن کتابت کا زبردست ماہر تھا

مے خواری کا سدباب

شراب کا رواج کہیں نہ تھا۔ بادشاہ کو اس سے سخت نفرت تھی اور یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی شخص ایک قطرہ شراب کا اپنے مکان میں رکھ لے۔ پان کا رواج عام تھا اور اس کی ممانعت بھی نہ تھی

ڈاک و خبر رسانی کا انتظام

خبر رسانی کا انتظام بھی سلطان نے نہایت مکمل کیا تھا علاوہ جاسوسوں کے، ڈاک کی آمد و روانگی کے لئے ہرکارے بھی مقرر تھے ہر محکمہ میں شاہی جاسوس پھرا کرتے تھے اور وہاں کی خبریں اپنے افسران کے ذریعہ سے بادشاہ پہونچاتے تھے۔ دور دراز مقامات کے حالات ڈاک کے ذریعہ سے پہونچتے تھے اس کا انتظام اس طور پر تھا کہ سڑکوں پر چار تیر کی مسافت سے چوکیاں بنی ہوئی تھیں، ہر چوکی پر دس ہرکارے متعین تھے جن کا فرض تھا کہ وہ ڈاک کو ہر ممکن سرعت کے ساتھ اگلی چوکی تک پہونچا دیں اس صورت سے ڈاک ادھر سے اُدھر بہت جلد پہونچ جاتی تھی۔ ہر چوکی پر ایک مسجد تعمیر کی گئی تھی جہاں مسافر قیام کرتے، نمازیں ادا کرتے اور شیریں پانی کے لبریز حوضوں سے اپنی تشنگی رفع کرتے۔ اسی طرح ہر چوکی کے پاس ایک بازار بھی تھا جس میں تمام ضروری اشیاء غذا کی ملتی تھیں اور جانوروں کی بھی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ دہلی اور دولت آباد کے درمیان ہر چوکی پر ایک نقارہ بھی رکھا رہتا اور کسی خاص امر کے وقوع پر وہ بجایا جاتا اس سے یہ فایدہ تھا کہ بادشاہ دہلی میں ہو یا دولت آباد میں اس کو دوسرے شہر کے تمام واقعات کی اطلاع فوراً ہو جاتی۔

ڈاک کے ذریعہ سے خراسانی میووں کا آنا

ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں زیادہ تفصیل کے ساتھ ڈاک کی انتظامی حالت بیان کی ہے، وہ لکھتا ہے کہ "اس وقت ڈاک دو قسم کی تھیں ایک برید الخیل (گھوڑے کی ڈاک) دوسرے برید الرجال (قاصدوں یا ہرکاروں کی ڈاک) ہر میل کے اندر تین چوکیاں ڈاک کی ہوتی ہیں۔ یہاں ہرکارے متعین ہوتے ہیں۔ جس وقت کسی ہرکارے کے پاس ڈاک پہونچتی ہے وہ فوراً اپنی کمر کستا ہے اور ایک ہاتھ میں ڈاک اور دوسرے میں گھونگرو دار چابک لئے ہوئے جسے وہ راستہ بھر بجاتا جاتا ہے، دوسری چوکی کی طرف روانہ ہوتا ہے اسی طرح وہاں کا ہرکارہ آگے لیجاتا ہے

اسی ڈاک کے ذریعہ سے خراسان کے میوے، طباقوں کے اندر سربمہر روزانہ بادشاہ کے پاس پہونچتے تھے، اور گنگا کا پانی بھی چالیس دن کے راستے سے شاہی استعمال کے لئے اسی ذریعہ سے روزانہ پہونچتا تھا

سکوں کی تفصیل

جب کوئی اجنبی ہندوستان آتا تو انھیں ہرکاروں کے ذریعہ سے بادشاہ کو فوراً معلوم ہو جاتا کہ فلاں شخص اس شکل وحلیہ اس صورت ولباس کا فلاں مقام پر آیا ہے اور اس کے متعلق مناسب احکام صادر کئے جاتے۔ خاص خاص قیدی بھی ڈاک ہی کے ذریعہ سے بادشاہ تک پہونچائے جاتے تھے

طلائی تنکہ کو تنکۂ سرخ کہتے تھے جس کا وزن تین مثقال کا تھا۔ نقرئی تنکہ کی قیمت ۸ درہم ہشت کانی تھی اور درہم ہشت کانی کا وہی وزن تھا جو اسوقت مصر وشام کے ایک نقرئی درہم کا ہوتا تھا

ایک درہم ہشت کانی، چار درہم سلطانی کے برابر سمجھا جاتا تھا جنھیں دوکانی بھی کہتے تھے۔ ایک سکہ نصف درہم سلطانی کا بھی تھا جس کو یکانی کہتے تھے اور اس کی قیمت ایک جیتل تھی۔ ایک درہم کا نام دوازدہ کانی بھی تھا جو ڈیڑھ ہشت کانی کے برابر تھا۔ ایک سکہ شانزدہ کانی بھی تھا جس کی قیمت دو درہم کے برابر تھی کل چھ نقرئی سکے اسوقت رائج تھے شانزدہ کانی دوازدہ کانی، ہشتکانی، ششکانی، سلطانی، اور یکانی۔ درہم سلطانی ۸ فلوس (پیسوں) کے برابر تھا اور جیتل چار فلوس کے برابر۔ درہم ہشتکانی کے ۳۲ فلوس ملتے تھے۔ سیر ستر مثقال کا تھا اور ایک من چالیس سیر کا ہوتا تھا

اشیاء کی ارزانی

ایک من گیہوں ڈیڑھ ہشتکانی میں ملتا تھا، ایک من جو ایک درہم میں، چاول ایک درہم میں ۱½ من مٹر اور چنا ایک درہم ہشتکانی میں دو من ملتا تھا۔ گوشت بکری کا ایک درہم سلطانی میں ۴ سیر ملتا تھا۔ بڑی بط دو درہم ہشتکانی میں ملتی تھی اور ایک ہشتکانی کی چار مرغیاں فروخت ہوتی تھیں۔ شکر ایک ایک ہشتکانی میں ۵ سیر ملتی تھی اور نہایت نفیس اور فربہ بھیڑ ایک تنکہ میں۔ اسی طرح ایک عمدہ بیل دو تنکہ میں فروخت ہوتا تھا[1]

ابن بطوطہ نے جو حالات دربار وغیرہ کے لکھے ہیں وہ بھی نہایت دلچسپ ہیں اس لئے مختصر الفاظ میں ان کا اظہار یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے، لکھتا ہے کہ:۔

محل و دربار کی تفصیل

"سلطان نے جو قصر دہلی میں تعمیر کرایا ہے اس کا نام دارسرا ہے اور اس میں متعدد دروازے ہیں پہلے دروازہ پر محافظ فوج کا ایک دستہ ہر وقت متعین رہتا ہے اور نقارے، نفیریاں اور قرنا وغیرہ بھی موجود رہتے ہیں جو امرا کبار کی آمد پر بجائے جاتے ہیں۔ یہی حال دوسرے اور تیسرے دروازہ کا ہے آخری دروازہ کے بعد قصر ہزار ستون[2] ملتا ہے جہاں بادشاہ لوگوں سے ملاقات کرتا ہے۔ نقیبوں کے سر پر زریں دستار، کمر میں پٹکا، ہاتھ میں طلائی یا نقرئی دستہ کا کوڑا رکھنا ضروری ہے۔ نقیب اعظم کے ہاتھ میں سونے کی جریب ہوتی ہے اور سر پر زریں کلاہ جس میں جواہر جگمگاتے رہتے ہیں

دربار کی نشست اکثر عصر کے بعد ہوتی ہے۔ ایک چبوترہ پر سفید فرش بچھا کر اس پر شاہی تخت رکھا جاتا ہے،

---

[1] یہ تمام حالات سوائے اُن بیانات کے جہاں ابن بطوطہ کی صراحت کردی گئی ہے مسالک الابصار (ایلیٹ) جلد سوم صفحہ ۵۷۴ - ۵۸۴ سے ماخوذ ہیں۔۱۲

[2] قصر ہزار ستون کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس میں ایک ہزار چوبی ستون لگے ہوئے تھے اس قصر کی چھت بھی لکڑی کی تھی

جب بادشاہ برآمد ہوکر اپنی نشست پر جاتا ہے تو تمام نقیب اور حاجب باآواز بلند بسم اللہ کہتے ہیں اور ملک کبیر چنور لے کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ سلطان کے داہنے اور بائیں جانب سو سو مسلح سپاہی کھڑے ہوتے ہیں جن کے ہاتھوں میں تلواریں اور شانوں پر کمانیں ہوتی ہیں تمام امراء درجہ بدرجہ بٹھائے جاتے ہیں۔ یہاں ساٹھ کوتل گھوڑے بھی جواہر کار ساز ویراق کے ساتھ رہتے ہیں۔ گھوڑوں کے بعد پچاس ہاتھی کھڑے ہوتے ہیں ان کی جھولیں حریر کی ہوتی ہیں، جن پر زردوزی کا کام ہوتا ہے اور ان کے دانتوں پر لوہے کا خول چڑھا رہتا ہے۔ ان ہاتھیوں پر ہودہ ہوتا اور ہر ہودہ پر چار علم بھی ہوتے ہیں

عید کی صبح کو ہاتھی آراستہ کئے جاتے ہیں اور ان پر جواہر کار زردوزی کی جھولیں ڈالی جاتی ہیں، سولہ ہاتھی بادشاہ کی سواری کے لئے مخصوص ہیں جن پر مرصع چھتر ہوتے ہیں، چھتر کی ڈنڈی خالص سونے کی ہوتی ہے۔ بادشاہ جس ہاتھی پر سوار ہوتا ہے اس کی مستک پر ایک روشن ستارہ جواہرات کا لگا دیا جاتا ہے، اس ہاتھی کے آگے غلاموں کی قطار ہوتی ہے جن کے سروں پر سونے کی کلغیاں ہوتی ہیں اور کمر میں جواہر کار پٹکے۔ ان کے آگے ۔۔۳ نقیب ہوتے ہیں جو سر سے پاؤں تک زر و جواہر سے لدے رہتے۔ ان کے آگے امراء ہاتھیوں اور گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں اور پھر فوج اور ماہی مراتب عیدگاہ کے دروازہ پر پہونچ کر ٹھہر جاتا ہے اور جب تمام علماء و امراء اندر چلے جاتے ہیں تو پھر خود ہاتھی سے اُتر کر اندر جاتا اور نماز سے فارغ ہوکر اونٹ کی قربانی کرتا ہے

عید کے دربار میں حد درجہ تزک و احتشام سے کام لیا جاتا، جس کا بیان ابن بطوطہ نے نہایت تفصیل سے کیا ہے لیکن ہم اس کا ذکر یہاں نہیں کرتے بیان ماسبق سے اس کی شان و شوکت کا اندازہ ہو سکتا ہے

جب بادشاہ کسی سفر سے واپس آتا تو ہاتھی آراستہ کئے جاتے اور ۱۶ ہاتھیوں پر جواہر کار ہودے رکھے جاتے، ہر ایک کی مستک پر ایک ستارہ لگایا جاتا جس میں موتی و الماس ٹنکے ہوتے۔ علاوہ ان کے کئی کئی منزل کے چوبی قبے بنائے جاتے اور ان پر ریشمی کپڑا لپیٹ دیا جاتا۔ ان قبوں کی ہر منزل میں خوبصورت کنیزیں پر تکلف لباس اور قیمتی زیور پہنے ہوئے نغمہ و رقص میں مصروف نظر آتیں۔ راستہ میں تمام ریشمی فرش ہوتا اور اس پر سے سلطان کی سواری گزرتی۔ شہر کے دروازہ سے لیکر قصر کے دروازہ تک راستے آراستہ کئے جاتے اور اُن پر بھی ریشمی فرش کیا جاتا۔ بادشاہ کے آگے ہزار غلام ہوتے اور پیچھے فوج کے دستے۔ بادشاہ جس وقت شہر کے اندر داخل ہوتا تو دینار و درم کی بارش ہونے لگتی تھی، غرباء انھیں لوٹتے تھے اور سلطان اسی حال میں قصر کے اندر داخل ہو جاتا

طریقِ طعام یہ تھا کہ جب مطبخ سے کھانا چلتا تو نقیب باآواز بلند بسم اللہ کہتے ہوئے آگے ہوتے جب کھانا بادشاہ کے قریب پہونچ جاتا تو سوائے بادشاہ کے سب کھڑے ہو جاتے اور کھانا فرش پر چُنا جاتا اس کے بعد نقیبِ اعظم، بادشاہ کی مدح و تعریف کرتا اور تمام نقیب بادشاہ کو مجرا کر کے ہٹ جاتے پھر بادشاہ کے سامنے تمام حاضرین کی فہرست پڑھی جاتی اور اس کے بعد کھانا کھایا جاتا۔ صدر دسترخوان پر فقہاء و علماء، یا قضاۃ و مشائخ، ہوتے اس کے بعد بادشاہ کے

اقارب و امراء کبار اور پھر تمام آدمی اپنی اپنی معین جگہ پہ بیٹھ جاتے۔ اس کے بعد شراب دار سونے چاندی کے برتن لئے ہوئے آتے جن میں مصری کا شربت ہوتا، پہلے یہ پی لیا جاتا اس کے بعد کھانا شروع کیا جاتا۔ فراغت طعام کے بعد جو اور مویز کا افشردہ پینے کو دیا جاتا اور پھر ریشمی تاگے سے بندھی ہوئی پان کی گلوریاں تقسیم ہوتیں

سلطان عدل و انصاف کے معاملہ میں بہت سخت تھا حتیٰ کہ وہ اپنے وجود کو بھی اس سے مستثنیٰ نہ سمجھتا تھا۔ ایک بار کسی ہندو امیر نے قاضی کے ہاں نالش کی کہ سلطان نے اس کے بھائی کو بے سبب قتل کر ڈالا ہے۔ قاضی نے سلطان کو طلب کیا چنانچہ یہ گیا اور قاضی کو سلام کر کے کھڑا ہو گیا۔ جب قاضی نے بیٹھنے کی اجازت دی تو بیٹھا اور اس وقت تک عدالت سے باہر نہ گیا جب تک مدعی راضی نہیں ہو گیا[1]

ان تمام بیانات سے یہ امر بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ محمد تغلق اپنی صفات کے لحاظ سے ایک بے مثل حکمراں تھا، عزم و استقلال، سطوت و جبروت، بذل و کرم، زہد و اتقاء، شجاعت و بسالت، اس میں بدرجۂ اتم پائی جاتی تھیں۔ وہ خود تمام اُمور کا انتظام کرتا، قوانین نافذ کرتا اور خود اپنے کو بھی اس سے مستثنیٰ نہ سمجھتا، خود میدان جنگ میں فوج کے ساتھ جاتا اور دشمن کا مقابلہ کرتا لیکن باوجود ان تمام باتوں کے وہ کامیاب بادشاہ ثابت نہ ہوا اور تمام صوبے اس کے آخر عہد میں خود مختار ہو گئے

تخت نشین ہوتے ہی وہ ایک سیلاب کی طرح تمام دور و دراز علاقوں پر چھا گیا اور سلسلۂ فتوحات شروع ہوا تو گجرات، مالوہ، تلنگانہ، جھجھر، دور سمندر، لکھنوتی، (بنگال) سٹ گاؤں (چاٹگام) کرناٹک، ورنگل یکے بعد دیگرے اس کے قبضے میں آ گئے[2]۔ لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ اس کی حکومت میں کثرت سے بغاوتیں رونما ہوئیں

اس کی وہی رعایا جس پر وہ اپنی دولت بیدریغ صرف کیا کرتا تھا اس سے متنفر ہو گئی، تمام دور و دراز کے صوبے سوائے گجرات کے خود مختار ہو گئے۔ یہاں تک کہ جب ۲۶ سال کے بعد وہ ساحل سندھ پر دم توڑ رہا تھا تو اس کی ساری سلطنت میں شورش برپا تھی اور ہنگامہ و بغاوت سے سارا نظام حکومت متزلزل ہو رہا تھا

جب ہم اس کے اسباب پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ محمد تغلق کی انھیں صفات حسنہ میں بعض صفات نے اک معیوب صورت اختیار کر لی تھی اور چونکہ ان میں حد سے زیادہ غلو ہو گیا تھا اس لئے چند در چند خرابیاں ان سے پیدا

---

[1] ابن بطوطہ (تاریخ ہندوستان مولوی ذکاء اللہ) ۱۴۷۔۱۵۶

[2] صاحب مسالک الابصار نے حسب روایت سراج الدین ابوالفتح عمر مقبوضات محمد تغلق کی یہ فہرست پیش کی ہے۔ دہلی، دیوگر دولت آباد ملتان، کہرام، سمانہ، سیوستان، اوچ، ہانسی، سرستی، معبر، تلنگانہ، گجرات، بدایوں، اودھ، قنوج، لکھنوتی، بہار، کڑہ، مالوہ، لاہور، کلانور، جاجنگر، دور سمندر

ہوئیں اور بڑھتی رہیں

یہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ وہ حد درجہ بلند حوصلہ اور بے انتہا فیاض تھا اور غالباً یہی دو سبب ایسے تھے جو محمد تغلق کے لئے سب سے زیادہ مُضر ثابت ہوئے

یہ بالکل صحیح ہے کہ جس وقت غیاث الدین تغلق کا انتقال ہوا تو خزانہ شاہی معمور تھا، اور سلطنت کی حالت نہایت اچھی تھی، لیکن اس میں بھی کلام نہیں کہ محمد تغلق کے عزائم اور جذبات بذل وسخا، کو دیکھتے ہوئے خزانہ اور حکومت کی تمام موجودات بہت کم تھیں۔ محمد تغلق نے تخت نشین ہوتے ہی، جو نصب العین مقرر کیا وہ یہ تھا کہ ساری دنیا اسکے قبضہ میں چلی آئے اور لوگوں کو اتنی دولت تقسیم کر دے کہ کوئی شخص محتاج و غریب نہ رہے۔ چنانچہ اس نے بیدریغ دولت لٹانی شروع کر دی اور تسخیر ایران[1] و چین[2] کے لئے کثیر افواج فراہم کر کے اور بھی خزانہ کو خالی کر دیا چونکہ روپیہ برابر صرف ہو رہا تھا اور آمدنی کم تھی، اس لئے محمد تغلق نے اس کے لئے دو تدبیریں اختیار کیں ایک یہ کہ دوآبہ کے خراج میں ۱۰ وہ فیصدی اور اضافہ کر دیا اور دوسرے یہ کہ بجائے نقرئی و طلائی تنکہ کے تانبہ کا سکہ جاری کیا۔ اس کی یہ دونوں تدبیریں کامیاب نہ ہوئیں۔ کیونکہ اضافۂ خراج سے رعایا سخت بد دل ہو گئی اور کاشتکاروں نے کاشت چھوڑ دی۔ بادشاہ نے نہایت سختی سے خراج وصول کرنے کا حکم دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عمال نے بے انتہا تشدد سے کام لے کر خراج وصول کرنا شروع کر دیا اور رعایا بھاگ نکلی، گاؤں ویران ہو گئے زراعت بالکل مسدود ہو گئی اور سارا ملک تباہ ہو گیا۔ اتفاق سے اسی وقت

---

[1] شاہزادہ چغتائی کا داماد بہت سے امراء عراق و خراسان کے ساتھ ہندوستان آیا اور محمد تغلق کا ملازم ہو گیا۔ ان لوگوں نے بادشاہ کو تسخیر ایران و توران کے لئے آمادہ کیا۔ چونکہ محمد تغلق خود فتوحات کو وسیع کرنا چاہتا تھا اس لئے اس تجویز کو بہت پسند کیا اور ان لوگوں کے تالیف قلوب میں بے شمار دولت صرف کرنے لگا اسی کے ساتھ چونکہ اس مہم میں علاوہ مستقل فوج کے عارضی سپاہ کی بھی ضرورت تھی اس لئے تین لاکھ ستر ہزار سپاہ اور فراہم کی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایران و توران کی تسخیر کی نوبت تو آئی نہیں لیکن اس عارضی سپاہ اور اُن امراء ایران پر سارا خزانہ صرف ہو گیا

[2] بادشاہ نے ارادہ کیا کہ کوہ ہمالیہ کی طرف سے چین پر حملہ کرے چنانچہ ۷۳۸ھ ۱۳۳۷ء میں ایک لاکھ سوار اپنے بھانجے خسرو ملک کی ماتحتی میں دئے اور حکم دیا کہ پہلے کوہستان ہمالیہ پر قبضہ کیا جائے اور اس کے بعد سرحد چین میں پیشقدمی کی جائے۔ ہر چند امراء دربار اور خود ملک خسرو اس مہم کے خلاف تھے لیکن بادشاہ کی مخالفت نہ کر سکتے تھے اس لئے فوج روانہ ہوئی جب سرحد چین میں پہونچے تو معلوم ہوا کہ آگے بڑھنا سخت دشوار ہے کیونکہ کوہستانی راستے نہایت تنگ و دشوار گذار ہیں، سامان رسد بالکل فراہم نہیں ہو سکتا اور علاوہ اس کے اجنبی ملک کی راہیں بھی معلوم نہیں ہیں۔ پھر اس پر قیامت یہ ہوئی کہ بارش شروع ہو گئی اور چاروں طرف سے کوہستانی سیلاب نے اس فوج کو گھیر لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چینی فوج نے ان کو سخت نقصان پہونچایا اور سوائے چند نفوس کے اور کوئی زندہ نہ بچا۔ اس مہم میں بھی خزانہ پر ناقابل تلافی بار پڑا

نہایت سخت قحط پڑ گیا جس نے ان تباہیوں میں اور اضافہ کر دیا، ہر چند محمد تغلق نے انسداد گرانی کے لئے پوری کوشش کی اور شاہی ذخیرہ سے لوگوں کو غلہ تقسیم کیا گیا، لیکن اللہ کی ڈالی ہوئی مصیبت انسانی تدابیر سے دور نہیں ہو سکتی تھی، اسلئے مشکلات میں کوئی کمی نہ ہوئی اور اضافہ خراج کی تدبیر سخت ناکام ثابت ہوئی۔ اس کے بعد سلطان محمد تغلق نے اپنی غلطی کو محسوس کر کے پھر اس امر کی کوشش کی کہ ویران گاؤں آباد ہو جائیں کاشت کی حالت بہتر ہو جائے اور اس کے لئے اس نے خزانہ شاہی سے ستر لاکھ تنکہ بطور تقاوی کے رعایا کو تقسیم کیا لیکن افسوس ہے کہ کارکنوں نے بہت کچھ اس میں سے خود غصب کر لیا۔ تھوڑا بہت جو رعایا کو ملا بھی اس میں سے ہزارواں حصہ بھی خزانہ میں نہ آسکا، اب چونکہ خزانہ بالکل خالی ہو چکا تھا اور روپیہ کی ضرورت شدید تھی، اس لئے سلطان نے خیال کیا کہ سکّہ کی قیمت بڑھا دینی چاہیئے اور اسی خیال کو پیش نظر رکھ کر اس نے تانبہ کا سکہ بجائے طلائی سکہ کے جاری کیا، لیکن اس تدبیر نے اور زیادہ نقصان پہونچایا۔ چونکہ دارالضرب میں سکہ ڈھالنے کا کوئی ایسا مخصوص طریق نہ تھا کہ عام طور سے لوگ اس کی نقل نہ کر سکیں اس لئے تمام ملک میں گھر گھر خفیہ ٹکسالیں قایم ہو گئیں اور لوگوں نے کروروں سکے تانبہ کے بنا کر بازار میں سونے چاندی کے ہموزن سکوں سے بدلنا شروع کئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام تاجر، زمیندار، گاؤں کے مکھیا اور ہندو راجہ دولتمند ہو گئے اور خزانہ شاہی خالی ہونے لگا آخر کار سلطان نے اس معاملہ میں بھی اپنی غلطی کو تسلیم کیا اور مجبوراً اس سکّہ کے رواج کو بھی مسدود کرنا پڑا

سلطان محمد تغلق کی یہ بھی فطرت تھی کہ جب وہ کسی بات کا عزم کر لیتا تو مشکل سے باز آتا اور چونکہ وہ خود اپنی رائے قایم کیا کرتا تھا اور امراء و ارکین سے مشورہ کرنے کا عادی نہ تھا اس لئے بسا اوقات اپنی تدابیر کے نقایص اسے بعد میں معلوم ہوتے۔ اس کے مزاج میں عجلت بہت تھی چنانچہ جب وہ کسی انتظام کی طرف مایل ہوتا تو چاہتا کہ ایک ہی دن میں مکمل ہو جائے اور جب وہ اس میں تاخیر دیکھتا تو برہم ہو جاتا اور نہایت سختی کا عمل شروع کر دیتا

جب سلطان محمد کو اپنی ان تدابیر میں ناکامیابی ہوئی تو ایک خود مختار اور مطلق العنان بادشاہ کی طرح وہ سخت غضبناک ہو گیا اور رفتہ رفتہ اس کے مزاج کی نزاکت اس حد تک بڑھ گئی کہ بات بات میں قتل کرا دینا اس کے دربار کا معمولی منظر ہو گیا۔ چنانچہ ابن بطوطہ نے اس کے دربار کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر شاہی قصر کے کسی دروازہ پر بارش انعام ہوتی ہوگی تو دوسرے دروازہ پر تم کسی لاش کو بھی ضرور پھڑکتے ہوئے دیکھو گے

پھر چونکہ محمد تغلق کی یہ برہمی، ہر ناکامی کے ساتھ روزانہ بڑھتی جاتی تھی اور تمام رعایا اس سے متاثر ہو رہی تھی، اس لئے رفتہ رفتہ اس کی طرف سے بد دلی عام ہو گئی اور اس کے تمام امراء و اراکین میں جذبات بغاوت موجزن ہونے لگے

اس میں شک نہیں کہ بعض تدبیریں اس کی نہایت مناسب ہوتی تھیں، لیکن جس انداز سے وہ ان پر

عمل درآمد چاہتا تھا وہ نہایت سخت ہوتا تھا۔ مثلاً دہلی سے پایہ تخت بدل کر دیوگیر (دولت آباد)[1] قایم کرنا بجائے خود اک عمدہ تجویز تھی، کیونکہ دیوگیر درمیان میں واقع تھا اور یہاں سے مختلف صوبوں پر اقتدار آسانی سے قایم رہ سکتا تھا۔ لیکن اس کا یہ حکم دینا کہ تین دن کے اندر دہلی کی تمام آبادی معہ اپنے اسباب کے دیوگیر منتقل ہوجائے اور ایک تنفس بھی یہاں باقی نہ رہے نہایت جابرانہ حکم تھا اور اس میں شک نہیں کہ جہاں اور اسباب امراء و اراکین کی بد دلی کے تھے انھیں میں سے یہ بھی ایک قوی سبب تھا

یہاں ایک امر اور قابل غور ہے کہ جن صوبوں نے اس کے عہد میں بغاوت کی ان میں سے اکثر وہی تھے جہاں خود اس کے مقرر کئے ہوئے مسلمان امراء حکومت کر رہے تھے اور ظاہر ہے کہ سلطان کے جبر و تشدد کا اثر ان پر براہ راست نہ پڑتا تھا، پھر جو انھوں نے بغاوت کر کے خودسری اختیار کی تو اس کی وجہ کچھ اور بھی تھی۔ وہ یہ کہ غلام خاندان کے زمانہ میں صوبہ کے گورنر جاگیردار ہوتے تھے اور چونکہ وہ خود بھی اپنے بادشاہوں کی طرح ترک نژاد تھے اس لئے سلطنت کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ جب ان ترک فرمانرواؤں کے بعد خلجیوں کا دور شروع ہوا تو اس نظام میں کچھ تغیر پیدا ہوا لیکن نہ اس قدر، کیونکہ خلجی

---

[1] ابن بطوطہ نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ دلّی کے بعض آدمیوں نے سلطان کو ایک گمنام خط بھیجا جس میں بہت سی گالیاں لکھی ہوئی تھیں اس پر برہم ہو کر بادشاہ نے حکم دیا کہ دہلی خالی کر دی جائے اور ہر شخص دیوگیر (دولت آباد) میں جا کر قیام کرے لیکن یہ بالکل بازاری افواہ معلوم ہوتی ہے جو ابن بطوطہ نے دلّی آنے پر کسی شخص سے سن لی ہوگی۔ اصل وجہ یہ تھی کہ سلطنت وسیع ہوجانے کی وجہ سے سلطان محمد تغلق نے پایۂ تخت ایسی جگہ کو بنانا چاہا جو وسط میں واقع ہو اور وہاں سے ہر جگہ بآسانی اثر ڈالا جا سکے بعض لوگوں نے اجین کو تجویز کیا۔ لیکن خود اس نے دیوگیر کو پسند کیا اور اسی کو اپنا دارالحکومت بنانا چاہا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ خیال ایک حد تک بالکل درست تھا لیکن چونکہ وہ اپنی عجلت پسند فطرت سے مجبور ہو کر یہ چاہتا تھا کہ دولت آباد فوراً آباد ہوجائے اور دہلی کی تمام رونق وہاں آناً فاناً منتقل ہوجائے، اس لئے اس نے عام حکم دیدیا کہ تمام امراء و اراکین، تمام دوکاندار و پیشہ ور، امیر و غریب مرد و عورت الغرض دہلی کا ہر تنفس تین دن کے اندر دولت آباد چلا جائے ہر چند اس نے بہت سے لوگوں کو زاد راہ دیا، ان کے گھروں کی قیمت دلوائی سفر کے لئے آسانیاں فراہم کیں لیکن ظاہر ہے کہ جس شہر نے ایک صدی سے زائد زمانہ میں رونق و آبادی حاصل کی تھی وہ دفعتہً دوسری جگہ منتقل نہ ہو سکتا تھا اور نہ رعایا کسی طرح اس کو گوارا کر سکتی تھی کہ وہ اس زحمت کو برداشت کرے۔ تاہم بادشاہ کے خوف سے اس کی تعمیل کی گئی اور دہلی ویران ہوگیا

سلطنت کے زمانہ میں صوبوں کے گورنر پھر بھی مرکزی حکومت سے قریب کا تعلق رکھتے تھے۔ لیکن جب عہد تغلق شروع ہوا تو یہ تعلقات بالکل ختم ہوگئے اور صوبوں کی حکومت بالکل اجنبی سرداروں (ایرانیوں خراسانیوں، تغلقوں، افغانوں) کے سپرد کی گئی۔ جو بادشاہ سے نہ خون کا تعلق رکھتے تھے نہ قومیت کا۔ بادشاہ جس قدر ان پر انعامات کی بارش کرتا جاتا تھا، ان کی طمع بڑھتی جاتی تھی اور یہ خود اپنی خود مختار سلطنتیں قایم کرلینی چاہتے تھے۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ تھا کہ محمد تغلق کی وسیع سلطنت (ایسی وسیع کہ پھر دو صدی بعد تک ایسی وسعت حاصل نہ ہوسکی) ٹکڑے ٹکڑے ہوکر منتشر ہوگئی۔ ہرچند ان بغاوتوں کے فرو کرنے میں بادشاہ نے پوری کوشش کی اور وہ کامیاب بھی ہوا لیکن ظاہر ہے کہ وہ ہر جگہ نہ پہونچ سکتا تھا اور وہاں حالت یہ تھی کہ آج ملتان باغی ہوا تو کل بنگال، کل لاہور میں فتنہ اُٹھا تو پرسوں ورنگل میں۔ اسوقت اودھ کی بغاوت کی خبر ملی تو دوسرے وقت گجرات کی بادشاہ کہاں کہاں پہونچ سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعض صوبے جن میں بنگال اور دکن بھی شامل تھے، بالکل خود مختار ہوگئے اور پھر کبھی تغلق سلطنت میں شامل نہ ہوسکے

سلطان محمد تغلق نے ۲۶ سال تک حکومت کی اور اس میں شک نہیں کہ ابتدائی زمانہ باعتبار وضع قوانین نظم سلطنت، کثرت فتوحات، ایک یادگار زمانہ تاریخ ہندوستان کا شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ بعض اسباب کی وجہ سے جن کا اجمالی بیان ہم نے ابھی کیا ہے، اس کا درمیانی اور آخری عہد حد درجہ اضطراب واضطرار میں بسر ہوا۔ جس سال وہ مرنے والا تھا اسی سال سندھ میں بغاوت رونما ہوئی۔ محرم کا مہینہ تھا کہ اس نے دریائے سندھ کو عبور کیا اور بے شمار افواج لئے ہوئے ٹھٹہ کی طرف بڑھا

محرم ۷۵۲ھ (۱۳۵۱ء) کی دسویں تاریخ تھی اور ٹھٹہ صرف تیس کوس رہ گیا تھا کہ شام کو روزہ افطار کرنے کے بعد اس نے مچھلی کھائی طبیعت پہلے سے بھی کچھ خراب تھی اس بدپرہیزی سے بخار بڑھ گیا۔ لیکن بادشاہ نے سفر کو ملتوی نہیں کیا اور تیسرے دن ٹھٹہ سے صرف چودہ کوس کا فصل رہ گیا تھا کہ بادشاہ کی حالت زیادہ ردی ہوگئی اور مجبوراً حملہ ملتوی کرنا پڑا۔ ایک ہفتہ تک سلطان اسی حال میں مبتلا رہا یہاں تک کہ ۲۱ محرم کو دریائے سندھ کے ساحل پر اس نے انتقال کیا[1] اور اس طرح خاندان تغلق کے اُس جلیل القدر بادشاہ کا عہدِ حکومت ختم ہوگیا۔ جس کا مثل تاریخ ہندوستان پھر کوئی اور پیدا نہ کرسکی

---

[1] تاریخ فیروزشاہی برنی (ایلیٹ) جلد سوم۔ ۲۶۴ - ۲۶۵ - فرشتہ - ۱۴۳۔

سلطان فیروز شاہ

۷۵۲ھ ۱۳۵۱ء = ۷۹۰ھ ۱۳۸۸ء

"محمد تغلق" کی وفات کے ساتھ ہی "ہندوستان" کی حالت میں پھر ردِ عمل شروع ہوا اور بقول "لین پول" کے ہندوستان، اسی طرح ہوش میں آگیا جیسے نہایت تیز بخار کے رفع ہونے پر ایک بیمار اپنے حواس میں آجاتا ہے۔

چونکہ محمد تغلق نے اپنے بعد کوئی اولاد نرینہ نہیں چھوڑی تھی اور اپنے آخری وقت میں بھی وہ "فیروز شاہ"[1] کی تخت نشینی کے لئے وصیت کرگیا تھا، اس لئے ۲۴ محرم ۷۵۲ھ کو وہیں "وادیِ سندھ" کے اندر تمام امراء کے انتخاب و اصرار سے تخت نشین ہوا۔ اور باغیوں کی سرکوبی کے بعد "دہلی" کی طرف روانہ ہوا۔ ہرچند اس تخت نشینی پر "تغلق شاہ" کی لڑکی "خداوند زادہ" (داور ملک کی ماں) کی طرف سے اعتراض ہوا کہ بھانجے کے ہوتے ہوئے برادرِ عم زاد کا کوئی حق نہیں ہے، لیکن امراء نے خداوند زادہ کو سمجھایا کہ داور ملک حکومت کا اہل نہیں ہے۔ اور اسوقت جبکہ ہم لوگ دہلی سے بہت بعید فاصلہ پر ہیں اور مغلوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے، کسی ہوشیار اور قابل دماغ کی ضرورت ہے

---

[1] غیاث الدین تغلق کے دو بھائی اور تھے ایک کا نام رجب تھا اور دوسرے کا ابوبکر۔ سلطان علاؤالدین خلجی کے عہد میں تینوں بھائی خراسان سے آئے۔ غیاث الدین تغلق ملازمت شاہی میں داخل ہوکر رفتہ رفتہ دیپل پور کا گورنر مقرر ہوا اور باقی دونوں بھائی بھی مناصب جلیلہ پر پہونچے تغلق کی خواہش تھی کہ اس کے بھائی رجب کی شادی دیپل پور کے کسی راجہ کے خاندان میں ہوجائے۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں اس کو خبر معلوم ہوئی کہ رانا مل بھٹی کی لڑکی بہت حسین ہے، رانا مل نے پہلے تو انکار کیا لیکن پھر راضی ہوگیا اور رجب سے اپنی لڑکی کی شادی کردی۔ چند سال کے بعد اس کے بطن سے فیروز پیدا ہوا اور تغلق نے بڑا جشن اس تقریبِ مسرت میں برپا کیا۔ فیروز سات سال کا تھا کہ اس کا باپ رجب مرگیا۔ اور تغلق نے اس کی پرورش اپنے بچوں کی طرح کی۔ فیروز ۱۴ سال کا تھا کہ تغلق تخت نشین ہوا اور اس نے فیروز کو کبھی اپنے پاس سے جدا نہیں کیا۔ سفر و حضر میں اپنے ساتھ رکھ کر ملک داری و آئین فرمانروائی کی پوری تعلیم دی۔ فیروز ۱۸ سال کا تھا کہ تغلق شاہ کا انتقال ہوگیا اور محمد تغلق فرمانروا ہوا۔ محمد تغلق نے اسے نائب باربک کا خطاب دیکر نائب امیر حاجب بنادیا اور بارہ ہزار[12] سوار اس کی ماتحتی میں دیدئے۔ محمد تغلق، فیروز پر بہت مہربان تھا اور ہمیشہ معاملات سلطنت کے نشیب و فراز اُسے سمجھاتا رہتا تھا چنانچہ جب محمد تغلق نے اپنی سلطنت کو چار حصوں میں تقسیم کیا تو ایک حصہ فیروز کے سپرد کیا تاکہ وہ عملی طور سے امورِ حکومت کو سمجھ جائے۔ الغرض پورے ۲۶ سال تک فیروز محمد تغلق کی تعلیم و نگرانی میں رہا اور آخر وقت میں اس نے اپنے حسن خدمات سے محمد تغلق کو اس قدر خوش رکھا کہ مرتے وقت وہ اسی کیلئے تخت نشینی کی وصیت کرگیا۔

گیارھواں باب

جماعتِ آوارگان

دنیا کے حالات بدل گئے ہیں اور فضا کے تمام سیاروں کو معلوم ہو چکا ہے کہ معلم اکبر کی روح نے اپنے قیام کے لئے کرۂ زمین کو منتخب کر لیا ہے اور اب یہی سیارہ سب کی گفتگو کا مرکز بن کر رہ گیا ہے

یہاں کا کتاب خانہ اور اس کا دارالمطالعہ ہر وقت شائقین سے بھرا رہتا ہے اور دوسرے سیاروں کے رہنے والے اپنی اپنی رصدگاہوں سے ہر وقت یہاں کے حالات دریافت کرتے رہتے ہیں۔ بیشمار درخواستیں سوسائٹی میں شامل ہونے کی آ رہی ہیں اور متعدد شاخیں اس کی کھول دی گئی ہیں

یہ کیفیت روز بروز بڑھتی ہی رہی یہاں تک کہ اندیشہ یہ پیدا ہو گیا کہ کہیں اور کرے ویران نہ ہو جائیں۔ اس علم نے کہ معلم اکبر کی روح اب کرۂ زمین کو اپنا مستقر بنانا چاہتی ہے، فضا میں ہیجان بپا کر دیا تھا اور کائنات کی ساری آبادی مضطرب نگاہوں سے ان حالات کا مطالعہ کر رہی تھی

معلم اکبر کی آمد سے قبل کرۂ زمین مرکز تھا افلاس وجہل کا، بغض وعناد کا، سیاسی رقابتوں کا، روحانی تعصبات کا، اور زبانوں کے اختلاف کا، لیکن اب یہ تمام لعنتیں دور ہو رہی تھیں۔ فساد کی جگہ امن نے لیلی تھی اور اختلاف کی جگہ اتفاق نے، جہل کی تاریکی کو علم نے دور کر دیا تھا اور ساری آبادی صرف ایک مذہب کی متبع تھی۔ جس کا نام "مذہب محبت" تھا۔

تمام سیاسی جماعتیں متفق ہو کر ایک ہی مقصود کی طرف مائل تھیں اور وہ مقصود نوعِ انسانی کی فلاح تھا۔ رواداری اور آزادیٔ ضمیر، دو ابتدائی اصول تھے جن پر ہر ہر فرد کاربند تھا اور ایک ہی زبان، ایک ہی خط میں وہ اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتے تھے

اس وقت یہاں جن اصول پر کام ہو رہا تھا وہ یہ تھے کہ ایک "حزب الاتحاد" پیدا کیا جائے اور اس کے سلسلہ کو اتنا وسیع کیا جائے کہ یہاں کا ہر بسنے والا اس سے متعلق ہو جائے، ہر ممبر کا فرض تھا کہ وہ اٹھارہ "جانباز" پیدا کرے اور پھر ہر "جانباز" اسی طرح اٹھارہ اٹھارہ "جانباز" اور پیدا کرے۔ جس وقت میری باری آئی تو میں نے غلطی سے اپنے اٹھارہ "جانباز" فضا کے چند منتشر وآوارہ سیاروں سے منتخب کئے۔ سب سے پہلے جلسہ میں انھوں نے تجویز کی کہ ان کی جماعت کا نام "جماعتِ آوارگان" رکھا جائے۔ میں نے اس کی مخالفت کی کیونکہ آوارگی کی نسبت میں

اپنے نام کے ساتھ پسند نہ کرتا تھا، لیکن میری کسی نے نہیں سنی اور باوصف اس کے کہ میں ان کا افسر تھا، مجھے مجبوراً ان کے اصرار کے سامنے سر جھکا دینا پڑا۔ اس جماعت کے افراد چونکہ آوارہ سیاروں سے تعلق رکھتے تھے اسلئے ان کے جذبات میں بھی آوارگی پائی جاتی تھی اور انھوں نے سوائے لہو ولعب کے اور کچھ نہ کیا

جامِ زر اور دوست پرست نے تو اس طرف زیادہ توجہ نہیں کی، لیکن دلآرام نے ایک دن مجھے سمجھایا اور کہا کہ اگر یہ جماعت تمھارے قابو سے باہر ہے تو اس کو توڑ دو اور دوسرے "جانباز" پیدا کرو، کیونکہ ان کے لہو ولعب اور تفریحی ہنگاموں نے اصل مقصود کی طرف سے لوگوں کو منحرف کر رکھا ہے۔ میں پہلے ہی سے محسوس کر رہا تھا اور اب دلآرام کے کہنے سے زیادہ محسوس کرنے لگا، آخر کار ان کو جمع کرکے میں نے ایک دن کہا کہ اگر وہ اپنے کھلنڈرے پن سے باز نہ آئیں گے تو میں ان کا دستہ توڑ دوں گا اور دوسرا دستہ طیار کروں گا۔ اس کے بعد وہ چند دن تو چین سے بیٹھے رہے لیکن پھر اس سے زیادہ بدتمیزیاں شروع کردیں۔ اس کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ خود لوگوں کو ان سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی اور وہ ان کے ہنسی ٹھٹھوں سے لطف اُٹھاتے تھے

مجبور ہوکر جامِ زر نے یہ تمام شکایتیں معلم اکبر تک پہونچائیں، میں بھی اسوقت موجود تھا۔ معلم اکبر پہلے میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور پھر جامِ زر کی طرف مخاطب ہوکر بولا:۔

"اے جامِ زر، یہ لوگ تمھارا کیا بگاڑ رہے ہیں یہ تو تمھیں ہنساتے ہیں، خوش رکھتے ہیں، فضا میں مسرت و نشاط کی لہریں دوڑا رہے ہیں۔ اس سے زیادہ کی توقع تم ان سے کیا رکھ سکتے ہو۔ تم اور کام کرنے والوں کو دیکھو کہ وہ اپنے مشاغل میں اتنے مصروف ہیں کہ وہ خوش رہنا بالکل بھول گئے ہیں، مسرت و تبسم کا مفہوم ان کے دماغ سے محو ہوگیا ہے

"اے جامِ زر، اپنی پیشانی سے یہ شکنیں دور کردو اور عقل و فراست کے بوجھ سے اپنے کو ہلکا کرکے کبھی کبھی بچہ بھی بن جایا کرو۔ فضا کی یہ آوارہ گرد جماعت دنیائے مسرت کی، پیامبر ہے، میرے فردوسِ نشاط کی بادِ نسیم ہے۔ تم کہتے ہو ان کا کوئی مقصود زندگی نہیں، لیکن میں جانتا ہوں کہ ہے اور بہت اہم مقصود ہے۔ وہ یہ کہ جب تم شکست و ناکامی سے بددل ہو جاؤ، جب تم پر یاس کے بادل چھا جائیں تو یہ تمھارے اندر ولولۂ عمل اور کیفیت نشاط پیدا کریں اور تم باطل کے خلاف اپنی جنگ قایم رکھ سکو۔ اس سے زیادہ اور کیا چاہئے۔ بولو"

یہ سنکر مجھے بہت اطمینان ہوا کیونکہ معلم اکبر نے یہ خیال میری ہی جماعت، میرے ہی جانبازوں کے دستہ کے متعلق ظاہر کیا تھا۔ جامِ زر البتہ خاموش ہوگیا اور وہ اس آوارہ گرد دستے کی طرف چلا تاکہ اپنے کئے کی تلافی کرے، لیکن میں نے اسے منع کردیا کہ معلم اکبر نے جو کچھ کہا ہے اس کا اظہار ان کے سامنے نہ کرے، ورنہ وہ اور کھل کھیلیں گے اور ہر جگہ ہنگامہ بپا ہوجائے گا

میں سیارۂ اکبر چلا گیا تاکہ جامعۃ الجامعات کے وائس پریسیڈنٹ گورگور سے تمام حال بیان کردوں کیونکہ وہ

میری جماعت کا اتنا زیادہ مخالف نہ تھا۔ گورگور نہایت سنجیدہ مخلوق تھا اور ہر کام انتہائی صبر و تحمل سے کرتا تھا، اسی لئے معلم اکبر اس پر بہت بھروسہ کرتا تھا اور انسانی معاملات کا مہتمم اسی کو بنا دیا گیا تھا

معلم اکبر نے ایک بڑی اہم خدمت گورگور کے سپرد یہ کر رکھی تھی کہ طلبائے سیارگان کو مملکت تحت الثریٰ کے پایۂ تخت "اندھیر نگری" (Pandemonium) کی طرف بھیجتا رہے تاکہ وہاں جاکر تاریک قوتوں کا مقابلہ کریں

میرے یہاں پہونچنے کے کچھ دن بعد ایک مباحثہ "مذہب و علم" کے عنوان سے قایم ہوا۔ اور مباحثہ کے دوران ہی میں کسی مقرر نے "اندھیر نگری" کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس کا بہت برا اثر کائنات پر پھیل رہا ہے میں نے اس بیان کی مخالفت کی، کیونکہ بہت کمسنی میں مجھے یہ بتایا گیا تھا کہ برائی نام ہے نیکی کے فقدان کا، جہل نام ہے علم کے نہ ہونے کا، بیماری نام ہے صحت کے زایل ہو جانے کا اور ان سلبی کیفیات کا کوئی مستقل وجود نہیں ہے۔ میں نے ہر ایک سے "اندھیر نگری" کے متعلق صحیح کیفیات معلوم کرنا چاہیں لیکن کسی نے مجھے صاف جواب نہیں دیا، یہاں تک کہ انھیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ ہے کہاں۔ معلم اکبر نے کبھی اپنی تقریروں میں اس کا ذکر نہ کیا تھا اور نہ حاکم حاکمیان نے جو فضا کا بڑا زبردست مورخ و جغرافیہ داں تھا کبھی اس کا حوالہ دیا تھا

میں نے ایک دن حاکم حاکمیان سے پوچھا "یہ اندھیر نگری کہاں ہے"۔ اس نے کہا "مجھے نہیں معلوم" میں نے کہا "میں خیال کرتا ہوں کہ "سیارۂ اکبر میں شیاطین کا وجود نہیں ہے"۔ اس نے کہا کہ "بڑا اچھا خیال ہے، نہایت پاکیزہ تمنا ہے"

میں۔ "مجھ سے کہا گیا ہے کہ سیارۂ محبت میں نفرت کا وجود نہیں ہے اور وہاں رحمت ہی رحمت ہے"

وہ۔ "یہ خیال تمہارا بہت سطحی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ برائی ہر نیکی کے پیچھے موجود ہے اور کائنات کیلئے سب سے بڑا خطرہ یہی ہے"

میں چلا اٹھا کہ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو، مجھے تو تم نے یہ کہکر ہلاک کر ڈالا، میرے علم و یقین کی بنیاد متزلزل کر دی۔ کیا برائی کے وجود کے معنے یہ نہیں ہیں کہ خدا موجود نہیں ہے اور کیا تاریکی روشنی کے فقدان کا نام نہیں ہے"

وہ۔ "نہیں ـــ برائی ایک سرطان ہے جو نیکی کے قلب کو کھائے جا رہی ہے، تاریکی ایک قوت ہے جو نور کے مقابلہ میں صف آرا ہے۔ تم ایک بھوکے کے پاس جاؤ اور کہو کہ بھوک بالکل خیالی چیز ہے اور اس کا وجود کہیں نہیں تو کیا وہ اس کا یقین کرے گا۔ اگر ظلمت کا وجود نہیں ہے تو پھر یہ جنگ کس کے خلاف ہے؟

اے میرے عزیز دوست، سوچو اور یہ وہم دور کر دو، تمہارا کسی چیز سے انکار کر دینا اس کے وجود کو باطل نہیں کر سکتا۔ معصیت و برائی، ظلمت و تاریکی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے اور وہ نیکی و روشنی کو فنا کر دینے پر تلی ہوئی ہے۔ تم عالم نور کے سپاہی ہو، تمہارا فرض ہے کہ تاریکی کے خلاف پوری مستعدی سے جنگ کرو۔ کیونکہ یہ جنگ تو بہر حال ہونا ہے اور بغیر اسکے

کامیابی محال ہے"

میں ۔"کیا روشنی تاریکی کو دور نہیں کرتی، کیا محبت نفرت کو فنا نہیں کر سکتی"

وہ ۔"ہاں، کر سکتی ہے، لیکن کس قسم کی محبت ؟ ــــ زندہ محبت، یعنی وہ محبت جو تو ارعمل میں حرکت پیدا کر دے، جو احساس کے ساتھ کردار میں بھی زندگی کی روح پھونک دے اور جو دشمن کے مقابلہ کے لئے ہمارے دلوں میں غیر معمولی جوش و ولولہ بھر دے"

میں ۔"معاذاللہ، میں نے تو تمام عمر یہی درس دیا کہ مقابلہ اچھا نہیں، مدافلت بُری چیز ہے، عفو و درگزر سے بہتر کوئی طریقہ نہیں"

وہ ــ"لیکن اس درس نے کیا فایدہ پہونچایا، ہر شخص نے تمھیں کُچلا، پامال کیا اور برائی "بڑھتی رہی"

میں ۔"پھر اب میں کیا کروں ۔ مجھے کیا کرنا چاہئے"

وہ ــ"وہی جو پہلے کہہ چکا ہوں ــ زندہ محبت ۔ زندہ یقین اور زندہ علم و اعتقاد !"

میرا خون کھول رہا تھا، میری روح بے چین تھی، فضا میں ہر طرف نعرۂ جنگ گونجتا ہوا محسوس کر رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لڑائی کا اعلان ہو چکا ہے اور مجھے اس میں شرکت کے لئے کوئی کھینچے لئے جا رہا ہے ۔

باب بارھواں

"اندھیر نگری" کی طرف جانے کی طیاریاں ہو رہی ہیں ۔ مختلف سیاروں کے طلبہ سے ہال بھرا ہوا ہے ۔ معلم اکبر اُٹھا اور اس نے جلسہ کو مخاطب کیا کہ :-

"اے میرے عزیزو، تمھیں اپنے آپ کو صیقل شدہ آئینہ کی طرح بنانا چاہئے اور اس آئینہ کی صیقل کو ہمیشہ قایم رکھنا چاہیے، رشک و حسد، خوف و مکر، عُجب و ریا کا زنگ اس پر نہ چڑھنا چاہئے ۔ بُرائی کے وجود کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا، بُرائی کی حمایت کرنا ہے ۔ بُرائیوں کو دیکھنا اور کچھ نہ کہنا اپنے آپ کو اس روح اعلیٰ سے علٰحدہ کر دینا ہے جو تمھارا مقصود حقیقی ہے ۔

خدا کی بادشاہت امن و محبت ہے اور وہ تمھارے ہی اندر پائی جاتی ہے ۔

شیطان کی مملکت جنگ و نفرت ہے اور وہ تم سے باہر ہونا چاہئے ۔

میں چاہتا ہوں کہ تم ایک عالمگیر اتحاد روحانی کی بنیاد ڈالو اور اس راہ میں جن مشکلات سے واسطہ پڑے انھیں صبر و استقلال کے ساتھ جھیل جاؤ ۔ یہی تمھارا امتحان ہے، یہی تمھاری آزمایش ہے، جاؤ، آگے بڑھو، خدا تمھاری مدد کرے گا"

ضروری اعلان

۱۔ اگر جنوری ۳۸ء سے اس وقت تک کے مسلسل پرچے آپ کے پاس نہیں ہیں تو اب طلب فرما لیجئے، تاکہ اسلامی ہند کی تاریخ اور نغمۂ کارواں (دونوں کتابیں) آپ کے پاس مکمل ہو جائیں۔ یہ کتابیں علحدہ کتابی صورت میں شایع نہ ہوں گی

۲۔ چونکہ اسلامی ہند کو دسمبر ۳۸ء تک ختم کر دینا ہے، اس لئے "نغمۂ کارواں" کی اشاعت فی الحال ملتوی کر کے "اسلامی ہند" کے صفحات میں اضافہ کر دیا گیا ہے

منیجر نگار

جلد (۳۴)	فہرست مضامین ستمبر ۱۹۳۸ء	شمار (۳)

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ
ہندوستان سے باہر صرف سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ

ششماہی چندہ میں نگار کا جنوری نمبر بہ اضافۂ ضخامت وقیمت شامل نہ ہوگا۔

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۳۴	ستمبر ۳۸ء	شمارہ ۳

ملاحظات

واردھا اسکیم اور مولانا سید سلیمان ندوی

ابتدائی جبریہ تعلیم کی جو اسکیم گاندھی جی کے مشورہ سے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب شیخ الجامعہ دہلی نے مرتب کی ہے، اسے "واردھا اسکیم" کہتے ہیں اور اس کا مقصود یہ ہے کہ ابتدا ہی سے بچوں میں کچھ کام کرنے کا شوق پیدا ہو جائے اور بڑے ہو کر وہ صرف نوکری ہی کی توقع پر ہاتھ پاؤں توڑ کر نہ بیٹھ جائیں

جسوقت یہ اسکیم شایع ہوئی تھی میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ ہمارے یہاں کے علمار کرام حسب عادت ضرور اس میں کوئی نہ کوئی نقص پیدا کرکے مسلمانوں کو اس کا مخالف بنا دیں گے اور آخرکار یہ اندیشہ پورا ہوکر رہا

عام طور پر علمار کی تقسیم علمار سوء و علمار خیر میں کی جاتی ہے اور اس میں شک نہیں کہ جس حد تک ذاتی اخلاق و عادات کا تعلق ہے ہزار میں دو چار علمار ایسے مل جاتے ہیں جنھیں ہم علمار خیر کی صف میں جگہ دے سکیں، لیکن اگر ذہنی بیداری یا حاسۂ اجتماعی (Common Sense) کے لحاظ سے ان کی تقسیم اعلیٰ و ادنیٰ میں کی جائے تو قسم ادنیٰ میں تو ہمیں ادنیٰ، ادنیٰ تر اور ادنیٰ ترین سبھی مدارج کے نمونے مل جائیں گے، لیکن دوسری طرف قسم اعلیٰ کے خانہ میں بھی انشاء اللہ صفر ہی نظر آئے گا، تدریجی علو کی اور تقسیموں کا کیا ذکر ہے

سرسید مرحوم نے جب انگریزی تعلیم کی طرف مسلمانوں کو متوجہ کیا تو یہی علماء تھے جنھوں نے مخالفت کرکے پچاس سال پیچھے اپنی قوم کو ہٹا دیا اور جب ملکی آزادی کا سوال پیدا ہوا تو ہمارے یہی علماء کرام تھے جنھوں نے ہندوؤں کے ساتھ اشتراک عمل کو ناجایز قرار دیکر سیاسی حیثیت سے ہمیں پیچھے گرا دیا، اور اب کہ عام جبریہ تعلیم کا سوال پیش ہے تو ہمارے یہی مذہبی اجارہ دار اسے شجر ممنوع قرار دیکر مسلمانوں کو اس سے دور رہنے کی تلقین کر رہے ہیں

میں یہ سمجھتا تھا کہ اس اسکیم کی مخالفت علماء کی طرف سے ضرور ہوگی، لیکن اسی کے ساتھ یہ حُسن ظن بھی تھا کہ شاید اونچے درجے کے مولوی اس میں حصہ نہ لیں، لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے علامۂ سید سلیمان ندوی ایسے حضرات کو بھی اس کی مخالفت پر کمربستہ پایا۔ اچھا تو آیئے ان کے دلایل پر بھی اک نظر ڈال لیں

معارف میں مسلسل تین ماہ سے اس مسئلہ پر شذرے شایع ہو رہے ہیں اور ان سب کا خلاصہ وہ ہے جو اگست کے معارف میں شایع ہوا ہے یعنی یہ کہ "بچوں کی ابتدائی تعلیم کی اہمیت اس لئے نہیں ہے کہ اس سے بچپن ہی میں ہر بچہ کو لکھنے پڑھنے اور کچھ کرانے کا ڈھنگ آجائے گا بلکہ اس لئے کہ اس عمر کی تعلیم کا نقش ان کی زندگی میں ہمیشہ کے لئے قایم رہ جائے گا۔ مسلمانوں کا ایسی اہم عمر کی تعلیم کو مذہبی تعلیم سے خالی رکھنا، عملاً اپنے مذہب سے ارتداد کے ہم معنی ہے۔ جس جبری تعلیم کے نفاذ کی اسکیم میں یہ پہلو نظر انداز ہوگا، اس کے معنے یہ ہیں کہ یا تو اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان اس جبری تعلیم سے محروم رہیں یا یہ ہے کہ مسلمان آیندہ عملاً مسلمان نہ رہیں"

اس اعتراض کو اگر ہم اور زیادہ مختصر کردیں تو مفہوم یہ قرار پائے گا کہ واردھا اسکیم ان کے نزدیک گویا بیدینی کی ترویج ہے

ہرچند ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے اس اعتراض کا یہ جواب دیدیا ہے کہ "اس اسکیم میں مذہبی تعلیم کی پوری گنجایش رکھی گئی ہے اور اسکول کے اوقات کے علاوہ ہر فرقہ اپنی ضرورت کے مطابق اس کا انتظام کرسکتا ہے" لیکن سید سلیمان اس سے مطمئن نہیں ہیں کیونکہ ان کے نزدیک اسکول کے اوقات کے علاوہ جو تعلیم دیجاتی ہے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی، علاوہ ازیں وہ یہ بھی سوال کرتے ہیں کہ اس تعلیم کا بار کون اُٹھائے گا؟ یعنی ہم کیوں اُٹھائیں

ان تمام باتوں کو سامنے رکھ کر، حسب ذیل تنقیحات ہمارے سامنے آتی ہیں :۔

۱۔ کیا واردھا اسکیم واقعی اسلام سے ارتداد کی مترادف ہے

۲۔ کیا اسکول کے اوقات کے علاوہ مذہبی تعلیم خواہ وہ گھر پر ہو یا مدرسہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی

۳۔ کیا مسلمانوں پر اپنی مذہبی تعلیم کا بار اُٹھانا فرض نہیں ہے

تنقیح اول کے سلسلہ میں ارتداد کے لغوی و اصطلاحی معنے کو معرض بحث میں لاکر کوئی منطقی حجت لانا پسند نہیں کرتا، ورنہ میں ان سے تسلیم کرا لیتا کہ لفظ ارتداد انھوں نے بالکل غلط استعمال کیا ہے اور زیادہ سے زیادہ اگر وہ کوئی اعتراض کرسکتے تھے تو صرف یہ کہ واردھا اسکیم میں مسلمانوں کو اُن کے مذہبی عقاید سے باخبر رہنے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ لیکن اس بحث سے قطع نظر اُن سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے "مسلمان" کا کیا مفہوم قرار دیا ہے، یعنی انھوں نے اسلام کے عقایدی پہلو کو سامنے رکھکر

اعتراض کیا ہے یا اخلاقی و کلچرل پہلو کو سامنے رکھ کر۔ اگر ان کی مراد اس سے صرف "ایمان مجمل و ایمان مفصل" کی تعلیم ہے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں، ہر مسلمان بچہ کو ابتدا ہی میں کلمۂ شہادت، کلمۂ تمجید اور اسی طرح کے بہت سے کلمات کی تعلیم مل جاتی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ اور اُن تمام باتوں کی جو اسلام کے نقطۂ نظر سے ضروری ہوں یا نہ ہوں لیکن مولویوں کے زاویۂ نگاہ سے ضروری ہیں۔ اور اس صورت میں واردھا اسکیم پر اعتراض کرنا تحصیل حاصل پر اصرار کرنا ہے۔ لیکن اگر مذہبی تعلیم سے ان کی مراد وہ تمام مذہبی لٹریچر ہے جو ندوۃ العلماء یا دارالعلوم دیوبند میں پڑھایا جاتا ہے اور جس کی ترویج و تبلیغ کے لئے ایک جگہ لمبی داڑھی رکھنے کے لئے وظائف مقرر کئے جاتے ہیں اور دوسری جگہ القاسم ایسے خالص مذہبی رسایل کے ذریعہ سے رسول اللہ کی قوتِ رجولیت کے افسانے بیان کئے جاتے ہیں، تو پھر زیادہ صحیح اعتراض یہ ہونا چاہئے کہ جدید جبریہ تعلیم کا انتظام ندوۃ العلماء اور دیوبند کے سپرد کیوں نہ کر دیا گیا تاکہ سوائے مسلمانوں کے (اور مسلمانوں میں بھی مجھ ایسے نہیں بلکہ خالص سید سلیمان کی قسم کے) کسی اور قوم کا بچہ اس سے مستفید ہی نہ ہو سکتا۔ لیکن اگر مراد اس سے اسلامی کلچر کی تعلیم ہے، سو اس کا تعلق نہ دین اسلام سے ہے اور نہ کسی اٹل قانون معاشرت سے۔ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں کی جو معاشرت عہدِ نبوی میں تھی وہ عہدِ بنی امیہ کی معاشرت سے مختلف تھی اور جو کلچر بنو عباس کا تھا وہ شاہانِ مغلیہ کا نہ تھا، پھر ہو سکتا ہے کہ جس معاشرت کو آج ہم مسلمانوں کا کلچر کہتے ہیں کل اس میں تبدیلی پیدا ہو جائے۔ ایک قوم کی تمدنی خصوصیات پر مذہبی تعلیم کا اثر ضرور پڑتا ہے لیکن اسی کے ساتھ ماحول بھی کم موثر نہیں ہوتا اور اس لئے تہذیب و معاشرت کے مسایل کو مذہب میں داخل کرنا یا اُن میں کسی تغیر و تبدل کے اندیشہ کو خطرۂ ارتداد سے تعبیر کرنا سخت ناروا جسارت ہے۔ (میں یہاں اس مسئلہ پر گفتگو نہ کروں گا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا کلچر زندہ رہنے والا کلچر نہیں ہے اور اس میں تبدیلی ضروری ہے)۔ اب اگر کوئی اور تیسرا مفہوم مذہب کا ہو سکتا ہے تو براہ کرم سید سلیمان صاحب اسے واضح فرمائیں تاکہ اسکو بھی سامنے رکھ کر ان کے اندیشۂ ارتداد کی حقیقت معلوم کی جائے۔ حیرت ہے اور کسقدر حیرت کہ سید سلیمان صاحب یہ اعتراض تو کر بیٹھے کہ واردھا اسکیم میں مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں، اور یہ بات ان کی سمجھ میں نہ آئی کہ یہ اسکیم آل انڈیا اسکیم ہے اور صرف مسلمانوں ہی کے لئے مخصوص نہیں ہے، اس میں شیعہ، سنی، خارجی، وہابی، قادیانی، معتزلی، اشعری، ہندو، جین، سکھ، زردشتی، عیسائی، یہودی، گبر و ترسا سبھی شامل ہیں اور ظاہر ہے کہ اگر اس اسکیم میں مذہبی تعلیم کو شامل کیا گیا تو مسلمانوں میں کوئی سرخاب کا پر تو لگا نہیں کہ صرف انھیں کے مذہب کی تعلیم کا انتظام کیا جائے اور باقی تمام مذاہب کو نظرانداز کر دیا جائے اور اس صورت میں ان تعلیم گاہوں کی جو حالت ہوگی وہ ظاہر ہے مدرسہ کے ایک گوشہ میں مولوی یہ بتا رہا ہوگا کہ گائے کی قربانی میں کئی آدمی شریک ہو سکتے ہیں، دوسری طرف پنڈت سمجھا رہا ہوگا کہ گائے کا مرتبہ ماں کے برابر ہے اور جو اسے ذبح کرتا ہے وہ ظالم و ناپاک ہے۔ ایک طرف بعض بچوں کو یہ بتایا جا رہا ہوگا کہ غیراللہ کے نام کا ذبیحہ حرام مطلق ہے، دوسری طرف یہ کہ گوشت جھٹکہ ہی کا کھانا چاہئے، کہیں قرآن پڑھا جا رہا ہوگا، کسی جگہ گیتا، کوئی انجیل کا درس دے رہا ہوگا اور کوئی گرنتھ کا، کسی گوشہ میں تثلیث پر بحث ہو رہی ہوگی اور کسی گوشہ میں وحدانیت پر، کہیں مدح صحابہ کے فضایل بیان ہو رہے ہوں گے اور کہیں تبرا کے ——— مولانا کو معلوم ہونا چاہئے کہ مذہب کا تجربہ بہت کافی ہو چکا ہے اور انسانی خون سے زمین کی پیاس بجھانے میں وہ جس حد تک اپنا فرض ادا کر سکتا تھا، ادا کر چکا ہے۔ دنیا کے جتنے مذاہب ہیں سبھی اپنے آپ کو الہامی کہتے ہیں

اور سوائے اپنے سب کو گمراہ ۔۔۔ دنیا میں ہزاروں بار حق و باطل کی تمیز کے لئے مناظرے اور مجادلے ہوئے، لیکن آج تک کوئی مذہب اپنے آپ کو برتر ثابت نہ کر سکا، اس لئے اب ان تجربات کی گنجایش مطلق باقی نہیں ہے اور اس پر اصرار کرنا، انتہائی قصور فہم ہے ۔۔۔ اگر ابھی ہندوستان کا جہل اس حد تک دور نہیں ہوا کہ وہ مروجہ مذاہب کو خیرباد کہہ کر محض "انسانیت" و پاکیزگی اخلاق کے مندر دلوں میں تعمیر کر سکے اور مولویوں اور پنڈتوں کے عذاب سے چھٹکارا حاصل کر سکے، تو سید سلیمان صاحب کو "امن و سکون" کی رعایت اتنی تو ضرور کرنا چاہئے کہ اگر وہ کوئی معقول رائے نہیں دے سکتے تو کم از کم خاموش ہی رہیں

دوسری تنقیح یہ تھی کہ کیا اسکول کے اوقات کے علاوہ مذہبی تعلیم کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اس پر زیادہ بحث کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کی لغویت اتنی واضح ہے کہ اگر خود سید سلیمان صاحب سے یہ سوال کیا جائے تو وہ گھبرا کر کہہ اُٹھیں گے کہ "میرا مطلب یہ تو نہ تھا" دراصلیکہ اس کے سوا ان کے اعتراض کا کوئی اور مفہوم ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ اگر مذہبی تعلیم نام ہے کسی مخصوص عقیدہ پر قایم کر دینے کا تو اسکی تعلیم گھر کے گہوارہ اور ماں کی آغوش سے شروع ہوتی ہے اور اگر مقصود پیشہ ور مولوی بنانا ہو (جسکی تخلیق اسکول کی حدود سے باہر ہی خوب ہوتی ہے) تو بھی سید سلیمان صاحب مجھ سے زیادہ اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ علماء سلف میں کتنے ایسے تھے جنھوں نے کسی مدرسہ میں زانوئے ادب تہ کیا اور کتنے ایسے جن کا فضل و کمال ان کی انفرادی کوشش کا مرہونِ منت تھا۔ حیرت ہے کہ ان کے قلم سے یہ بات کیسے نکل گئی کہ "اسکول کے اوقات کے علاوہ جو مذہبی تعلیم دیجائے گی اسکو کوئی اہمیت حاصل نہ ہوگی"

تیسری تنقیح یہ ہے کہ "کیا اپنی مذہبی تعلیم کا بار اُٹھانا مسلمانوں کا فرض نہیں ہے"۔ کیا میں سید سلیمان صاحب سے یہ پوچھ سکتا ہوں کہ جب خود ان کی نگاہ میں بھی مذہب کی اہمیت اتنی نہیں ہے کہ وہ جمعیت اسلامیہ کو اس کا ذمہ دار قرار دیں تو حکومت کو کیا غرض پڑی ہے کہ وہ یہ عذاب مول لے ۔۔۔ اگر مذہبی تعلیم کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے واردھا اسکیم پر مسلمانوں کو مرتد بنا دینے کا الزام قایم کیا جا سکتا ہے تو سید سلیمان صاحب بھی اسی جُرم کے مُجرم قرار دئے جائیں گے، کیونکہ نہ مذہبی تعلیم کے لئے نہ واردھا اسکیم روپیہ صرف کرنے کے لئے طیار ہیں اور نہ سید سلیمان صاحب

اس سلسلہ میں البتہ ایک بات ضرور غور طلب ہے [illegible] نصاب اور زبان کے لحاظ سے یہ اسکیم کوئی ایسی فضا پیدا کرنے والی ہو جس سے مسلمانوں کے قومی احساس، اجتماعی وقار یا سیاسی [illegible] پہونچ سکتا ہے (اور یہ نفاذِ اسکیم سے پہلے نہیں معلوم ہو سکتا) تو بیشک اس کی مخالفت کرنا چاہئے اور پوری قوت کے ساتھ۔۔۔ یعنی محض معارف کے شذرات سے نہیں، بلکہ عمل سے، ایثار و قربانی سے، دار المصنفین کے گوشہ میں بیٹھکر نہیں بلکہ میدان میں نکل کر اور آستینیں چڑھا کر۔۔۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ اگر یہ وقت کبھی آیا تو "رندانِ قدح خوار" میں سے کوئی نکل آئے تو نکل آئے، اس "فرقۂ زہاد" سے کسی کا اُٹھ کھڑا ہونا محال ہے۔ بلکہ میرا تو خیال یہ ہو کہ اُسوقت شاید معارف کے شذرات میں بھی اس کا ذکر شاید آئے گا [illegible] ہے کہ بدقسمتی سے یہ خطرہ اسی وقت پیش آئے جب مولانا مذکور کو بوجہ علالت ڈاکٹروں نے سختی کے ساتھ زبان و قلم کی جنبش سے روک دیا ہو۔

کیا چین شکست کھا جائے گا؟

چین و جاپان کی جنگ [illegible] وقت آنے والا ہے جب اس کے نتائج سے نہ صرف ایشیا بلکہ ساری دنیا کو متاثر ہونا [illegible] چین کو یا جاپان کو۔ اس لئے ضروری ہے کہ قارئین نگار کو

اس کی رفتار سے باخبر رکھا جائے ۔۔۔ اس جنگ کے نتیجہ پر حکم لگانے کے لئے واقعات کو مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ چین و جاپان کی اندرونی سیاسی حالت کیا ہے، دوسرے یہ کہ عسکری تنظیم، جغرافی ماحول اقتصادیات اور بین الاقوامی سیاسیات کے لحاظ سے فریقین کے لئے کیا آسانیاں اور کیا دشواریاں ہیں ۔۔ اس جنگ پر اسوقت تک جو کچھ لکھا گیا ہے وہ یا تو اُن ماہرین سیاست کا بیان ہے جو محاذ جنگ سے علٰحدہ صرف واقعات وحالات کو سامنے رکھ کر نتیجہ اخذ کرتے ہیں، یا اُن سیاحوں اور اخباری نمایندوں کا جو اس وقت وہاں موجود ہیں اور یہ دونوں اس باب میں متحد الخیال ہیں کہ "چین تو اس جنگ میں کامیاب نہیں ہوسکتا، لیکن جاپان کا ہاری مان لینا بھی یقینی ہے"۔۔ بظاہر یہ بات بہت عجیب معلوم ہوتی ہے، لیکن ہے بالکل صحیح، کیونکہ جاپان کے لئے چین اتنا بڑا لقمہ ہے کہ وہ اسے چبا نہیں سکتا اور لامحالہ ایک نہ ایک دن اسے اُگلنا پڑے گا۔ اس وقت تک جو حصۂ ملک جاپان نے فتح کیا ہے اسے آپ نقشہ سامنے رکھ کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ وہ صرف شمالی حصہ ہے اور جنوبی حصہ کی طرف وہ کوئی اقدام نہیں کرسکا ہے۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ شمالی حصہ میں ریلوں اور دریاؤں کی وجہ سے فوجی نقل وحرکت وہ بہ آسانی کرسکتا ہے اور جنوبی حصہ میں چونکہ یہ آسانیاں نہیں ہیں اس لئے وہ مجبور ہے۔ جاپان کی بڑی کوشش یہ ہے کہ چین کی ہر طرف سے ناکہ بندی کردیجائے تاکہ باہر سے اسلحہ وغیرہ کی مدد اسے نہ پہونچ سکے، لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہوا اور نہ آیندہ اسکا امکان ہے ۔۔ یہ ممکن ہے کہ وہ ہانگ کانگ اور کینٹن کا تعلق اندرون ملک سے قطع کردے، لیکن اس سے چین بالکل بے دست وپا نہیں بنایا جاسکتا۔ اسکی کئی سبا ہیں اول تو سامانِ حرب آنے کے اور متعدد راستے ایسے ہیں جنھیں جاپان بند نہیں کرسکتا۔ مثلاً ایک ہنوئی (فرانسیسی انڈوچائنا) کا راستہ ہے کہ یہاں سے چین کی سرحد تک ریل بھی ہے، سڑکیں بھی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ اس طرف سے کثیر سامانِ حرب چین کو پہونچ رہا ہے، اس کے علاوہ دوسرا راستہ برما کا ہے، جہاں سے یونا نفو تک سڑک طیار ہوگئی ہے اور نہایت آسانی سے چین کو سب کچھ پہونچ سکتا ہے۔ تیسرا راستہ براہ لانچو روس تک پہونچتا ہے، جہاں سے بھری ہوئی لاریاں برابر چین میں آرہی ہیں اور اسی راستہ سے چین چاء کی بڑی مقدار روس روانہ کررہا ہے

اب اسی کے ساتھ اس حقیقت کو بھی سامنے رکھئے کہ چینی انسان کے مصارف زندگی بہت کم ہیں اور وہ قدرتاً بے انتہا جفاکش ومتحمل واقع ہوا ہے اس لئے چین کے لئے مصارف کا مسئلہ زیادہ پیچیدہ نہیں ہے اور اگر ہو بھی تو وہ دیوالیہ نہیں ہوسکتا کیونکہ اسکی کرنسی کے لحاظ سے سونا اس کے پاس بہت کافی مقدار میں موجود ہے ۔۔۔ جس وقت ہم چین کے اندرونی جغرافیہ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہاں سڑکیں بہت کم ہیں اور کوئی راستہ فٹ دو فٹ سے زیادہ چوڑا نہیں ہے، اس لئے جاپان نہ وہاں بھاری بھاری توپخانے پہونچا سکتا ہے، نہ ٹینک۔ اگر اس کی کوشش بھی کیجائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ دھانوں کے کھیت میں وہ دھنس کر رہجائیں گے اور پھر کوئی صورت ان کے اِدھر سے اُدھر لیجانے کی نہ ہوگی۔ البتہ ہوائی جہاز ضرور جاسکتے ہیں اور ریلوے لائن سے (جو ایک ہی ہے) مشین گنیں بھی پہونچ سکتی ہیں، لیکن جب تک فوج کی کافی تعداد مع جدید ترین آلاتِ آتش افشاں کے وہاں نہ پہونچے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ الغرض چین کو مفتوح کرنے کے لئے بجائے توپوں اور ٹینکوں کے انسانوں سے زیادہ کام لینے کی ضرورت ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جاپان کے پاس اتنی حملہ آور فوج نہیں ہے، جتنے چین کے پاس جان دینے والے انسان موجود ہیں

یہ بالکل صحیح ہے کہ اس وقت تک چینی سپاہ زیادہ ہلاک ہوئی ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہئے کہ جاپان نے اپنے ملک سے آکر دوسرے ملک پر حملہ کیا ہے اور چین اپنے ملک کے اندر ہی مدافعت کررہا ہے اور اس صورت میں اگر دونوں ملکوں کی آبادی برابر ہوتی تو بھی چین کا پلہ بھاری رہتا، چہ جائیکہ جاپان کی آبادی ۸ کروڑ ۴۰ لاکھ ہے اور چین کی ۴۵ کروڑ ۳۰ لاکھ

جاپان کا حقیقی مقصود اس حملہ سے چین پر حکومت کرنا نہیں ہے بلکہ اس کو مغلوب کرکے اپنی تجارت کی منڈی بنانا اور وہاں سے خام پیداوار حاصل کرنا ہے جس کی جاپان کو سخت ضرورت ہے، لیکن اس مقصود کا پورا ہونا آسان نہیں، کیونکہ اول تو چینیوں کے وطن پرستانہ جذبات اب بہت قوی ہوگئے ہیں اور وہ کبھی جاپانی مال استعمال نہیں کریں گے، علاوہ اس کے اسوقت جاپان جو کچھ جنگ میں صرف کر رہا ہے وہ اتنا زیادہ ہے کہ عرصہ تک وہ اسے برداشت نہیں کرسکتا۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ جاپان اسوقت ۵۰ لاکھ جاپانی ڈالر یعنی تقریباً ایک کروڑ تیس لاکھ روپیہ روزانہ صرف کر رہا ہے اور اس وقت تک ۲ ارب ڈالر (یا چھ ارب روپیہ) خرچ ہوچکا ہے اور نہیں کہا جاسکتا کہ کب تک اس صرف خطیر کو برداشت کرنا پڑے گا اور اس کے بعد بھی نتیجہ کیا ہوگا۔ جاپان میں اسوقت ٹیکسوں کی بھرمار ہے اور اس کے مال کی برآمد ۲۰ فیصدی گھٹ گئی ہے

خود جاپان اس لڑائی کی اُلجھنوں کو جس نقطۂ نظر سے دیکھ رہا ہے اس کا اندازہ یوں ہوسکتا ہے کہ وہاں کے تمام لیڈر لوگوں سے یہی کہہ رہے ہیں کہ ان کو اس جنگ سے جلد اختتام کی توقع نہ رکھنا چاہئے۔ لیکن اور ملکوں کے ماہرین جنگ سوچ رہے ہیں کہ آیا جاپان اس غیر معمولی بار کو دو تین سال تک برداشت کرسکتا ہے یا نہیں اور چونکہ چینیوں کو بھی اس کا علم ہے کہ جاپان زیادہ عرصہ تک اس بوجھ کو سہار نہیں سکتا اس لئے وہ بھی اڑے رہنے پر طیار ہوگئے ہیں اور انھیں یقین ہے کہ جنگ جتنی زیادہ طوالت پکڑے گی ان کا اتنا ہی زیادہ فایدہ ہے

اب جنگی نقطۂ نظر سے ہٹ کر انتظامی زاویۂ نگاہ سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ جب تک وہ چین کے اس جذبۂ مقاومت کو نہ توڑ دے وہ کسی مفتوحہ علاقہ پر قابض نہیں رہ سکتا، یعنی اگر وہ کوئی حصۂ ملک حاصل کرے تو بھی اسے قبضہ میں رکھنے کے لئے کم از کم ۲۰ لاکھ سپاہ رکھنے کی ضرورت ہوگی، اور اس کے بعد بھی یقین نہیں کہ چینی لوگ جاپانیوں کے ساتھ ان کی مرضی کے مطابق معاملۂ تجارت کرنے پر راضی ہوجائیں گے۔

اب اسی کے ساتھ آپ جاپان کی اندرونی حالت پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ وہ بھی امید افزا نہیں ہے — کہا جاتا ہے کہ چین اندرونی اختلافات کا شکار ہے، یہ درست ہے، لیکن جاپان بھی ان اندرونی اختلافات سے پاک نہیں ہے۔ وہاں اس وقت دو جماعتیں ہیں، ایک عسکری اور دوسری مدبرین سیاست کی اور ان دونوں میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔ ہر چند کچھ عرصہ سے وہاں عسکری جماعت ہی برسر اقتدار ہے لیکن ملک کی عام آبادی اس کو اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھتی اور دوسری جماعت کا کسی نہ کسی وقت برسر اقتدار ہوجانا یقینی ہے، کیونکہ چیزوں کی قیمت بہت بڑھ گئی ہے اور کاروبار کی خرابی کی وجہ سے وہاں کا متوسط طبقہ بہت برہم ہے

پھر علاوہ ان دو جماعتوں کے اختلاف کے لطف یہ ہے کہ خود عسکری جماعت کے اندر دو گروہ پائے جاتے ہیں، چنانچہ وہاں کی بری اور بحری فوج کی مخالفت مشہور چیز ہے۔ شنگھائی کی بربادی کا سبب صرف یہی تھا کہ جاپان کی بری فوج منچوریا میں کامیابی حاصل کرچکی تھی اور اس کے مقابلہ میں بحری فوج کو بھی اپنا کارنامہ دکھانا ضروری تھا۔ بظاہر یہ جذبۂ مسابقت فال نیک معلوم ہوتا ہے، لیکن جسوقت اقتصادی دشواریاں بڑھ جائیں گی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ دونوں فوجیں خود دست و گریباں ہوجائیں گی اور جاپان نہایت ہی ہولناک قسم کے انقلاب کا شکار ہوجائے گا

اب اس کے مقابلہ میں چین کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ۱۹۱۱ء کے انقلاب کے بعد وہاں اتنا اتحاد کبھی نہیں پایا گیا جتنا اسوقت پایا جاتا ہے سیاسی جماعتوں کا اختلاف وہاں اب بھی پایا جاتا ہے اور اگر جاپان نے جنگ نہ چھیڑ دی ہوتی تو یہ اختلاف بدستور تباہیاں پھیلاتا رہتا لیکن اب ایک مشترک دشمن کے مقابلہ کے لئے انھوں نے اپنے اندرونی اختلافات کو ملتوی کر دیا ہے

چین میں ایک جماعت اشتراکیوں کی ہے جس کا سردار مارشل شنگ کائشیک ہے اور دوسری جماعت ملوکیت پسندوں کی ہے جس کا سردار اسوقت جنرل پائی زنگ ہسی ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ اشتراکیوں کو نہایت ہی نفرت وحقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے، لیکن اسوقت دونوں جماعتیں ایک ہوگئی ہیں اور مارشل شنگ کائشیک نے اپنی سترہ ڈویژنوں اور جنرل پائی زنگ ہسی کی افواج کو ایکدوسرے سے بالکل متحد کر دیا ہے

اب اسباب جنگ کی فراہمی اور تربیت افواج کے مسئلہ کو لیجئے۔ اس میں شک نہیں کہ اگر سامان حرب مل بھی جائے تو غیر تربیت یافتہ فوج اس سے کوئی فایدہ نہیں اُٹھا سکتی۔ اسپین کی موجودہ جنگ کی ابتدا میں یہی ہوا کہ بہت سے ہوائی جہاز غیر ماہر انجینیروں کی وجہ سے تباہ ہوگئے چین کے پاس غیر ملکی ماہرین فن موجود ہیں لیکن کم، اور پھر یہ کہ وہ بہت زیادہ ہوشیار بھی نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ روسی ہواباز چین میں زیادہ کام کر رہے ہیں لیکن یہ صحیح نہیں ہے اور اگر ہوں بھی تو وہ اس لئے زیادہ مفید نہیں ہوسکتے کہ وہ زیادہ خود رائی سے کام لیتے ہیں۔ جرمن ماہرین فن وہاں زیادہ ہیں اور اس میں شک نہیں کہ نہایت ہوشیار ہیں۔ اول اول جب شین کانگ پر جاپان نے حملہ کیا تو چینی جنرلوں نے ان کے مشوروں کو نہیں مانا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چین کو شکست کھانا پڑی، لیکن اب جرمن افسران کا اثر بڑھتا جاتا ہے ——— جب ۲۰ر فروری کو ہر ہٹلر نے منچکوہ پر جاپان کے اقتدار کو تسلیم کر لیا تو یہ اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ شاید جرمن افسران واپس بلائے جائیں گے، لیکن اول تو ابھی تک کوئی کارروائی ایسی ہوئی نہیں اور اگر ہو بھی تو خیال یہی ہے کہ یہ واپس نہ جائیں گے کیونکہ وہ چین کی کامیابی کے لئے بہت کوشاں ہیں۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ چین کے پاس نہ ویسے آلات حرب موجود ہیں جیسے جاپان کے پاس ہیں اور نہ فوج اتنی تربیت یافتہ ہے تاہم اسکی تلافی تعداد سپاہ اور اندرون ملک کے اُن دشوار گزار راستوں سے ہوسکتی ہے جہاں جاپان اپنے جدید اسلحہ سے کام نہیں لے سکتا۔ علاوہ اس کے چین کو سب سے زیادہ اعتماد اپنی غیر آئینی (گوریلا[1]) قسم کی جنگ پر ہے۔ ہر چند اس کا نتیجہ یہ ضرور ہوگا کہ چین کی عسکری مرکزیت پھر متزلزل ہوجائے گی اور جنگ ختم ہونے پر ان جماعتوں کو سنبھالنا دشوار ہوجائے گا لیکن اس وقت جاپان کا اقدام وتسلط ضرور رک جائے گا ——— یہ ہے چین وجاپان کی موجودہ حالت اور یہ ہے وہ صحیح پوزیشن جس کو دیکھ کر ہر شخص اس نتیجہ پر پہونچ سکتا ہے کہ چین کی کامیابی تو جاپان کے مقابلہ میں ممکن نہیں، لیکن جاپان بھی فایدہ میں نہیں رہ سکتا اور جس مقصد کو لیکر وہ اُٹھا ہے وہ پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔

حال ہی میں روس اور جاپان کے درمیان جو سرحدی نزاع ہوگئی تھی اس سے چین کی توقعات بہت بلند ہوگئی تھیں، کیونکہ جاپانی اقدامات چین کی طرف رُک گئے تھے، لیکن اس نزاع کے ختم ہوجانے پر پھر وہی صورت عود کر آئی ہے جو پہلے پائی جاتی تھی۔ دریائے زرد کے سیلاب اور ہیضہ وغیرہ کی وجہ سے گو جاپانی فوجوں کو کافی نقصان پہونچا اور پہونچ رہا ہے، لیکن یہ فطری موانع ایسے نہیں جو انسانی عزائم کو پست کر سکیں۔ جاپان تو اسوقت جوا کھیل رہا ہے اور اس نے داؤں پر اپنا سب کچھ لگا دیا ہے۔ اگر اس کو کامیابی ہوگئی تو پھر یہ یقینی ہے کہ ایشیا میں مغربی اقوام کا زور بالکل گھٹ جائے گا، ورنہ کم از کم دس سال کے لئے پھر اسے سر اُٹھانے کی فرصت نہیں مل سکتی ——— مغربی ممالک یہ تو یقیناً نہیں چاہتے کہ چین پامال کر دیا جائے، لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ جاپان جنگ ختم کر دے، کیونکہ وہ تو بہرحال اس کے زور وطنطنہ کو توڑنا چاہتے ہیں اور اس کی بہترین صورت یہی ہے کہ جنگ کے غیر معمولی مصارف سے اس کی اقتصادی حالت کو تباہ کر دیا جائے اور تجارتی منڈیوں کو اس کے مصنوعات سے خالی

---

[1] (Guerrilla) ہسپانوی زبان سے آیا ہے۔ اس سے مراد وہ بے قاعدہ جنگ ہے جس میں عسکری جماعتیں دشمن پر حملہ کرتی ہیں ۱۸۰۸ء ہسپانیوں نے فرانسیسیوں کے خلاف اسی طریق سے جنگ کی تھی اور اسی وقت سے یہ لفظ اس معنے میں رائج ہوگیا۔

مولانا نسبتی واسطی تھانیسری

(۲)

کلیات آپ نے سولہ ہزار اشعار فارسی زبان میں کہے ہیں۔ بارہ قصائد و قطعات اور مختصر سے مرثیہ کے علاوہ باقی سب غزلیں ہیں۔ کلیات نسبتی کے زیر نظر نسخہ میں قصائد وغیرہ کے اشعار کی تعداد چار سو اڑسٹھ اور غزلوں کے شعروں کی پندرہ ہزار پانسو ترانوے ہے۔ چند غزلیں دوبارہ لکھی ہوئی ہیں۔ ان مکرر اشعار کی تعداد ساڑھ اشعار کے قریب ہوگی رباعی کے مقررہ اوزان میں چار شعروں کی ایک غزل ہے۔ اس کے علاوہ ان کے مجموعۂ سخن میں کوئی رباعی نہیں۔
کلمات الشعراء اور روز روشن کے قول کے مطابق فارسی کے علاوہ ہندی (بھاکا) میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے اور "نسبتی" جس کے معنی محمد افضل سرخوش نے "چاند" لکھے ہیں تخلص فرماتے تھے۔ آپ کا ہندی کلام بالکل نہیں ملتا۔ فارسی کلیات بھی خان آرزو المتوفی ۱۱۶۹ھ کے عہد کے بعد گم ہوگیا تھا۔ علاوہ اس نسخہ کے جو مجھے دستیاب ہوا ہے۔ "دیوان نسبتی" کے دو مختصر سے انتخابات اورنٹیل لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہیں ـــ ایک نمبر کا ۳۱۸ ہے اس کا پہلا شعر یہ ہے:-

در زلزلہ آوردۂ از ناز زمیں را ، یک رہ سرپائے مزن ایں خاک نشیں را

میرے نسخہ میں یہ شعر پندرھویں غزل کا مطلع ہے:-

مہت گفتم برخ پردہ فگندی ، مرا از روئے خود شرمندہ کردی

میرے نسخہ میں یہ شعر آخری غزل سے پہلی غزل کا تیسرا شعر ہے
اس نسخہ پر تاریخ تحریر درج نہیں۔ مولوی عبدالمقتدر صاحب کے خیال میں یہ نسخہ اُنیسویں صدی عیسوی کا ہے۔
دوسرے نسخہ کا نمبر ۳۱۹ ہے اور یہ پہلے سے زیادہ مختصر ہے۔ یہ اس شعر سے شروع ہوتا ہے ؎

بکوئے یار بنا کردہ اند خانۂ ما ، بہ شاخ زلف نہادند آشیانۂ ما

اس میں ۲۸ رباعیاں بھی پائی جاتی ہیں، پہلی رباعی یہ ہے ؎

ازما نچہ رو دست اختلافِ دُنیا ، لافِ دنیا بما ۔ گزافِ دُنیا
ایں ہردو مخالفت بمن آید راست ، دنیا بخلاف ما و ما خلافِ دُنیا

میرے پاس جو کلیات ہے اُس میں بجز چار اشعار کے جو ذیل میں درج کئے جاتے ہیں کوئی رباعی موجود نہیں، وہ چار شعر یہ ہیں :۔

از جور من شکستہ خاطر شادم — بشکن بشکن کہ دل بدستت دادم
زاد است ہماں روز بلا ہم یارب — زاں روز سیہ کہ من زمادر زادم
از من غلط او فتاد او را چہ کند — جاں می طلبید یار، من دل دادم
اے اشک مبادا کہ برد سیل مرا — اے آہ مبادا کہ دہی بر بادم

میں نہیں کہہ سکتا کہ پٹنہ لائبریری کے یہ انتخابات کن نسخوں سے کئے گئے ہیں۔ میرے نسخہ میں نسبتی کے جتنے مشہور اشعار ہیں، سب موجود ہیں اور دیوان کے ابیات کی تعداد بھی بالکل وہی ہے جو مشہور ہے۔ کاغذ کی رنگت اور کتابت بھی نسخہ کی قدامت پر دال ہے۔ مگر صحیح تاریخ تحریر کا علم دشوار ہے، کیونکہ نہ کاتب کا نام درج ہے نہ تاریخ نقل وتحریر البتہ کہیں کہیں حواشی پر کاتب نے اشارہ کر دیا ہے کہ یہ نسخہ اصل نسخہ کی بعینہ نقل ہے۔ کاتب کسی کسی مقام پر پڑھ نہیں سکا۔ اس لئے وہ جگہیں اس نے خالی چھوڑ دی ہیں۔ جہاں تک میں سمجھ سکتا ہوں زیر نظر نسخہ تمام معلومہ نسخوں میں سب سے زیادہ مکمل ہے

خانِ آرزو نے دیوان نسبتی کا ایک انتخاب کیا تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں" میں نے آج سے بیس برس پہلے اسکے دیوان سے تین ہزار اشعار کا انتخاب کیا تھا۔ جو شاہ مبارک آبرو (میرا شاگرد تھا اور قرابتِ قریبہ بھی رکھتا تھا) لے گیا اس کی وفات کی وجہ سے وہ کاغذات مجھے نہ مل سکے۔ میں ان کی گم شدگی پر کفِ افسوس ملتا تھا۔ اتفاقاً پندرہ برس کے بعد شیخ مبارک محی الدین کی سعی سے جو اس تذکرہ (مجمع النفائس) کی تصنیف کے محرکِ اصلی ہیں، وہی کھویا ہوا انتخاب دستیاب ہو گیا"۔ مختلف تذکروں میں ان کے سَو، دو سَو اشعار ملتے ہیں بجز ان کے اور کوئی نسخہ کلیات نسبتی کا کہیں موجود نہیں انڈیا آفس اور بوڈلین لائبریری کی فہرستیں پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں میری نظر سے گزری ہیں —— ان میں بھی دیوان نسبتی موجود نہیں۔ علامۂ شیرانی اور علامۂ شبلی کے کتب خانے بھی اس سے خالی نظر آتے ہیں۔ مجھے جو نسخہ کلیات نسبتی کا ملا ہے وہ مولوی صاحب مکھڈ کے کتب خانہ کا ہے

کلام پر تبصرہ

اگرچہ نسبتی کا کلام دستِ بُردِ زمانہ کی نذر ہو گیا، مگر آپ کا نام شاعری کے حلقوں میں برابر گونجا کیا اور جب کبھی ہندوستان نے ایران کے مقابلہ میں اپنے فارسی گو شعرا پیش کئے تو نسبتی کا نام بھی ان میں ہوتا تھا۔ چنانچہ صائب شاہ عباس صفوی کے دربار کا ملک الشعراء، نسبتی کے سحرِ کلام کا قایل تھا۔[1] ذیل میں چند اکابر ادب و اساطین شعر کی رائیں پیش کی جاتی ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ اسلاف کا ان کی شاعری کے متعلق کیا خیال تھا

---

[1] گزشتہ اشاعت میں صائب کی رائے اور اُس پر علامۂ شیرانی کی رائے گزر چکی ہے

اور علماء حال کس نظر سے دیکھتے ہیں:۔

۱۔ "اشعارش نہایت گداختہ۔ پختہ وخوش قماش واقع شدہ" مخزن الغرائب (احمد علی سندیلوی)

۲۔ "ان کا ہر شعر پر معانی ہوتا ہے، یہ شعر ادبی حلقوں میں بہت مشہور ہے:۔

نسبتی دل بدرد معتبر است ÷ لالہ با داغ آبرو دارد۔ کلمات الشعراء (محمد افضل سرخوش)

۳۔ در شاعری خداوند علوِ کلام۔ اکثر گفتو ہائے عشق دارد وسرا پا درد از کلام او می بارد۔ گل رعنا (شفیق اورنگ آبادی)

۴۔ نسبتی تھانیسری شاعر خوش خیال است۔ سفینۂ بے خبر (میر عظمت اللہ بے خبر بلگرامی)

۵۔ بندہ آرزو معتقد سخن اوست۔ خیلے بدرد و مزہ حرف می زند۔ مجمع النفائس (سراج الدین علی خاں آرزو)

۶۔ طبعے باسوز و گداز داشت کہ اثرش از اشعارش ترادش می کند، ہنگام خواندن اشعار اشک از چشم او می تراوید۔
روز روشن (مظفر حسین صبا)

۷۔ کہتے ہیں نسبتی ہمہ تن درد ہے۔ شعر پڑھتے ہی آنکھوں میں آنسو بھر لاتا ہے۔ عمل صالح (محمد صالح کنبوہ)

۸۔ ملک الشعراء میرزا رفیع سودا نے انھیں فارسی کے اکابر شعرا میں شمار کیا ہے

۹۔ مرزا صائب کی رائے گزر چکی ہے

۱۰۔ مولانا نسبتی کا کلام تذکرہ میں پڑھا ہے۔ کلام پختہ ہے۔ کہیں کہیں تشبیہیں بھی نادر ہیں (سید سلیمان ندوی)

۱۱۔ نسبتی بے مثل کہنے والے تھے (مولانا نیاز مدیر نگار)

ادب وشعر کے نقاد، نسبتی کے متعلق جو رائے رکھتے ہیں۔ مجملاً عرض کرچکا ہوں اب ان کے کلام سے مثالیں پیش کر کے میں یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ نسبتی کیا تھے[۱]! کسی نے کہا ہے کہ شاعری دل کا معاملہ ہے۔ حساس طبیعتیں جب

---

[۱] رفع التباس کے لئے یہ بتانا ضروری ہے کہ مولانا نسبتی واسطی تھانیسری کے علاوہ ایک اور شاعر بھی نسبتی تخلص کیا کرتا تھا، وہ مشہد کا رہنے والا اور شاہ طہماسپ صفوی کے زمانہ کا مشہور شاعر ہے۔ بہت عرصہ آذربائیجان میں رہا۔ آخر الامر شاہ مذکور کے عہد حکومت میں دار الارشاد اردبیل میں وفات پائی اور وہیں سپرد خاک ہوا۔ (آتش کدۂ آذر اصفہانی)

نمونہ کلام یہ ہے:۔

غائب ز دیدہ ناشدہ جاں داد نسبتی، بے چارہ تاب ہجر ازیں بیشتر نداشت
می نگری زماں زماں روز وصال سوئے من تا شب ہجر سوزدم حسرت ہر نگاہ تو
بسوئیم گرکم آئیم بردلم نبود غبار از تو کہ از آمد شد بسیار گشتم شرمسار از تو
(منقول از آتش کدۂ آذر اصفہانی)

در اول بے دانستمت درنہ بایں حسرت چہ می کردم اگر دل می نہادم بر وفائے تو
سے رفت و عالمے نگرانش ز بے کسی آنکم بدل فزود کہ تاب نظر نداشت
منقول از خرابطہ جواہر میرزا مظہر

دردمندے کہ بامید وفائے تو بود صبر او کاش بمقدار جفائے تو بود
نسبتی سادہ چرا ئی شدہ قاصد ہمہ شوق اضطرابش پئے رفتن نہ برائے تو بود
(منقول از مجمع النفائس۔ خان آرزو)

اپنے واردات قلب بیان کرنے پر آتی ہیں تو سننے والوں کو جگر تھام لینا پڑتا ہے۔ نسبتی چونکہ ایک آزاد منش صوفی تھے اسلئے انھوں نے زیادہ تر غزلیں ہی لکھیں۔ یا یوں کہئے کہ آنسوؤں۔ آہوں۔ نالوں۔ دل کے ٹکڑوں اور جگر پاروں کا ایک انبار ہے جس کا نام دیوان نسبتی ہے۔ قصائد ہیں تو وہ بھی اس والہانہ محبت کا نتیجہ ہیں جو انھیں داماد رسول اور زوج بتول سے تھی ۔ مدحیہ شاعری کو وہ ننگِ انسانیت سمجھتے تھے

چرا مدح کردند مخلوق را به ننگم ز خاقانی و انوری ،،

تذکرہ نویسوں کا متفق اللفظ ہو کر کہنا کہ عشق ان کے کلام سے ٹپکتا ہے اور درد ان کے اشعار سے برستا ہے۔ مبالغہ نہیں حقیقت ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں اور کتنا صحیح لکھتے ہیں ؎

جز شعر تو نسبتی ندیدیم خونِ جگرے بایں روانی

نسبتی کا اندازِ سخن وہی ہے جو کلیم۔ صائب۔ غنی اور سلیم کا ہے۔ مگر یہ ساتھ ہی ساتھ متقدمین کی سادگی کے بھی دلدادہ ہیں۔ ان کے سیکڑوں اشعار پڑھ جائیے ایک لفظ ایسا نہ ملے گا جس کے لئے لغت دیکھنے کی ضرورت پڑے۔ کلیم کا ہم سخن کہنے سے میرا یہ مطلب نہیں کہ مضمون آفرینی اور خیال بندی میں یہ بھی اسی فضا میں اُڑتے ہیں۔ بلکہ جب تک خیال بندی حسن تعلیل کی حد سے نہیں نکلتی، نسبتی اس کے ہمدوش رہتے ہیں اور مثالیہ میں تو یہ یقیناً کلیم کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔

علامہ شبلی شعر العجم جلد سوم میں تحریر فرماتے ہیں:۔ "مثالیہ مضامین پہلے بھی خال خال پائے جاتے تھے، امیر خسرو کا ایک مشہور قصیدہ سرتاپا اسی صنعت میں ہے۔ لیکن کلیم۔ صائب اور غنی نے گویا اس کو ایک خاص فن بنا دیا۔ چونکہ تینوں شاعر کشمیر میں مدت تک ہمدم و ہم قلم رہے تھے، اور باہم مشاعرے رہتے تھے۔ اس لئے قیاس یہ ہے کہ ہم صحبتی کے اثر نے اس طرز کو مشترک جولاں گاہ بنا دیا"

یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ نسبتی کو ظفر خاں احسن سے یک گونہ تعلق تھا اور وہ اس تعلق کی بنا پر کبھی کبھی کشمیر جایا کرتے تھے۔ اس لئے ممکن ہے ان کی شاعری پر کشمیر کے اس قیام گاہ گاہی کا اثر ہوا ہو اور صائب کی ملاقات اور دوستی سمند طبع پر تازیانہ ہوئی ہو، گو نسبتی طبعاً حافظ شیراز کے رنگ کو پسند کرتے تھے، چنانچہ لکھتے ہیں کہ:۔

من نسبتیم معتقدِ حافظِ شیراز در فارسیم بیں کہ ہمہ فرس طراز است
راہِ زمینِ حافظِ شیراز رفتہ ایم تاہمتش بہ فیض سخن راہبر شود

اور حسن دہلوی کے بھی معتقد تھے ؎

احسن احسن زہے سخن پرداز حسن ہند سعدی شیراز

مگر ماحول سے متاثر ہونا ضروری تھا۔ علامہ ایک جگہ شعر العجم میں رقمطراز ہیں کہ "مثالیہ یعنی کوئی دعویٰ کرنا اور اسپر شاعرانہ دلیل پیش کرنا۔ یہ طرز نہایت مقبول ہوا۔ یہاں تک کہ شاعری کے خاتمہ تک قایم رہا"

یہی وجہ ہے کہ اگر نسبتی اپنے سوز دروں، کی وجہ سے سعدی۔ حسن دہلوی اور حافظ کے معتقد تھے وہاں صائب کے مثالیہ کے بھی شیدا تھے۔ مثالیہ شاعری بظاہر ایک قسم کا تصنع وآورد ہے۔ بسا اوقات یہ پھبتی کی حد سے نہیں بڑھتی۔ لطیف تغزل ایسی پھبتی کب برداشت کر سکتا ہے۔ مگر مثالیہ کی اثر آفرینی کی اسوقت کوئی حد نہیں رہتی، جب وہ حسب حال ہونے کے علاوہ بے ساختہ معلوم دے۔ مثلاً

نسبتی دل بدرد معتبر است — لالہ با داغ آبرو دارد،

دل بدرد آمد مراد۔ بزم وصلش نسبتی — در بہاراں تازہ می گردد جنوں دیوانہ را

شدم از خاطر آں مست بد خو، — چو حرفِ حالتِ مستی فراموش

چوں ناوکے کہ در جگرِ صید می خلد — در دل ہمی خلد نگہ ناتمام او،

رواں شد محمل لیلیٰ و مجنوں با دلِ سوزاں — جُدا از کارواں اُفتادہ چوں از کارواں آتش

مانندِ غریقے کہ بخاشاک زند دست — چسپیدہ بداماں مژہ چشمِ ترِ ما

از دیدنِ تو دیدۂ من سیر نگردد — کس پُر نتواند کہ کند چشمِ گدا را

مثالیہ کی دُھن میں تغزل کی لطافت ہاتھ سے جانے نہ دینا نسبتی کو اپنے ہمشربوں میں ممتاز بنا دیتا ہے۔ اسکی وجہ غالباً وہی ہے جو سعدی کے ذکر میں علامہ شبلی نے تحریر فرمائی ہے "شیخ میں یہ جذبہ (عشق) فطری تھا۔ اور چونکہ وہ تمام عمر ہر قسم۔ کے دنیاوی تعلقات سے آزاد رہا۔ اس لئے اس جذبہ کی گرمی اور تیزی اسی طرح مشتعل رہی۔ اسی آگ کے شعلے ہیں جو اس کی زبان سے نکلتے ہیں"۔ سعدی کو دنیا داروں سے تعلق رکھنا پڑتا تھا اور وہ ان کی طرف سے یکسر بے نیاز نہیں ہو سکتے تھے جیساکہ ان کی زندگی کے واقعات ثابت کرتے ہیں۔ مگر نسبتی ان سب باتوں سے پاک تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی آتشِ شوق کا التہاب کم اور اُن کا کلام سراپا سوز بن گیا۔ مثلاً

ایں عشقِ بے قرار وایں صبر بے تحمل — فرصت نداد دیگرم از ترکتاز مارا

ہست از آشنائی تو بمن، — ایں کہ بیگانگی است خویشاں را

آشنا می شوی و می ترسم — آشنائی شود بلا نشود،

رہے است راہِ محبت کہ غیر دل نزود — بیا دو سر نتواں کرد جستجوئے ترا

شوق گو دود دم برآرد عشق گو جانم بسوز — نیست غم در خانہ گر آتش فتد پروانہ را

جانِ از آں بیش ما عزیز تر است — کہ بجا بنہا سر نیست جاناں را

می کنم سخت یادِ او امروز، — غالباً یاد کردہ است مرا

تفرقۂ ہجر و وصل لازمۂ عاقلی است — ہست یکے روز و شب عاشقِ دیوانہ را

سخت می ترسم کہ من بسیار می خواہم ترا — آرزو خوب ست امّا این قدر ہا خوب نیست

مراندوہِ دل۔ دلگیر کردہ است — در آغازِ جوانی پیر کردہ است

نسبتی می رود زحال بحال، — باز بر حالِ خویش می آید

برخاک فگندم دل وہم خواہش دل را — دیوانہ چو شوریدہ باسباب نسازد

حسرتِ بے حسرتی از غم مرا ساز د ہلاک — حسرت او یک نفس گر از دلم بیروں شود

دور آخر گشت وساقی رفت ومجلس بر شکست — من ہماں خُم کہ در مینائے خود مستم ہنوز

دیدیم عاقبت کہ ہمیں داغ بود گل — عمر عبث تلف شدہ در انتظار گل

گفتی احوال بگو۔ حال دگر گونم شد — حال این است کہ از حال بجائے شدہ ام

علوم درد باوراقِ لالہ درج شدہ است — زعلمِ داغ ہمیں یک رسالہ می بینیم،

شرح وبیانِ داغ دراوراقِ لالہ نیست — اے دل بجاں مطالعۂ این رسالہ کن،

خبر زخاک شہیدِ تو بادہم نگرفت — خوشا غبار کہ بادے بگیر دش خبرے

شعر اسی قدر لطیف اور پُرزور ہوتا ہے، جتنی تشبیہات نادر ولطیف ہوں۔ نسبتی کے کلام کا اس زاویۂ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو تختۂ گلزار سامنے آجاتا ہے:۔

بے روئے تو بیمار شد از بسکہ نگاہم — از جا بعصائے مژہ خیزد نظرِ ما

مژہ کو نظر کا عصا کہنا تشبیہ ومحاکات کا نہایت پاکیزہ امتزاج ہے

چشمِ مخمورت زند بر دل چو زخم تازہ را — زخمہائے کہنہ لب وامی کند خمیازہ را

زخم کو خمیازہ کہنا کتنا پیارہ انداز بیان ہے

مانندِ غریقے کہ بخاشاک زند دست — چسپیدہ بداماں۔ مژۂ چشمِ ترِ ما

قاآنی کا یہ شعر ہے

دو زلفِ تابدار او بچشمِ اشکبارِ من — چو چشمۂ کہ اندرو شنا کنند مارہا

مرکب تشبیہ کا لاجواب نمونہ کہا جاتا ہے۔ مگر قاآنی سے بہت پہلے نسبتی یوں فرماتے ہیں:۔

وقتِ گریہ یادِ رویش می کنم — خام کارم نقش می بندم بر آب

قاآنی نے پانی میں سانپ لہرائے اور نسبتی نے تصویر کھینچی "نقش بر آب بستن" محاورہ بھی ہے اور عاشق کی سعیِ لاحاصل کی حسرتناک تصویر بھی۔ جب آدمی نئی نئی محبت کرتا ہے تو اس کی نظر میں حسنِ یار کی کشش بھی ہوتی ہے اور خطرات کا اندیشہ بھی اس تذبذب وپس وپیش کو نسبتی یوں ظاہر کرتے ہیں:۔

دلم ہمی رود و باز پس ہمی نگرد — چگونہ راہِ بیاباں رود کہ نوسفر است

محبوب کے چلے جانے کے بعد دل میں جو خلش سی پیدا ہوتی ہے اس کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں

تو رفتی خار خارے ہست در دل — گزشتہ موسمِ گل - خار باقی است

تشبیہ شاعری کی جان ہے اور اس کی خوبی یہ ہے کہ عامۃ الورود واقعات پر اسکی بنیاد قایم ہو۔ اس رنگ کا شعر ملاحظہ ہو۔

می رود بے تو بسز پیرمژہ ہا جوئے سرشک — سایۂ بید بر آں آب روان است ہنوز

جس نے کسی دریا کے کنارے بید کے سایہ کو متحرک دیکھا ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ نسبتی نے مصرعہ اول پیدا کرنے میں کیا کمال دکھایا ہے۔ راز کے جلد تر افشا ہوجانے کو یوں کہنا کہ آدھی رات کے وقت سورج طلوع کر آیا۔ ندرتِ بیان اور پاکیزگیٔ تشبیہ کی لاجواب مثال ہے ؎

رازِ ما زد در روئے روز افتاد — نیم شب - صبح شد - بخانۂ ما

ذوق مرحوم کا ایک شعر ہے جو سادگی جوش اور واقعیت کی بہترین مثال ہے

رہتا ہے اپنا عشق میں یوں دل سے مشورہ — جس طرح آشنا سے کرے آشنا صلاح

نسبتی کا بھی یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

چوں دو ہمدرد کہ گریند بہم از تہِ دل — می کند دیدہ جدا گریہ - دلِ زار جدا

میر تقی میر کا شعر ہے :-

زمیں پر میں جو پھینکا خط کو کر بند — بہت تڑپا کیا - جوں مرغِ پر بند

نسبتی بہت عرصہ قبل اس مضمون کو یوں ادا کر چکے ہیں

نسبتی مکتوب را ما در زمیں افگندہ ایم — ہمچو مرغِ نیم بسمل خود بخود پر می زند

کسی مضمون کو جوں کا توں لے لینا سرقہ کہلاتا ہے لیکن اگر مضمون میں کوئی ترقی پیدا کی جائے تو معیوب نہیں یہی حال ترجمہ کا ہے۔ کسی مضمون کا ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا اسی وقت جایز ہو سکتا ہے۔ جب اصل خیال کا حُسن قایم رہے۔ مثلاً نظیری نیشاپوری کا شعر ہے ؎

بوئے یارِ من ازیں سست وفا می آید — گلم از دست بگیرید کہ از کار شدم

سودا نے اس کو اُردو میں منتقل کیا اور زیادہ حسن کے ساتھ

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا — ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں

خاقانی کا ایک شعر ہے :-

ہمسایہ شنید نالہ ام گفت — خاقانی را دگر شب آمد،

اُردو میں یہ شعر اس طرح منتقل ہوا کہ اصل اور نقل کا امتیاز اُٹھ گیا

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ ۔۔۔ بس آج بھی رات سو چکے ہم

میر نے اس مضمون کو یوں لیا

یونہی میر گر رات روتا رہے گا ۔۔۔ تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

حاجی جان محمد قدسی عہد شاہجہانی کا مشہور شاعر کہتا ہے:۔

زود بہ کردم من بے صبر داغ خویش را ۔۔۔ اول شب می کُشد مفلس چراغ خویش را

یہی خیال میر نے اُردو میں ادا کیا اور زیادہ حُسن کے ساتھ

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے ۔۔۔ دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

ہاں تو میں نسبتی اور میر کے اشعار کا تقابل دکھا رہا تھا۔ شیخ غلام ہمدانی مصحفی کا ایک شعر ہے جس کا اس مضمون سے تو کوئی تعلق نہیں مگر اس کے خیال کی بنیاد یہی نسبتی کا "مکتوب برزمیں اُفتادہ"، معلوم ہوتی۔ اس لئے وہ بھی سُن لیجئے:۔

مرے سینہ میں دل بے تابیوں سے ۔۔۔ پھڑکتا ہے مثالِ مرغِ پربند

عاشق مے کشی میں مصروف ہے، لیکن چونکہ معشوق شریک نہیں۔ اس لئے وہ مصروفِ نالہ بھی ہے۔ معشوق کی ستم ظرفی دیکھئے کہ وہ نالۂ عاشق کو پیالہ کی "کھنک"، کہتا ہے۔ وجہ شبہ وہی آواز ہے سے

پیالہ می خورم و دل بنالہ می آید ۔۔۔ ترا گماں کہ صدا از پیالہ می آید

معاملہ بندی عشق و ہوسناکی کے واقعات اہلِ لکھنؤ کی زبان میں معاملہ بندی کہلاتے ہیں۔ فارسی میں معاملہ بندی کے موجد شیخ سعدی مانے جاتے ہیں۔ امیر خسرو نے اس میں نمایاں اضافہ کیا۔ مرزا اشرف جہاں قزوینی۔ ولی دشت بیاضی۔ وحشی یزدی نے اس کو مستقل فن بنا دیا۔ (شعر العجم) نسبتی نے بھی اس فن میں بساط بھر خوب داد دی سعدی کا مشہور شعر ہے:۔

دوستاں منع کنندم چرا دل بتو دادم ۔۔۔ باید اول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

امیر خسرو نے ایک جدید اسلوب پیدا کرکے یہی مضمون باندھا

جراحتِ جگرِ خستگاں چہ می پرسی ۔۔۔ زغمزہ پرس کہ ایں شوخی از کجا آموخت

نسبتی کے تیور ملاحظہ کیجئے:۔

نسبتی را ملامتے مکنید ۔۔۔ ناصحاں روئے یار را نگزیدہ

رئیس المتغزلین نظیری نیشاپوری نے کہا تھا۔

تا منفعل ز بر بخشش بیجانہ بنیمش ۔۔۔ می آرم اعتراف گناہ نبودہ را

نسبتی یک جرم را صد عذر گفت گرچہ تقصیرے کہ می باید نداشت

محفل جمی ہے، معشوق کی دزدیدہ نظری رقیب پر پڑ رہی ہے۔ دفعتاً عاشق کی نظر بھی معشوق کی طرف اُٹھتی ہے۔ وہ اس حال سے آگاہ ہوکر گھبرا سا جاتا ہے لیکن فوراً سنبھل کر عاشق کو بری نظروں سے دیکھنے لگتا ہے عاشق نادم ہوتا ہے، اور رقیب بھی شرمندہ ہو جاتا ہے۔ اس منظر کی تصویر نسبتی نے جس خوبی سے کھینچی ہے اسکی مثالیں شاعری میں بہت کم ملتی ہیں لکھتے ہیں

سوئے اغیار ہمی دید۔ نہانے دیدم من خجل گشتم و اغیار خجل۔ یار خجل

ناکام عاشق جانتا ہے کہ محبوب کا اس کے یہاں آنا محال ہے، لیکن پھر بھی وہ جھوٹی باتوں سے دل کو تسلی دیتا رہتا ہے، اس کیفیت کو نسبتی یوں بیان کرتے ہیں :۔

دروغے می کنم در کار و می گویم کہ یار آمد نمی دانم کہ تا کے ایں روش دل را بجا دارم

دوسرے مصرعہ سے سوز و گداز کی جو تصویر پیش کی گئی ہے، اس کا جواب نہیں۔ آدمی عالم تنہائی میں محبوب کی غیبت میں سیکڑوں منصوبے باندھتا ہے اور دل ہی دل میں کہتا ہے کہ اب کے ملاقات ہونے پر یہ کہوں گا، یوں کہوں گا، مگر سامنا ہوتے ہی سب کچھ بھول جاتا ہے اور پھر وہ سوچتا ہے کہ یہ کیا بات تھی، مجھ سے کیوں نہ کچھ کہا گیا، رعب حسن تھا۔ سحر کلام تھا۔ کیا تھا۔ نسبتی اس کو یوں ظاہر کرتے ہیں :۔

ہیچ ہتو نمی تواں گفت کہ ایں چہ حکمت است لب بسخن چو واکنی بستہ شود زبان من

اسی رنگ و مضمون کے اشعار چند اور ملاحظہ ہوں :۔

می پرسی و ما دلشدگاں نطق نداریم ایں چیست کہ از کار فتادہ است زبانہا
پُرسید کہ چونی و نگفتم کہ چسانم امروز زباں سخت ز تقریر فتادہ است
می رسی و خشک می گردد زبانِ گفتگو می روی و می ترا دد از لبم گفتارہا

رہگزر کی ملاقات کے بہت سے پہلو ہوا کرتے ہیں، ایک یہ بھی ہے کہ محبوب انجان بن کر عاشق کے قریب سے گزر جاتا ہے اور نگاہ نہیں اُٹھاتا، عاشق سوچتا ہے کہ میں نے کیا جرم کیا جسکی پاداش میں یہ ظلم روا رکھا گیا ہے

نمی دانم چہ دیدہ از منِ بے چارہ آں بدخُو بہ بیند چوں مرا در رہ نماید دیدہ نادیدہ

عاشق شکایتوں سے بھرا بیٹھا ہے، معشوق آنکھوں آنکھوں میں اُس سے پوچھتا ہے کہ کیا حال ہے وہ کیا جواب دے۔ باتیں تو ہزار ہیں، لیکن بیان کیونکر ہوں۔ نسبتی اس کیفیت کو یوں بیان کرتے ہیں :۔

چو زحالِ من بستی ہنگہ سوال کردی ز ہجوم گفتگوہا۔ گلہ پائمال کردی

شیخ سعدی کا ایک شعر ہے :۔

دل و جانم بتو مشغول و نظر در چپ و راست تا ندانند رقیباں کہ تو منظورِ منی

اسی مضمون کو مولانا نسبتی یوں ادا کرتے ہیں :-

نگاہ می کنم و در کساں ہمی بینم　　مباد رازِ من و تو کس از نگہ یابد

حسن و عشق کی دُنیا غیر محدود ہے، اس میں ہزاروں قسم کے واقعات پیش آتے ہیں۔ وصال کی نشاط آفرینیوں اور ہجر کی زہرہ گدازیوں کے دامن میں جس قدر حوادث و واردات پنہاں ہیں، ان کے اظہار کا نام ہی غزل ہے۔ لیکن غزل کا بہترین شعر وہی ہو سکتا ہے جس میں سوز و ساز کے ساتھ زبان کی شیرینی اور بیان کی نقادگی بھی پائی جائے۔ چنانچہ سعدی۔ خسرو۔ حافظ اور نظیری کے قبولِ عام کا سبب یہی ہے۔ اب ہم نسبتی کے رنگ کی مختلف مثالیں پیش کرتے ہیں :-

نسبتی ما را بعالم عالمے دیگر شدہ است　　ہستم اندر عالم و عالم نمی دانم کہ چیست

دُنیا میں ہونا اور پھر دُنیا کو نہ جاننا۔ اور اسی جہاں میں ایک نیا جہاں آباد کرنا محویت کی بہترین صورت ہے۔ مجبوری کی صورتیں ملاحظہ ہوں :-

ہر چند دوختیم دلِ پارہ نسبتی،　　پہلوئے ہر شگاف شگفتے چند ماندہ است

بلبل چہ کند گناہِ او نیست　　آں گلبن سر کشیدہ خوب است

نظر بروئے تو بے اختیار می افتد　　نگاہ از رخِ خوبت نگاہ نتواں داشت

دردِ محبت کی گرانمایگی ملاحظہ ہو :-

ہزار جانِ گرامی فدائے یک دردت　　کہ نیم دردِ تو۔ سرمایۂ دو صد جگر است

معشوق کی طرف سے معمولی سی معمولی تکلیف بھی سیکڑوں راحتوں کی حامل اور ہزاروں لذتوں کا سرمایہ ہوتی ہے۔

آرزوئے دوست کے جانگزا نتائج کی طرف اشارہ کرتے ہیں :-

سخت می ترسم کہ من بسیار می خواہم ترا　　آرزو خوب است اما ایں قدرہا خوب نیست

میر نے اس مضمون کو یوں باندھا ہے :-

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ　　نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

لفظ "سخت" کا استعمال ملاحظہ ہو :-

می کنم سخت یادِ او امروز،　　غالباً یاد کردہ است مرا،

کہتے ہیں کہ اگر کسی کو یاد کیا جائے تو وہ بھی اس کا اثر محسوس کرتا ہے۔ اس مفروضہ کے ماتحت نسبتی کہتے ہیں کہ میری بے قراری کا باعث اس کا یاد کرنا ہے

رشک جوں جوں حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔ عاشق کی پریشانیاں بڑھتی جاتی ہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ حسن کی یہ عالمگیری دُنیا کو اپنا مسحور کرے گی اور یہی اسے گوارا نہیں۔ اس جذبۂ رشک کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں :-

رشکِ من چوں عشقِ من۔ہر روزی گردد فزوں خوب ترمی گردی و من بدگماں ترمی شوم

رشک کے اور بعض اشعار ملاحظہ ہوں :۔

نہ طربہا نہ شادمانیہاست عشق وسواسِ بدگمانیہاست

چہ بری تونام دشمن بہ بہانۂ شکایت گلہ گر مراد داری۔گلہ کن ولے زما کن

من تلخکام گشتم ازیں رشک ومرداں نامِ لبت برند و دہاں پرشکر کنند

ہرکہ سودائے کند اول بہ بیند سود را درزیانِ چند دادم جانِ غم فرسود را

سودا کرنے والے کی نظر پہلے نفع پر پڑتی ہے۔لیکن میری تجارت دیکھئے کہ جان کے عوض چند نقصان خرید لئے لیکن اس زیانکاری کے "سود" کو دیکھئے کتنا بلند ہے۔

قیمت دوستی چہ می پرسی عاشقی صدزیاں ویک سود است

عاشق چاہتا ہے کہ یار کی نظر بار بار اس پر پڑے۔ذرا اس کا حسنِ طلب اور انداز بیان کا فریب ملاحظہ فرمائیے :۔

نگاہے چند باید کرد تا فارغ کند ما را یکے جاں می بردا زما۔یکے دل را۔یکے دیں را

نظیری کا ایک لاجواب شعر ہے ؎

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

بابا فغانی کا ایک مشہور مطلع ہے ؎

خوبی ہمیں کرشمۂ و ناز و خرام نیست بسیار شیوہ ہاست بتاں راکہ نام نیست

نظیری اور فغانی کے اشعار میں جو فرق ہے۔اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔نظیری فرماتے ہیں :۔"سر سے پاؤں تک جہاں کہیں نظر جا پڑتی ہے کرشمہ، دامنِ دل تھام لیتا ہے کہ دیکھنے کے قابل جگہ اگر ہے تو یہی" گویا نظیری کے نزدیک قامتِ یار کی "ادائیں اور کرشمے" اصل حسن ہیں۔مگر فغانی فرماتے ہیں۔کرشمہ و ناز و خرام ہی کا نام حسن نہیں۔اور بھی بیسیوں جانستاں ادائیں ہیں جن کا کوئی نام نہیں

ورائے عشوہ و ناز و خرام و رعنائی دگر ہزار بلا ہمرہ است بالا را

عام خیال ہے کہ وصل سے دل کا اضطراب ختم ہو جاتا ہے۔مگر اہلِ بصیرت جانتے ہیں۔کہ وصل میں شوق کی آگ اور بلند ہوتی ہے اس رمز کو نسبتی یوں ظاہر کرتے ہیں :۔

دل بدر دآمد مرا در بزمِ وصلش نسبتی در بہاراں تازہ می گردد جنوں دیوانہ را

حافظ نے بھی یہ نکتہ سمجھایا ہے لیکن دو شعروں میں ؎

بلبلے برگِ گل خوش رنگ در منقار داشت و ندراں برگ و نوا خوش نالہائے زار داشت

گفتمش در عین وصل این نالہ و فریاد چیست گفت مارا جلوۂ معشوق در این کار داشت

مرزا غالب فرماتے ہیں ؎

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق نوحۂ غم ہی سہی۔ نغمۂ شادی نہ سہی

نسبتی اس سے پہلے یوں کہہ گئے تھے ؎

عیش گر نیست "کارِ دیگر" است نیست بے کار کارخانۂ ما،

اگرچہ مرزا کا شعر زیادہ چست ہے، لیکن نسبتی نے "کارِ دیگر" کے ابہام سے ایک خاص لطف پیدا کر دیا۔

دعا و دشنام کے پامال مضمون کو نسبتی نے یوں لکھا ہے :-

گفتیم دعا و داد دشنام یعنی کہ شنیدہ ام دعا را

باز آکہ باز رنگ بکار آورد کسے آب رفتہ باز بیاید بجوئے ما

کہنے کو تو عاشق کہتا ہے کہ تو لوٹ آئے گا تو ہم پھر زندہ ہو جائیں گے مگر اس واپسی کو "آب رفتہ بجوئے باز آمدن" سے تعبیر کر کے دلی خدشات و نا امیدی کا اظہار بھی کر رہا ہے۔ یعنی اس دعا کی حیثیت طفل تسلی سے زیادہ نہیں۔ دو محاوروں کو کس خوبی اور حسن کے ساتھ نظم کیا ہے

بعض اوقات انسان کا دل نامعلوم طور پر اندر ہی اندر بیٹھنے لگتا ہے۔ لیکن انسان اس اذیت کے باوجود چپ رہتا ہے

گشتہ ام آزردہ دل۔ اما نمی دانم۔ چرا شکوہ ات کردن نیارم باہمہ آزارہا۔

رندی و سرمستی کے خیالات۔ دنیا کی بے ثباتی اور صلائے عشرت و نشاط کے مضامین خیام اور حافظ نے جس جوش و خروش کے ساتھ ادا کئے ہیں فارسی شاعری میں کسی نے کم ادا کئے ہوں گے۔ نسبتی نے اس موضوع پر نسبتاً کم خامہ فرسائی کی ہے۔ مگر جو کچھ لکھا ہے خوب لکھا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

نیست دوراں را بقائے دور دور ساغر است غم مخور از دورِ گردوں۔ خوش بگیر داں جام را

نسبتی مے خوردہ۔ اسبابِ قیل و قال چیست اینک اینک آتش است و اینک اینک فرصت است

نسبتی بادہ بریاد لب او نیز دہیم فصلِ گل بر من و تو خندہ زناں می گزرد

بے وجد مرو کہ راہِ عشق است مستانہ بزن دو گام و می رقص،

تا کے غم صبح و شام خوردن مے می خور و صبح و شام می رقص

از پا منشیں بپائے خم ہم در دست بگیر جام و می رقص

شراب خوردم و افروختم ستارۂ خویش، ز ذرہ اختر و از اختر آفتاب شدم

مے باقی و ماہتاب باقی ست ما را بتو صد حساب باقی ست

رودے و سرودے و شرابے و کبابے ——— از عمر بگیرید حریفانہ حسابے

خرقہ بر دوش، صراحی بہ بغل، جام بکف ——— می خورم بادہ ببازار بہ بانگِ نے و دف

کوئے یار میں پہونچ کر عاشق کے قدم رُکنے لگتے ہیں۔ گویا کسی نے پاؤں سے طاقتِ رفتار سلب کر لی۔ یہ مضمون بہت ہی عام ہے۔ تقریباً تمام شعرا نے اس پر خامہ فرسائی کی۔ لیکن نسبتی نے جس انداز سے اس کو پیش کیا ہے وہ بھی دیکھئے :-

یارب! سرِ کوچہ کہ باشد؟ ——— ایں راہ کہ دیر می شود طے

از سرِ کوئے تو ہر گہ روئے در رہ می کنم ——— راہ کم کم می سپارم۔ گام کوتہ می کنم

ایں سرِ کو، راست بگو، جائے کیست؟ ——— بے سببے، پائے ز جا می رود

کہنا تو یہ ہے کہ معشوق بے وفا ہوتے ہیں اور ان کے وعدوں کا کوئی اعتبار نہیں، لیکن طرزِ ادا کی بلاغت دیکھئے

نمود وعدۂ قتلم دو چشمِ او، لیکن ——— چہ اعتماد تواں کرد قولِ مستاں را

جب عشق مکمل ہو جاتا ہے، تو پھر ہجر و وصال کی تمیز اُٹھ جاتی ہے

تفرقۂ ہجر و وصل لازمۂ عاقلی است ——— ہست یکے روز و شب عاشقِ دیوانہ را

تکالیف سہتے سہتے آدمی ان تکالیف کو بھی لذت محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس خیال کو محتشم کاشی نے یوں ادا کیا ہے

ایں جورِ دیگر است کہ آزارِ عاشقاں ——— چنداں نمی کنی کہ بہ بیداد خو کنند

نسبتی کہتے ہیں :-

جورِ تو التفاتِ دگر بود بر دلم ——— کم کردۂ برائے چہ ایں التفات را

لباسِ عربدہ بر قدِ غمزہ ات تنگ است ——— چہ دشمنی تو کہ جنگِ تو آشتی رنگ است

عشاق کے دل چھیننے والی چیز "غمزہ و ادا" ہوتی ہے، اس لحاظ سے "غمزہ" جنگ ہوا لیکن وہی چیز جس کا نام غمزہ ہے عاشق کو سب سے زیادہ محبوب ہے اس لئے اسے آشتی سے تعبیر کیا

در وصل عیش سے کشد و در فراق غم ——— مانندِ شعلہ حسنِ ترا پشت و رو یکے است

شعلہ کا کام جلانا ہے۔ سیدھے۔ اُلٹے جس رُخ اس کے سامنے جائیں گے۔ وہ جلائے گا۔ یہی مثال ترے حسن کی ہے وصل و فراق دونوں حالتوں میں تباہ کن ہے

زندگی شدائد و نوائب کے مجموعہ کا نام ہے۔ اگر ایک مشکل حل ہو جائے تو اس کا مطلب یہ نہیں۔ کہ اب جادۂ حیات کی ساری ہی اُلجھنیں اور تمام پیچیدگیاں دور ہو گئیں۔ اس کو نسبتی یوں ظاہر کرتے ہیں :-

یک گرہ گر وا شد از کاکل، چہ سود، ——— شانہ را صد کار با ہر موئے اوست

دنیا دل لگانے کے قابل نہیں۔ اوروں نے کیا نفع پایا۔ جو تمھیں کسی فایدہ کی امید ہو۔ یہ مضمون ہزاروں طرح بندھ چکا ہے۔ شیخ سعدی نے یوں فرمایا ہے :-

دل دریں پیرزنِ عشوہ گر دہر مبند کیں عروسے است کہ در بند بسے داماد است

خواجہ حافظ یوں نصیحت کرتے ہیں :-

مجو درستیٔ عہد از جہانِ بے بنیاد کہ ایں عجوزہ عروسِ ہزار داماد است

لیکن نسبتی نے ایک نیا اسلوبِ بیان اختیار کیا ہے ؎

یکے ز باغِ ہوس "نوبر مراد" نخورد ہزار مرغ بریں کہنہ شاخسار نشست

مضمون آفرینی اور جدت بیان کی مثال ملاحظہ ہو :-

فہمید زبانِ آں دو ابرو گویا کہ دو چشم من دو گوش است

خندہ خندہ ہیچ گہ حالم نپرسیدی بناز گریہ گریہ آبروئے دیدۂ خونبار رفت

خندہ خندہ اور گریہ گریہ کی تکرار و تقابل نے شعر میں جان ڈال دی ہے

ہزار دے بگزشت و ہزار فصل بہار ولیک از دلِ پرخونِ لالہ داغ نرفت

اس مضمون کا مشہور شعر ہے :-

تہی دستانِ قسمت را چہ سود از رہبر کامل کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ می آرد سکندر را

لیکن نسبتی کا اندازِ بیان بہت شاعرانہ ہے، شاعر بھی انھیں چیزوں کو دیکھتا ہے جنھیں عام لوگ دیکھتے ہیں۔ لیکن شاعر کا نقطۂ نظر بدلا ہوا ہوتا ہے۔ فرہاد و شیریں کے معاملہ کو نسبتی جس نگاہ سے دیکھتے ہیں وہ یہ ہے :-

لالہ است از قتلگاہِ کوہکن در بیستوں خونِ ناحق رفتہ رفتہ دامنِ صحرا گرفت

مرزا غالب نے جب لالہ و گل کو دیکھا تھا تو ان کے دل نے یہ صدا دی تھی :-

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں خاک میں کیا صورتیں ہونگی جو پنہاں ہو گئیں

مصیبت اور تکلیف عشق کی پہلی منزل ہے، بہت پامال مضمون ہو مگر نسبتی نے اس انداز سے تازگی پیدا کی ہے :-

ہر کس کہ براہِ تو بیفتاد در افتاد پیچیدنِ پا - قاعدۂ اولِ گام است

انسان اپنی غلطیاں دوسری کے سر تھوپنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اس بات پر کبھی راضی نہیں ہوتے کہ اپنی خطا کا اعتراف کرلیں۔ اگر کوئی ایسا موقع پیش آئے کہ ماننے کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہ رہے۔ تو پھر یہ کہ کر کہ میرا قصور تو نہ تھا فلاں نے مجھے اس غلط راستہ پر لگا دیا،" الزام سے اپنی بریت ثابت کی جاتی ہے۔ ذیل کے شعر میں انسانی فطرت کے اسی پہلو کو تمثیل کے پیرایہ میں بے نقاب کرنے کی کوشش کی گئی ہے ؎

نسبتی دل از مزاج خولیشتن افتادہ است بے دماغیہائے خود را خردہ بر مینا گرفت

کسی دلیل کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ لفظ آخر ہے اور اس کو رد نہیں کیا جا سکتا، مسکت سے مسکت دلائل ٹوٹ سکتی ہیں۔ اور رد کردی جاتی ہیں۔ فلاسفہ کو جو لوگ گمراہ کہتے ہیں۔ ان کے پاس یہی بڑی دلیل ہے ؎

اے نسبتی تو چند بری نام چون و چند چندیں ہزار وسوسہ۔ در ہنبد چون تست

عارفِ روم نے اسی مسئلہ کو ان دو اشعار میں سمجھایا تھا

پائے استدلالیاں چوبیں بود پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود
گر باستدلال کار دیں بُدے فخر رازی راز دار دیں بُدے

لیکن نسبتی نے ایک شعر میں ادا کر دیا اور زیادہ پُر لطف انداز سے۔

بلند بالا ہونا حُسن سمجھا جاتا ہے۔ لیکن نسبتی فرماتے ہیں، نہیں وہ چیز جس کا نام حُسن ہے کچھ اور ہے ؎

قامتش سخت دلکش افتادہ است ورنہ قدِ بلند، بسیار ست

نسبتی لفظ سخت کا استعمال اکثر کرتے ہیں اور نہایت خوبی کے ساتھ

نظیری نے بھی اسی مضمون کا ایک شعر کہا ہے:۔

حسن تو زیور تو لیس است ایں قدر چرا بر گوش و سینہ زحمتِ زیور نہادۂ،

جب تک امتحان۔ آزمایش اور مقابلہ نہ ہو، کھرے کھوٹے کی تمیز نہیں ہو سکتی۔ نسبتی کا شاعرانہ انداز بیان ملاحظہ ہو:۔

شمع روشن کن کہ تا روشن شود احوالہا در تہ بال و پر پروانہ چندیں دفتر است
خاموش گشتہ تو وے گفتگو بجاست چندیں حدیث بالب خاموش رفتہ است

یعنی تری خاموشی لاکھ زبانوں کی ایک زبان ہے۔ اس لئے اگر تو خاموش ہو گیا تو کیا ہوا۔ ہنگامۂ گفتگو اسی طرح گرم ہے

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہمارے حافظہ میں کوئی چیز چٹکیاں لیتی ہے۔ لیکن یاد نہیں آتی، نسبتی اس خیال کو یوں ظاہر کرتے ہیں:۔

چہ حکمت است ندانم کہ نام من او را بدل ہمی رسد و ہمچناں فراموش است

اسی مضمون کو دوسرے زاویۂ نگاہ سے اس طرح ادا کیا ہے:۔

نسبتی ہر چہ در دل است از تو بر زباں آید و ادا نشود

دیر و حرم کے جھگڑے اور یہ ظاہر پرستیاں اسی وقت تک ہیں۔ جب تک انسان خدا شناس نہیں ہوتا، عرفان حاصل ہونے کے بعد مسجد و مندر کے جھگڑے ختم ہوتے ہیں، نسبتی اس خیال کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں:۔

مرا از دیر پیدا گشت آں گم گشتۂ مسجد مگر پس کوچۂ از کعبہ در بتخانہ مے آید

عرفی نے اسی مسئلہ کو یوں سلجھایا ہے :۔

عاشق ہم از اسلام خرابست وہم از کفر پروانہ چراغ حرم و دیر نداند

کسی دوسرے عارف نے اسی باب میں یوں اظہار خیال کیا ہے :۔

ہر جا کنیم سجدہ بداں آستاں رسد مقصود ما ز دیر و حرم جز حبیب نیست

نسبتی کے کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں زندگی ہے۔ اس کا ہر شعر زندگی کے متفاول رُخ سے بحث کرتا ہے اور تشائم پہلو کو بہت کم سامنے رکھتا ہے، ملاحظہ ہو :۔

تا ہست دست و بازو، در کار دار دستے انداز دست، شاید یکرہ بدامن افتد

یعنی بڑے بڑے تارک الدنیا جب دنیا کی دلفریبیوں کو دیکھتے ہیں تو حسرت بھری نظریں اس پر ڈالتے ہیں۔ نسبتی نے اس خیال کو کیسے اچھوتے انداز سے ظاہر کیا ہے، فرماتے ہیں :۔

نگاہ از پس سر می کند بصد حسرت ہر آں شکار کہ از پیش دام می گزرد

عرفی نے کہا تھا :۔

عرفی از صید گہ اہل نظر دور مرو کہ گہے گوشۂ چشمے بشکارے دارند

عرفی کو یقین ہے کہ کسی کا التفات ضرور کسی وقت شکار کی طرف پھر مائل ہوگا۔ اس لئے وہ دور جانا نہیں چاہتا۔ لیکن نسبتی کہتے ہیں :۔

بر امیدے زندہ می باشم دریں نخچیر گاہ یار، می گویند، گاہے قصد لاغر می کند

" می گویند" کہہ کر شک کا اظہار کرتا ہے۔ یعنی معلوم تو ہے۔ کہ لاغر کو کوئی شکار نہیں کرتا۔ لیکن محض دل خوش رکھنے کے لئے ہم نے اس ناقابل یقین بات پر امید کی عمارت کھڑی کر رکھی ہے۔ اور اس نخچیر گاہ میں جی رہے ہیں۔ صحیح رنگ تغزل ملاحظہ ہو

بودیم ز خود بے خبر افتادہ ؛ لیکن در سینہ خلیدی و بیک بار خبر شد

ہم اپنے آپ سے بھی بے خبر پڑے تھے کہ اچانک تو نے دل میں چٹکی لی، اور ہم خبردار ہو گئے

ایک اور شعر :۔

ملامتہائے پے در پے ندامتہائے گوناگوں کسے داند کہ او چوں من بہر افسانہ می سوزد

وہی شخص پے بہ پے ملامتوں اور گوناگوں ندامتوں سے واقف ہو سکتا ہے جو میری طرح ہر افسانہ پر تڑپ اُٹھے ۔

فضل حسین تبسم

(باقی)

سیاسیات یوروپ

(۷)

جمہوریت فرانس کا نقطۂ نظر

یوروپ میں فرانس ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں زراعت و حرفت دونوں کا وزن برابر پایا جاتا ہے اور اس لئے وہ بہ نسبت جرمنی اور برطانیہ کے بیرونی بازاروں سے زیادہ بے نیاز ہے اور اسے غیر ممالک سے بہت کم سامانِ غذا منگانا پڑتا ہے

فرانس کی ریڑھ کی ہڈی وہاں کا متوسط طبقہ ہے جس میں چھوٹے چھوٹے زمیندار و کاشتکار شامل ہیں اور ان کی مالی حالت ایسی ہے کہ حکومت مفلس ہو جائے تو ہو جائے لیکن ملک نادار نہیں ہو سکتا۔ لورین کے آہنی معدنیات فرانس کی صنعت و حرفت کو اتنا اُبھارے ہوئے ہیں کہ اسے مزید کسی چیز کی ضرورت نہیں

یہ ہے فرانس کی اقتصادی حالت جس سے وہ بہر حال مطمئن ہے، لیکن اسی کے ساتھ ایک تلخ حقیقت بھی سن لیجئے جس کا دور کرنا نہ جمہوری حکومت کے بس کی بات ہے نہ کسی سرمایہ دار کی اس کا تعلق نہ اندرونی اقتصادیات سے ہے نہ سرحد رہائن سے اور نہ قدیم دشمن جرمنی سے بلکہ اس کا تعلق صرف سماج سے ہے اور وہ یہ کہ وہاں کی پیدائش کا اوسط بہت کم ہوتا جارہا ہے

سنہ ۳۴ء میں وہاں کی پیدائش ۶۷۷۳۶۵ تھی اور اموات ۶۳۸۵۲۵، یعنی صرف ۴۰ ہزار زیادہ سنہ ۳۵ء کے ابتدائی تین ماہ میں پیدائش کا اوسط بہ نسبت سنہ ۳۴ء کے ۱۰ ہزار اور کم رہا۔ سنہ ۳۴ء میں پیدائش کا اوسط ۱۶ فی ہزار تھا اور اموات کا ۱۵ فی ہزار۔ لیکن اب یہ اوسط بھی برابر گھٹتا جارہا ہے۔ اس کے مقابلہ میں جرمنی کو دیکھئے وہاں پیدائش کا اوسط ۱۸ فی ہزار ہے اور اموات کا ۱۰ فی ہزار۔ اٹلی میں ۲۳ اور ۱۳ کی نسبت ہے اور روس میں ۴۴ اور ۲۶ کی

ہر چند جرمنی میں بھی یہ اوسط قابل رشک نہیں ہے پھر بھی فرانس سے زیادہ ہے، کیونکہ جرمنی آبادی میں سالانہ گیارہ لاکھ کا اضافہ ہوتا ہے اور فرانس کی آبادی میں صرف سات لاکھ کا اس لئے اگر فرانس کی ۴ کروڑ ۲۰ لاکھ کی آبادی ماورار رہائن کی جرمن آبادی کو جو ۶ کروڑ ۵۰ لاکھ ہے، بیم و ہراس کی نگاہوں سے دیکھ رہی ہے تو تعجب کی بات نہیں، چنانچہ یہی وہ اندیشہ تھا جس کی بنا پر مارشل فوش نے ایکبار مزاحیہ انداز میں کہا تھا کہ فرانس اور جرمن کے مسئلہ کا حل یہی ہے کہ دو کروڑ جرمن مردوں کو آختہ کر دیا جائے

ہر چند فرانس میں اسلحہ کی تجارت بہت وسیع ہے، لیکن عام طور پر وہاں کے لوگ بہت صلح پسند ہیں اور تاجروں زمینداروں اور کاشتکاروں میں کوئی ایسا نہیں جو جنگ کو پسند کرتا ہو۔ جو مختلف حکومتوں نے اپنا نصب العین ظاہر کرنے کے لئے مختلف جملے وضع کئے ہیں۔ مثلاً جرمنی کا مقولہ یہ ہے کہ "جرمنی ہر چیز سے بلند ہے"[۲] برطانیہ کا مقولہ ہے کہ "حکومت تو برطانیہ کی ہے"[۱] لیکن فرانس کا کہنا صرف یہ ہے کہ "فرانس کو زندہ رہنے دو"[۳]

الغرض فرانس صرف یہ چاہتا ہے کہ وہ مرے نہیں زندہ رہے، اپنی زمینوں کی کاشت کرتا رہے اور اپنی چھوٹی چھوٹی دوکانوں کو قایم رکھے۔ فرانس کے انسان کی تین خصوصیات بہت عجیب ہیں:۔ صحت فکر، توازن اور صداقت۔ وہ مبالغہ، شیخی اور بڑھ چڑھ کے باتیں بنانا پسند نہیں کرتا، اور امن و سکون چاہتا ہے سیاسی حیثیت سے وہ محض اپنی حفاظت چاہتا ہے اور اقتصادی حیثیت سے روپیہ بچانا پسند کرتا ہے۔ وہ ترقی چاہتا ہے لیکن اپنے اجتماعی حرکت و عمل سے، اپنی محنت و ذہانت سے، دوسروں کا حق غصب کرکے نہیں

فرانس کو گزشتہ جنگ عظیم میں بظاہر جو کچھ ملا ہے کم نہیں ہے اور وہ صرف یہی چاہتا ہے کہ وہ اس کے پاس باقی رہے۔ درانحالیکہ انصاف سے دیکھئے تو اُن قربانیوں کے لحاظ سے جو اس نے کی ہیں، اس کو بہت کم فایدہ رہا۔ اس کو گزشتہ جنگ کے اختتام پر کیا ملا؟ ۔ السیک لورین۔ پندرہ سال کے لئے حصۂ سار، جزائر کامرون، شام کا حق وکالت (Mandata) اور تاوان۔ سو السیک لورین فرانسیسی علاقہ تھا ہی جو جرمنی نے چھین لیا تھا، سار جرمنی کو واپس مل گیا، شام کی وکالت میں جتنا صرف ہوجاتا ہے اتنا ملتا نہیں، رہگیا تاوانِ جنگ، سو جرمنی نے وہ بھی ادا نہیں کیا

سچ پوچھئے تو ۱۹ء کی صلح فرانس کو بھلی نہیں اور اب پندرہ سال بعد وہ جرمن عسکریت کا دباؤ اپنی مغربی سرحد پر دیکھ رہا ہے۔ گزشتہ ایک صدی میں جرمن، فرانس پر تین بار حملہ کر چکا ہے اور اب فرانس کسی طرح نہیں چاہتا کہ پھر اس پر حملہ کیا جائے

---

[۱] Rule Britinia. [۲] Germany on top of everything [۳] Let France live.

گزشتہ جنگ عظیم کے متعلق یہ کہنا کہ اس میں غلطی جرمنی ہی کی تھی درست نہیں، یقیناً فرانس بھی اس غلطی میں شریک تھا، لیکن اس میں شک نہیں کہ جرمن افواج نے زیادتیاں بہت کیں۔ فرانس کو اس جنگ میں جو نقصان پہونچا وہ فرانسیسی قوم کی کفایت شعار اور امن پسند ذہنیت کے لئے یقیناً ناقابل برداشت تھا۔ دو کروڑ انسانوں کا اتلاف اور ناقابل اندازہ مالی نقصان ایسی بات نہ تھی کہ فرانس اسے اتفاق کہکر خاموش ہو جاتا۔ اس نے سوچا کہ آیندہ اس امکان کا سدباب کرنا چاہئے اور اس نے اپنے مستقبل کا تعمیری پروگرام یہ قرار دیا:۔

(۱) مغربی یورپ میں قوی ترین بری و ہوائی قوت۔ (۲) توپخانہ اور آہن پوش موٹروں کی بڑی تعداد۔ (۳) مشرقی سرحد کی قلعہ بندیاں (۴) اسلحہ و سامان حرب کی صنعت کا فروغ (۵) دنیا میں سب سے زیادہ سونے کی مقدار (۶) جرمنی کی عسکری قوت کو کم کرنا (۷) بین الاقوامی انجمن (۸) معاہدۂ لوکارنو (۹) وسطی یورپ کی چھوٹی چھوٹی سلطنتوں (رومانیا، زیکوسلاویکیا، جگوسلیویا) اور پولینڈ سے عسکری و سیاسی اتحاد (۱۰) محاذ اسٹریلیا کے متعلق برطانیہ و اٹلی سے مفاہمت۔

لیکن باوجود اس پروگرام کی تکمیل کے بھی فرانس مطمئن نہیں ہے اور اس کا عدم اطمینان بالکل بجا ہے۔ فرانسیسی فوج اسوقت یورپ کی قوی ترین فوج نہیں ہے، روسی فوج تعداد میں اور جرمن فوج قوت میں اس سے زیادہ ہے۔ فرانس اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کی لازمی فوجی خدمت کرنے والی سپاہ جرمن توپخانوں کے سامنے ایک دن نہیں ٹھہر سکتی اور ہوائی طاقت میں بھی جرمنی بالکل فرانس کے برابر ہے۔ رہیں مشرقی سرحد کی قلعہ بندیاں سو وہ زمیں دوز ہیں اور جرمن طیارے ان پر آسانی سے گزر سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۹۱۴ء میں فرانس کی جنگی طیاریاں ۱۸۷۱ء کی جنگ کیلئے موزوں نہیں اور ۱۹۳۷ء کی طیاریاں ۱۹۱۴ء کی جنگ کے لئے

لیگ اقوام کو جو ضرب کاری جاپان نے منچوریا میں اور اٹلی نے حبشہ میں پہونچائی ہے اس نے لیگ کا اقتدار بالکل ختم کردیا اور اب اس کے اعتماد پر فرانس یا کوئی اور سلطنت اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھ سکتی۔ وسطِ یوروپ کی چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کے ساتھ فرانس کا اتحاد بیشک مستحکم ہے، لیکن پولینڈ پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ رہا جرمنی کے غیر مسلح کرنے کا مسئلہ سو وہ اس طرح ختم ہو گیا کہ جرمن نے لیگ سے علحدگی اختیار کرلی اور اب اس پر کوئی دباؤ باقی نہیں رہا۔ روس کے ساتھ فرانس کی صلح بیشک کار آمد چیز ہے، لیکن وہ اتنی دور واقع ہوا ہے کہ کوئی فوری مدد فرانس کو اس سے نہیں مل سکتی۔ رہا محاذ اسٹریلیا کا معاملہ سو اسے انگلستان و جرمنی کے بحری معاہدہ اور اٹلی کی جنگ حبشہ نے ختم کردیا۔ الغرض یہ ہیں مشکلات فرانس کے جنھوں نے اس کو پریشان کر رکھا ہے

بریانڈ کی صدارت کے زمانہ میں فرانس کا طرزِ عمل جرمن کے ساتھ مصالحانہ رہا، کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ جرمنی کی ۶ کرور ۵۰ لاکھ کی آبادی عرصہ تک دبی حالت میں نہیں رہ سکتی، علاوہ اس کے وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جرمن کی جائے وقوع وسطِ یورپ میں ایسی ہے کہ اگر یہ کمزور ہو گیا تو پھر دول یوروپ کا توازن بھی باقی نہ رہے گا۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی بے لگام ہو کر

اور منھ زور ہوگیا۔ فرانسیسیوں نے رہائن خالی کیا اور اس کا جواب یہ ملا کہ تاوان جنگ بھی ختم ہوگیا۔ جرمنی کو برابر کا عسکری اقتدار دیا گیا اور اس کے جواب میں کیا ملا؟ ۔ ہٹلر ۔ جرمنی کو انھوں نے سار واپس دیا اور اس کے بدلے انھیں کیا ملا؟ جرمنی میں لازمی فوجی خدمت اور ایک زبردست ہوائی بیڑا

اب اسی کے ساتھ اور اُلجھنوں کو دیکھئے۔ فرانس نے اسلحہ بندی کے معاملہ میں امریکہ اور انگلستان کے مقابلہ میں اپنی نسبت ۵، ۷، ۱ منظور کرلی ہے۔ اس لئے کیوں نہ جرمنی اپنے لئے بھی اسی نسبت کا مطالبہ کرے، اسی کے ساتھ فرانس یہ بھی دیکھ رہا ہے کہ معاہدۂ ورسیلز بیکار ہوکر رہگیا ہے اور جرمنی کے مطالبہ کرنے پر اس کے کھوئے ہوئے علاقہ کا واپس مل جانا بالکل قرین قیاس ہے۔ پھر جب حالات یہ ہیں تو فرانس کیا ہر وہ ملک جو جنگ عظیم میں کامیاب رہا تھا، بجز اس کے اور کسی نتیجہ پر نہیں پہونچ سکتا کہ لڑائی میں نقصان فی الحقیقت انھیں کو پہونچا جنھوں نے فتح حاصل کی تھی

فرانس کی ڈپلومیسی یہ ہے کہ جن ممالک سے اس کا اتحاد ہے وہ لیگ اقوام میں شامل ہوکر باہمدگر متحد رہیں۔ پھر اب دیکھئے کہ فرانس کا اتحاد کن ممالک سے ہے۔ انھیں سے جن کو جنگ میں کچھ نہ کچھ مل رہا تھا یعنی بلجیم، زیکوسلاوکیا، اور یوگوسلیویا روس کو بھی بوجہ اتحاد فرانس اسی میں شامل کرلیجئے۔ اب ان کے مقابلہ میں ان ممالک کو لیجئے جنھیں جنگ سے کچھ فایدہ نہ ہوا یعنی جرمنی، اٹلی، آسٹریا، ہنگری اور بلغاریہ۔ یہی وہ دو گروپ جن کے درمیان اختلاف قایم ہے اور فاتح گروپ آیندہ تحفظ کے لئے جتنی تدبیریں کرتا جاتا ہے دوسرا گروپ اتنا ہی زیادہ معیار تحفظ کو سخت کرتا جارہا ہے

اب فرانس کی اور تدابیر کو ملاحظہ کیجئے:۔

(۱) وہ مغربی حصۂ یوروپ کے ممالک کے درمیان ایک معاہدہ ہوائی طاقت کے متعلق چاہتا تھا تاکہ اس طرح انگلستان اور اٹلی کے ساتھ اس کے تعلقات زیادہ مضبوط ہوجائیں لیکن اسی کے ساتھ ضرورت اس کی بھی تھی کہ مشرقی حصۂ یوروپ سے بھی اس کے تحفظ کا اطمینان ہوجائے، لیکن جرمنی نے اس کو گوارا نہیں کیا اور اس لئے فرانس کی یہ تدبیر خاک میں مل گئی

(۲) وہ ایک معاہدہ ایسا چاہتا تھا کہ فرانس اور اٹلی ملکر اس کے ذمہ دار ہوجائیں کہ وسط یوروپ کے ممالک کی جو سرحدیں اسوقت قائم ہیں وہ بدستور قایم رہیں گی، لیکن ہٹلر نے اسے بھی کامیاب نہیں ہونے دیا اور اب کہ اسکا قبضہ آسٹریا پر بھی ہوگیا ہے، اس کا امکان ہی باقی نہیں رہا

(۳) اسی طرح کا ایک معاہدہ وہ اور بھی چاہتا ہے جس سے پولینڈ، روس اور جرمن کی سرحدیں محفوظ ہوجائیں۔ روس تو اس پر راضی ہے لیکن پولینڈ اور جرمنی طیار نہیں۔

فرانس کے اس تمام داؤ پیچ میں قابل اعتماد بات صرف وہ معاہدہ ہے جو ۱۹۳۵ء میں روس کے ساتھ ہوا ہے اس کی رو سے ایک ملک دوسرے کی مدد کرنے پر مجبور ہے۔ زیکوسلاوکیا نے بھی روس اور فرانس کے ساتھ ایسا ہی

معاہدہ کرلیا ہے۔ لیکن جرمنی بھی، جو روس و فرانس کے اس اتحاد کو کبھی اچھی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا تھا، خاموش نہیں رہا اور اس نے ایک طرف جاپان سے اتحاد کرلیا اور دوسری طرف روم برلن محور (Rome Berlin Axis) قایم کرکے فرانس کے اطینان کو خاک میں ملادیا

الغرض جس طرح ۱۹۱۴ء میں یورپ کے دو ٹکڑے تھے اسی طرح اب بھی ہیں اور فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے تفریق ملوکیت و جمہوریت کی تھی اور اب فاسزم و اشتراکیت کی ہے

غیر فرانسیسی لوگ فرانس کے سمجھنے میں اکثر غلطی کرتے ہیں اور اس کا بڑا سبب وہاں کے صحافت کی اخلاقی پستی ہے۔ اسوقت پیرس سے ۱۰۲ روزنامے نکل رہے ہیں لیکن ایک دو کو چھوڑ کر سب غدار و ملت فروش ہیں جسوقت جاپان منچوریا میں جنگ کر رہا تھا تو فرانس کا پریس جاپان کی طرفداری میں تھا کیونکہ جاپان ان کی مدد کر رہا تھا۔ اسی طرح ۱۹۳۵ء میں اٹلی نے ۶ کرور ۵۰ لاکھ فرانک، یہاں کے پریس کو دیکر جو چاہا لکھوایا۔ لیکن اگر اس بدنما داغ کو ہم علحدہ کردیں تو اس میں شک نہیں کہ فرانس ہر لحاظ سے عجیب ملک ہے۔ وہاں کی زبان، وہاں کا لٹریچر، اور وہاں کی تہذیب پر سارے یوروپ کو رشک ہے۔ لیکن جنگ کے بعد سے فرانس سمجھنے لگا ہے کہ دنیا میں محض تہذیب و شایستگی سے کام نہیں چلتا بلکہ یہاں بدتمیزی و درندگی بھی کبھی کبھی درکار ہوتی ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ "خوبی" اس میں کیونکر پیدا ہو۔

مغرب کی سیاسیات کا مطالعہ کرنے والے کے لئے یہ بڑی اُلجھن کی بات ہے کہ وہ کس ملک کو واقعی صلح پسند قرار دے اور کس کو سبب جنگ، کیونکہ ہر وہ ملک جو اپنے آپ کو امن و سکون کا حامی سمجھتا ہے وہی فی الحقیقت جنگ کا باعث ہے

یہ حقیقت مخفی نہیں کہ موجودہ سیاسیات یوروپ کی پیچیدگی کا ایک بڑا سبب تجارتی مقابلہ (Competition) بھی ہے اور جس وقت ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس سلسلہ میں ایک بڑی تجارت اسلحہ و سامانِ حرب کی بھی ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ ایک طرف امن و صلح کی خواہش کا اظہار بھی کیا جاتا ہے اور دوسری طرف اسی چیز کی تجارت بھی کی جاتی ہے جو یکسر امن شکن ہے

جنگ میں سامان حرب کتنا صرف ہوتا ہے اور اس کی کتنی بڑی تجارت یوروپ میں ہوتی ہے، اس کا صحیح اندازہ شاید آپ کو نہ ہو

یوں تو ایک گولی جس سے ایک انسان ہلاک کیا جاتا ہے اس کی لاگت صرف ایک آنہ اور قیمت تین آنے ہوتی ہے لیکن اگر ایک گھنٹے میں دس لاکھ گولیاں چلائی جائیں (جو معمولی بات ہے) تو ان کی قیمت چھ ہزار پونڈ ہو جاتی ہے۔ ایک رائفل کی قیمت صرف پانچ پونڈ ہوتی ہے لیکن جب آپ دس لاکھ آدمیوں کی فوج کو اس سے آراستہ کریں گے تو پچاس لاکھ پونڈ صرف رائفل پر خرچ ہو جائیں گے۔ ایک مشین گن کی قیمت ۱۲۸ پونڈ ہوتی ہے، لیکن یہ دیکھئے کہ

فرانس کو اپنی ۴۰ ہزار مشین گنوں کے لئے کتنا صرف کرنا پڑا ہوگا۔ ۷۰ ملی میٹر والی توپ کی قیمت ۲۰۰ پونڈ ہوتی ہے اور ایک گولہ کی تین پونڈ۔ فرانس کی بڑی توپ کی قیمت ۱۶۰۰ پونڈ ہے اور ہر فیر پر پانچ پونڈ لاگت آتی ہے، ایک ٹینک کی قیمت ۱۶۰۰ پونڈ ہوتی ہے اور بم گرانے والے جہاز کی بیس ہزار پونڈ۔ ایک کروزر ۲۲ لاکھ پونڈ میں طیار ہوتا ہے اور ایک جنگی جہاز ۷۰ لاکھ پونڈ میں۔ الغرض جنگ سے زیادہ صرف کسی مشغلہ میں نہیں، لیکن لطف یہ ہے کہ سامان حرب ہی کی تجارت سے نفع بھی زیادہ حاصل ہوتا ہے

۱۹۳۴ء میں اقوام عالم نے ۸۵۵۳۶۰۰۰۰۰ پونڈ اپنی اسلحہ بندی پر صرف کئے تھے اور ۱۹۳۷ء میں یہ مصارف دوارب پونڈ تک پہونچ گئے

اگر ہم ۱۹۳۴ء کے مصارف اسلحہ بندی کو سامنے رکھیں تو اس کے معنے یہ ہیں کہ اگر ہمارے پاس اتنی رقم موجود ہو اور ہم روزانہ دو پونڈ کے حساب سے خرچ کریں تو دس لاکھ سال کے بعد بھی کچھ بچ ہی رہیگا اور اگر اس کا شمار کرنا چاہیں تو ۲۶ سال سے کم زمانہ اس کے لئے درکار نہ ہوگا

حقیقت یہ ہے کہ اس تجارت میں بڑا زبردست فایدہ ہے لیکن اس کو صرف وہی حکومتیں کر سکتی ہیں جو بہت ترقی یافتہ و مالدار ہیں اور چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کے ہاتھ سامان حرب فروخت کر کے کثیر نفع حاصل کرتی ہیں

تمام دنیا میں اسلحہ کی ۹۸ فی صدی برآمد دس ملکوں سے ہوتی ہے۔ ان میں ۶۵ فی صدی کے مالک برطانیہ، امریکہ، فرانس، سویڈن اور زیکوسلاویکیا ہیں اور فرانس کے مشہور کارخانہ اسلحہ سازی (شنیڈر) نے ۱۹۳۲ء میں ۷۰ فی صدی سے زیادہ اسلحہ و سامان حرب طیار کر کے فروخت کیا:-

آپ شنیڈر اور دوسری اسلحہ ساز کمپنیوں کے ڈائرکٹروں کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ فطرتاً وہ نہایت متین و سنجیدہ بہت نیک نفس و شریف ہیں، لیکن انکا مشغلہ ہلاکت بار اسلحہ کی اختراع و تجارت ہے

اسلحہ سازی کی کمپنیوں کی حالت وہی ہے جو محرمات سے مباشرت کرنے والے سفید چوہوں کی ہوتی ہے کہ ساتھ کھیلتے بھی ہیں اور نسل کشی بھی کرتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان کمپنیوں میں تجارتی مقابلہ کا جھگڑا زیادہ نہیں ہے فرض کیجئے اگر ایک ملک شنیڈر کے کارخانہ سے اسلحہ طلب کرتا ہے تو دوسرا فریق دوسرے ملکوں سے سامان حرب خریدتا ہے۔ اگر ایک ملک کوئی نئی جنگی اختراع خریدتا ہے تو دوسرے ملک بھی اس کے لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ کسی ایک ملک کو سامان حرب فراہم کرنے میں یہ کمپنیاں مقابلہ پر آجائیں اور کسی کو گھاٹا ہو جائے لیکن بین الاقوامی حیثیت سے یہ سب فایدہ میں رہتی ہیں اور ان کے تعلقات ایک دوسرے سے ایسے گتھے ہوئے ہیں کہ اس وقت ساری دنیا ان کے جال میں پھنسی ہوئی ہے

مشہور بات ہے (اور غالباً غلط نہیں) کہ اسلحہ ساز کمپنیاں اپنے کاروبار میں سیاسی حیثیت سے بالکل غیر جانبدار

و تنگ نظری کی پیداوار ہیں۔

انھوں نے ہمیشہ خدا کا ڈر دکھا کر اپنا اثر قایم کیا، انھوں نے ہمیشہ دُنیا کو یہی یقین دلایا کہ اگر ان کی دعائیں شاملِ حال نہ ہوں تو بارش بند ہو جائے، کھیتیاں برباد ہو جائیں، دنیا قحط و وبا سے فنا ہو جائے اور جب کبھی کوئی مصیبت نوعِ انسانی پر نازل ہوئی تو انھوں نے اس کو اپنی ہی بد دعاؤں کا نتیجہ بتایا۔ پھر انھوں نے صرف یہی نہیں کیا، بلکہ جب کبھی انھیں اقتدار حاصل ہوا، علم کو روندا گیا، عقل پامال کی گئی، آزادی کو مٹایا گیا، مفکرین عالم کو قید میں ڈالا گیا۔ اربابِ فضل و کمال کو ذبح کیا گیا اور خدا کے نام پر وہ سب کچھ کیا گیا جسے شیطان بھی گوارا نہ کر سکتا تھا

لیکن مذاہب کا ظہور، مذہبی کتابوں کی پیداوار، خانقاہوں کی تعمیر اور اہل خانقاہ کا وجود، کوئی غیر فطری بات نہ تھی، بلکہ عہد وحشت کے غاروں سے لیکر موجودہ دورِ تہذیب تک انسان نے جو تدریجی ترقی کی ہے اسی کے یہ لازمی مظاہر تھے، دنیا کی تاریخ میں اتفاق کوئی چیز نہیں ہے، اس میں معجزہ و خرقِ عادات کو کوئی دخل حاصل ہے اور نہ غیبی مداخلت کو۔ ہر شے اور ہر حالت واقعات سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے اگر ہمارے اسلاف کے دلوں میں مذہب و روحانیت کا خیال پیدا ہوا تو وہ بالکل فطری خیال تھا، کیونکہ ان کی عقل زیادہ سے زیادہ یہیں تک پہونچ سکتی تھی اور اسی کو وہ سچ سمجھ کر پیش کرتے تھے

تمام زمانوں میں انسان نے اپنے اور اپنے ماحول کے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ دیکھتے تھے اور تعجب کرتے تھے کہ پانی کیوں بہتا ہے، درختوں کا نشو و نما کیوں ہوتا ہے، بادل کیونکر معلق فضا میں اُڑتے ہیں، ستاروں میں چمک کہاں سے آتی ہے، چاند سورج کو کون اِدھر سے اُدھر لیجاتا ہے۔ وہ سوچتا تھا کہ زندگی کے بعد موت کا سکون کیا، بیداری کے بعد نیند کیسی، روشنی کے ساتھ تاریکی کیا معنی۔ بجلی اور کڑک کو دیکھ کر وہ سہم جاتا تھا، زلزلوں اور پہاڑوں کی آتش فشانیوں کو دیکھ کر وہ لرزہ براندام ہو جاتا تھا، اور چونکہ وہ ان کے طبعی حوادث کے اسباب سے ناواقف تھا اس لئے وہ سمجھتا تھا کہ ان تمام حوادث کے پیچھے کوئی عظیم الشان، ذیحیات ہستی ضرور ایسی موجود ہے جو ان تمام مناظر و مظاہر کی پیدا کرنے والی ہے اور انھیں کو وہ دیوتا یا دیوی سمجھ کر ان سے ڈرنے لگا اور ان کی پوجا کرنے لگا

طلوعِ صباح کو وہ سمجھنے لگا کہ یہ کوئی نہایت ہی حسین و جمیل دیوی ہے، آفتاب کو اس نے ایک جنگجو عاشق مزاج دیوتا فرض کر لیا، رات کو اس نے سانپ یا ناگ سمجھ لیا اور ہوا کو مُغنی، جاڑے کو اس نے ایک ایذا رساں درندے سے تعبیر کیا اور خزاں کو ایسی دیوی سے جو دنیا کے سب پھول چُن کر لیجاتی ہے۔ الغرض اسی طرح کی سیکڑوں تعبیریں، ہزاروں تفسیریں اپنے مناظرِ فطرت اور حوادثِ طبیعی کی اپنی ذہانت سے پیدا کیں اور ان کو حقیقت جانکر پھیلانا شروع کیا۔ اقوامِ عالم کی روایات مذہبی یا "اساطیر الاولین" پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ان کی بنیاد یکسر انھیں شاعرانہ تعبیروں اور اسی قسم کے قیاسات ضعیفہ پر قایم ہے۔ چنانچہ باغِ عدن کی روایت کو دیکھئے کہ وہ دنیا کی ہر قوم میں پائی جاتی ہے، کیونکہ جب وہ مصائب سے گھبرا

اُٹھی تو اپنی تسکین کے لئے اس نے ایک ایسی دنیا کا تخیل پیدا کیا جہاں راحت ہی راحت ہے

اسی طرح طوفان کی روایت ایشیا و یوروپ کے تمام قدیم قوموں میں پائی جاتی ہے۔ انھوں نے گھونگھے، سیپیاں، اور لہروں کے نشانات، پہاڑوں، وادیوں اور میدانوں میں دیکھ کر خیال کیا کہ کسی وقت ضرور ساری دنیا پر طوفان آیا تھا جس سے سوائے چند مقبول بندوں کے کوئی جانبر نہ ہوسکا۔ توریت انجیل اور کلام مجید کے علاوہ ہندؤں میں بھی یہ روایت موجود ہے۔ منُو نے ایکبار گنگا میں کوئی ظرف ڈبو کر پانی لیا، اس میں ایک مچھلی بھی آگئی۔ مچھلی نے التجا کی کہ مجھے پھر پانی میں چھوڑ دیجئے، منُو نے رحم کھا کر اسے چھوڑ دیا لیکن مچھلی نے اس احسان کے عوض میں ان کو بتایا کہ ایک بڑا زبردست طوفان آنے والا ہے، آپ ایک کشتی بنا کر اس میں اپنے ساتھیوں کو معہ مولشیوں کے بٹھا لیجئے، میں بروقت پہونچکر آپ کی مدد کرونگی چنانچہ منُو نے اس کی تعمیل کی اور جب طوفان آیا تو وہ مچھلی حاضر ہوئی لیکن اب وہ بہت بڑی مچھلی ہوگئی تھی جس کے سر پر ایک سینگ بھی نکلا ہوا تھا۔ منُو نے ایک رسی اس کے سینگ سے باندھ کر کشتی میں اٹکا دی اور وہ طوفان سے کشتی کو بچا کر ایک پہاڑ کی چوٹی پر لے گئی اور طوفان ختم ہونے تک منُو جی یہیں ٹھہرے رہے۔ ان تمام روایات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے زندگی اور موت کے اسرار کو کس کس طرح سمجھنے کی کوشش کی اور ان کوششوں میں اسکے کتنے اندیشے کتنی امیدیں کتنی مسکراہٹیں اور کتنے آنسو شامل تھے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا اولین مذہب "آفتاب پرستی" تھا اور یہ بالکل فطری بات تھی، کیونکہ روشنی ہی زندگی ہے، اور اسی سے زندگی میں حرارت قایم رہتی ہے، اپالو بھی سورج تھا جو رات کے ناگ کو شکست دیکر بھگا دیتا تھا۔ اگنی بھی سورج تھا جو انسان کے ہر ہر جھونپڑے کی حفاظت کرتا تھا، کرشن بھی سورج ہی تھے کہ ان کی ولادت کے وقت تمام درخت ہرے بھرے ہوگئے۔ ہرقلس بھی سورج دیوتا تھا، جونا (یونس) بھی وہی تھا اور یہ سب کے سب ۲۵ دسمبر ہی کے لگ بھگ پیدا ہوئے، سب نے چالیس دن کا روزہ رکھا، سب غیر طبعی موت سے مرے اور پھر زندہ ہوئے۔ اب مسیح کے حالات کا ان روایات سے موازنہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ وہاں بھی سب کچھ یہی ہے، ۲۵ دسمبر کو ایک غار میں پیدا ہوئے، ہیروڈ نے بہت سے بچوں کو ان کے دھوکے میں ہلاک کیا، چالیس[1] دن کا روزہ رکھا، غیر طبعی موت سے مرے اور پھر زندہ ہوئے۔ عیسیٰ بھی سورج دیوتا تھے اور یقیناً تمام مذاہب کی ابتدا آفتاب پرستی ہی سے ہوئی، چنانچہ اس وقت بھی عبادت کے وقت لوگوں کا آنکھیں بند کرلینا اسی زمانہ کی یادگار ہے کیونکہ وہ سورج کی طرف دیکھ نہ سکتے تھے اور آنکھیں بند ہوجاتی تھیں

اس کے علاوہ جب ہم امم سابقہ کی دیگر مذہبی روایات کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے مذاہب میں بھی کوئی نئی بات نہیں پائی جاتی، ان کے تمام مراسم و عبادات کا رشتہ عہد قدیم کے مذاہب ہی سے جا کر ملجاتا ہے۔

---

[1] چالیس کا عدد مذاہب عالم کی تاریخ میں بہت نظر آتا ہے۔ طوفان سے پہلے چالیس دن بارش ہوتی رہی، موسیٰ چالیس دن کوہ سینا پر رہے، چالیس سال تک بنی اسرائیل صحراؤں میں پھرتے رہے،

آپ نے دیکھا ہوگا کہ عیسائیوں میں بپتسمہ یا اصطباغ کی رسم پائی جاتی ہے، لیکن یہ عیسویت سے بہت پہلے کی چیز ہے، ہندوؤں، مصریوں، یونانیوں اور رومیوں میں بھی مقدس پانی کا وجود پایا جاتا تھا صلیب کا خیال بھی نہایت قدیم خیال ہے۔ یہ علامت تھی غیر فانی ہونے کی، زندگی کی، اگنی کی، قبر انسانی کی۔ اٹلی کی قدیم آبادی (رومیوں سے بہت پہلے کی) قبروں پر صلیب ہی کا نشان قایم کرتی تھی۔ وسطی امریکہ کے قدیم معبدوں میں صلیبی نشان کثرت سے دریافت ہوئے ہیں بابل کی سرزمین سے جو اسطوانے یا نلکے دریافت ہوئے ہیں ان پر بھی صلیب کا نشان موجود ہے۔ اسی طرح تثلیث کا خیال بھی بہت پرانا ہے اور قدیم مصر میں پایا جاتا تھا

ہم کو سمجھ لینا چاہئے کہ اساطیر و معجزات میں بہت فرق ہے۔ اساطیر نام ہے کسی بات کی تخیلی تصویر پیش کرنے کا، اور معجزہ کہتے ہیں کوئی بات گھڑکر بیان کرنے کو

اگر تم کسی سے کہو کہ دو ہزار سال قبل مردے زندہ ہوگئے تھے، تو وہ غالباً کہے گا "ہاں ہوا ہوگا" اگر تم اس سے کہو کہ ایک لاکھ سال بعد تمام مردے زندہ ہو جائیں گے تو وہ کہے گا "دیکھو، کیا ہوتا ہے" لیکن اگر تم یہ کہو گے کہ تم نے خود قبر کے اندر سے کسی مردہ کو باہر نکلتے ہوئے دیکھا تو وہ تمھیں دیوانہ سمجھ کر کوئی جواب نہ دے گا

مذہبی کتابیں اسی قسم کے بیانات سے معمور ہیں۔ خدا نے یہودیوں کے لئے جتنے معجزات سے کام لیا وہ سب کو معلوم ہیں۔ ان کو غلامی سے آزاد کرانا بھی معجزوں ہی کے ذریعہ سے ہوا، اور جب وہ مصر سے باہر نکلے ہیں تو دن کو بادل اور رات کو روشنی کا ایک ستون آگے آگے رہنمائی کے لئے ہوتا تھا، دریائے نیل ان کے لئے شق کیا گیا، من وسلویٰ ان کے لئے آسمان سے نازل کیا گیا، لیکن یہودیوں نے ان میں سے کسی معجزہ کی پرواہ نہیں کی اور جب تک بچھڑا بناکر پوج نہیں لیا انھیں چین نہ آیا

اسی طرح مسیح نے بہت سے معجزے پیش کئے لیکن بالکل بے نتیجہ، وہی مردے جن کو انھوں نے زندہ کیا، وہی اندھے جن کو انکھیارا بنایا اور وہی کوڑھی جنھیں چنگا کیا ان پر ایمان نہ لائے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس کا کیا سبب تھا؟ صرف یہ کہ معجزے کبھی ظاہر ہی نہیں ہوئے بلکہ یہ سب داستانیں ہیں جو صدیوں بعد گھڑی گئیں

پانی کو شراب بنا دینا، سیکڑوں آدمیوں کو صرف ایک روٹی سے سیر کر دینا، اندھے کو مٹی لگا کر بینا بنا دینا، طوفان کو خاموش کر دینا، پانی پر چلنا، یہ سب وہ باتیں ہیں جنھیں انسان سوچتا تھا، جن کے پورا ہونے کی تمنائیں رکھتا تھا اور انھیں کی تکمیل کو سب سے بڑی نعمت سمجھ کر اظہار عظمت و تقدس کے لئے اس نے پیغمبروں سے منسوب کر دیا

یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا جہل و خوف سے معمور تھی اور اپنی ہر مشکل میں مافوق الفطرت ہستی سے امداد کی توقع رکھتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے ان مفروضہ غیر انسانی ہستیوں کو خوش کرنے کے لئے مندر بنائے، قربان گاہیں طیار کیں، ان کے سامنے ناک رگڑی، قربانیاں چڑھائیں اور وہ سب کچھ کیا جس سے وہ خود خوش ہو سکتے تھے، لیکن ان آسمانی قوتوں نے

ایک نہ سنی، ان میں سے کوئی انسان کی فریاد کو نہ پہونچا، طوفان بھی آئے، کھیتیاں بھی برباد ہوئیں، وبائیں بھی پھیلیں، جنکو بُرے حال جینا تھا وہ بُرے حال ہی جیے اور جنھیں مرنا تھا وہ مر ہی گئے

انسان یہ سمجھتا تھا اور اب بھی مذہبی انسان یہی سمجھتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ پیدا ہوا ہے وہ اسی کے لئے ہے، اسی کی ضروریات پورا کرنے کے لئے کائنات وجود میں آئی، چنانچہ وہ ہر چیز پر قابض ہونا چاہتا تھا اور جب ناکام رہتا تھا تو سمجھتا تھا کہ خدا ضرور اس کی مدد کرے گا، حالانکہ اگر دنیا میں ایک انسان نہ ہوتا تو بھی سورج کا یہی طلوع وغروب ہوتا، یہی بہار و خزاں ہوتی، گلاب اسی طرح کھلتا، انگور کی بیلیں اسی طرح پھل لاتیں، وہی سمندر کا مدوجزر ہوتا اور وہی رات دن، وہی طوفانی ہوائیں ہوتیں اور وہی رعد وبرق

ایک زمانہ، ایک غیر محدود زمانہ انسان پر اسی جہل وبے بصری کی حالت میں گزر گیا کہ کچھ لوگ سوچنے والے پیدا ہوئے اور انھوں نے ان روایات ومعجزات کو شک کی نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔ انھوں نے غور کیا کہ کسوف وخسوف کیوں مقررہ وقفہ کے بعد ہوتا ہے اور آخر کار انھوں نے اس کی وجہ معلوم کرکے سمجھ لیا کہ اجرام فلکی کی گردش اولادِ آدم سے بالکل بے نیاز ہے اور انسان خود بھی مظاہر طبیعی کا ایک معمولی مظہر ہے

گلیلو، کوپرنکس اور کیپلر نے مذہب کی بتائی ہوئی ہیئت کو درہم برہم کر دیا، زمین چپٹی ہونے کے بجائے گول ہوگئی ساکن ہونے کے بجائے متحرک ہوگئی، آسمان بجائے ٹھوس ہونے کے خلاء محض بن گیا اور سارا بنا بنایا کھیل مذہب والوں کا بگڑ گیا

ظاہر ہے کہ مذہب اپنی روایات کی اس تکذیب وتوہین کو برداشت نہ کر سکتا تھا، وہ تاریکی جو زمانۂ نامعلوم سے دماغوں پر مسلط تھی یوں آسانی سے دور نہ ہو سکتی تھی، آخر کار جہل نے علم کے خلاف ایک محاذ جنگ قائم کیا اور مذہب کے درندے جس کے پنجے ہمیشہ خون سے رنگیں رہے ہیں، برونو (Bruno) کے خلاف اپنا پنجۂ بڑھایا اور محض اس خطا پر کہ وہ اس کُرہ کے علاوہ اور کُروں کا بھی قایل تھا

اسے کافر وملحد قرار دیکر سات سال کے لئے قید کرایا گیا اور کہا گیا کہ اگر وہ اپنے الحاد سے باز آجائے تو رہا کیا جا سکتا ہے، لیکن اس نے کہا کہ ایک حق بات سے انکار کیونکر ممکن ہے اور آخر کار پا بزنجیر اسے قصاص گاہ میں لے گئے اور بہت سی لکڑیاں جمع کرکے چتا میں آگ لگا دی گئی اور وہ جلکر راکھ ہوگیا۔ الغرض مذہب نے عقل وعلم کو شکست دینے کی ہر امکانی کوشش کی، لیکن جہل کے پاؤں جب ایکبار اُکھڑ جاتے ہیں تو مشکل سے جمتے ہیں، عقل کی روشنی پھیلتی رہی اور مذہب کی تاریکی سمٹتی رہی

جانبازانِ علم اُٹھے اور انھوں نے سمندروں، پہاڑوں اور وادیوں میں جانیں دے دیکر وہ باتیں دریافت کیں جو مذہب کی دسترس سے باہر تھیں، انھوں نے بخار وبرق کی قوت دریافت کرکے انسان کو دیوتا بنا دیا، لیکن اہلِ مذہب

بدستور دیوتاؤں کے غلام ہی بنے رہے۔ مذہب والے مفروضہ معجزے روایت ہی کرتے رہے اور انھوں نے انھیں کرکے دکھا دیا یعنی انسان کی جن تمناؤں کو دیوتا پورا نہ کرسکے تھے اسے علم و عقل نے پورا کر دیا

سائنس بتاتی ہے کہ نہ تخلیق کوئی چیز ہے نہ فنا کوئی چیز، ایک لامحدود ہستی کا وجود ایک لامحدود استحالۂ عقلی ہے، کائنات کے تمام مظاہر و آثار اسباب و نتیجہ سے وابستہ ہیں اور اشیاء کے اسی فطری رابطہ کو ایک نے نہ سمجھا اور مذہب بن گیا، دوسرے نے سمجھ لیا اور علم کہلایا

مذہب کا تجربہ انسان نے ہزاروں سال کیا لیکن کوئی آسمانی مدد اسے نہ پہونچی۔ خدا کا رحم حاصل کرنے کے لئے ماؤں نے اپنے بچوں کی قربانیاں پیش کیں لیکن اسے ان پر رحم نہ آیا، برہنہ وحشی انسان کو لاکھوں کی تعداد میں درندوں نے کھایا، سانپوں نے ڈسا، طوفانوں نے ڈبویا، زلزلوں نے تباہ کیا لیکن خدا نے اپنا اصول کار نہ بدلا، انسان نے لاکھوں مندر بنائے رات دن اس کی پوجا کی لیکن ظالموں کا ظلم بدستور قایم رہا اور غلاموں کی پیٹھ پر جو کوڑے پڑا کرتے تھے بدستور پڑتے رہے۔ یہاں تک کہ انسان نے لاکھوں سال کے تلخ تجربات کے بعد سمجھا کہ خدا انسانی معاملات میں دخل نہیں دیتا اور اس کے نزدیک گھاس کی پتی اور انسان سب برابر ہیں، اس لئے اس کی ترقی کا انحصار صرف اس کی محنت و کاوش اور رہبریٔ عقل پر ہے، آخر کار رفتہ رفتہ معجزات کا زمانہ گزر گیا، روایات مذہبی کا دور ختم ہوگیا اور اب انسان اس کے لئے طیار نہیں کہ وہ مذہب کے بتائے ہوئے اصول نجات پر یقین رکھ کر اپنی دنیا کو تباہ کرے اور بیوقوف کہلائے

قیامت قایم ہے، حشر و نشر کا ہنگامہ برپا ہے۔ مسیح اپنے تخت پر جلوہ افروز ہیں کہ ایک روح سامنے آتی ہے

مسیح :۔ "تیرا کیا نام ہے"

روح :۔ "ٹارکومیڈا"[1]

مسیح :۔ "کیا تو عیسائی تھا؟"

ٹار :۔ "تھا"

مسیح :۔ "کیا تونے اوروں کو مسیحی بنانے کی کوشش نہیں کی"

ٹار :۔ "کی اور پوری طرح کی"

---

[1] اسپین کا وہ ظالم انسان جس نے سب سے پہلے غیر مسیحی لوگوں کے لئے جسمانی سزائیں دینے کا محکمہ قایم کرایا۔ سنہ ۱۴۲۰ء میں پیدا ہوا اور سنہ ۱۴۹۸ء میں مرا

مسیح :۔ "کیونکر"

تار :۔ "میں نے منکرین کو قید کیا، ان کے پاؤں میں خاردار زنجیریں ڈالیں، ان کی زبانیں کھنچوالیں، ان کی آنکھیں نکلوائیں، شکنجے میں کسوا کر ان کی رگ رگ توڑ دی اور اگر اب بھی زندہ رہے تو کھال کھنچوا کر زندہ آگ میں ڈلوا دیا"

مسیح :۔ "خوب کیا، اے میرے وفادار خادم خوب کیا۔ اچھا جاؤ اور قرب خداوندی میں رہ کر نجات ابدی کی راحتیں حاصل کرو"

دوسری روح حاضر ہوتی ہے

مسیح :۔ "تیرا کیا نام ہے"

روح :۔ "برونو"

مسیح :۔ "کیا تو مسیحی تھا"

برونو :۔ "کچھ عرصہ تک مسیحی رہا، لیکن اس کے بعد میں نے خود اپنی عقل سے سچائی کی تلاش شروع کی"

مسیح :۔ "کیا تو نے لوگوں میں تبلیغ کی"

برونو :۔ "کی، لیکن مسیحیت کی نہیں، آزادی فکر و ضمیر کی، اچھا کام کرنے کی بغیر طمع ثواب اور برے کام سے بچنے کی بلا خوفِ عذاب، میں نے لوگوں کو بتایا کہ انسانیت نام ہے صرف بھلائی کا، ہمدردی کا اور دوسروں کے لئے ایثار و قربانی کا"

مسیح :۔ "یہ تو گویا تو نے انجیل کو جھٹلایا اور معجزات سے انکار کیا، اچھا تو جا، اسفل سافلین میں تیرا ٹھکانا ہے اور وہیں تجھے ابدالآباد تک دوزخ میں جلنا ہے"

کیا خدا اور مسیح کے اس فیصلہ کو دنیا اب بھی قرین انصاف سمجھ سکتی ہے؟ اور کیا مذہب کا دورِ معجزہ و کرامات اب پھر واپس آسکتا ہے؟

مطلوب ہیں

نگار جنوری ۲۶ء۔ نومبر ۳۳ء۔ جنوری و اپریل تا دسمبر ۳۴ء۔ جون ۳۵ء۔ مئی و اگست ۳۶ء فروری و دسمبر ۳۷ء کے نگار کے پرچے جو صاحب علیحدہ کرنا چاہیں۔ دفتر کو اطلاع دیں۔ منیجر نگار

اگر دنیا میں ڈاکٹر نہ ہوتے

اب سے دور ایک حکیم تھے، بے روزگار اپنے سے مایوس دوسروں سے بیزار۔ یہ دیکھ کر کہ وطن میں لوگ بیمار بھی پڑتے ہیں، اچھے بھی ہوتے ہیں اور مر بھی جاتے ہیں لیکن ان تمام باتوں میں سے کسی ایک میں بھی انکا دخل نہیں ہوتا انھوں نے وطن سے ہجرت کی اور دیار غیر میں پہونچکر قسمت آزمائی پر آمادہ ہوئے۔ قضارا پہلا ہی مریض ان کے ہاتھوں اس دنیا سے چل بسا، ورثا ان کو خبر کرنے آئے، انھوں نے بھی رسماً اظہار ہمدردی کیا۔ تھوڑی دیر بعد ان کی فرمائش ہوئی "حضور والا ہمارے ہاں کا دستور ہے کہ جو مریض جس طبیب کے علاج سے وفات پائے، اس کی تجہیز و تکفین بھی اُسی طبیب کے ہاتھوں عمل میں آئے۔" طب کے قانون میں یہ دفعہ اس سے پہلے حکیم صاحب کی نظر سے نہیں گزری تھی۔ مجبوراً یا اخلاقاً اُٹھ کھڑے ہوئے، میت کے گھر پہونچکر غسل میت کے فرایض انجام دئے، کفن پہنایا اور میت کو تابوت میں رکھا۔ رسماً تابوت اُٹھانے میں پیش قدمی کر کے ایک طرف کاندھا بھی دیا۔ لیکن اب جو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوا کہ ہر طرف کا کاندھا تو لوگ بدلتے رہتے ہیں ان کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہوتا۔ قبرستان بستی سے بہت دور واقع تھا۔ اُفتاں وخیزاں وہاں تک پہونچے میت کو قبر میں اُتارا، مٹی دی اور بڑی رات گئے گھر پہونچے

دوسرے دن سے جب کوئی مریض اُنکے مطب میں آتا تو اُس کا حال سنتے سنتے قطع کلام کر کے پوچھ بیٹھتے "اور کیوں جناب آپ کا قبرستان کتنی دور ہے؟" ظاہر ہے یہ سوال ایسا نہ تھا کہ مریض یا اس قبیل کے دوسرے لوگ ان سے مزید گفتگو کرتے۔ یہاں سے بھی پریشان ہو کر نکلے۔ اس درماندگی کے دوران میں ان کی ملاقات ایک ایسے بزرگ سے ہوئی جو بظاہر نہایت بھلے مانس معلوم ہوتے تھے۔ بڑی شفقت فرمائی۔ حکیم صاحب نے نام اور پتہ پوچھا انھوں نے مسکرا کر فرمایا "انسان مجھے فرشتہ کہتے ہیں اور فرشتے مجھے شیطان کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ میں انسانوں کا اعمال نامہ اور مشیت کا کارنامہ ہوں میں دیکھتا ہوں تم بڑی مصیبت میں ہو۔ فرشتے تمہارے لئے دعا مانگیں یا نہ مانگیں میں تمہاری مدد کرنے کو حاضر ہوں۔ دیکھو میں تمھیں ایک گر بتاتا ہوں۔ جب کبھی تمہارا سابقہ کسی مریض سے ہو تو یہ علامت دیکھنا، اگر ملے تو سمجھنا مریض اچھا نہ ہوگا، اُسے ہاتھ نہ لگانا۔ اگر یہ علامت نہ ملے تو جو کچھ دیدوگے، فایدہ ہوگا اور مریض تندرست ہو جائے گا۔" حکیم صاحب بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے، "خدا آپ کو جزائے خیر دے، آپ نے بڑا احسان کیا، میرے لایق جو خدمت ہو فرمایئے" شیطان مسکرایا جس میں زہر کی تلخی اور پھول کی خوشبو اور لوچ تھا، کہنے لگا "آخر حکیم ہی ٹھہرے وہی ہوا الشافی اور وہی بندے کے بنفشہ اور نیلوفر تم میری خدمت کیا کروگے۔ جو ایت تک جزائے خیر اور احسان کا مفہوم بھی نہ سمجھے" حکیم صاحب

شیطان کے تیور سے گھبرائے، فوراً آداب بجالا کر رخصت ہوگئے ایک دوسرے شہر میں پہونچکر مطب کا ڈول ڈالا صبح کے وقت ایک مریض آیا اس میں وہی علامت ملی جو شیطان نے بتائی تھی۔ انھوں نے فوراً مریض سے کہدیا علاج کرانے سے کچھ حاصل نہیں تم جلد ہی مرجاؤ گے۔ یہ گیا تو دوسرا مریض آیا اس میں بھی وہی علامت ملی اسے بھی موت کی بشارت دیکر ٹالا غرض کئی دن متواتر ان غریب کے ہاں وہی لوگ آئے جن کی زندگی کا پیمانہ لبریز ہوچکا تھا۔ جن جن کو یہ مژدہ سنا چکے تھے وہ جاں بحق ہوتے رہے۔ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں اُن کی شہرت ایسی عام ہوئی کہ مریض تو درکنار، تندرست بھی ان کے سائے سے بھاگنے لگے۔ اور یہ بیچارے جہاں کے تہاں رہ گئے!

یہ واقعہ بجائے خود صحیح ہو یا نہ ہو اس کے دلچسپ ہونے میں یوں بھی شبہ نہیں ہوسکتا کہ اس میں شیطان کا کافی دخل ہے اور شیطان و ڈاکٹر جب یکجا ہوں تو آپ جانتے ہیں، تندرست اور مریض کا حشر یکساں ہوتا ہے۔ تندرستوں کے ساتھ شیطان کو وہی دلچسپی ہوتی ہے جو مریضوں کے ساتھ ڈاکٹروں کو ہوتی ہے۔ یا ان سب کو ریڈیو سے!۔ آپ کو تو معلوم ہوگا بعض ڈاکٹر ایسے ہوتے ہیں جو ہر مریض کو صرف یہ بتا سکتے ہیں کہ وہ کتنے دنوں میں اس جہاں سے گزر جائے گا۔ لیکن یہ بات میں نے کچھ قبل از وقت کہدی۔ ہاں تو جیسا کہ آپ جانتے ہیں آج شب کا موضوع گفتگو یہ ہے کہ اگر ڈاکٹر یا طبیب نہ ہوں تو کیا ہو۔ میں نے اس سلسلہ میں آپ کو کچھ باتیں سنائیں۔ جو بظاہر صرف لطیفہ معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن لطیفہ بجائے خود زندگی کے بعض سنگین اور تلخ حقائق کی صرف ایک دلچسپ تعبیر ہوتا ہے!

آپ نے یہ بھی محسوس کیا ہوگا، بعض ڈاکٹروں کا برزخ ہی کچھ ایسا ہوتا ہے کہ اُن کی پیشانی پر مریض کی موت لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے مجھے تو اکثر اپنے تمدن کا وہ دور اچھا معلوم ہوتا ہے جب ہر شخص ہر کام کے لئے موزوں نہیں خیال کیا جاتا تھا اور سوسائٹی اسبات کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ ہر شخص جو پیشہ چاہے اختیار کرلے۔ آپ نے اکثر ایسے ڈاکٹروں کو دیکھا ہوگا جنھیں مطب کرنے کے بجائے اکسچینج پر سٹہ بازی قسم کے مشغلہ میں مصروف ہونا چاہئے تھا۔ یا مشرقی لندن میں قہوہ کی دوکان رکھنی چاہئے تھی۔ بعض ڈاکٹروں کو دیکھ کر مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا ہے جیسے یہ شخص کبھی کوکین بیچنے میں سزایاب ہوچکا ہے یا بچے اور مویشیاں چُرالیجایا کرتا ہے۔ آپ ہی غور کیجئے اگر آپ بیوی سے عاجز نہ ہوں یا کسی جاہل دولتمند کے دستِ نگر نہ ہوں تو ایسے ڈاکٹر کو اپنی زندگی کیسے حوالہ کردیں گے۔ پھر آپ ہی غور کیجئے ایسے بزرگوں سے مُردہ شوئی، گورکنی یا میت برداری کا کام لیا جاتا ہو تو کسی کا کیا قصور! اور یہ کچھ ڈاکٹروں ہی پر منحصر نہیں ہے۔ ہر پیشہ میں ایسے لوگ ملیں گے جو اس پیشہ کے لئے قطعاً موزوں نہیں ہوتے محض پروفیسروں کو آپ ایسا پائیں گے جو نوجوانوں کو علم و اخلاق سے روشناس کرانے کے بجائے امراء کے تفننِ طبع کا زیادہ موجب بن سکتے ہیں اور جن کو مسندِ درس پر بیٹھنے سے زیادہ پرچون کی دوکان رکھنے میں لطف آتا ہے!

لیکن یہاں ڈاکٹر کے ہونے نہ ہونے کا سوال ہے، پروفیسروں کی داستان سے بحث نہیں!

میں ابھی ابھی عرض کرچکا ہوں اور بہت ممکن ہے عرض نہ کرچکا ہوں تو اب کئے دیتا ہوں کہ سائنس کی ترقی نے

دوسرے فنون کی طرح ڈاکٹری کے فن کو جتنا نفع پہونچایا ہے اس سے زیادہ نقصان ڈاکٹر کو پہونچایا ہے۔ فن سے شخصیت معدوم ہونے لگی ہے۔ اب ڈاکٹر اپنی طبیعت یا اپنے وجدان پر نہ بھروسہ کرتا ہے اور نہ صحیح وجدان کی تربیت کو کوئی اہمیت دیتا ہے۔ وہ آلات پر بھروسہ کرنے لگا ہے یا اُن پٹینٹ دواؤں پر جن کو تجارت نے فروغ دیا ہے۔ وہ فوٹو کا قایل ہے، اصل کے اسرار سے بالکل ناآشنا ہوگیا ہے۔ ڈاکٹروں کی ذہنیت کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کو صرف مرض سے دلچسپی ہوتی ہے مریض سے کوئی ہمدردی نہیں!

بقول آپ کے اسی دلّی کے ایک مشہور طبیب کے اصلی طبیب اور عطائی میں فرق صرف یہ ہے کہ دونوں مریض کی جان لیتے ہیں لیکن طبیب قاعدہ کے ساتھ اور عطائی بے قاعدگی سے۔ اس مقولہ کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور یہ کچھ طبابت اور ڈاکٹری ہی پر منحصر نہیں ہے۔ ہمارے تمدن کا تمام تار و پود اسی باقاعدہ اور بے قاعدہ طریقہ کار سے وابستہ ہے۔ ایک بادشاہ اور لٹیرے میں کوئی فرق نہیں ہے سوائے اس کے کہ ایک باقاعدہ لٹیرا ہے اور دوسرا بے قاعدہ بادشاہ۔ اسے بھی جانے دیجئے، اسی قاعدہ اور بے قاعدہ طریقۂ عمل نے ہم کو اپنے خالق سے یگانہ یا بے گانہ کر رکھا ہے۔ کوئی شخص خدا کے رحم و رحمت کا اسوقت تک مستحق نہیں سمجھا جاتا جب تک کہ وہ اپنے آپ کو کسی خاص مسلک یا مذہب سے وابستہ نہ کرلے۔ حالانکہ میرے ایسے بہتوں کا ایمان ہو کہ خدا اپنی مشیت کو پورا کرنے کے لئے نہ خود کسی مسلک کا پیرو ہے اور نہ اس کی پروا کرتا ہے!

ہاں تو بات ڈاکٹروں کی تھی یعنی یہ نہوں تو کیا ہو۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہو کہ باقاعدہ اور بے قاعدہ مرنے کا جھگڑا ختم ہوجائے لوگ مرنے سے پہلے نہ مریں۔ ڈاکٹروں میں ایک قوم (Specialist) یا ماہرین خصوصی کی نکل آئی۔ جسم کا کوئی عضو ایسا نہیں ہے جس کے مخصوص معالج نہ ہوں۔ اچھا تھوڑی دیر کے لئے فرض کرلیجئے کہ آپ کے دماغ میں فتور ہے اور آپ ایمانداری سے کام لیں تو فرض کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ آپ کسی امراضِ دماغ کے ماہر کے ہاں چلے جائیے وہ بہت ساری ترکیبیں کرکے آپ پر یہ حقیقت واضح کردے گا کہ آپ کے دماغ میں واقعتاً فتور ہے۔ اس کے پاس ایسے آلات ہوں گے، اس کی شہرت ایسی ہوگی اور آپ خود کچھ ایسے نیازمند ہوں گے کہ آپ کو اس کا یقین ہوجائیگا کہ آپ کا دماغ خراب ہے! آپ کو ایک دفعہ اس امر کا شک ہوا نہیں اور آپ ہاتھ سے بے ہاتھ ہوئے نہیں۔ شک کرنا انسانی فطرت کا نہایت آسان اور محبوب وظیفہ ہے جسکے بارہ میں بعضوں کا خیال ہے کہ اس کا علاج افلاطوں کے پاس بھی نہ تھا! تو اس سے ہرگز یہ معنی نہیں کہ جو چیز ارسطو و افلاطون کے پاس نہ تھی وہ کسی دیہاتی اسکول کے مدرس یا پولیس کے سپاہی کے پاس بھی نہ ہو!

میرے ایک دوست ہیں جن کا مقولہ ہے کہ آج کل کے ڈاکٹروں اور طریقۂ علاج سے سابقہ پڑجائے تو جان و مال دونوں کا بس خدا ہی حافظ ہے۔ اول تو یہ لوگ مرض کے تشخیص کرنے میں اتنے روپے خرچ کرادیتے ہیں کہ مریض قلاّش ہوجاتا ہے۔ پھر مریض میں قدرے توانائی بھی ہونی چاہئے۔ ورنہ تشخیص کے سلسلہ میں اکثر اس کو در بدر پھراتے پھراتے ہی مار ڈالتے ہیں۔ ڈاکٹر کے نزدیک تشخیص کی جو اہمیت ہے اس سے بحث نہیں لیکن مریض کے نزدیک تشخیص نام ہے مرض کی شدت بڑھا دینے کا۔

اس کے بعد علاج کا دور آتا ہے۔ اس میں قیمتی دوائیں، مہنگے مقامات جہاں اسے جلاوطن کرتے ہیں اور تیمار داری کے وہ ضوابط ہیں جن کو برتنے کے بعد تیماردار خود مریض بنجاتا ہے۔ ان سب سے عہدہ برا ہونے کے بعد جب موت واقع ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ گھر کا سارا اندوختہ ختم ہوچکا ہے۔ ڈاکٹر کا بل ادا کرنا باقی ہے اور مقدمہ قائم ہونے کی دیر ہے

ایک ڈاکٹر ہیں جن سے مجھے بڑی دلچسپی ہے، بحیثیت ڈاکٹر کے بھی اور بحیثیت ایک عجیب و غریب انسان کے بھی۔ آپ کے ایک پھنسی بھی نکل آئے اور آپ اُن سے رجوع کریں تو پہلے وہ پھنسی کو اُس نگاہ سے دیکھیں گے جس سے کوئی مراقی اپنی بیوی کو دیکھتا ہے پھر نہایت پراسرار اور رازدارانہ ہمدردی کے ساتھ دریافت فرمائیں گے، آپ کبھی کوڑھ یا اس قبیل کے دوسرے ناگفتہ بہ امراض میں تو نہیں مبتلا ہوئے ہیں اور آپ نہیں تو آپ کے بزرگ کبھی اس سے دوچار ہوئے ہیں۔ زکام کی ابتداء وہ نمونیا سے کریں گے۔ اور نمونیا کو دق کا مقدمہ بتائیں گے ہر بخار کو ٹائیفائڈ یا میعادی بخار کا پیش خیمہ قرار دیں گے اور اس کے ساتھ اسکی انتہائے مدت کا بھی تذکرہ کردیں گے اور ضمناً مریضوں کا بھی نام بتا دیں گے جو اسی مرض میں اپنی میعاد حیات ختم کرچکے۔ دواؤں کے بارہ میں انھیں یقین ہے کہ مقررہ مقدار سے کم سے کم دس حصہ کم دینا چاہئے۔ اس سے دوا کی تاثیر، مریض کا امکانِ صحت، ڈاکٹر کی عافیت دس گنا بڑھ جاتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ چالیس سال میں ہر انسان کا انتقال ہوجاتا ہے۔ اگر وہ زندہ ہے تو اس کا قصور ہے۔ ایسوں کا علاج بھی وہ ایک خاص اُصول پر کرتے ہیں یعنی قضا تو مسلم ہے سکرات کو آسان بنانے کی کوشش کرنا چاہئے۔

ایک دن کھانا کھاکر میں فوراً لکھنے پڑھنے بیٹھ گیا، چونک پڑے، فرمایا، غضب خدا کا ایسی غلطی نہ کیا کیجئے۔ کھانا کھانے کے بعد دورانِ خون تیز ہوجاتا ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ چالیس سال کی عمر میں شریان سخت ہوجاتی ہیں۔ بہت ممکن ہے دورانِ خون کی تیزی سے کوئی شریان پھٹ جائے۔ فالج گرے اور موت واقع ہوجائے۔ میں نے عرض کیا ڈاکٹر صاحب کیا یہ علامتیں مجھ میں نظر آرہی ہیں فرمانے لگے تم لوگ تو ہو احمق، مرض کے اسوقت قائل ہوتے ہو جب اس میں مبتلا ہوجاتے ہو، ڈاکٹر امکان کا قایل ہوتا ہے۔ میں نے بات کاٹ کر کہا ڈاکٹر صاحب آپ لوگ کس کے قایل ہوتے ہیں امکانِ مرض یا امکانِ موت! ڈاکٹر صاحب خفا ہوکر اُٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا مخول کرلو، جب آن پڑے گی تو سر پکڑ کر روؤ گے۔ ڈاکٹر صاحب چلے گئے۔ لیکن انکی گفتگو کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب مجھے سر پھٹنے کا اتنا خوف نہیں رہتا جتنا شریان پھٹنے کا

سائنس نے امراض کے اسباب دریافت کرنے اور اس کا قلع قمع کرنے میں بڑے کارنمایاں کئے ہیں لیکن سائنس کا علمبردار بن کر امراض کا قلع قمع کرنا اور بات ہے اور مریض کی تکلیف سے تکلیف محسوس کرنا اور اس کو اس سے نجات دلانے کی کوشش کرنا بالکل جداگانہ بات ہے۔ ہمارا ڈاکٹر لکیر کا فقیر ہوگیا ہے۔ وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ جو کچھ کتابوں میں لکھا ہے اس کی حرف بہ حرف تعمیل کردی گئی یا نہیں۔ وہ مرض کا ماہر ہو تو ہو مریض کا غمگسار نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ پہلے طبیب کے پیشہ کا محرک خدمتِ خلق ہوتا تھا۔ اب صرف ضوابط کی خانہ پُری رہ گئی ہے

ڈاکٹروں میں دواؤں سے علاج کرنے والوں کے علاوہ سرجن بھی ہوتے ہیں۔ ان کی اہمیت مسلم ہے۔ ڈاکٹری کے

باب الاستفسار

ہندوستان

(جناب جگدیش پرشاد صاحب - الہ آباد)

آپ نے انقلاب فرانس پر گزشتہ اشاعت میں نہایت مختصر لیکن بہت مکمل نوٹ شایع کیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اگر تمام تاریخی واقعات اور دنیا کی تاریخ پر اسی طرح مختصر نوٹ طیار کر دئے جائیں تو اس سے طالب علموں کو بھی بہت مدد ملیگی اور عوام بھی فایدہ اُٹھا سکیں گے۔ کیونکہ تاریخ کی کتابیں نہ ہر شخص پڑھ سکتا ہے نہ اتنی فرصت لوگوں کو ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اگر باب الاستفسار کے بجائے یہ سلسلہ مستقل طور پر نگار میں قایم کر دیا جائے تو دو چار سال میں ایک نہایت مفید کتاب طیار ہو سکتی ہے۔ میری رائے میں سب سے پہلے جغرافیہ اور تاریخ کو لینا چاہئے اور اس کے بعد دوسرے علوم و فنون کو

میں چاہتا ہوں کہ جغرافیہ و تاریخ کے سلسلہ میں سب سے پہلے ابتدا ہندوستان سے کی جائے۔ امید ہے کہ آپ نہایت مختصر طور پر ہندوستان کی موجودہ حالت اور گزشتہ تاریخ پر روشنی ڈالکر مدارس کے طلبہ، مدرسین اور عام پبلک کو ممنون فرمائیں گے

(نگار) بیشک یہ سلسلہ بہت مفید ہے اور ہو سکتا ہے کہ میں کسی آیندہ اشاعت سے ایک مستقل باب اس موضوع کے لئے وقف کر دوں لیکن فی الحال کوئی قطعی وعدہ نہیں کرتا۔ اگر مدرسین و طلبہ کی طرف سے اصرار ہوا اور مجھے یقین دلا دیا گیا کہ واقعی اس چیز کی ضرورت ہے تو پھر میں اس کو شروع کر دوں گا سب سے پہلے یقیناً جغرافیہ و تاریخ ہی کو لینا چاہئے اور اس کے بعد طبقات الارض (جیالوجی) بشریات (انتھراپالوجی) عضویات (فزیالوجی) اصول صحت (ہائی جین) طبیعیات (فزکس) فلکیات (اسٹرانومی) وغیرہ کو۔ اچھا اب ہندوستان کا بیان سنئے، اور بتائیے کہ کیا اس قسم کے مختصر رسالے مفید ہوں گے

ہندوستان ایک جزیرہ نما ہے ایشیا کے جنوب میں اور ملک ہے برطانیہ کی حکومت سے متعلق۔ اسکا رقبہ ۱۸۰۸۶۷۹ مربع میل ہے۔ شمال میں اسکے ہمالیہ اور افغانستان واقع ہے اور باقی تین طرف خلیج بنگال و بحیرۂ عرب جو بحر پاسفک کے حصے ہیں جزیرہ نمائے ہند میں برما شامل نہیں ہے لیکن ہے وہ برطانوی حکومت ہی سے متعلق۔ اسی طرح بعض مقامات ایسے ہیں جو جزیرہ نمائے ہند میں داخل ہیں لیکن برطانوی حکومت سے علیحدہ ہیں مثلاً مغربی ساحل پر گووا جو پرتگال کی حکومت میں

شامل ہے اور پانڈیچری جو فرانسیسیوں کے قبضہ میں ہے - لنکا برطانوی مقبوضہ ہے لیکن جزیرہ نمائے ہند سے علٰحدہ ہے
ہندوستان کے شمال میں ایک وسیع سلسلۂ کوہستان (ہمالیہ) پایا جاتا ہے جس کی بعض چوٹیاں دنیا کی سب سے اونچی پہاڑی چوٹیاں سمجھی جاتی ہیں۔ اس سلسلۂ کوہ سے نیچے وہ وادیاں شروع ہوتی ہیں جہاں متعدد دریا بہتے ہیں اور آگے چلکر میدانی علاقوں کو سیراب کرتے ہیں۔ گنگا اور دریائے سندھ سے سیراب ہونے والے علاقوں سے آگے جنوب میں دکن کا میدانی علاقہ ہے جہاں نیلگری اور گھاٹ پہاڑیوں کے سلسلے بھی پائے جاتے ہیں اور زیادہ جنوب میں ایک بڑا دریا دریائے برہمپتر پایا جاتا ہے - الغرض ہندوستان کا اکثر حصہ اپنے دریاؤں کی وجہ سے بہت سیراب ہے

اس کی آبادی ۱۹۳۱ء میں ۳۵۲۸۳۷۷۷۸ تھی، جس میں مختلف قومیں مختلف زبانیں بولنے والی شامل ہیں - ان زبانوں کی تعداد ۲۲۲ ہے اور اس کی تقسیم سات سلسلوں میں کی گئی ہے:- مغربی حصہ کی ہندی، بنگالی، تلگو، مرہٹی، تامیل پنجابی، راجستھانی اور ہندوستانی جو یہاں کی تنہا لٹریری زبان ہے۔ انگریزی بولنے والوں کی تعداد بھی تقریباً ۳۰ لاکھ ہے -

مذہبی تقسیم میں ہندوؤں کی تعداد ۲۳۹۱۹۵۱۴۰ ہے، مسلمانوں کی ۷۷۶۷۷۵۴۵ اور بودھ مت والوں کی ۱۲۷۸۶۸۰۶ شہروں میں کلکتہ اور بمبئی سب سے بڑے شہر ہیں، ان کے بعد مدراس، حیدرآباد، رنگون، دہلی، لاہور، لکھنؤ، احمدآباد، بنگلور، کراچی امرتسر، کانپور اور پونا کا مرتبہ ہے — ہندوستان سیاسی حیثیت سے دو حصوں میں منقسم ہے - برطانوی ہند اور ریاستی ہند - ریاستیں گو بظاہر آزاد ہیں لیکن ہیں وہ برطانیہ ہی کے اثر میں۔ برطانوی ہند کا رقبہ ۱۳۱۸۳۴۶ مربع میل ہے۔ سب سے بڑا صوبہ برما تھا جو اب ہندوستان سے علٰحدہ کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد صوبۂ مدراس ہے اور پھر صوبۂ بمبئی - یوپی، پنجاب، سی پی تقریباً برابر ہیں۔ ان کے بعد بہار، بنگال، آسام اور بلوچستان کا نمبر ہے - صوبۂ سرحد، اجمیر مارواڑ اور کورگ بہت چھوٹے صوبے ہیں، جزائر انڈمان ونکوبار کا صوبہ سب سے علٰحدہ ہے اور دہلی بھی اب علٰحدہ صوبہ ہو گیا ہے جہاں حکومت کا پایۂ تخت ہے - بمبئی میں سندھ اور عدن بھی شامل تھے، لیکن اب سندھ کا صوبہ الگ ہو گیا ہے اور عدن کو بھی جدا کر لیا گیا ہے۔ بڑے صوبوں کے حاکم اعلےٰ گورنر اور چھوٹے صوبوں کے چیف کمشنر کہلاتے تھے، لیکن اب یہ تفریق باقی نہیں رہی اور سب گورنر کہلاتے ہیں

ریاستی ہند کا رقبہ (جس میں کئی سو ریاستیں شامل ہیں) ۳۲۲۰۹۴ مربع میل ہے اور ہر ریاست کا فرمانروا علٰحدہ ہے، بڑی بڑی ریاستیں یہ ہیں :- حیدرآباد، کشمیر، میسور، گوالیار، بڑودہ - باقی ریاستیں ایجنسیوں سے متعلق ہیں -

تمام ہندوستان کے نظم حکومت کا ذمہ دار گورنر جنرل یا وسیرائے کہلاتا ہے جو وزیر ہند مقیم لندن کے سامنے جوابدہ ہے - وسیرائے کی حکومت دو ایوانوں سے متعلق ہے ایک کو اسٹیٹ کونسل کہتے ہیں اور دوسری کو لیجسلیٹو اسمبلی جو ۱۹۲۱ء میں قائم کی گئی تھی اور جس کے ممبروں کا انتخاب ہوتا ہے — ۱۹۱۹ء کی اصلاحات کی رو سے صوبوں میں بھی لیجسلیٹو کونسل قائم ہو گئی -

اصل انتظام وسیرائے کی اگزیکٹو کونسل اور صوبوں کی اگزیکٹو کونسلوں کے ذریعہ سے ہوتا ہے، مرکزی (یعنی وسیرائے کی) اگزیکٹو کونسل کا ہر ممبر ایک یا ایک سے زاید محکموں کا انچارج ہوتا ہے اور انڈین سول سروس کے ذریعہ سے وہ اپنے فرائض کو انجام دیتا ہے

ریاستوں کے معاملات پر بحث کرنے کے لئے رؤسائے ہند کا ایوان ہے جس میں مرکزی حکومت کی طرف سے ریزیڈنٹ صاحبان بھی شامل ہیں۔ وزیر ہند کو مشورہ دینے کے لئے لندن میں انڈیا کونسل بھی قایم ہے جسکے بارہ ممبروں میں سے دو ہندوستانی ہوتے ہیں اور ایک ہائی کمشنر بھی ہوتا ہے ـــــ یہاں کی آبادی کا ذریعۂ معاش زیادہ تر زراعت ہے۔ چاول، گیہوں اور کپاس کی پیداوار بہت ہوتی ہے۔ کوئلہ اور پٹرول کی کانیں بھی یہاں پائی جاتی ہیں اور اُن سے کم سونے چاندی کی بھی۔ جنگلی علاقہ بہت بڑا ہے جو ایک خاص محکمہ کی نگرانی میں ہے۔ ریلیں بھی بکثرت جاری ہیں۔ سکۂ رائج الوقت یہاں کا روپیہ ہے جو ایک شلنگ چھ پنس کے برابر سمجھا جاتا ہے یہاں کا خاص بنک امپیریل بنک ہے، لیکن اب جدید آئین کی رو سے ایک اور بنک رزرو بنک کے نام سے قایم ہو گیا ہے۔ ہندوستانی فوج میں افسر زیادہ تر انگریز ہیں۔ انگریزی فوج کی تعداد ستر ہزار ہے۔ ہوائی فوج بھی ہے اور بحری فوج بھی۔ پولیس کی تعداد ۲۰ لاکھ ہے۔

تاریخ مسلمانوں کے حملہ سے قبل جسکی ابتدا ۱۰۰۰ء سے ہوتی ہے، ہندوستان کا ایک حصہ یونانیوں نے بھی فتح کیا تھا لیکن کوئی سلطنت انھوں نے قایم نہیں کی۔ البتہ مسلمانوں کے حملوں نے جو ۳۰۰ سال تک جاری رہے دکن تک تسلط قایم کر لیا تھا ۱۳۹۸ء میں تیمور نے حملہ کیا اور ۱۵۲۶ء میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد یہاں قایم ہوئی۔ اٹھارویں صدی میں اس پر زوال آیا جسکا سبب ایرانیوں کا حملہ اور مرہٹوں کا خروج تھا۔ پندرھویں صدی میں پرتگالیوں نے ہندوستان کے ساتھ تجارت شروع کی اور اس سلسلہ میں یہاں آکر مقیم ہوئے۔ اس کے بعد ڈچ، فرانسیسی اور انگریز آئے اور ہر ایک نے اپنی اپنی تجارتی کمپنیاں قایم کرلیں۔ انگریزوں کی کمپنی کا نام ایسٹ انڈیا کمپنی تھا جس نے آہستہ آہستہ اپنی فتوحات بڑھا کر ۱۸۵۰ء تک تقریباً سارے جزیرہ نمائے ہند پر اپنا تسلط قایم کر لیا

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی توڑ دی گئی اور ہندوستان تاج برطانیہ سے متعلق ہو گیا۔ ۱۸۷۶ء میں وکٹوریہ یہاں کی ملکہ قرار دی گئی۔ اس کے بعد انگریزوں کو متعدد چھوٹی چھوٹی لڑائیاں لڑنا پڑیں اور ہر لڑائی کے بعد انکا تسلط بڑھتا ہی گیا۔

بیسویں صدی میں ہندوستان کے باشندوں میں آزادی کا خیال پیدا ہوا اور جنگ عظیم کے بعد یہ خیال زیادہ قوی ہو گیا۔ گاندھی جی نے برطانوی مال کا مقاطعہ کیا اور ستیاگرہ کو پھیلایا، لیکن اس تحریک سے پہلے ہی مطالبۂ آزادی پر حکومت نے کچھ اصلاحات کی تھیں لیکن ۱۹۲۲ء میں اصلاح کا ایک اور قدم اٹھایا گیا یعنی مجلس قانون ساز میں اہل ملک کی نمائندہ جماعت کو جگہ دی گئی۔ ۱۹۲۷ء میں ایک کمیشن سر جان سائمن کی سرکردگی میں قایم کیا گیا تاکہ آئندہ نظم و نسق کے متعلق اپنی رائے پیش کرے۔ ۱۹۳۰ء میں اس کمیشن کی رپورٹ شایع کی گئی۔ اس میں ایک سفارش یہ بھی تھی کہ برما کو ہندوستان سے علحدہ کر دیا جائے اور رائے دینے والوں میں ۶۶ لاکھ عورتیں بھی شامل کی جائیں ـــ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۳ء تک گول میز کانفرنس کے اجلاس لندن میں منعقد ہوئے اور وفاقی حکومت کا آئین مرتب کیا گیا۔ مارچ ۱۹۳۳ء میں وہائٹ پیپر کے نام سے حکومت کی تجاویز اصلاحات شایع کی گئیں اور ۱۹۳۵ء میں ایک ایکٹ نافذ کیا گیا جسکے رو سے برما ہندوستان سے علحدہ کر دیا گیا، عدن کا تعلق ہندوستان سے جدا ہو گیا اور صوبوں کو خود مختار حکومت تفویض کی گئی۔ وفاقی حکومت میں صوبوں کی حکومتیں اور ریاستہائے ہند شامل ہوں گی۔

جدید آئین چونکہ ایک علحدہ موضوع ہے اس لئے اس پر اس سلسلہ میں بحث کرنا مناسب نہیں

مطبوعات موصولہ

ریاض رضواں ریاض مرحوم کے کلیات کا مجموعہ ہے، جو ان کی زندگی میں تو شایع نہ ہو سکا لیکن اب ان کے احباب گورکھپور اور خصوصیت کے ساتھ جناب تلمذ حسین صاحب ام۔اے کی کوششوں سے شایع ہوا ہے

ریاض جس رنگ کے شاعر تھے اس کا علم ہر شخص کو ہے، گذشتہ دور شاعری کی یادگار یہی ایک رہ گئے تھے اور بڑا ظلم ہوتا اگر ان کا کلام شایع نہ ہوتا یا اگر شایع بھی ہوتا تو اس اہتمام کے ساتھ نہیں

کاغذ، کتابت، طباعت سب نفیس ہیں اور جلد بھی اچھی ہے۔ قیمت چھ روپیہ بظاہر زاید معلوم ہوتی ہے لیکن قدر شناسانِ ریاض کے لئے اس عروس سخن کا یہ رونما کچھ نہیں ہے۔ دائرۃ الادب حیدرگڑھ، حیدرآباد دکن یا دفتر شاہکار گورکھپور سے یہ مجموعہ ملسکتا ہے

مکاتیب مہدی یعنی مہدی حسن افادی الاقتصادی کے ان خطوط کا مجموعہ جو انھوں نے اپنے احباب کے نام لکھے تھے، مہدی حسن مرحوم ایک خاص رنگ کی انشار لکھنے والے تھے اور جنھوں نے مقالات مہدی کا مطالعہ کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ ان کا انداز بیان کتنا شوخ اور لطیف ہوتا تھا، جس کے نمونے ان خطوط میں بکثرت نظر آتے ہیں۔ مہدی بیگم نے اس مجموعہ کو شایع کرکے اُردو ادب پر یقیناً بڑا احسان کیا ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔ مہدی بیگم صاحبہ سے ذریعہ احمد حسن صاحب ڈپٹی کلکٹر لکھنؤ مراسلت کی جائے

اقبال کی شاعری ہمارے فاضل دوست مولانا عبد المالک آروی کا علمی مقالہ ہے جو انھوں نے ۹ جنوری ۳۸ء کو شاہ آباد اُردو لائبریری کے جلسہ میں پڑھا تھا۔ اس مقالہ میں ابتداءً مختصر طور پر اُردو شاعری کے ادوار سے بحث کی گئی ہے اور پھر بطریق گریز یہ بتا کر کہ اقبال کس اسکول کی پیداوار تھے ان کی شاعری پر تبصرہ کیا گیا ہے

اس سلسلہ میں جیسا کہ عبد المالک کی محققانہ فطرت کا تقاضا ہے، انھوں نے اقبال کی شاعری کے ہر پہلو پر نہایت عالمانہ انداز سے گفتگو کی ہے اور مختصراً میں اس مقالہ کی تعریف میں صرف یہ کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ

"ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا!"۔ وہ حضرات جو اقبال کی عمیق شاعری کا مطالعہ عمیق نگاہ سے کرنا چاہتے ہیں، انکو اس مقالہ میں بعض باتیں بہت عجیب و غریب ملیں گی۔ سکریٹری شاہ آباد اُردو لائبریری (آرہ) سے خط و کتابت کی جائے۔

ذکرِ غالب جناب مالک رام صاحب ام۔اے کی تالیف ہے۔موضوع نام سے ظاہر ہے۔اسوقت تک غالب پر متعدد کتابیں شایع ہوچکی ہیں بعض اچھی اور بعض معمولی، تاہم بقول ڈاکٹر عابد حسین صاحب (جنکا دیباچہ اس میں شامل ہے) ایک ایسی کتاب کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی جو جامع بھی ہو اور مختصر بھی۔چنانچہ مالک رام صاحب نے اس ضرورت کو پورا کردیا

اس کتاب میں نہ صرف وہ تمام واقعات درج ہیں جو غالب کے متعلق دوسری کتابوں میں پائے جاتے ہیں، بلکہ بعض نئی معلومات بھی اس میں شامل ہیں۔ واقعات کو سلسلہ وار بہ حساب سنین درج کیا گیا ہے، جس سے سمجھنے میں بہت آسانی ہوجاتی ہے۔ میرزا صاحب کی بالکل ایک نئی تصویر اس میں شامل ہے اور اُن کے آگرے والے مکان کی بھی۔اس کتاب کا وہ باب جس میں غالب کی تصانیف فارسی واُردو سے بحث کی گئی ہے، مجھے بہت پسند ہے۔انداز بیان آسان بھی ہے اور محققانہ بھی

مالک رام صاحب کو فارسی واُردو لٹریچر سے غیر معمولی شغف ہے اور وہ ہمیشہ اس ادبی خدمت میں مشغول رہتے ہیں جن میں سے بعض کا علم لوگوں کو ہوگیا ہے اور اکثر کا نہیں۔ اس کتاب کو بھی جامعۂ ملیہ نے شایع کیا ہے۔قیمت ۸ر ہے۔

سبدِ چین میرزا غالب کا وہ کلام جو کلیات میں شامل نہ ہوسکا تھا، ۱۸۶۷ء میں سبدِ چین کے نام سے شایع ہوا لیکن اب وہ بھی دستیاب نہ ہوتا تھا۔اتفاق سے ہمارے عزیز دوست مالک رام صاحب کو اس کا ایک نسخہ حبیب الرحمان خانصاحب شروانی کے کتب خانہ سے دستیاب ہوگیا اور انھوں نے اس کو ایڈٹ کرکے جامعۂ ملیہ کو دیدیا۔

مالک رام صاحب نے اس میں میرزا کا وہ کلام بھی شامل کردیا ہے جو کسی مجموعہ میں شامل نہ ہوا تھا۔گویا کلیات غالب کے علاوہ جتنا کلام غالب کا ملسکتا ہے وہ سب اس میں موجود ہے، اس میں میرزا کی وہ تصویر بھی ہے جو ذکرِ غالب میں دیگئی ہے ملک کو مالک رام صاحب کا ممنون ہونا چاہئیے کہ انھوں نے غالب پر یہ دو کتابیں پیش کرکے بڑی کمی کو پورا کردیا۔

یہ کتاب ۶ر میں مکتبہ جامعہ سے ملسکتی ہے

بنی اسرائیل کا چاند "بنی اسرائیل کا چاند" سر رائڈر ہیگرڈ کا نہایت مشہور تاریخی ناول ہے، جسے غالباً ہر انگریزی داں نے پڑھا ہوگا۔عبدالمجید صاحب حیرت بی اے نے اسی کا ترجمہ اس نام سے پیش کیا ہے اور مجھے سخت حیرت ہوتی ہے یہ دیکھ کر کہ انھوں نے اس سلسلہ میں کس صبر و تحمل سے کام لیا ہوگا

ہیگرڈ کے ناولوں کا ترجمہ کرنا آسان کام نہیں کیونکہ اس کے افسانوں کا پس منظر ایسا پیچیدہ ہوتا ہے کہ زبان وخیال دونوں میں از خود غیر معمولی اشکال پیدا ہوجاتا ہے، لیکن حیرت صاحب نے واقعی کمال کیا ہے کہ شروع سے اخیر تک کسی جگہ اس اُلجھن کو ظاہر نہیں ہونے دیا جو قدرتاً اس ناول کا ترجمہ کرتے وقت ان کے دل و دماغ میں پیدا ہونی چاہئیے تھی

زبان ومحاورہ دونوں حیثیتوں سے ترجمہ بہت کامیاب ہے۔ اس کتاب کو مکتبۂ پنجاب لاہور نے مجلد شایع کیا ہے

اور قیمت دو روپیہ رکھی ہے جو زیادہ نہیں ہے

بیوہ منشی پریم چند مرحوم کا ناول ہے جس کا دوسرا اڈیشن مکتبۂ جامعہ دہلی نے نہایت اہتمام کے ساتھ مجلد شایع کیا ہے۔ منشی پریم چند سوشل فسانے لکھنے میں یوں بھی خاص ملکہ رکھتے تھے، لیکن چونکہ یہ فسانہ انھوں نے کافی تجربہ و مہارت کے بعد لکھا ہے اس لئے ان کے فن افسانہ نگاری کا بہترین نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ اس میں انھوں نے ظاہر کیا ہے کہ ہندو معاشرت میں بیوہ کی زندگی کیا چیز ہے اور اس میں کیا اصلاح ہونا چاہئے۔ قیمت ایک روپیہ اور ملنے کا پتہ مکتبۂ جامعہ دہلی ہے

دلی کی دو سو برس کی تاریخ یہ مقالہ ہے مولوی سید حسن صاحب برنی کا جو انھوں نے جامعہ ملیہ کے اُردو اکاڈمی کے جلسہ میں پڑھا تھا۔ اس میں حملۂ تیمور سے قبل دلی کی دو سو سال کی تاریخ مختصر و جامع طور پر درج کی گئی ہے، واقعات کے استقصاء و تحقیق میں پوری کوشش سے کام لیا گیا ہے اور ہندوستان کی تاریخ کے جتنے ممکن الحصول ماخذ ہو سکتے ہیں اُن سب سے کام لیا گیا ہے، اسے بھی جامعہ ملیہ نے شایع کیا ہے قیمت درج نہیں ہے لیکن غالباً ۸ سے زیادہ نہ ہوگی

دہلی اس چار جزو کے رسالہ میں دہلی کے آثار و صنادید کی تاریخ بیان کی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس سے قبل سات جگہ دلی شہر کس کس جگہ آباد ہوا اور اُجڑا۔ نقشوں اور تصاویر سے اس کو زیادہ مفید و دلچسپ بنایا گیا ہے زبان و بیان کے لحاظ سے اس قدر سلیس ہے کہ ایک بچہ بھی آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ قیمت ۴ ہے اور ملنے کا پتہ مکتبۂ جامعہ دہلی

ضرب الامثال خواجہ عبدالمجید دہلوی کی تصنیف ہے جس میں انھوں نے بعض مشہور امثال کی توجیہ بیان کی ہے اور اس سلسلہ میں جو قصہ طلب باتیں تھیں ان کو قلمبند کر دیا ہے۔ اس رسالہ میں ۸۰ ضرب الامثال درج ہیں اور ہر ایک کے متعلق وہ واقعہ یا افسانہ بھی بیان کر دیا گیا ہے جس نے اسے مشہور کیا۔ یقیناً یہ کتاب کوئی تاریخی اہمیت نہیں رکھتی، لیکن فکاہی حیثیت سے خوب ہے۔ ملنے کا پتہ جامعۂ ملیہ دہلی، اور قیمت ۸ ہے

ایوان تمدن ڈاکٹر ریاض احمد بیگ صاحب چغتائی کا ناول ہے جو سرزمین عراق سے تعلق رکھتا ہے انھوں نے اس فسانہ میں موجودہ عراق کے تمدن کو پیش کرتے ہوئے وہاں کی عورت کے میلان سے بحث کی ہے اور نتیجہ کے طور پر یہ ظاہر کیا ہے کہ تہذیب حاضر کی آزادیاں عورت کی زندگی کے لئے کچھ زیادہ مفید نہیں ہیں

اکثر جگہ انداز بیان عربی ناولوں سے ملتا جلتا ہے۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے دیار عرب کی کافی سیاحت کی ہے اور اس طرح قدرتاً وہاں کے طرز انشاء سے انھیں متاثر ہونا چاہئے تھا۔ پلاٹ بہت سادہ و مختصر ہے لیکن دلچسپ عبارت صاف و سلیس ہے لیکن زبان کی لغزشوں سے پاک نہیں۔ مکالموں کے ذریعہ سے پلاٹ کو آگے بڑھانے میں بھی پوری کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ بعض جگہ ایسے خلا پائے جاتے ہیں جن کو پُر کرنا ضروری تھا اور بعض جگہ ضرورت سے زیادہ اطناب پایا جاتا ہے۔ یہ پہلا حصہ ہے اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ دوسرے حصہ میں فسانہ کا انجام واقعی کیا ہوگا۔ تاہم یہ حصہ بھی بُرا نہیں ہے اور لکھائی چھپائی بھی غنیمت ہے۔ قیمت ایک روپیہ ہے۔ اور ملنے کا پتہ الامان برقی پریس دہلی

مرثیۂ اقبال

جناب اسد ملتانی نے رحلت اقبال پر ایک ترجیع بند لکھا تھا جسے روزنامہ شمس ملتان نے شایع کیا ہے۔ نظم اچھی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ خاص تاثر کی حالت میں لکھی گئی ہے۔ قیمت ۳ر ہے

ابوالائمہ کی تعلیمات

امامیہ مشن لکھنؤ کا چھپنواں رسالہ ہے جسے مولانا سید علی نقی صاحب نے مرتب کیا ہے اس میں نہج البلاغۃ کے اُن حصوں کی تشریح کی گئی ہے جو اپنے مفہوم کے لحاظ سے مابہ النزاع ہیں اور ثابت کیا گیا ہے کہ اس کتاب کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہے جو تعلیمات مذہب شیعہ کے منافی ہو

جناب امیر کی تصنیف اور مولانا علی نقی صاحب کی تفسیر، ان دونوں کا اجتماع کوئی معمولی چیز نہیں ہو سکتا میں سمجھتا ہوں کہ یہ رسالہ سنیوں کے مطالعہ میں بھی آنا چاہئے۔ قیمت ۴ر ہے اور ملنے کا پتہ امامیہ مشن لکھنؤ

یادگار

جناب مائل انصاری خیرآبادی کی چند نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ جستہ جستہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مائل صاحب کی مشق سخن اچھی ہے۔ کتابت و طباعت بہت روشن ہے اور قیمت ۶ر۔ یہ مجموعہ جناب مائل سے خیرآباد سیتاپور کے پتہ پر مل سکتا ہے

سلسلۂ داستان گو

حیدرآباد کے نوجوانوں نے سلسلۂ داستان گو کے نام سے ہر ماہ ایک مختصر سا رسالہ شایع کرنے کا ارادہ کیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے اچھے اچھے طبعزاد اور مترجم افسانے اُردو میں پیش کئے جائیں۔ یہ بہ چپ اس سلسلہ کی پہلی اشاعت ہے جس میں دو افسانوں کے ترجمے "کیوں" اور "رقاصہ" کے عنوان سے شایع ہوئے ہیں۔

پہلا افسانہ سید محمد احسن بی۔اے کا ترجمہ کیا ہوا ہے اور دوسرا علی احمد صاحب بی اے کا۔ اس سلسلہ کا مقصود یہ ہے کہ جامعۂ عثمانیہ کے طلبہ میں ادب و انشا کا ذوق پیدا کیا جائے اور اُن کے کارناموں کو ملک سے روشناس کیا جائے۔ اسکی سالانہ قیمت عہ رکھی گئی ہے جو کسی طرح زاید نہیں ہے۔ اس اشاعت میں جو ترجمے شایع ہوئے ہیں وہ صاف و سلیس ہیں اور پڑھنے کے قابل۔ میری رائے میں اگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ظاہر کر دیا جاتا کہ وہ کس فسانہ کا ترجمہ ہیں تو افادی حیثیت زیادہ بڑھ جاتی۔ غلام دستگیر تاجر کتب، رحیم خاں بلڈنگ عابد روڈ حیدرآباد سے اس باب میں خط و کتابت کی جائے

ماہنامۂ دستکاری کے دو رسالے

"الخضاب" اور "سونا بنانا" ہمیں ملے ہیں جو ڈاکٹر شفیع احمد صاحب کی تصنیف ہیں۔ ایک میں تمام قدیم و جدید نسخے خضاب کے درج کر دئے ہیں اور دوسری میں بتایا گیا ہے کہ سونا بنانے کا دعویٰ کرنا یکسر مکر و فریب ہے، لیکن اس کے ساتھ بعض ترکیبیں ادنیٰ قسم کے پتھروں کو قیمتی پتھروں میں تبدیل کر دینے کی بھی درج کر دی ہیں

رسالۂ دستکاری دہلی ایک زمانہ سے صنعت و حرفت کی خدمت انجام دے رہا ہے اور لوگ اس سے فایدہ اُٹھا رہے ہیں۔ جن حضرات کو ان باتوں سے دلچسپی ہو وہ اڈیٹر دستکاری۔ دہلی سے خط و کتابت کریں

مقدس ٹائم چارٹ

روغنی نقشہ ہے جس میں آنحضرت کے تمام اہم واقعات زندگی کو ابتدا سے آخر تک بہت

خوش سلیقگی سے دکھایا گیا ہے۔ بعض بعض واقعات کو نقشوں سے بھی ذہن نشین کرایا گیا ہے۔ بچوں اور عورتوں کو سمجھانے کے لئے سیرت نگاری کا یہ طریقہ اچھا ہے۔ نذیر محمد خانصاحب مسکرا (ہمیرپور) سے خط و کتابت کی جائے۔ قیمت ۱۲ ار ہے۔

آگ ہفتہ وار اخبار ہے جو لکھنؤ کی سرزمین سے حال ہی میں نکلنا شروع ہوا ہے، پریم بندھو صاحب اس کے ڈائرکٹر ہیں اور خلیق ابراہیم صاحب چیف اڈیٹر۔ سوشلسٹ خیال کی ترویج اس کا مقصد ہے اور ملک کی کامل آزادی اس کا نصب العین۔ مذہب انقلاب میں چونکہ یہ دونوں مقاصد "ایمان مجمل" کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لئے ان سے اختلاف کی جرأت شاید ہی کسی کافر کو ہو سکتی ہو

تمام مقالے، تمام نظمیں اور جملہ اداریہ تحریریں اسی مدعا کو سامنے رکھ کر پیش کی جاتی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کے تمام کارکن اپنے دلوں میں ملک و ملت کا غیر معمولی جوش رکھتے ہیں۔ ادب و انشاء کے لحاظ سے بھی اس کو خصوصیت خاصہ حاصل ہے۔ اس میں تصویریں بھی ہوتی ہیں لیکن معیاری نہیں۔ فلمی تصاویر سے اگر اس کو پاک رکھا جائے تو بہتر ہے۔ نمونہ دفتر آگ جھوائی ٹولہ لکھنؤ سے مل سکتا ہے

آئندہ جنوری ۳۹ء کا "نگار"

"مصحفی" نمبر ہوگا

اساتذۂ قدیم میں "مصحفی" جس مرتبہ کا شاعر ہوا ہے، اس کا اندازہ یوں کرنا چاہئے کہ میر کے ساتھ ساتھ اس کا نام بھی لیا جاتا ہے بلکہ اس طرح کہ شاعری کی جن جن اصناف میں اس نے اپنا کلام پیش کیا اُن کو چھونے کی ہمت میر کو بھی نہیں ہوئی

تمام اردو شعراء میں یہ خصوصیت صرف مصحفی کو حاصل تھی کہ اس نے ہر رنگ کو اختیار کیا اور جس رنگ کو اختیار کیا اسے اپنا بنا لیا۔ خصوصیت کے ساتھ مشکل زمینوں کو مانوس بنا دینا کہ اس باب میں تو اس کا ہمسر کوئی پیدا ہی نہ ہوا

مصحفی نمبر بہت ضخیم ہوگا اور مومن نمبر کی طرح انتہائی احتیاط کے ساتھ مرتب کیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں جن جن عنوانات پر مقالے درکار ہیں ان کی مختصر سی فہرست یہ ہے:۔ (۱) مصحفی کی شاعرانہ خصوصیات۔ (۲) مصحفی تذکرہ نگار کی حیثیت سے۔ (۳) مصحفی اور اس کے ہمعصر اساتذہ۔ (۴) مصحفی اور اس کے تلامذہ (۵) مصحفی کی شاعری پر ماحول کا اثر۔ (۶) مصحفی بحیثیت ایک انسان کے۔ (۷) مصحفی ایک نقاد کی حیثیت سے۔ (۸) مصحفی اور مختلف اصناف سخن وغیرہ وغیرہ ۔۔ ان کے علاوہ آپ اور جو عنوان مناسب سمجھیں اس پر لکھ سکتے ہیں۔ مضمون مع تصویر زیادہ سے زیادہ اکتوبر ۳۸ء کے آخر تک پہونچ جانا چاہئے ۔

منیجر نگار لکھنؤ

غزل

اُمید امیٹھوی

روئی شبنم، گل ہنسا غنچہ کھلا میرے لئے
جس سے جو کچھ ہو سکا اُس نے کیا میرے لئے

ہستیِ موہوم کا اُف رے فریبِ اعتبار
گو یہ سب کچھ تھا مگر کچھ بھی نہ تھا میرے لئے

جھاڑ کر پھر سے بچھائی جائے دُنیا کی بساط
پھر نئے سر سے قیامت ہو بپا میرے لئے

ہنسنے والے رو دئے اور رونے والے ہنس پڑے
دل کے ہاتھوں جو نہ ہونا تھا ہوا میرے لئے

جو نہ ہونا چاہئے تھا وہ تو سب کچھ ہو چکا
کیا وہ ہوگا جو نہ اب تک ہو سکا میرے لئے

کیا خبر جیتے ہیں اب امید کس امید پر
ایسے جینے سے تو مرنا سہل تھا میرے لئے

بہکی بہکی باتیں

پھر مری تنہائیاں ہیں اور میں،
سُونی بزم آرائیاں ہیں اور میں

چاند چُپ، ساکت ہوا، شاعر خموش
سامنے پرچھائیاں ہیں اور میں

دُنیائے تصور میں جو کھو جاتا ہوں
اِک آئینۂ خیال ہو جاتا ہوں

کٹتے نہیں جب رات کے ساکت لمحے
تقدیر پہ روتا ہوا سو جاتا ہوں،

ہم اُنھیں جی سے بھلائے جائیں گے
وہ ہمیشہ یاد آئے جائیں گے

چند "وعدے" چند جملے ناتمام
نت نیا جادو جگائے جائیں گے

ایم۔ ن۔ سرمدی

غزل :۔

هادی مچھلی شهری

ہے یہ مشکل کہ موت دور نہیں، ورنہ جینا کوئی ضرور نہیں
شوق کی خامکاریوں کے سبب دل ہے مجبور، ناصبور نہیں،
خود پرستی بھی میری کیا کم ہے میری جنت میں کوئی حور نہیں،
بیدلی کو خدا کرے غارت اب طبیعت میں وہ سرور نہیں
ہم نے مانا کہ دور ہے منزل شوق اگر ہو تو کچھ بھی دور نہیں
عشق کی بے خودی، معاذ اللہ! اب مجھے ہوش کا غرور نہیں
جلوہ خارا گداز تھا اُس کا طور کا اس میں کچھ قصور نہیں
حُسن اور جلوہ ہائے رنگا رنگ عشق اور کچھ اُسے شعور نہیں
ڈھونڈھ ہادی دل حزین و خراب ورنہ جینے میں کچھ سرور نہیں

غزل :۔

دل شاہجہانپوری

اب تو اُس مرحلہ کا ہے آغاز نہ رہا اعتبارِ محرمِ راز
روح پُر کیف ہو نظر کی طرح مُطربِ مستِ ناز چھیڑ وہ ساز
سرگزشت اُس نظر کی طولانی، جس نظر سے ہے عشق کا آغاز
گونجتی ہے ابھی صدائے الست سُن رہا ہوں فضا میں وہ آواز
نہ رہا فرق عابد و معبود عشق کی بندگی بھی ہے اک راز
کیوں نہ ہوں مائلِ ترانۂ عشق، پندِ واعظ میں ہے نہ سوز نہ ساز
ان حدوں سے گزر چکا ہے دل، اب نہیں شکوۂ نشیب و فراز
صبحِ پیری ہے شمعِ بزمِ خموش ختم کر داستانِ سوز و گداز
فطرتِ عشق پر نثار اے دل، شمع کی زندگی ہے سوز و گداز

اس لئے فیروز شاہ کا تخت نشین ہونا ہر طرح مناسب ہے۔ رہا داور ملک تو اس کو نائب باربک بنا دیا جائے گا۔ یہ سن کر "خداوند زادہ" خاموش ہو گئی۔ اور پھر "فیروز شاہ" کی حکومت کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوئی سوائے اس کے کہ "خواجہ جہاں" نے دہلی میں "محمد تغلق شاہ" کا حال معلوم کر کے اس کا ایک فرضی بیٹا قرار دیکر تخت نشین کر دیا تھا (سو اس کے متعلق بھی شمس سراج عفیف[1] نے اپنی تاریخ فیروز شاہی" میں مفصل حالات لکھ کر ثابت کیا ہے کہ اس طرز عمل میں خواجہ جہاں[2] کی کوئی بدنیتی شامل نہ تھی) لیکن فیروز شاہ بغیر کسی مقابلہ کے دہلی میں داخل ہوا اور محل میں جا کر خداوند زادہ کے قدموں پر گر پڑا۔ اس نے فیروز کے سر پر تاج رکھا اور اس کے بعد کئی دن تک جشن شاہانہ قایم رہا

[1] ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی بہت مشہور کتاب ہے لیکن اس میں فیروز شاہ کے حالات بہت کم درج ہیں۔ البتہ شمس سراج عفیف نے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں نہایت تفصیلی حالات اس عہد کے لکھے ہیں اور غالباً اس سے بہتر کوئی تصنیف حالات فیروز شاہ کے متعلق نہیں ہو سکتی۔

شمس سراج عفیف کون تھا؟ اس کے متعلق زیادہ حالات نہیں معلوم ہو سکے۔ وہ موضع ابوہر کا رہنے والا تھا۔ اسی گاؤں کی رہنے والی بی بی نائلہ فیروز کی ماں بھی تھی۔ عفیف کا دادا ابوہر میں وصولی خراج کا افسر تھا اور غیاث الدین تغلق اس سے بہت خصوصیت سے پیش آتا تھا

شمس سراج عفیف نے نہ صرف فیروز شاہ کے حالات (اس کی ولادت کے زمانہ سے) لکھے ہیں بلکہ اس کے آئین جہانداری، رعایا کے حالات اور نظم و نسق سے بھی بحث کی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ مورخین مابعد نے اس سے بہت کم فایدہ اٹھایا اور زیادہ تر برنی کی تاریخ فیروز شاہی کو اپنا ماخذ قرار دیا۔ اس کی وجہ شاید یہ رہی ہو کہ اس کتاب کا اسوقت تک کسی کو علم نہ ہوا ہوگا۔ بہرحال ہم نے فیروز شاہ کے حالات لکھنے میں زیادہ تر اسی کتاب سے مدد لی ہے یا پھر فتوحات فیروز شاہی سے جو خود فیروز شاہ کی تصنیف ہے ہندوستان میں اس کے صرف دو نسخے نظر آتے ہیں ایک جنرل ہلٹن کی لائبریری میں اور دوسرا لوہارو کے کتب خانہ میں۔ مسٹر الیٹ نے اس کا ترجمہ کر کے اپنی تاریخ میں شامل کیا ہے

عفیف نے اپنی کتاب میں مناقب سلطان تغلق کا جابجا حوالہ دیا ہے لیکن یہ کتاب بالکل نایاب ہے

[2] جب سلطان محمد تغلق اپنے آخری عہد میں دولت آباد گیا تو دہلی تین شخصوں کے سپرد کر دی۔ ملک کبیر قتلغ خاں اور فیروز شاہ) نائب امیر حاجب۔ جب ملک کبیر اور قتلغ خاں کا انتقال ہو گیا تو محمد تغلق نے فیروز کو اپنے پاس ٹھٹہ میں بلا لیا اور ٹھٹہ سے خواجہ جہاں کو دہلی روانہ کیا کہ وہاں کا انتظام کرے اس کے ساتھ قوام الملک خان جہاں، ملک حسن اور ملک ہشام الدین ازبک وغیرہ دیگر امرا سلطنت بھی روانہ کئے گئے

اس کے بعد جب محمد تغلق کا انتقال ہوا تو امرا خراسان نے جو اس کی مدد کے لئے مختلف صوبوں سے آگئے تھے لشکر کا مال و اسباب اور بازار وغیرہ لوٹنا شروع کیا۔ فیروز شاہ ابھی تک تخت نشین نہ ہوا تھا اتفاق سے اسوقت خواجہ جہاں کا ایک غلام (مالح) یہاں کی خبر لینے بھیجا اس نے جو یہ ہنگامہ دیکھا تو فوراً دہلی واپس گیا اور خواجہ جہاں سے محمد تغلق کی وفات، مغلوں کا حملہ، بازار کا لوٹنا، شاہی افواج کا باہم کشت و خون وغیرہ تفصیل سے بیان کیا اور یہ بھی کہا کہ تاتار خاں اور امیر حاجب فیروز کا بھی پتہ نہیں ہے معلوم نہیں مغلوں نے انھیں قید کر لیا یا مارے گئے خواجہ جہاں یہ سنکر بہت متاسف ہوا کیونکہ فیروز سے اس کو بہت تعلق تھا اور اسے اپنا بیٹا کہا کرتا تھا) اور سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہ دیکھا کہ سلطان محمد تغلق کے ایک فرضی بیٹے کو رفع فساد کی غرض سے دہلی میں تخت نشین کر دے۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۱۲ پر ملاحظہ ہو)

فیروز شاہ کا نصب العین

سلطان فیروز حد درجہ رحیم المزاج، نیک نفس، پابند مذہب بادشاہ تھا۔ اور وہ خونریزی سے اتنا ہی بچتا تھا جیسا کہ اس کا ہم نام فیروز شاہ خلجی۔ اس نے خود فتوحات[1] "فیروز شاہی" میں جابجا اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے جور و ظلم سے پناہ مانگی ہے اور اس نے اپنا نصب العین یہی بتایا ہے کہ "ملک میں ہر طرف امن و سکون نظر آئے۔ خوں ریزی مفقود ہو جائے، رعایا خوشحال رہے

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۱۱)

جب خواجہ جہاں کو اس کے بعد معلوم ہوا کہ فیروز شاہ زندہ ہے اور دہلی کی طرف آ رہا ہے تو اس نے اپنی غلطی کو محسوس کیا لیکن چونکہ وہ ایک شخص کو تخت نشین کر چکا تھا اس لئے اس نے بھی فوج فراہم کرنی شروع کی اور بیس ہزار سوار جمع کر لئے۔ خواجہ جہاں، دہلی کا سارا خزانہ وہاں کی رعایا کو دے دیکر اپنا طرف دار بنا رہا تھا اور سب طرح سے اس کا ساتھ بھی دے رہے تھے لیکن حالت یہ تھی کہ دل ہی دل میں فیروز شاہ کی آمد اور اس کی کامیابی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ جب فیروز شاہ ملتان میں داخل ہوا تو یہاں کے تمام تاجروں نے لاکھوں تنکہ اس کی خدمت میں پیش کئے۔ چونکہ فیروز شاہ کو اسوقت روپیہ کی سخت ضرورت بھی اس لئے ان ہدایا کو لے لیا مگر یہ وعدہ کیا کہ دہلی پہونچکر ساری رقم واپس کر دیجائے گی (اور یہ وعدہ اس نے پورا کیا) اب فیروز شاہ جس قدر آگے بڑھتا جاتا تھا، اطراف و جوانب کے لوگ اس کی فوج میں شامل ہوتے جاتے تھے یہانتک کہ ۲۲ راجہ قرب و جوار کے بھی اسکے ساتھ ہو گئے جب سرستی سے گزر کر سلطان فیروز شاہ اکدار میں پہونچا تو یہاں خان جہاں وغیرہ دہلی سے آکر اس سے مل گئے اور وہاں کے سارے حالات بیان کئے۔ اتفاق سے یہیں فیروز کے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام اس نے فتح خاں رکھا اور اس کی یادگار میں وہیں ایک قصبہ فتح آباد کے نام سے تعمیر کر کے آباد کرایا

جب خواجہ جہاں کو معلوم ہوا کہ خان جہاں وغیرہ سب فیروز شاہ سے جا کر مل گئے ہیں تو یہ اور زیادہ مضطرب ہوا اور اس نے سلامتی اسی میں دیکھی کہ خود بھی فیروز شاہ کے پاس جا کر اپنی غلطی کا اظہار کر دے اور معافی چاہے ۔ خواجہ جہاں کی عمر اس وقت ۸۰ سال کی تھی اور تمام بال سفید ہو گئے تھے ضعف بھی بہت بڑھ گیا تھا لیکن یہ ہمت کر کے روانہ ہوا اور برہنہ سر گلے میں زنجیر ڈالے ہوئے فتح آباد فیروز شاہ کے حضور میں پہونچا۔ فیروز شاہ نے اس کی بہت عزت کی اور اس کے حقوق دیرینہ اور اپنے اس کے تعلقات قدیم پر نگاہ کر کے معاف کر دینا چاہا۔ اول اول لوگوں نے سخت اختلاف کیا لیکن جب فیروز شاہ کے رنج و ملال کو دیکھا تو یہ رائے قرار پائی کہ اس کو سامانہ کا حاکم کر دیا جائے تاکہ اپنی بقیہ عمر وہیں عبادت میں صرف کر دے۔ خواجہ جہاں اس فیصلہ سے بہت خوش ہوا اور سامانہ کی طرف روانہ ہوا لیکن اس کے بعد ہی امرا فیروز شاہ نے مشورہ کر کے ایک شخص شیر خاں نامی کو اسکے پیچھے روانہ کیا تاکہ راستہ ہی میں اس کو ہلاک کر دے۔ چنانچہ خواجہ جہاں نے چند منزلیں طے کی تھیں کہ شیر خاں وہاں پہونچ گیا اور خواجہ جہاں سے ملا۔ خواجہ سمجھ گیا اور اس کو بلا کر کہا کہ میں تیرے آنے کی وجہ سمجھ گیا ہوں لیکن جب میں نماز شروع کروں اسوقت تم اپنا کام کرنا۔ چنانچہ خواجہ وضو کر کے سجدہ میں گیا تھا کہ شیر خاں نے اس کا سر اپنی تلوار سے قلم کر دیا۔ (ماخوذ از تاریخ فیروز شاہی، شمس سراج عفیف)

[1] فتوحات فیروز شاہی میں خود فیروز شاہ نے اپنے حالات لکھے ہیں اور جو اصلاحیں اس نے کی تھیں اُن کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ جس انداز سے اس نے یہ تاریخ مرتب کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فیروز شاہ کس فطرت کا شخص تھا۔ ہر چند یہ کتاب بہت مختصر ہے لیکن معلومات سے لبریز ہے۔ اسکا ایک نسخہ مسٹر ٹامس کے پاس سنہ ۱۱۳۹ھ کا لکھا ہوا موجود ہے۔ جس سے مسٹر الیٹ نے فائدہ اُٹھایا اور اسکا ترجمہ کر کے اپنی تاریخ میں شامل کیا۔ یہ کتاب بھی نوادر میں شامل ہے۔ فیروز آباد کی جامع مسجد میں فیروز شاہ نے ایک مثمن (ہشت پہل) گنبد بنوایا تھا اور اسکے ہر پہلو میں اس کتاب کا ایک باب کندہ کرایا تھا۔

اصلاحات فیروز شاہی خود اس کے بیان کے مطابق (فیروز شاہ کی تصنیف فتوحات فیروزی)

اور اس کی طرف سے کسی کو ایذا نہ پہونچے

جب فیروز شاہ جشن سے فارغ ہوا تو "خواجہ فخر شادی" نے جو سلطنت کا محاسب اعظم تھا ایک فہرست پیش کی کہ خواجہ جہاں نے فلاں فلاں لوگوں کو اس قدر زر و جواہر تقسیم کیا تھا اور محمد شاہ تغلق نے جو دو کرو ر تنکہ تقاوی تقسیم کرنے کی غرض سے دیا تھا، اس میں سے فلاں فلاں کو اتنا ملا ہے۔ فیروز شاہ نے قوام الملک خان جہاں[1] سے رائے طلب کی۔ اس نے کہا کہ جب کوئی نیا بادشاہ تخت نشین ہوتا ہے، تو وہ گزشتہ تقصیریں لوگوں کی معاف کر دیتا ہے۔ اگر "محمد شاہ تغلق" کی تقسیم کردہ تقاوی اور "خواجہ جہاں" کے لٹائے ہوئے زر و جواہر کا مطالبہ کیا جائے گا، تو لوگ بد دل ہو جائیں گے اور وصول کچھ نہ ہوگا۔ فیروز شاہ نے اس رائے کو پسند کیا اور اسی وقت تمام کاغذات جن میں حساب درج تھا، مجمع عام میں جلا کر نیست و نابود کر دئے اور ہر شخص اپنی جگہ پر مطمئن ہو گیا۔

فیروز شاہ نے اپنے عہد میں بہت سے انتظامات کئے اور قوانین رائجہ میں متعدد اصلاحیں کیں لیکن ان میں سے کوئی اصلاح ایسی نہ تھی جس کی بنیاد رحم و انصاف پر نہ ہو

چنانچہ وہ خود فتوحات فیروز شاہی میں لکھتا ہے کہ:۔ (۱) مجھ سے قبل بہت سے ناجائز اور نا مشروع ٹیکس[2] قایم تھے۔

---

[1] خان جہاں پہلے ہندو تھا اور قبل اسلام اسکا نام کٹو تھا۔ یہ تلنگانہ کا رہنے والا تھا اور اپنی صفات کی وجہ سے راجہ تلنگانہ کا مقرب سردار ہو گیا تھا۔ جب سلطان محمد تغلق نے راجہ تلنگانہ کو دہلی بھیجا تو کٹو بھی ساتھ تھا۔ راستہ میں راجہ کا انتقال ہو گیا اور کٹو محمد تغلق کے پاس حاضر ہو کر مسلمان ہو گیا۔ بادشاہ نے اس کا نام مقبول رکھا۔ یہ بالکل جاہل شخص تھا لیکن ذہین حد درجہ کا تھا محمد تغلق نے اس کی عقل و فراست کو دیکھ کر چند دن بعد خان جہاں اور قوام الملک کا خطاب دیکر ملتان اسکی جاگیر میں کر دیا، اسکے بعد دہلی کا نائب وزیر بنا دیا۔ جب فیروز بادشاہ ہوا تو اس نے عہدۂ وزارت اسکے سپرد کر دیا۔ خان جہاں نے جس تدبیر و فراست سے فیروز شاہ کے عہد میں وزارت کی وہ تاریخ کے اہم واقعات میں شمار کئے جانے کے قابل ہے اور حقیقت یہ ہے کہ فیروز شاہ کی کامیابی کا انحصار تمامتر اسی وزیر کی دانشمندی پر منحصر تھا، بارہا ایسا ہوا کہ بادشاہ دہلی سے مہینوں بلکہ برسوں باہر رہا لیکن انتظام سلطنت میں کوئی فرق نہیں ہوا اور تمام معاملات بدستور جاری رہے۔ فیروز شاہ بھی اسکی بہت عزت کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ دہلی کا بادشاہ تو حقیقتاً خان جہاں ہی ہے

خان جہاں، عورتوں کی طرف بہت مایل تھا چنانچہ کہا جاتا ہے کہ دو ہزار خواتین روم و چین کی اسکے حرم میں داخل تھیں فیروز شاہ کا حکم تھا کہ خان جہاں کے جو اولاد نرینہ پیدا ہو، گیارہ ہزار تنکہ اس کی تنخواہ اور ہر لڑکی کی شادی کے بعد پندرہ ہزار تنکہ مقرر کر دیا جائے۔ خان جہاں نے سلطنت فیروز شاہ کے اٹھارھویں سال ۷۷۰ھ میں، جبکہ اس کی عمر ۸۰ سال کی تھی انتقال کیا۔ فیروز شاہ کو بہت رنج ہوا اور اس کے بیٹے جونان شاہ کو وزیر مقرر کیا جو بیس سال تک عہد فیروز شاہ میں نہایت قابلیت سے اپنی خدمات انجام دیتا رہا لیکن آخر میں شاہزادہ محمد خاں (جو بعد کو سلطان محمد شاہ کے نام سے تخت نشین ہوا) اس سے برہم ہو گیا اور اس نا اتفاقی نے سلطنت میں سخت بدامنی پیدا کر دی۔

[2] ان کی فہرست بھی فیروز شاہ نے دی ہے جن میں سے خاص خاص ٹیکس کے نام یہ تھے:۔ گل فروشی، دلالی بازاری، چنگی غلہ، ماہی فروشی، صابون گری، ریسمان فروشی، روغن گری، نخود بریانی، تہ بازاری، قمار خانہ، کوتوالی، چرائی۔

میں نے ان کو یک قلم منسوخ کر دیا اور حکم دیا کہ صرف شرع کے مطابق خراج وصول کیا جائے یعنی زمین مزروعہ کی پیداوار کا دسواں حصہ، معدنی پیداوار کا ایک خمس، اور مسلمانوں کی صدقہ وزکوٰۃ کی رقم خزانہ میں داخل ہونی چاہئے

(۲) میرے عہد سے پہلے مال غنیمت کا پانچواں حصہ سپاہیوں کو دیا جاتا تھا باقی خزانہ میں داخل ہوتا تھا میں نے اس کو بھی موقوف کیا کیونکہ حکم شرعی اس کے بالکل خلاف تھا، چنانچہ میں نے ہمیشہ خزانہ میں مال غنیمت کا ایک خمس داخل کیا اور باقی سپاہیوں کو تقسیم کر دیا

(۳) شرع کے خلاف مسلمانوں میں عام طور سے یہ رواج ہو گیا تھا کہ انکی عورتیں شہر کے باہر مزاروں پر جاتی تھیں، چونکہ اوباشوں کو بدمعاشی کا زیادہ موقع ملتا تھا اس لئے میں نے حکم دیا کہ آئندہ جو عورت مزاروں پر جائے گی اس کو سخت سزا دیجائے گی چنانچہ یہ دستور بالکل موقوف ہو گیا

(۴) مجھ سے قبل یہ دستور تھا کہ شاہی دسترخوان پر سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا کھایا جاتا تھا اور تلواروں کے قبضے وغیرہ زروجواہر سے مرصع ہوتے تھے میں نے ان باتوں کو ممنوع قرار دیا اور حکم دیا کہ ہتھیاروں میں صرف ہڈیوں کے دستے لگائے جائیں، اور ظروف نقرئی وطلائی کا استعمال یک قلم موقوف کر دیا جائے

(۵) امراء زریں لباس پہنا کرتے تھے اور زین، لگام، گلوبند، صراحی، خیمے، پردے، کرسیاں اور تمام چیزیں تصویروں سے آراستہ کی جاتی تھیں، میں نے ان ناجائز نقش ونگار کو محو کرا کے آئندہ کے لئے ممانعت کر دی

(۶) ریشمیں و زربفت کے لباس کا بھی امراء میں عام رواج تھا میں نے اس کی بھی ممانعت کی اور شریعت کے مطابق ایک انگل سے زیادہ عریض ریشمی کپڑے کا استعمال ممنوع قرار دیا

(۷) میرے مربی اور آقا سلطان محمد تغلق کے عہد میں جو لوگ قتل ہوئے ان کے وارثوں کو اور جو مفلوج الاعضاء تھے خود انھیں بلا کر اتنی بخشش کی کہ انھوں نے رضامندی کا اظہار کر کے اقرارنامے لکھدئے کہ ہم کو اب سلطان محمد تغلق پر کوئی دعوےٰ نہیں ہے میں نے یہ سارے اقرارنامے ایک صندوق میں بند کرا کے محمد تغلق کی قبر کے سرہانے رکھدئے اس امید کے ساتھ کہ خدا میرے آقا کے ساتھ مہربانی فرمائے گا

(۸) مجھ سے قبل جو وظایف اور دیہات معافی وغیرہ کے ضبط ہو گئے تھے ان کے متعلق میں نے عام حکم دیدیا کہ ازروئے سند جس کا حق ثابت ہو اس کے حق میں تمام وظایف وغیرہ بحال کر دئے جائیں

سراج عفیف نے فیروز شاہ کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقتاً فیروز نہایت اچھے صفات کا بادشاہ تھا اور محمد تغلق کے بعد ہندوستان کو ایسا فرمانروا مل جانا ایک ایسا مرہم تھا جس نے تمام جراحتوں کو مندمل کر دیا فیروز شاہی عہد میں جو انتظامات ہوئے، ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ :۔

(۱) بازار نفیس اور عمدہ اسباب تجارت سے معمور ہو گئے۔ (۲) مزدوروں کو پوری اجرت ملنے لگی اور انکی اقتصادی حالت بہتر ہو گئی

(۳) پیشہ ور لوگ نہایت اطمینان سے اپنے مشاغل میں مصروف ہو گئے اور شہر کی رونق بڑھنے لگی

(۴) ایک ایک کوس کے اندر چار چار گاؤں آباد ہوگئے

(۵) رعایا کے پاس غلہ اور تمام ضروری سامانِ زندگی مہیا ہوگیا اور تمام سلطنت میں امن و سکون و مسرت و خوشحالی نظر آنے لگی ہر چند ان ٹیکسوں کے موقوف کردینے سے سلطنت کی آمدنی کم ہوگئی لیکن اس کے عوض میں مخلوق خدا کو جو راحت و آسانی حاصل ہوئی وہ کافی سے زیادہ معاوضہ اس کی کمی کا تھا جس پر فیروز شاہ قانع تھا

سلطنت کے امراء و اراکین افسران و معززین علاءالدین خلجی سے پہلے جاگیریں رکھتے تھے اور وہی ان کی خدمات کا معاوضہ سمجھی جاتی تھیں۔ لیکن علاءالدین خلجی نے اس دستور کو مٹا کر نقد تنخواہیں کردی تھیں اور تمام جاگیریں وغیرہ خالصہ میں شامل کرلی تھیں۔ اس کے بعد بھی یہی دستور جاری رہا لیکن جب فیروز شاہ نے عنانِ سلطنت اپنے ہاتھ میں لی تو اس نے اپنی فطری فیاضی اور نرمی سے مجبور ہوکر جاگیریں پھر بحال کردیں اور کامل چالیس سال تک اس کے عہد سلطنت میں اس قاعدہ کی پابندی کی گئی اور کسی جاگیر دار یا معافی دار کی طرف سے اظہار سرکشی و بغاوت نہیں ہوا جس کے خوف سے علاءالدین خلجی نے جاگیریں ضبط کرلی تھیں[۱]

فوجی ملازمین کے لئے اس نے ایک قانون اور بنایا وہ یہ تھا کہ کوئی فوجی افسر مرجائے یا ضعیف ہوجائے تو اس کے بیٹے کو جگہ دی جائے اگر بیٹا نہ ہو تو داماد کو، اگر یہ بھی نہ ہو تو غلام کو اور اس کے بعد اور کسی قریبی رشتہ دار کو۔ جب تک فیروز شاہ زندہ رہا اس قانون پر اس نے عمل کیا اور اس طرح فوجی خدمات کی طرف لوگوں کو بہت زیادہ توجہ ہوگئی[۲]۔

فیروز شاہ کو چونکہ غلاموں کے جمع کرنے کا بہت شوق تھا اس لئے تھوڑے دنوں میں تحائف اور نذرانوں کی صورت سے اسقدر کثیر تعداد میں غلام جمع ہوگئے کہ سلطان کو مستقلاً ان کا انتظام کرنا پڑا۔ بہت سے غلام تو اس نے مختلف اقطاع ملک میں بھیج دئے اور وہاں ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔ جو غلام شہر میں رہ گئے ان کا مشاہرہ ۱۰ تنکہ سے دس تنکہ تک حسب حیثیت مقرر کیا۔ علاوہ اس کے ہر غلام کو اس کی میلانِ طبیعت کے موافق تعلیم بھی دلائی، کسی کو حافظ بنایا اور کسی کو فقیہ کسی کو حدیث کا درس دلایا اور کسی کو علم کلام کا، کسی کو خوشنویسی کی تعلیم دلائی اور کسی کو سپاہ گری کی، اسی طرح دوسرے

---

[۱] جاگیردار ملوک و امراء کی خوش حالی کا یہ عالم ہوگیا تھا کہ ہر شخص اپنی جگہ بیٹھ بیٹھا ہوا غلہ اور ... قصبات، دیہات اور پرگنوں کی آمدنی سے بڑے بڑے کارخانے انکے ہاں جاری تھے رعایا سے لیکر جاگیردار تک، امیر سے لیکر غریب تک، کاشتکار سے لیکر ... تک ہر شخص اپنی اپنی جگہ خوش اور نہایت بے فکری سے زندگی بسر کر رہا تھا۔

[۲] جب ملک عماد الملک دیوان عرض ضعیف ہوگیا تو اسکا بیٹا ملک اسحق اسکی جگہ کام کرنے لگا ایک دن اسحاق نے بادشاہ سے کہا کہ سپاہ میں بعض آدمی بہت ضعیف ہوگئے ہیں انکی جگہ دوسرے جوان آدمی بھرتی کرنا چاہئے بادشاہ نے کہا یہ رائے مناسب ہے لیکن پہلے مجھے تمہارے باپ کو علٰحدہ کرنا چاہئے کیونکہ وہ بھی بہت ضعیف ہے یہ سنکر اسحق خاموش ہوگیا۔ [۳] فیروز شاہ کے عہد میں اسی نوے ہزار سوار شاہی سپاہ میں تھے

پیشوں اور حرفوں کی طرف ان کو راغب کیا۔ چنانچہ ایک لاکھ اسّی ہزار غلاموں میں بارہ ہزار غلام صرف وہ تھے جو مختلف پیشوں اور صنعتوں کے ماہر تھے۔ بادشاہ نے غلاموں کا محکمہ ہی جدا کر دیا تھا اور اس محکمہ کے دیوان خزانچی، محاسب، وزیر الگ کر دئے تھے۔ جن امراء کو غلام دئے جاتے تھے اُن کو سخت تاکید کی جاتی تھی کہ اپنے بچوں کی طرح انکی پرورش کریں اور تعلیم و تربیت کی خاص نگرانی رکھیں

زراعت و آبادی

زراعت و آبادی کی ترقی کا یہ عالم تھا کہ دوآبہ کے ۵۲ پرگنے تھے اور تمام پرگنوں میں ایک گاؤں بھی غیر آباد نہ تھا اور ایک جریب زمین کاشت سے خالی نہ تھی، صوبہ سامانہ میں بھی ایک ایک کوس کے اندر چار چار گاؤں آباد ہو گئے تھے۔ اور تمام رعایا خوشحال نظر آتی تھی۔

ارزانی

ارزانی کی یہ کیفیت تھی کہ خاص دہلی میں (جہاں پایۂ تخت تھا اور بڑا شہر ہونے کی وجہ سے غلّہ کو قدرتاً گراں ہونا چاہئے) ایک من گیہوں ۸ جیتل میں ایک من جوار اور جو ۴ جیتل میں عام طور سے فروخت ہوتا تھا۔ ایک سوار اپنے گھوڑے کے لئے دس سیر دلا ہوا غلّہ جسے سراج عفیف نے دلیدہ یعنی "دلیہ" سے تعبیر کیا ہے ایک جیتل میں خرید لیتا تھا۔ گھی ڈھائی جیتل کا ایک سیر اور شکر ۲ یا ۳ ½ جیتل کی ایک سیر ملتی تھی[1]۔ اگر کبھی امساک باراں ہوتا تو ایک تنکہ فی من سے زیادہ کبھی نرخ نہ بڑھتا، چالیس سال تک فیروز شاہ نے حکومت کی اور اس زمانہ میں قحط عام یا گرانی کی شکایت کسی کو نہیں ہوئی۔ کپڑے کی ارزانی کا بھی یہی عالم تھا۔

سلطنت کی آمدنی اور امرا کی ثروت

اس کے عہد میں صرف دوآبہ کی آمدنی ۸۰ لاکھ تنکہ اور کل سلطنت کی ۶ کرور ۸۵ لاکھ تنکہ تھی لیکن یہ سب خزانۂ شاہی میں نہ آتی تھی بلکہ مختلف امراء و ارکین، ملوک و وزراء، ملازمین مال و فوج پر جاگیروں کی صورت میں منقسم تھی۔ خان جہاں وزیر کی ذات خاص کا تیرہ لاکھ تنکہ مقرر تھا۔ اسی طرح کسی کی جاگیر آٹھ لاکھ کی تھی، کسی کی ۶ لاکھ کی، کسی کی ۴ لاکھ تنکہ کی۔ چنانچہ امرا کی دولت کا یہ حال ہو گیا تھا کہ جب ملک شاہین شحنہ (جو مجلس خاص کا نائب امیر بھی تھا) مرا ہے تو علاوہ قیمتی گھوڑوں اور جواہرات کے پچاس لاکھ تنکہ نقد اس کے گھر سے نکلا تھا۔ اسی طرح عماد الملک کی دولت کا کوئی اندازہ نہ ہو سکتا تھا مشہور ہے کہ اس نے روپیہ رکھنے کے لئے جو تھیلیاں سلوائی تھیں ان میں ڈھائی ہزار تنکہ صرف ہو گیا تھا۔ (حالانکہ اُسوقت ایک ٹاٹ کا تھیلا چار جیتل میں آتا تھا) کہا جاتا ہے کہ سترہ کرور تنکہ نقد اس کے پاس موجود تھا۔ پھر یہ دولت و خوشحالی مخصوص افراد کا حصہ نہ تھی بلکہ تمام امراء و ارکین، ملازمین و متوسلین یہاں تک کہ کاشتکار اور مزدور بھی ایک دوسرے سے مستغنی نظر آتے تھے اور حد درجہ راحت و آرام سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ علماء و مشائخ کے لئے ۳۶ لاکھ تنکہ اور سائلین و فقراء کے لئے ایک لاکھ تنکہ بطور وظائف کے تقسیم کیا جاتا تھا

بیکار آدمیوں کا انتظام

فیروز شاہ کے لئے یہ امر بہت تکلیف دہ تھا کہ کوئی شخص اس کی سلطنت میں بیکار پھرے اور تکلیف سے زندگی بسر کرے چنانچہ اس نے ایک عام حکم دیدیا تھا کہ جب کوئی بیکار آدمی نظر آئے، تو کوتوال اہل محلہ سے اس کے حالات تحقیق کر کے بادشاہ کے روبرو پیش کرے۔ پھر بادشاہ ہر بیکار کو اس کی حسب حیثیت مشاغل بتا دیتا۔ کسی کو کارخانہ میں بھیج دیتا کسی کو وزیر کے پاس

---

[1] گھی اور شکر کا نرخ سراج عفیف نے نہیں لکھا بلکہ مارکوئیس ہیسٹنگز نے اپنی تحقیق سے لکھا ہے جسے ایڈورڈ ٹامس نے اپنی کتاب کرانکلس آف دی پٹھان کنگس میں درج کیا ہے

بھیجدیتا اگر کوئی کسی جاگیر دار کے پاس رہنا چاہتا تو وہاں بھیجدیا جاتا۔ ان لوگوں کے رہنے کے لئے مکان ملتے اور ان کی معاش کا پورا انتظام کیا جاتا

کارخانے اور ان کے مصارف

بادشاہ نے کل ۳۶ کارخانے قایم کر رکھے تھے۔ ان کی دو قسمیں تھیں معمولی اور غیر معمولی۔ معمولی قسم میں فیل خانہ یا پائے گاہ (اصطبل) مطبخ، شتر خانہ، سگ خانہ، آبدار خانہ وغیرہ شامل تھے ان کارخانوں کا خرچ ماہوار ایک لاکھ ساٹھ ہزار تنکہ تھا اور اسقدر صرف ملازمین وغیرہ کے مشاہرہ کا تھا

غیر معمولی قسم میں جامدار خانہ، علم خانہ، فراش خانہ، رکاب خانہ وغیرہ داخل تھے ان کارخانوں کے لئے ہر سال نیا سامان خریدا جاتا۔ جامدار خانہ کے لئے موسم سرما میں (بہار و گرمی کی خریداری علحدہ تھی) ۶ لاکھ تنکہ کا، علم خانہ کے لئے ہر سال ۸۰ ہزار تنکہ کا، اور فراش خانہ کے لئے ہر سال دو لاکھ تنکہ کا اسباب خریدا جاتا۔ ہر کارخانہ ایک امیر کے سپرد تھا اور سب کا حساب جداگانہ مرتب کیا جاتا تمام کارخانوں کی نگرانی خواجہ ابو الحسن کے ذمہ تھی۔

بادشاہ کے سکے اور بادشاہ کی دیانت

سلطان محمد تغلق کی طرح فیروز شاہ کو بھی سکوں کی طرف بہت توجہ تھی اس نے بڑی احتیاط کی کہ سکے عمدہ اور خالص طیار ہوں۔ اس کے عہد کے خاص سکے علاوہ طلائی اور نقرئی تنکہ کے جو پہلے سے رائج تھے۔ چہل و ہشت گانی۔ بست و پنج گانی (یہ سکے خاص فیروز شاہ کی اختراع تھے) بست و چہار گانی، دوازدہ گانی، دہ گانی، ہشت گانی، شش گانی تھے۔ ان کی قیمتیں علی الترتیب ۴۸ سے لیکر ۶ جیتل تک تھیں

ایک بار بادشاہ کو خیال آیا کہ خرید و فروخت کے وقت ایک جیتل سے کم کا حساب ہوتا ہوگا تو بیچنے والا کیونکر فاضل رقم واپس کرتا ہوگا، جبکہ جیتل سے کم کوئی سکہ نہیں ہے[1]، چنانچہ اس نے دو سکے اور رائج کئے ایک نصف جیتل کا جسے آدھہ کہتے تھے اور دوسرا پاؤ جیتل کا جس کا نام بیکھ[2] رکھا گیا

ایک دفعہ بادشاہ کو دو آدمیوں نے خبر دی کہ شش گانی سکہ میں کچھ خفیف سی کھوٹ ہے اور بازار میں اس کا چرچا ہو رہا ہے۔ بادشاہ نے وزرار کو حکم دیا کہ اس کی کامل تحقیقات کی جائے۔ یہ واقعہ ۷۷۶ھ ۱۳۷۴ء کا ہے۔ خان جہاں زندہ تھا جب اس کو بھی خبر ہوئی تو بادشاہ سے عرض کیا کہ سکہ کی حالت نا کتخدا لڑکی کی سی ہے کہ اگر اس کی عصمت پر جھوٹا الزام بھی لگ جائے تو پھر اسے کوئی نہیں پوچھتا، اس لئے اگر علانیہ تحقیقات کی گئی اور کھوٹ ثابت ہو گیا تو شاہی سکہ کا اعتبار اُٹھ جائے گا، اس لئے پہلے خفیہ جانچ مناسب ہے اس وقت کجر شاہ ٹکسال کا مہتمم تھا۔ اس سے خان جہاں نے دونوں مخبروں کو حراست میں لیکر کہا کہ کیا تم اپنی طور پر تحقیق کر کے مجھے اطلاع دو گے۔ چنانچہ اس نے تفتیش کی اور خان جہاں سے کہا کہ واقعی ٹکسال کے بعض شریر

---

[1] جیتل سے کم قیمت سکے، فلوس (پیسے) کہلاتے تھے لیکن کوئی سکہ جیتل کی قسم کا اس سے کم قیمت نہ تھا، اس نے چاندی اور تانبہ ملا کر نہایت چھوٹے چھوٹے دو سکے ½ اور ¼ جیتل کی قیمت کے اور رائج کئے۔ [2] غالباً اس لفظ کی حقیقت "بھیک" رہی ہوگی یعنی وہ سکہ جو گداگروں کو بھیک میں آسانی سے دیا جاسکے

آدمیوں نے سکہ میں کچھ کھوٹ ملا دی ہے۔ خان جہاں یہ سن کر خاموش ہوگیا۔ اور پھر کچھ سوچکر حکم دیا کہ سناروں کو بلاکر بادشاہ کے سامنے اس طور سے جانچ کرائی جاوے کہ وہ سکہ کے کھرے ہونے کی طرف سے مطمئن ہو جائے۔ کجرشاہ نے سناروں سے حالات بیان کئے اُنھوں نے مشورہ دیا کہ ہم لوگ بادشاہ کے سامنے بغیر کسی سامان کے برہنہ طلب کئے جائیں لیکن تھوڑی سی چاندی کسی کوئلہ کے اندر رکھکر سوراخ یا شگاف کو موم سے بند کر دیا جائے۔ جب ہم سکہ گلائیں گے تو اس کوئلہ کو بھی اس میں ڈالدیں گے اور اس کی چاندی سکہ کی چاندی سے ملکر وزن کو پورا کر دیگی۔ چنانچہ اس پر عمل کیا گیا اور مجمع عام میں بادشاہ کے سامنے سکہ کی جانچ کی گئی۔ چونکہ اس ترکیب سے کسی کو کھوٹ کا پتہ نہ چلا اور سکہ کا وزن صحیح نکلا اس لئے بازاروں میں عام اعلان کر دیا گیا کہ جانچ سے سکہ ششگانی بالکل کھرا معلوم ہوتا ہے اور اس میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔ کجرشاہ کو خلعت دیا گیا اور مخبروں کو شہر بدر کر دیا گیا۔ لیکن چند دن بعد خان جہاں نے کسی اور بہانے سے کجرشاہ کو علحدہ کر دیا

اس سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ خان جہاں کس قابلیت کا وزیر تھا بلکہ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ معاملات سلطنت میں فیروزشاہ کیسا امین اور متدین تھا

جب بادشاہ نے بنگال کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد شہر حصار فیروزہ کی بنیاد ڈالی (جس کا حال ہم آگے بیان کریں گے) تو اس نے اس نواح کی زمین کو (جس میں فتح آباد اور حصار فیروزہ دونوں داخل تھے) بہت آباد کیا[1] اور نہریں جاری کر کے تمام قصبات و دیہات (جس میں ہانسی، جنید[2] اور دہاترہ بھی شامل تھے) کی پیداوار کو بہت بڑھایا

بادشاہ کو آبادیٔ املاک کا اس قدر خیال تھا کہ بارش کے زمانہ میں وہ خاص خاص سرداروں کو متعین کرتا کہ نہروں کے کنارے پھر کر دیکھیں کہ سیلاب کہاں تک پہونچتا ہے اور وہ بہت خوش ہوتا جب اُسے معلوم ہوتا کہ کاشتکار نہروں سے فایدہ اُٹھارہے ہیں۔ فیروزشاہ کے یہی انتظامات تھے جنھوں نے نہ صرف اُس کی جاگیر بلکہ سارے ملک کو آباد و خوش حال بنا دیا تھا۔

فیروزشاہ کے عہد میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے وہ اس کی تعمیرات ہیں جنھوں نے ایک طرف ملک کو پُر رونق بنانے میں مدد دی تو دوسری طرف رفاہ عام میں غیر معمولی اضافہ کیا

اس کو تعمیرات[3] کا غیر معمولی شوق تھا اور آثار قدیمہ کی طرف توجہ کرنے میں اوّلیت کا فخر اسی بادشاہ کو حاصل ہے۔

---

[1] ان اضلاع میں تقریبًا ... اکوس تک نہروں کے ذریعہ سے آبپاشی ہوتی تھی اور کوئی حصۂ زمین زراعت سے خالی نہ تھا

[2] اس سے مراد غالبًا وہی جنید ہے جہاں آجکل ایک سکھ خاندان فرمانروا ہے

[3] فیروزشاہ کے عہد میں ملک غازی شحنۂ میر تعمیرات تھا جو اس فن کا بہت بڑا ماہر تھا اسکا نائب ایک شخص عبدالحق تھا جسے جاہر سوندھار بھی کہتے تھے چوب تراشوں، سنگ سازوں، آہنگروں، وغیرہ کی جماعتیں الگ الگ تھیں اور ہر ایک جماعت پر ایک شحنہ یا داروغہ مقرر تھا جب کوئی عمارت زیر تجویز ہوتی تو دیوان وزارت کے سامنے نقشہ پیش کیا جاتا اور وہ اسکو دیکھنے کے بعد خزانہ سے ضروری روپیہ تعمیر کے لئے منتظمین کو دیدیتا

علاوہ فتح آباد[1] و فیروزہ حصار[2] کے اس نے حسب تفصیل ذیل اور نئے شہر تعمیر کئے:-

فیروز آباد[3]۔ فیروز آباد ہارنی کھیڑا، تغلق پور کاسنہ، تغلق پور ملوک کموت، اور جونپور[4]، اس نے محلات بھی کثرت سے تعمیر کرائے جن میں فیروز کوشک، نزول کوشک مہندواری، کوشک حصار فیروزہ، کوشک فتح آباد، کوشک جونپور، کوشک شکار (جسے اب فیروز شاہ کا کوٹلہ کہتے ہیں اور جو دلی سے نظام الدین جاتے ہوئے راستہ میں ملتا ہے) کوشک بند فتح خاں، کوشک سامورہ، خاص شہرت رکھتے تھے

---

[1] جب فیروز شاہ، سندھ سے دہلی کی طرف عنانِ حکومت ہاتھ میں لینے کی غرض سے چلا اور سرستی سے گزر کر منزل اکدار میں پہونچا تو وہاں اس کے لڑکا پیدا ہوا جس کا نام اس نے فتح خاں رکھا اور وہیں اس مسرت کی یادگار میں ایک شہر فتح آباد کے نام سے تعمیر کرایا

[2] جب بادشاہ، بنگال کی مہم سے فارغ ہو کر دلی آیا اور انتظام مملکت کی طرف متوجہ ہوا تو اسے اسی سلسلہ میں حصار فیروزہ کی بھی تعمیر کی۔ جہاں حصار طیار کیا گیا وہاں پہلے ایک گاؤں (لہراس بزرگ) آباد تھا پانی یہاں تقریبًا معدوم تھا اور عراق و خراسان کی طرف سے جب مسافر یہاں آکر ٹھہرتے تھے تو انھیں ایک گھڑے پانی کے لئے چار چار جیتل ادا کرنا پڑتا تھا فیروز شاہ نے اس جگہ کو پسند کیا اور حصار کی تعمیر شروع کرادی۔ تمام ملوک و امرا کو خدمتیں تقسیم کر دیں، اور چند سال میں یہ حصار (جو پتھر اور چونے سے بنایا گیا ہے) مکمل ہو گیا اور اسکا نام حصار فیروزہ رکھا۔ اسکے بعد چاروں طرف خندق کھدوائی اور اسکی مٹی سے حصار کے گرد دمدمہ بنوایا۔ حصار کے اندر ایک بہت بڑا تالاب تعمیر کرایا۔ جسکے پانی سے خندق بھی ہر وقت لبریز رہا کرتی تھی یہیں اس نے ایک بہت بڑا قصر بھول بھلیاں کی طرح تعمیر کرایا اور متعدد دیگر محل بنوائے۔ پہلے صدر مقام تحصیل مالگذاری کے لئے ہانسی مقرر تھا لیکن جب یہ شہر مکمل ہو گیا تو صدر مقام اس نواح کا حصار فیروزہ کر دیا گیا

[3] فیروز آباد کی تعمیر دہلی سے پانچ کوس کے فاصلہ پر شروع ہوئی اور تقریبًا ۸ دیہات کی زمین اس میں داخل کر لی گئی خاص خاص دیہات کے نام یہ تھے۔ اندرپت سرائے شیخ ابوبکر طوسی، کھیتوارہ، مہرولہ (غالبًا موجودہ مہرولی یا قطب صاحب) مقبرہ رضیہ سلطان کی زمین بھی اس شہر کے اندر آگئی تھی

اس شہر میں اس کثرت سے عمارتیں بنوائی گئیں کہ اندرپت سے لیکر کوشک شکار (جسے اب کوٹلہ فیروز شاہ کہتے ہیں) تک ۵ کوس میں ایک چپہ زمین بھی ایسی نہ تھی جہاں کوئی نہ کوئی عمارت نہ ہو۔ تمام مکانات پختہ اور وسیع تھے۔ ۸ مسجدیں صرف نماز جمعہ کے لئے اتنی وسیع بنوائیں کہ ہر مسجد میں دس ہزار آدمی نماز پڑھ سکتے تھے۔ یہ مسجدیں امراء نے تعمیر کرائی تھیں جو انھیں کے نام سے موسوم کی گئیں (کہا جاتا ہے کہ دہلی کی موجودہ کالی مسجد اور مسجد ترکمان دروازہ انھیں مسجدوں میں سے ہیں) جب تک فیروز شاہ زندہ رہا دہلی اور فیروز آباد کے درمیان کثرت سے لوگوں کی آمد و رفت جاری رہی اور ہر وقت اس پانچ کوس کے اندر میلا سا لگا رہتا تھا۔ صبح نماز کے وقت سے اونٹ، گھوڑے، خچر، گاڑیاں، چھکڑے، پالکیاں، تیار رہتی تھیں اور لوگ دہلی سے فیروز آباد اور فیروز آباد سے دہلی تک آیا جایا کرتے تھے گاڑی کا کرایہ چار جیتل، اونٹ کا ۲ جیتل، گھوڑے کا بارہ جیتل، پالکی کا نصف تنکہ تھا

[4] جب فیروز شاہ دوبارہ لکھنوتی کی مہم پر گیا اور قنوج و اودھ ہوتا ہوا اس مقام پر پہونچا جہاں اب جونپور ہے تو یہاں اس نے مناسب جگہ دیکھ کر ایک شہر آباد کرنا چاہا چنانچہ اس نے ساحل گومتی پر ۶ ماہ کے اندر ایک شہر تعمیر کرایا اور اپنے آقا و برادر عم زاد سلطان محمد تغلق کے نام پر (جسے جونا خاں بھی کہتے تھے) اس کا نام جوناپور رکھا جو بعد کو کثرت استعمال سے جونپور ہو گیا۔ یہ شہر بعد میں مشرقی سلطنت کا پایۂ تخت ہو گیا جس کا حال آپ آیندہ معلوم کریں گے

اس نے پانی کے بند بھی کثرت سے بنوائے۔ ان میں "بند فتح خاں"، "بند مالجا"، بند مہپال پور، بند شکر خاں، بند سالورہ اور بند وزیر آباد، بہت مشہور ہیں اور چھوٹے چھوٹے بندوں کا کوئی شمار نہیں ہے

دہلی اور فیروز آباد میں اس نے ایک سو بیس خانقاہیں اور سرائیں تعمیر کرائیں یہ ہمیشہ مسافروں سے بھری رہتیں اور بادشاہ کی طرف سے سب کو کھانا وغیرہ دیا جاتا تمام مصارف خزانۂ شاہی سے نقد دئے جاتے تھے اور ایک امیر، ان کا متولی تھا

فیروز آباد میں اس نے اپنے دربار کے لئے تین محل طیار کئے تھے ایک کا نام "محل صحن گلی"، اس کو محل انگور بھی کہتے تھے۔ دوسرے کا نام "محل چھجہ چوبیں"، تھا اور تیسرے کو "محل بار عام" کہتے تھے۔ (صحن میانگی اس کا دوسرا نام تھا)۔ پہلے محل میں صرف خوانین، ملوک، امرا، اور خاص خاص اہل قلم سے ملاقات ہوتی تھی۔ دوسرا محل گویا خلوتکدہ تھا اور نہایت ہی مخصوص امراء کے ساتھ وہاں نشست ہوتی تھی، تیسرا محل عام دربار کے لئے تھا[1]

فیروز شاہ کو باغوں کا بھی بہت شوق تھا، دہلی کے قریب اس نے بارہ سو باغات خود نصب کرائے اور علاء الدین کے زمانہ کے تیس باغات کو بھی از سر نو آباد کرکے بہت ترقی دی۔ اسی طرح سلورہ کے قریب اس نے ۸۰ باغ طیار کرائے اور چتور میں چالیس تمام باغوں میں علاوہ اور میووں اور پھلوں کے صرف انگور سات قسم کے پیدا ہوتے تھے اور بحساب فی سیر ایک جیتل فروخت کئے جاتے تھے۔ اسی ہزار تنکہ صرف ان پھلوں کی آمدنی تھی۔ جب حصار فیروزہ میں نہر کا پانی آنے لگا تو یہاں بھی کثرت سے باغات نصب کرائے

فیروز شاہ کے تمام کاموں میں جو رفاہ عام سے متعلق ہیں سب سے بڑا اور اہم کام نہروں کا اجراء تھا۔ یہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ حصار فیروزہ جس جگہ بنایا گیا تھا۔ وہاں پانی کی بہت تکلیف تھی[2] اس لئے اس نے، یہ مصیبت دور کرنے کے لئے اور نیز مزارعین کو فایدہ پہونچانے کے لئے دو نہریں بنوائیں۔ ایک نہر اس نے دریائے جمن سے، نکالی جس کا نام اس نے رجبواہ (رجیواہ) رکھا اور دوسری نہر دریائے ستلج سے جس کا نام الغ خانی تھا۔ یہ دونوں نہریں کرنال کے قریب ہوکر گزرتی تھیں اور ۸۰ کوس کے بعد دونوں ملکر شہر فیروزہ حصار میں پہونچتی تھیں[3]

---

[1] فیروز شاہ نے دہلی کا قیام ترک کر دیا تھا اور فیروز آباد ہی میں رہا کرتا تھا۔ جب دربار وغیرہ کی ضرورت ہوتی تھی تو وہ ان محلات میں آتا تھا۔ دربار میں تمام امراء کی جائے نشست مقرر تھی۔ خان جہاں وزیر تخت سے متصل داہنی جانب بیٹھتا تھا اور سراج عفیف (مصنف تاریخ فیروز شاہی) بھی کبھی کبھی دربار میں شریک ہوتا تھا۔ [2] قبل اجراء نہر فیروزہ حصار میں بوجہ قلت آب صرف خریف کی فصل ہوتی تھی اور وہ بھی ناقص لیکن جب نہر جاری ہوگئی تو ربیع و خریف دونوں فصلیں نہایت اچھی ہونے لگیں۔ ان نہروں سے ہزاروں بیگہ زمین کی آبپاشی ہوتی تھی اور وہ وسیع رقبہ جو نہروں کے قرب وجوار میں تھا چند دن کے بعد حد درجہ زرخیز اور آباد نظر آنے لگا۔ [3] اصل عبارت سراج عفیف کی یہ ہے:۔ "یک جوئے از لب آب جون کشیدہ، وجوئے دوم از دہانہ لب آب ستلج آوردہ از لب آب جون، چنانچہ رجبواہ وجوئے الغ خانی دہانہ ایں ہر دو جوئے از اتصال کرنال بیرون آوردہ میان ہشتاد کروہ کردہ در شہر حصار فیروزہ بردہ"۔

نہر جیوا جس کا اوپر ذکر ہوا اب بھی موجود ہے اور پورے ۲۰۰ میل کے رقبہ زمین میں اس وقت بھی آب پاشی ہوتی ہو

اسی طرح نہر ستلج اب بھی روپڑ اور سرہند کے درمیان موجود ہے

۱۸۳۳ء میں کرنل کالون نے نہر جیوا کے متعلق تحقیق کی تھی جس سے معلوم ہوا تھا کہ اس نہر کی تعمیر اس جگہ سے شروع کی گئی تھی جہاں سے جمنا نکلی ہے (اب اس مقام کا نام بادشاہ محل ہے) اور جگدولی، بوریہ، ہوتی ہوئی کرنال تک آئی تھی او یہاں سفیدوں[۵۱] کے قریب دریائے چٹانگ کی مشرقی شاخ سے مل کر ہانسی اور حصار تک چلی گئی تھی[۵۲]

اس نہر کا ثبوت عہد اکبری کی ایک سند (۹۷۸ھ) سے بھی ملتا ہے جس کے شروع میں لکھا ہے کہ "دریائے چٹانگ سے ۲۱۰ سال ہوئے سلطان فیروز شاہ نے نہر نکالی تھی۔ نالوں وغیرہ کا پانی بہتا ہوا سادھورہ[۵۳] کے قریب ہانسی، حصار کی پہاڑی کے دامن میں پہونچتا ہے"

علاوہ ان نہروں کے فیروز شاہ نے اور بھی متعدد نہریں جاری کی تھیں جن میں سے ایک کا ذکر تیمور نے اپنی ملفوظات میں قلعہ لونی کا حال لکھتے ہوئے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "قلعہ لونی دریائے جمنا اور ہنڈون کے درمیان واقع ہے۔ ہنڈون حقیقتاً ایک بڑی نہر ہے جسے فیروز شاہ نے دریائے کالی ندی سے نکال کر فیروز آباد کے محاذ میں جمنا سے ملا دیا تھا

ان تمام بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ فیروز شاہ کو عمارات اور رفاہ عام کے کاموں کی طرف بہت توجہ تھی اور اس نے کثرت سے اس قسم کی عمارتیں بنوائیں جن سے پبلک کو فایدہ پہونچے

آثار قدیمہ کو محفوظ رکھنے کا خیال، سب سے پہلے سلطنت ہند میں فیروز شاہ کو پیدا ہوا اور اس خیال کے ماتحت جن جن عمارتوں کی اس نے مرمت کرائی ان کا ذکر خود اس نے اپنی فتوحات میں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:- "پرانی عمارتیں جو خراب و ویران ہوگئی تھیں میں نے ان کی مرمت کرائی اور ان کی آبادی کو میں نے اپنے محلات میں تعمیر پر مقدم جانا۔ چنانچہ:-

(۱) دہلی کی جامع مسجد جو سلطان معزالدین سام نے تعمیر کرائی تھی اور کہنگی کے سبب سے خراب ہوگئی تھی میں نے اسکو بالکل نیا کرا دیا۔ (۲) سلطان معزالدین سام کے مقبرہ کی مغربی دیوار بوسیدہ ہوگئی تھی میں نے اس کو از سر نو تعمیر کرایا اور منقش محرابیں صندل کی لگوا دیں۔ سلطان معزالدین کا مینار بھی بجلی سے گر پڑا تھا میں نے اس کو پہلے سے بھی زیادہ بلند بنوا دیا۔

(۳) حوض شمسی (سلطان التمش کے حوض) میں بعض شریر آدمیوں نے پانی آنے کی راہیں بند کر دی تھیں میں نے ان

---

۵۱ دریائے چٹانگ، ہندؤں کے متبرک دریاؤں میں سے شمار ہوتا ہے

۵۲ اس نہر سے بعد کو سترھویں صدی عیسوی میں علی مردان خاں نے ایک شاخ دہلی کے اندر پہونچائی

۵۳ سادھورہ ضلع انبالہ کا ایک قصبہ جو جمنا سے ۲۰ میل جانب مغرب واقع ہے۔ اس کے قریب مرکنڈا ندی بہتی ہے لیکن چٹانگ دریا کے چشمے بھی اس سے آٹھ میل کے فصل پر پائے جاتے ہیں

لوگوں کو سزا دی اور پانی کے منبع پھر جاری کر دیئے۔ اسی طرح حوض علائی (سلطان علاء الدین کا حوض) مٹی سے بھر گیا تھا۔ اور وہاں کھیتی ہونے لگی تھی میں نے اس کو بھی صاف کرایا۔ (۴) سلطان التتمش کا مدرسہ (جو التتمش کے مقبرہ سے ملحق تھا) بالکل خراب ہو گیا تھا میں نے اُسے بھی ازسرِ نو بنایا اور صندل کے دروازے اس میں لگوا دیئے۔ جو ستون گر گئے تھے ان کو پہلے سے زیادہ اچھا بنوایا، مقبرہ کا صحن مدور نہ تھا میں نے اُسے مدور کرا دیا۔ چاروں برجوں کا پشتہ گر گیا تھا وہ بھی میں نے وسیع کرا دیا۔ (۵) سلطان شمس الدین کے بیٹے معز الدین سام کا مقبرہ جو ملک پور میں تھا بالکل کھنڈر ہو گیا تھا اور قبر کا کہیں نشان نہ تھا میں نے ازسرِ نو برج کی تعمیر کرائی۔ اور احاطہ کی دیوار کھچوا کر قبر کا چبوترا بنوا دیا۔ (۶) سلطان شمس الدین کے بیٹے سلطان رکن الدین کا مقبرہ جو ملک پور میں تھا بالکل خراب ہو گیا تھا میں نے اس کی دیوار احاطہ کھنچوائی اور نیا گنبد بنوا کر ایک خانقاہ بھی وہیں تعمیر کرا دی۔ (۷) سلطان علاء الدین کے مقبرہ کی مرمت کرائی اور صندلی دروازے اس میں لگوا دیئے آبدار خانہ کی دیوار اور مدرسہ کے اندر جو مسجد تھی اس کی مغربی دیوار بنوائی اور چوپڑ کا فرش طیار کرایا۔ (۸) سلطان قطب الدین کا مقبرہ اور سلطان علاء الدین کے بیٹوں، خضر خاں، شادی خاں، فرید خاں، سلطان شہاب الدین، سکندر خاں، محمد خاں، عثمان اور اس کے پوتوں اور پرپوتوں کے مقبروں کی مرمت کرائی اور ازسرِ نو تعمیر کرایا۔ (۹) شیخ الاسلام نظام الدین (اولیا) کے مقبرہ کے دروازے اور قبر کی صندلی جالیاں خراب ہو گئی تھیں ان کی مرمت کرائی اور چاروں محرابوں میں سونے کے جھاڑ طلائی زنجیروں سے آویزاں کرا دیئے ایک مجلس خانہ[1] بھی بنوا دیا جو اس سے قبل نہیں تھا۔ (۱۰) سلطان علاء الدین کے وزیر اعظم تاج الملک کافوری کی قبر ہموار ہو گئی تھی اور گنبد گر پڑا تھا میں نے اسکی بھی ازسرِ نو تعمیر کرائی۔ (۱۱) دار الامان (یہ بڑے بڑے آدمیوں کے دفن ہونے کی جگہ تھی) میں نئے دروازے صندل کے لگوائے اور مشہور آدمیوں کی قبروں کے غلاف اور پردے بنوائے۔ (۱۲) سلطان محمد تغلق نے "جہاں پناہ"[2] کی بنیاد ڈالی تھی میں نے اُسے مکمل کرا دیا کیونکہ سلطان محمد تغلق میرا مربی اور اُستاد تھا۔ (۱۳) دہلی میں اگلے بادشاہوں نے جتنے قلعے اور حصار بنوائے تھے ان سب کی میں نے مرمت کرائی۔ (۱۴) ان مدرسوں و مقبروں کی تعمیر کا خرچ ان کی قدیم املاک اوقاف کی آمدنی سے کیا گیا۔ بعض عمارتیں ایسی بھی تھیں جن کے فرش، روشنی اور مسافرین و زائرین کی مہماں نوازی کے لئے کوئی آمدنی نہ تھی، میں نے ان کے لئے دیہات وقف کئے تاکہ ان کی آمدنی سے مصارف پورے ہوتے رہیں۔ (۱۵) نامور سلاطین اور اولیاء کے مقابر کے لئے دیہات وقف تھے میں نے انکو بدستور قائم رکھا۔ اور بعض جدید مقابر و مزارات کے لئے بھی

---

[1] اس وقت مزارات اولیاء کے ساتھ مجلس خانوں کی تعمیر کا عام رواج تھا شیخ صلاح الدین (عہد محمد تغلق کے مشہور بزرگ) کا مقبرہ جو موضع کھڑکی میں بنایا گیا تھا اس میں بھی مجلس خانہ شامل تھا۔ (آثار قدیمہ دہلی اسٹیفن)

[2] سلطان محمد تغلق نے قلعۂ علائی سے قلعۂ رائے پتھورا تک (جو سلطان جلال الدین فیروز خلجی کے وقت پرانی دلی کے نام سے مشہور تھا) دو دیواریں شہر پناہ کے انداز پر بنائی تھیں ایک سرا ان دیواروں کا قلعۂ علائی یا قلعۂ سیری سے ملا دیا تھا اور دوسرا قلعۂ رائے پتھورا سے اور اس کا نام جہاں پناہ رکھا تھا (آثار الصنادید)

زمین وقف کردی - (۱۶) میں نے دار الشفا بھی تعمیر کرایا - اس میں ادنے و اعلےٰ تمام طبقوں کے مریضوں کا علاج ہوتا ہے اطبائے حاذق تشخیص امراض و معالجہ کے لئے مقرر ہیں اور غذا دوا وغیرہ سب جایداد موقوفہ کی آمدنی سے مہیا کی جاتی ہے۔"

فیروز شاہ نے جو مدارس قایم کئے تھے ان میں سے ایک فتح خاں کے مقبرہ کے پاس تھا جسے "قدم شریف"[1] کہتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ایک مسجد بھی تھی اور ایک حوض بھی - فتح خاں، فیروز شاہ کا بہت محبوب فرزند تھا اور یہ مدرسہ مع مسجد کے اسی کی یادگار میں تعمیر کیا گیا تھا

دوسرا مشہور مدرسہ فیروز آباد میں تھا جو "فیروز شاہی مدرسہ" کے نام سے مشہور تھا - ضیار برنی نے لکھا ہے کہ "یہ مدرسہ بہ لحاظ عمارت و تعلیم اپنی نظیر نہ رکھتا تھا"

اس مدرسہ کی عمارت بہت وسیع تھی اور اس کے گنبد بڑے شاندار تھے - یہ مدرسہ ایک بہت بڑے باغ کے اندر تالاب کے کنارے واقع تھا ہر وقت سیکڑوں طلبہ اور کثیر علما و فضلا یہاں موجود رہتے تھے اور سارا باغ ان کے لئے وقف تھا - یہاں ان کی تعلیم و تعلم، درس و تدریس، عبادت و تفریح کے لئے مکانات بنے ہوئے تھے اور وہ نہایت آزادی کے ساتھ تالاب کے کنارے باغ کے کنجوں میں سنگ مرمر کے صیقل کئے ہوئے فرش پر اپنے مشاغل علمیہ میں منہمک نظر آتے تھے[2]

اس مدرسہ سے متعلق ایک مہمان خانہ بھی تھا جہاں سیاح آکر قیام کرتے تھے اور مسجد مدرسہ کے ساتھ ایک لنگر خانہ یا خیرات خانہ بھی تھا جس سے تمام غربا اور مساکین کو امداد ملتی تھی[3]

فیروز شاہ کے تمام کاموں میں سے سب سے زیادہ اہم اور موجودہ تہذیب کے نقطۂ نظر سے بے انتہا قابل قدر کام یہ ہے کہ اس نے قدیم عہد کے دو سنگین مینار میرٹھ اور خضر آباد کے قریب سے اکھڑوا کر کوشک شکار میں نصب کرائے یہ دونوں مینار ۲۰۰ سال قبل مسیح کے ہیں جن پر پالی حروف میں اسوکا (بدھ مذہب کے بہت بڑے مبلغ) کے احکام مذہبی منقوش ہیں جب یہ دونوں مینار دہلی پہونچے تو فیروز شاہ نے تمام پنڈتوں کو جمع کیا لیکن کوئی منقوش عبارت کو نہ پڑھ سکا[4]

---

[1] قدم شریف موجودہ دہلی کے "لاہوری دروازہ" سے ڈیڑھ میل جانب جنوب واقع ہے

[2] مسٹر اسٹیفن نے دہلی کے آثار قدیمہ پر ریویو کرتے ہوئے ایک مدرسہ کا ذکر کیا ہے کہ "۷۵۲ھ ۱۳۵۲ء میں فیروز شاہ نے ایک مدرسہ، حوض علائی کے قریب تعمیر کرایا تھا اب یہ عمارت مدرسہ شکستہ حالت میں ہے اور گاؤں کے لوگ وہاں رہتے ہیں اس مدرسہ کے متولی سید یوسف بن جمال نے ۷۸۹ھ ۱۳۸۸ء میں انتقال کیا"۔ یقیناً یہ مدرسہ، "مدرسۂ فیروز شاہی" سے علحدہ تھا کیونکہ حوض علائی کسی باغ کے اندر نہ تھا اور "فیروز شاہی مدرسہ" کا باغ کے اندر پایا جانا ثابت ہے۔

حوض علائی اب بھی موجود ہے اور اس کے مشرقی جانب متعدد عمارتیں ہیں انھیں میں مقبرہ فیروز شاہ کی عمارت بھی (مع ایک مسجد و مدرسہ کے) پائی جاتی ہے۔

[3] تاریخ فیروز شاہ برنی

[4] اب مسٹر جیمس پرنسپ نے جو آثار قدیمہ کے مشہور ماہر ہیں ان کتبوں کو پڑھ لیا ہے ان میں بودھ مذہب کی کچھ ہدایات درج ہیں اور خاص خاص مذہبی اصول بتائے گئے ہیں

ہر چند یہ دونوں مینار ہندو یا بودھ مذہب سے تعلق رکھتے تھے، لیکن فیروز شاہ نے بے انتہا کاوش و سعی محنت و صرف سے ان دونوں میناروں کو اپنی دارالحکومت میں منتقل کرایا[1] - صرف اس وجہ سے کہ وہ آثار قدیمہ کی حفاظت کا فطری ذوق رکھتا تھا اور اس مسئلہ میں بھی وہ مذہبی تعصب سے کام نہ لیتا تھا - بالکل ممکن تھا کہ وہ ان دونوں میناروں کو مسمار کرا کے تباہ کرا دیتا یا یہ کہ وہ انکی حفاظت نہ کرتا اور وہ خود ٹوٹ کر پامال و معدوم ہو جاتے لیکن فیروز شاہ نے ایسا نہیں کیا اور حقیقت یہ ہے کہ اس کا یہ احسان ایسا معمولی نہیں ہے جسے فن آثار قدیمہ اور بودھ مذہب فراموش کر سکے

اس قدر بیان سے یہ امر بخوبی واضح ہو گیا ہوگا کہ فیروز شاہ کو عمارات کا بڑا شوق تھا - ہمارے پاس کوئی مکمل فہرست ان تمام

---

[1] ٹھٹہ کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد فیروز شاہ نے دوران سیر و شکار میں خضر آباد کے قریب (جو دہلی سے ۹۰ کوس کے فصل پر واقع ہے) ایک گاؤں (توبرہ) میں ایک سنگین منار پہاڑی پر نصب دیکھا اور ارادہ کیا کہ اسے دہلی لے جائے چنانچہ اس نے قرب و جوار کے تمام لوگوں کو جمع کیا اور فوج کو بھی طلب کیا اس کے بعد اس نے سیمل روئی منگوا کر مینار کے گرد لپیٹی، زمین پر چاروں طرف موٹے موٹے تکیے اسی روئی کے زمین پر بچھوا دئے اور پھر زمین کھدوا کر مینار کو اس نرم جگہ پر لٹا دیا - اس کی بنیاد کے نیچے ایک بڑا چوکور پتھر تھا اسے بھی کھود کر نکالا - خیر یہاں تک تو کوئی ایسا دشوار کام نہ تھا، لیکن بڑی دقت اس مینار کو دہلی تک لیجانے میں تھی، بادشاہ نے اس غرض کے لئے ایک چھکڑا ۴۲ پہیوں کا طیار کرایا اور ہر پہیہ کے دُھرے میں مضبوط رسّے بندھوائے اور ہر رسّے پر ۲۰۰ آدمی کھینچنے والے متعین کئے - اس طرح وہ ساحل جمنا تک لایا گیا یہاں بڑی بڑی کشتیاں (جن میں سات سات ہزار من غلہ لادا جاتا تھا) مہیا کی گئیں اور ان پر یہ مینار نہایت احتیاط سے بار کر کے فیروز آباد تک لایا گیا (بادشاہ خود اس اہتمام کے وقت موجود تھا) یہاں جامع مسجد کے قریب پتھر چونے کی ایک عمارت پایۂ دار بنائی گئی جب ایک پایہ بن جاتا تو مینار اس پر چڑھایا جاتا پھر دوسرا پایہ بن جاتا تو اس پر رکھا جاتا اس صورت سے وہ اوپر تک پہونچایا گیا - اس کو سیدھا کرنے میں بڑی محنت صرف کی گئی اس کے سرے میں رسّا باندھا گیا اور رسّے کا دوسرا سرا چرخ میں باندھ کر اس کو گھمایا گیا - جب مینار آدھ گز بلند ہو جاتا تو اس کے نیچے سیمل روئی کے تکیے رکھے جاتے اور وہ بلند کیا جاتا اسی طرح جب وہ سیدھا عمود کی طرح کھڑا ہو گیا تو بنیاد میں پہلے وہی چوکور پتھر رکھا گیا اور اسکے بعد وہ مینار نصب کیا گیا اور اس کے بعد وہ مینار نصب کیا گیا - مینار کے گرد سنگ مرمر اور عباسی کا کام کیا گیا چوٹی پر سونے کا کلس لگایا گیا اس لئے اس کو مینار زریں کہنے لگے) اب بھی یہ مینار دہلی میں کوشک فیروز شاہ کے اندر (جسے کوٹلہ کہتے ہیں) موجود ہے - سراج عفیف نے لکھا ہے کہ اس کا طول ۳۲ گز تھا (۸ گز زمین کے اندر اور ۲۴ گز باہر) مگر اب اس کا طول ۴۲ فٹ - ۷ انچ ہے جس میں سے چار فٹ ایک انچ زمین کے اندر رہے

دوسرا مینار میرٹھ میں تھا لیکن یہ کچھ چھوٹا تھا - بادشاہ نے اسے بھی نہایت احتیاط سے منتقل کرا کے کوشک شکار میں نصب کیا جس وقت یہ مینار نصب ہو گیا تو بادشاہ نے بڑا جشن کیا اور پبلک کو عام اجازت اس کے دیکھنے کی دی گئی - شربت کی سبیل قائم کی جو کوئی دیکھنے آتا اسے شربت پلایا جاتا - فرخ سیر کے عہد میں بارود اُڑنے کی وجہ سے اس کے پانچ ٹکڑے ہو گئے لیکن انگریزوں نے اس کو جوڑ کر پھر ہندو راؤ کے باڑے میں نصب کیا جہاں وہ اب تک موجود ہے

عمارات کی نہیں ہے جو فیروز شاہ نے تعمیر کرائیں۔ البتہ فرشتہ نے اور صاحب طبقات اکبری نے حسب ذیل فہرست مرتب کی ہے:۔
۵۰ بند جن سے آب پاشی ہوتی تھی — ۴۰ مسجدیں — ۳۰ مدارس جن کے ساتھ مسجدیں بھی تھیں — ۲۰ خانقاہیں۔
۱۰۰ محل — ۵۰۰ شفاخانے — ۱۰۰ مقبرے — ۱۰ حمام — ۱۵۰ کنوئیں — ۱۰۰ پل

فہرست مرتبۂ طبقات اکبری:۔ ۵ بند (غالباً ۵۰) — ۴ مساجد (غالباً ۴۰) — ۳۰ مدرسے — ۲۰ خانقاہیں — ۱۰۰ محل — ۲۰۰ رباط (کارواں سرائے) — ۳۰ شہر — ۴ حوض — ۴ شفاخانے — ۱۰۰ مقبرے — ۱۰ حمام — ۱۰ مینارے — ۱۵۰ کوئیں — ۱۰۰ پل — باغوں وغیرہ کا کوئی شمار نہیں ہے ان میں سے ہر عمارت کے لئے اس نے جایداد وقف کی تاکہ وہ خراب نہ ہونے پائے اور اس کے مصارف پورے ہوتے رہیں

مدارس کے متعلق مورخین کا اختلاف ہے مآثر رحیمی[1] میں پچاس مدرسے درج ہیں۔ فقیر محمد لکھتے ہیں کہ طبقات اکبری اور تاریخ فرشتہ میں تیس کی تعداد درج ہے اگر ان میں سے کوئی تعداد صحیح نہ ہو تو بھی اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اسنے متعدد مدرسے قایم کئے

ان شفاخانوں کا جو انتظام تھا اس کا حال خود فیروز شاہ نے اپنی فتوحات میں لکھدیا ہے اور جسے ہم درج کر چکے ہیں۔ غربا کے فایدہ و سہولت کے لئے اس نے دیوانِ خیرات بھی قایم کیا تھا۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ جن غربا و مساکین کی لڑکیاں جوان ہو گئی ہوں اور بوجہ افلاس ان کی شادی نہ ہو سکتی ہو انھیں مدد دیجائے۔ پچاس سے تیس تنکہ تک ہر شخص کی مدد کی جاتی تھی۔ سراج عفیف لکھتا ہے کہ "اس سلسلہ میں ہزاروں آدمیوں کی اعانت کی گئی اور خدا جانے کتنی ناکتخدا لڑکیوں کی شادی ہو گئی"

یہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ علما و مشائخ کے لئے اس نے ۳۶ لاکھ تنکہ کے وظایف مقرر کئے (مقابر کے لئے ایک لاکھ تنکہ اس کے علاوہ تھے) لیکن اس نے خدمتِ علم صرف اسی حد تک نہیں کی، بلکہ تصانیف کی طرف بھی خاص توجہ کی جب سلطان نے نگرکوٹ[2] فتح کرنے کے بعد وہاں کے راجہ کو بدستور حکمراں قایم رکھا تو اس نے چند دن وہاں قیام بھی کیا۔ اس دوران میں اس سے لوگوں نے کہا کہ جب سکندر ذوالقرنین یہاں آیا تھا تو برہمنوں نے نوشابہ (سکندر بی بی) کا بت تیار کرکے اس کی پرستش

---

[1] مآثر رحیمی کا مصنف محمد عبد الباقی الرحیمی النہاوندی تھا۔ یہ عہد اکبری کے خاص لوگوں میں اور عبد الرحیم خان خاناں کے متوسلین خصوصی میں سے تھا۔ اس کتاب میں سلاطین دہلی کی تاریخ درج ہے اور خصوصیت کے ساتھ عہد اکبری کے امرا و ملوک کے حالات نہایت تفصیل سے درج کئے گئے ہیں عبد الرحیم خانخاناں کے حالات اس قدر شرح و بسط کے ساتھ لکھے ہیں کہ بعض لوگوں نے اس کو خانخاناں ہی کی سیرۃ قرار دیدیا۔ چونکہ یہ کتاب عبد الرحیم خانخانان کے نام منسوب ہے اسی لئے اس کا نام مآثر رحیمی رکھا گیا — [2] فتح کے بعد نگرکوٹ کا نام اسنے سلطان محمد تغلق کی یادگار میں (کیونکہ تغلق یہاں آیا تھا) محمد آباد رکھا [3] نگرکوٹ آنے سے قبل فیروز شاہ، سرہند کی طرف فتوحات میں مصروف تھا اور وہاں اُس نے ایک قلعہ فیروز پور کے نام سے تعمیر کرایا تھا

شروع کر دی تھی۔ چنانچہ اب بھی یہاں کے لوگ اسی مجسمہ کو پوجتے ہیں، علاوہ اس کے فیروز شاہ سے یہ بھی کہا گیا کہ مندر میں ۱۳۰۰ کتابیں قدیم زمانہ کی رکھی ہوئی ہیں۔ چنانچہ فیروز شاہ اس بت خانہ میں جس کو "جوالا مکھی"[1] کہتے تھے گیا اور وہاں تمام علماء کو طلب کر کے بعض کتابوں کا ترجمہ کرایا، انھیں کتابوں میں سے ایک کتاب حکمت نظری و عملی کی تھی جس کو اعز الدین خالد خانی نے (جو اس وقت کے مشہور شعراء میں سے تھا) نظم کر کے دلائل فیروز شاہی نام رکھا[2] ایک کتاب عروض علم موسیقی کی اور ایک فن پٹہ بازی کی بھی سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کی گئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فیروز شاہ کے عہد میں حاکم و محکوم کے درمیان ایسے تعلق پیدا ہو گئے تھے کہ ایک دوسرے کی زبان کو سیکھتا تھا اور تعصب بڑی حد تک مٹ چکا تھا۔ ضیا برنی کی تاریخ فیروز شاہی (جس میں عہد فیروز شاہی کے ابتدائی دس سال کے حالات بھی درج ہیں) اسی کے عہد میں ختم ہوئی تفسیر تاتار خانی[3] فتاوائے تاتار خاں (جو فن تفسیر و فن فقہ کی بے مثل کتابیں ہیں) اور عین[4] الملکی بھی اسی عہد کی مشہور تصانیف ہیں۔

---

[1] جوالا مکھی، کوہ آتش فشاں کو کہتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مندر میں کوئی آتشکدہ قایم تھا اور وہاں آتش پرستی ہوتی تھی [2] فرشتہ ۱۴۸۔

[3] غیاث الدین تغلق کے عہد میں خراسان کے فرمانروا نے ملتان اور دیپال پور پر حملہ کیا اسکی بیوی بہت خوبصورت تھی جس سے وہ ایک لمحہ کے لئے جدا نہ ہو سکتا تھا اور ساتھ ساتھ رکھتا تھا چنانچہ حملۂ ملتان کے وقت بھی وہ ہمراہ تھی یہیں اس سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ جب سلطان تغلق نے مغلوں کی فوج کو شکست دی اور فرمانروائے خراسان بھاگا تو اضطراب میں یہ لڑکا یہیں رہ گیا محمد تغلق نے اس کی پرورش اپنے بچوں کی طرح کی اور اس کا نام تاتار ملک رکھا وہ ابھی کمسن ہی تھا کہ سلطان محمد تغلق کا انتقال ہو گیا لیکن محمد تغلق نے بھی اس کی تربیت کا خاص خیال رکھا بعد کو تاتار ملک نے اپنی قابلیت سے بہت جلد مناصب جلیلہ حاصل کئے۔ فیروز شاہ کے عہد میں تاتار خاں کا خطاب ملا۔ اس کو علم کی طرف بہت شغف تھا اور خود بھی ایک فاضل شخص تھا اس نے اس عہد کے تمام اکابر علماء و فقہاء کو جمع کر کے فن تفسیر میں ایک کتاب تفسیر تاتار خانی اور ایک کتاب فقہ میں فتاوائے تاتار خانی مرتب کرائی۔ فیروز شاہ کی تخت نشینی کے چند سال بعد اس کا انتقال ہو گیا

[4] عین الملک کا نام عین ماہرو بھی تھا۔ یہ نہایت قابل و ذہین شخص تھا سلطان محمد تغلق کے عہد میں ایک بار اس کے بھائیوں کی طرف سے کوئی نامناسب حرکت سرزد ہوئی تھی تو سارے خاندان پر زوال آگیا تھا لیکن اس کے بعد ایک بار محمد تغلق دربار کر رہا تھا کہ اس کی نگاہ عین پر پڑی۔ چونکہ محمد تغلق اس کی ذاتی قابلیت سے واقف تھا اس لئے اس کا قصور معاف کر کے پھر دربار میں اس کو جگہ دی۔ اس نے محمد تغلق اور فیروز شاہ کے عہد میں متعدد تصانیف کیں انھیں میں سے ایک عین الملکی ہے

فیروز شاہ کے عہد میں یہ اشرف الملک کے درجہ تک پہونچ گیا تھا لیکن کسی بات پر خان جہاں وزیر اور اس کے درمیان کچھ نااتفاقی ہو گئی اور یہ اختلاف اس حد تک پہونچ گیا کہ فیروز شاہ نے مجبور ہو کر اُسے ملتان، بھکر اور سوستان کی جاگیر دیکر دربار سے چلے جانے کا حکم دیا۔ عین الملک نے کہا کہ میں صرف اس شرط سے اس جاگیر کو قبول کرتا ہوں کہ اس کا حساب خان جہاں کے پاس نہ بھیجوں گا بادشاہ نے یہ بھی منظور کیا جب اور درباریوں کو یہ معلوم ہوا تو وہ ڈرے کہ کہیں خان جہاں اُن پر بھی حملہ نہ کرے اسلئے انھوں نے بادشاہ سے کہا کہ خان جہاں کے حوصلوں کا اس قدر وسیع کر دینا مناسب نہیں ہے اور عین الملک کا دربار سے علحدہ رہنا خلاف مصلحت ہے چنانچہ وہ ابھی صرف تھوڑی دور گیا ہوگا کہ فیروز شاہ نے اُسے طلب کیا اور خلوت میں بلا کر خان جہاں کے بابت مشورہ کیا اور لوگ بھی موجود تھے سب نے یہی رائے دی کہ خان جہاں کو وزارت سے علحدہ کر دینا چاہئے لیکن عین الملک نے اس کی مخالفت کی اور فیروز شاہ سے کہا کہ خان جہاں سے زیادہ مناسب شخص اور کوئی اس عہدہ کے لئے نہیں ہو سکتا اسکا ہٹا دینا سلطنت کے لئے بہت مُضر ہوگا۔ فیروز شاہ اس کے اس انصاف پسندی سے بہت خوش ہوا اور بعد کو خان جہاں اور اس کے درمیان صفائی کرا دی جب خان جہاں کو یہ معلوم ہوا کہ عین الملک نے باوجود دشمن ہونے کے بادشاہ سے اسکی تعریف کی تو وہ بہت گرویدہ ہو گیا اور عین الملک کو نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگا۔

ضروری اعلان

۱۔ اگر جنوری ۱۹۳۸ء سے اسوقت تک کے مسلسل پرچے آپ کے پاس نہیں ہیں تو اب طلب فرمالیجئے تاکہ "اسلامی ہند کی تاریخ" اور "نغمۂ کارواں" (دونوں کتابیں) آپ کے پاس مکمل ہو جائیں یہ کتابیں علٰحدہ ۔۔۔۔۔۔۔ شایع نہ ہوں گی

۲۔ چونکہ "اسلامی ہند" کو دسمبر ۳۸ء تک ختم کر دینا ہے، اس لئے "نغمۂ کارواں" کی اشاعت فی الحال ملتوی کرکے "اسلامی ہند" کے صفحات میں اضافہ کر دیا گیا ہے

منیجر نگار

جلد ۳۴	فہرست مضامین اکتوبر ۱۹۳۸ء	شمار ۴

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ
ہندوستان سے باہر سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ

ششماہی چندہ میں نگار کا جنوری نمبر
بوجہ اضافہ ضخامت وقیمت شامل نہ ہوگا۔

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد-۳۴	اکتوبر ۳۸ء	شمار-۴

ملاحظات

برطانوی اقتدار کا جنازہ

آخر کار زیکوسلوکیا میں وہی ہو کر رہا جس کا اندیشہ تھا اور جو ہمیشہ ایک کمزور قوم کے ساتھ طاقتور قوموں نے کیا ہے
پنجۂ آہنی کی قوت کے سامنے جس طرح نزولِ مسیح سے قبل سر جھکا دینا پڑتا تھا، اسی طرح تعلیمات مسیح کی اشاعت کے بعد
ہمیشہ جھکایا گیا اور جھکایا جائے گا، لیکن دنیا کی تاریخ میں، اس بلند اخلاق کی نظیر یقیناً نہیں ملیگی جو ۲۲ ستمبر ۳۸ء کو
دُنیا کی سب سے بڑی حکومت کی طرف سے پیش کیا گیا۔ وہ حکومت جس کے طول وعرض میں آفتاب کبھی نہیں ڈوبتا
جس کی عسکری قوت کے سامنے موجِ فلک بھی لرزہ بر اندام رہتا ہے اور جس کی دولت وثروت دنیا کی اقتصادی توازن
کی ذمہ دار ہے!۔ پھر جس وقت اس زبردست قوت وجبروت رکھنے والی سلطنت کا وزیر اعظم اعلان کرتا ہے کہ وہ
زیکوسلوکیا کی سرزمین کو جرمنی کی قشونِ قاہرہ سے پامال نہ ہونے دے گا، وہ فرانس کی فوجوں کو تنہا نہ چھوڑیگا اور وہ
اس معاہدۂ اتحاد کا پورا احترام کرے گا جو زیکوسلوکیا کے باب میں فرانس اور روس سے ہو چکا ہے، تو دنیا میں امن وسکون
کی سی لہر دوڑ جاتی ہے اور ڈماکریٹک حکومتوں کی وہ امیدیں جن کو نازیت وفسطائیت عرصہ سے پامال کرتی چلی آتی تھیں

از سر نو زندہ ہو جاتی ہیں ۔ لیکن چند ساعتیں نہیں گزرتیں کہ جرمنی کا آمر اعظم، ہر ہٹلر جو مکار ڈماکریٹک حکومتوں کی دکھتی ہوئی رگ کو پکڑتا جانتا ہے، جو دغا باز دعویداران امن وسکون کے دلوں کے چور سے اچھی طرح واقف ہے، نیورنبرگ میں صاف صاف کہہ دیتا ہے کہ سوڈٹین علاقہ، فلسطین نہیں ہے جہاں عربوں پر برش تیغ و خنجر کی آزمایش جاری ہے اور کوئی انکی فریاد سننے والا نہیں، یہ وہ علاقہ ہے جہاں جرمنی کی زندہ قوم بستی ہے، جہاں گھونسہ کا جواب گھونسہ سے دیا جاتا ہے اور جہاں انسانی خون کا سودا انسانی خون ہی سے ہوتا ہے ۔ تو برطانوی وزیر اعظم گھبرا اُٹھتا ہے ۔ صید زبوں کی طرح ہر ہٹلر کے قدموں پہ جا گرتا ہے اور امن وسکون کے نام سے دنیا میں غریب آزاری کی وہ مثال قایم کر جاتا ہے جسے چنگیز و ہلاکو کی خوں آشام تلواریں بھی قایم نہ کر سکی تھیں

اس نے یقیناً ہوا کا رُخ بدل دیا اور کچھ عرصہ کے لئے تلواریں نیاموں میں رکھدی گئیں، لیکن جو قیمت اسکی برطانوی حکومت نے ادا کی ؟ اس کو مسٹر چیمبرلین برداشت کر لیں تو کر لیں، لیکن کوئی غیرت دار قوم کبھی برداشت نہیں کر سکتی اور اگر برطانوی قوم میں احساس عزت و خودداری بالکل محو نہیں ہو گیا ہے تو یقیناً اسے بھی برداشت نہ کرنا چاہئے

مسٹر چیمبرلین غالباً خوش ہوں گے کہ اسوقت انھوں نے عالمگیر جنگ کے خطرہ سے دنیا کو بچا لیا، لیکن عالم انسانیت سرنگوں ہے، دنیائے اخلاق سوگوار ہے اور خود برطانوی قوم کو بھی آج نہیں تو کل محسوس کرنا پڑے گا کہ زیکوسلیویکیا کی موت حقیقتاً برطانوی اقتدار کی موت ہے اور ارباب فہم کے مشام میں ابھی سے اس کفن کی بو آنے لگی ہے جو برطانیہ قوم کے لئے مسٹر چیمبرلین نے زیکوسلیویکیا کی لاش سے طیار کیا ہے

مسٹر ایڈن فرماتے ہیں کہ ۔ "ہم کو ایسا امن وسکون نہیں چاہئے جو ہماری قومی شہرت اور احساس انصاف کو صدمہ پہونچانے والا ہو، کیونکہ یہ امن وسکون ناپایدار اور غیر حقیقی امن وسکون ہوگا ۔ قوم ہونے کی حیثیت سے ہم کو استقلال سے کام لینا چاہئے ورنہ ہماری خودداری فنا ہو جائے گی یہ ہماری تاریخ میں پہلا واقعہ نہیں ہے کہ ہکو اس قسم کا چیلنج دیا گیا ہو، بارہا ایسا ہوا اور ہم ہمیشہ آزادی اور قانون کی حمایت پر قایم رہے"

مسٹر ایڈن کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ زیکوسلوویکیا کا معاملہ برطانوی اقتدار اور احساس دیانت کا امتحان تھا، لیکن یہ دعویٰ کہ برطانوی تاریخ میں بارہا یہ صورتیں پیش آئیں اور اس قوم نے ہمیشہ راستی و صداقت کی حمایت کی، یقیناً غلط ہے ۔ اب سے چند سال قبل جب جاپان نے لیگ اقوام کو ٹھکرا کر منچوریا پر اپنا اقتدار قایم کرنا چاہا تھا، تو کیا یہ برطانوی غیرت و خودداری کا امتحان نہ تھا اور اب بھی شنگھائی کے سواحل پر جو سلوک وہ برطانوی جہازوں، برطانوی رعایا اور برطانوی افسران کے ساتھ کر رہا ہے تو کیا یہ ملکی و ملی غیرت کا سوال نہیں ہے

جسوقت مسولینی نے حبشہ پر حملہ کیا ہے تو کیا برطانیہ کے احساس دیانت و صداقت کا یہی اقتضا تھا کہ وہ اسپر اعتماد کرنے والے ملک کو پامال ہو جاتے ہوئے دیکھے اور کچھ نہ کہے ۔ پھر اس کے علاوہ سواحل اسپین پر جنرل فرانکو کا

برطانوی جہازوں کو ڈبوتا اور مسٹر چیمبرلین کا کچھ نہ کہنا، جرمنی کا آسٹریا پر قابض ہو جانا اور انگلستان کا خاموش رہنا، کیا یہ سب کچھ آزادی و قانون کی حمایت میں ہوا اور کیا مسٹر ایڈن کو اپنی قوم کے اس طرزِ عمل پر فخر کرتے ہوئے شرم نہ کرنا چاہئے۔

پھر ہو سکتا ہے کہ اسوقت وہ چند مخصوص افراد جن کے کمزور و ناعاقبت اندیش ہاتھوں میں برطانیہ کی عنانِ حکومت دیدی گئی ہے، اس توہین کو بھول جائیں، لیکن تاریخ اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتی اور زیکوسلوویکیا کے باب میں مسٹر چیمبرلین کے طرز عمل نے برطانیہ کی پیشانی پر بزدلی، بے غیرتی، عہد شکنی اور خود غرضی کا جو بدنما داغ لگا دیا ہے وہ ابدالآباد تک نہیں مٹ سکتا

برطانوی تاریخ میں ہمیں انسانی ہمدردی کی بھی مثالیں نظر آتی ہیں اور اس کی جرات و شہامت کی بھی، چنانچہ اسوقت فلسطین میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ انسانی ہمدردی ہی کا تقاضہ ہے، ایک مفلوک الحال یہودی قوم کی اعانت و حمایت کے لئے ہے۔ لیکن کس قدر عجیب و غریب بات ہے کہ برطانوی قوم کے اس اخلاق بلند کی نمائش ہمیشہ اسی حکومت اور اسی جماعت کے مقابلہ میں ہوتی ہے جو بے یار و مددگار رہے، جس کے تاب مقاومت نہ لاسکنے پر اسے یقین ہوتا ہے اور جو سیاسی مکاید میں ان کی حریف نہیں ہو سکتی

آج فلسطین کے عربوں کو پامال کرنے کے لئے انگلستان و ہندوستان دونوں جگہ سے فوجوں پر فوجیں روانہ ہو رہی ہیں، کیونکہ یہودیوں کے ساتھ ہمدردی کرنے کا جواب دینے والا کوئی موجود نہیں ہے، لیکن جب اسی انسانیت کے اظہار کا وقت حبشہ میں آتا ہے تو ایک فوجی دستہ بھی باہر نہیں نکالا جاتا۔ بحر روم میں اقتدار کھو دینا گوارا کر لیا جاتا ہے، لیکن مسولینی کے سامنے جانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ پھر اس کو بھی جانے دیجئے کیونکہ حبشہ کا تعلق سیاسیات یوروپ سے نہ تھا، لیکن زیکوسلوویکیا کا مسئلہ تو وسط یوروپ کی اُن حکومتوں کا مسئلہ تھا جن کے توازُن پر دنیا کے امن و سکون کا انحصار بتایا جاتا ہے ایک ایسی حکومت کا مسئلہ تھا جس کے ساتھ برطانیہ کا عسکری معاہدہ تھا، جس کے بقا کی ذمہ داری روس و فرانس کے ساتھ برطانیہ نے بھی اپنے سر لے رکھی تھی۔ پھر یہاں وہ انسانیت کہاں گئی، وہ اخلاق کہاں گیا، وہ "قولِ مرداں" کیا ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ ہٹلر کے پاس دھونس (Bluffing) کے سوا کچھ نہیں، لیکن کیا برطانیہ کی بزدلی اس سے زیادہ کوئی اور ہو سکتی ہے کہ دھونس کو دھونس جانتے ہوئے بھی ہٹلر کے سامنے آنے کی ہمت اس کو نہ ہو سکی

چند دن اس طرف کی بات ہے کہ زیکوسلوویکیا کی اعانت میں برطانیہ نے بھی اسی دھونس سے کام لینا چاہا تھا یہاں تک کہ گیس سے محفوظ رکھنے کے لئے کروروں نقاب تقسیم کر دینے کا بھی اعلان کر دیا گیا تھا، لیکن اب معلوم ہوا کہ غریب برطانیہ کو دھونس دکھانے کا بھی سلیقہ حاصل نہیں اور یہ اسی میدان کا شیر ہے جہاں کوئی دوسرا شیر اسکے مقابلہ کے لئے موجود نہ ہو

جس وقت یہ خبر رائٹر نے پہونچائی کہ مسٹر چیمبرلین ہر ہٹلر سے ملنے کے لئے ہوائی جہاز پر جا رہے ہیں تو اہل نظر اسی وقت تاڑ گئے تھے کہ یہ سراسیمگی بے وجہ نہیں ہے اور اس کے بعد جب زیکوسلوویکیا کی جدید حد بندی کے متعلق فرانس سے مشورہ لیا گیا تو یہ اندیشہ اور زیادہ قوی ہو گیا، لیکن بایں ہمہ اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ برطانوی پارلیمنٹ اور برطانوی قوم سے استمزاج کئے بغیر اس کا فیصلہ ہو جائے گا اور فیصلہ بھی ایسا شرمناک جسے کوئی خوددار قوم برداشت نہیں کر سکتی

اہل زیک نے اس فیصلہ کو کس طرح قبول کیا، یہ بیان اتنا دردناک ہے کہ ریوٹر ایجنسی کی محتاط روش بھی اسے نہ چھپا سکی۔ کہا جاتا ہے کہ جس وقت پراگ میں آلہائے مکبر الصوت کے ذریعہ سے اعلان ہوا تو شہر پر موت کا سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اعلان کے الفاظ یہ تھے کہ:-

"زیک حکومت نے برطانوی فیصلہ کو ایسے سخت دباؤ کے زیر اثر قبول کیا ہے جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ فیصلہ گویا ایک حکم تھا جو کسی مغلوب و ضعیف قوم کو دیا جاتا ہے، ہم امن و سکون کے لئے وہی قربانی پیش کر رہے ہیں جو کسی وقت مسیح نے پیش کی تھی۔ ہم خود کسی پر الزام نہیں لگاتے، تاریخ خود اس کا بہتر فیصلہ کرنے والی ہے کہ قابل الزام کون ہے"

بہر حال یہ ڈرامہ تو ختم ہو چکا اور (Runciman) کا پارٹ جن جن کو کرنا تھا وہ نہایت کامیابی سے ساتھ کر چکے، لیکن ہم کو سوچنا چاہئے کہ حقیقتاً پس پردہ وہ کیا محرکات تھے جنھوں نے تجویز، مشورہ اور فیصلہ کے تمام مراحل ایک ہی سانس میں طے کرا دئے

فرانس کے عزائم کی شکست کے لئے تو صرف یہ جان لینا کافی تھا کہ برطانیہ اس کا ساتھ نہ دے گا، لیکن خود برطانیہ نے کیوں ایسا کیا، اس کا سراغ لگانے کے لئے ہم کو ایک طرف اس تحریک اشتراکیت کا مطالعہ کرنا چاہئے جو حد درجہ انگلستان کے اندر بھی خطرناک صورت اختیار کرتی جاتی ہے اور بہ حالت جنگ ملک کے اندر انقلاب پیدا کرنے پر آمادہ ہے اور دوسری طرف ہندوستان کی سیاسیات کو دیکھنا چاہئے کہ اگر اس وقت جنگ چھڑ جاتی تو اس کی آزادی کے تمام امکانات واقعات میں تبدیل ہو جاتے اور یہ وہ بات ہے جس کے مقابلہ میں برطانوی حکومت اپنا سب کچھ قربان کر سکتی ہے

پائنیر نے خوب لکھا ہے کہ مسٹر چیمبرلین پیام امن لیکر تو ضرور واپس آئے ہیں لیکن اتنی بے عزتی کے ساتھ کہ برطانوی پارلیمنٹ کے وزیر اعظم کا اُسے ملک و قوم کو سنانا کچھ ناممکن سی بات معلوم ہوتی ہے

ہو سکتا ہے کہ جس وقت پارلیمنٹ کے سامنے یہ مسئلہ پیش ہو تو چیمبرلین کی وزارت کو مستعفی ہو جانا پڑے لیکن اس کا اثر اب زیک حکومت کی بدقسمتی پر کوئی نہیں پڑ سکتا۔ زیکوسلوویکیا تو جتنا ذلیل ہونا تھا ہو چکا اور مسٹر چیمبرلین

کو جو کچھ کرنا تھا کر چکے ۔ گو اسوقت تک تفصیلی بیان شایع نہیں ہوا اور ہٹلر چیمبرلین مفاہمت کے جزئیات سے ہم بے خبر ہیں، لیکن اس کی نوعیت اس سے ظاہر ہے کہ جرمن افواج سوڈٹین علاقہ پر قبضہ کرنے کے لئے روانہ ہو رہی ہیں اور بڑا پیسٹ میں جرمن قوم کے ساڑھے تین لاکھ افراد نے ہٹلر کی درازی عمر کی دعا مانگتے ہوئے اقدام کا نعرہ بلند کیا۔ یقیناً کوئی صاحب فکر و نظر اس امن و سکون پر مطمئن نہیں ہو سکتا اور نہ یہ التوائے جنگ کوئی پایدار چیز ہے بلکہ اس مسئلہ نے یوروپ کی سیاسیات کو زیادہ پیچیدہ بنا دیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ خود اہل زیک جرمن آمریت کو قبول نہ کریں اور جنگ کے لئے آمادہ ہو جائیں۔ پھر یہ وہ آگ ہوگی جسکو ایک چیمبرلین کیا سو چیمبرلین بھی بجھا نہ سکیں گے

میں یہاں تک لکھ چکا تھا کہ یوروپ کے سیاسی حالات بہت نازک ہو گئے اور قوی اندیشہ پیدا ہو گیا کہ یکم اکتوبر کو دوسری عالمگیر جنگ شروع ہو جائے گی، لیکن ہر ہٹلر کے ساتھ مسٹر چیمبرلین کی آخری ملاقات نے پھر ہوا کا رخ بدل دیا اور گمشدہ امن و سکون حاصل ہو گیا یعنی نازیت کے دیوتا پر زیکو سلاویکیا کی قربانی چڑھا دی گئی اور ہر ہٹلر نے وہ کچھ پالیا جس کی اس کو توقع نہ تھی۔

کہا جاتا ہے کہ ہر ہٹلر نے آیندہ کے لئے نہایت مستحکم وعدہ قیام امن و سکون کا کیا ہے اور یوروپ میں اپنے جارحانہ اقدام سے توبہ کر لی ہے۔ لیکن جو لوگ آسٹریا کے باب میں ہٹلر کے وعدہ کا حشر دیکھ چکے ہیں وہ اس وعدہ کی حقیقت سے واقف ہیں۔

اب غالباً مسولینی کی باری آئے گی اور وہ اسپین میں وہی کرے گا جو ہر ہٹلر نے زیکو سلاویکیا میں کیا ہے۔ اسکے بعد جرمنی افریقہ کے مستعمرات کی واپسی کا مطالبہ کریگا اور آخر کار اس طرح رفتہ رفتہ یوروپ کی ڈماکریسی کو نازیت و فسطائیت ہمیشہ کیلئے ختم کر دیگی

کانگرس کی آستین کا سانپ

اصول و مقاصد کے لحاظ سے کوئی متنفس ایسا نہیں جو کانگرس کا مخالف ہو لیکن افسوس ہے کہ بعض مخصوص افراد کی وجہ سے جو اسوقت برسر اقتدار ہیں کانگرس کی مقبولیت کم ہوتی جا رہی ہے

کانگرس کا مقصود ملک کو آزاد دیکھنا ہے اور سوائے اُن چند خود غرض افراد کے جو اپنے ضمیر کو محو کر چکے ہیں، سارا ہندوستان اس مسئلہ میں اس کا ہم آہنگ ہے، لیکن یہ مقصد عظیم اسوقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک اکثریت اقلیت کا اعتماد حاصل نہ کرے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب مذہبی تعصبات، قومی روایات اور ذاتی اغراض سے بلند ہوکر انسانی رواداری سے کام لیا جائے

اسوقت جن جن صوبوں میں کانگرس کی حکومت ہے، ان کے حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ کانگرس کے اُن افراد نے جو برسر اقتدار و حکومت ہیں، کانگرس کے حقیقی مقصود کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ان کا احساس مذہبی اُبھر آیا ہے ان کا پندار اکثریت نمایاں ہو گیا ہے اور خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کے جذبات پامال کرنے میں انھوں نے کانگرس کے احکام اور انسانی اقتضاء دونوں کو پس پشت ڈال دیا ہے

لکھنؤ کے اجلاس کانگرس میں جسوقت پنڈت جواہر لال نہرو نے زبان کے متعلق اظہار رائے کرتے ہوئے

اس کو دوسرے درجہ کا مسئلہ ظاہر کیا تھا، اسی وقت ہم نے کانگرس اور نیز پنڈت جی کو متوجہ کیا تھا کہ اگر وہ ہندو مسلم اتحاد چاہتے ہیں تو سب سے پہلے زبان کے مسئلہ کا فیصلہ کر دیں، کیونکہ اگر ہندو سنسکرت کے ثقیل الفاظ استعمال کرنا ترک نہ کریں گے تو مسلمانوں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اُردو کو عربی فارسی الفاظ سے پاک کر دیں مہمل سی بات ہوگی۔
یقیناً اس کے بعد مہاتما گاندھی اور پنڈت جی نے چند بیانات ایسے شایع کئے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس مسئلہ کی اہمیت ان پر واضح ہوگئی ہے اور ایک مشترک زبان "ہندوستانی" کے رواج کو اپنے مقاصد میں شامل کر کے اس فتنہ کا سدِ باب کرنا چاہا ہے، لیکن افسوس ہے کہ کانگرس حکومتوں نے اس پر مطلق عمل نہیں کیا اور اس سے زیادہ افسوسناک امر یہ ہے کہ ہائی کمانڈ نے بھی ان سے کوئی بازپرس نہیں کی

میں کانگریسی خیال کا آدمی ہوں اور ہمیشہ میں نے اس کی حمایت کی ہے، لیکن میرے نزدیک کانگرس نام کسی خاص شخص کا نہیں ہے، اور اس لئے اگر کوئی کانگرسی مقصد کانگرس کے خلاف قدم اُٹھاتا ہے تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اس سے بازپرس کریں خواہ وہ کسی حکومت کا وزیر ہی کیوں نہ ہو

حال ہی میں ڈاکٹر گوکل چند نے شملہ کے اجلاس "ہندی ساہتیہ سمیلن" میں کتنی معقول بات کہی ہے کہ ہندی اور ہندوستانی فی الحقیقت دونوں ایک ہی چیز ہیں اور بنارس اسکول کی یہ کوشش کہ ہندی میں سنسکرت الفاظ کا استعمال زیادہ کرنا چاہئے قابلِ ملامت حرکت ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اُردو کے حامی جو اس کو سادہ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں پھر عربی و فارسی کے الفاظ شروع کر دیں گے اور ان کا یہ طرزِ عمل یقیناً حق بہ جانب ہوگا۔

مشترک زبان کے باب میں سب سے پہلی اُصولی بات جس پر ہندو مسلمانوں دونوں کا اتفاق ہونا چاہئے یہ ہے کہ ملک کی زبان سے مراد وہ زبان ہے جس کو دونوں فریق آسانی سے سمجھ سکیں اور اسی اُصول کی بنا پر کانگرس نے "ہندوستانی" کے رواج کی تجویز کی۔ اس میں سوال نہ عربی فارسی الفاظ کا ہے نہ سنسکرت کا۔ اگر عربی فارسی کا کوئی لفظ ایسا ہے جسے سب آسانی سے سمجھ سکتے ہیں تو اس کے نکالنے کی کوئی وجہ نہیں اور اگر ثقیل عربی یا فارسی لفظ کی جگہ اس سے زیادہ آسان لفظ ہندی کا مل سکتا ہے تو اس کے اختیار کرنے میں مسلمانوں کو کوئی عذر نہ ہونا چاہئے

اب اسی اُصول کو سامنے رکھ کر آپ شہر یا گاؤں میں جا کر تحقیق کیجئے تو معلوم ہوگا کہ عربی فارسی کے بہت سے الفاظ لوگوں کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں اور خصوصیت کے ساتھ قانونی الفاظ تو تمامتر عربی فارسی کے ہیں جنکا مفہوم ہر شخص کے ذہن نشین ہو چکا ہے، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ان کی جگہ دوسرے الفاظ وضع کئے جائیں۔ کوئی شخص ایسا نہیں جو صوبۂ متحدہ یا یو۔پی کے الفاظ کو نہ سمجھتا ہو لیکن کوشش کی جا رہی ہے کہ اس کی جگہ "سنکیت پرانت" لکھا جائے، ان تمام باتوں سے ہمیں اس ذہنیت کا پتہ چلتا ہے جو ان لوگوں کے اندر کام کر رہی ہے اور اس کا نتیجہ کبھی مفید نہیں ہو سکتا

میں دیکھ رہا ہوں کہ اسی زبان کے مسئلہ میں ہندوستان کے تمام مسلمان خواہ وہ کانگرس سے متعلق ہوں یا مسلم لیگ سے متفق الخیال ہوتے جارہے ہیں اور اگر کسی وقت مسلمانوں کی پوری جماعت کانگرس سے بالکل علحدہ ہوگئی تو اس کی ذمہ داری نہ مسٹر جینا پر ہوگی نہ مسٹر شوکت علی پر بلکہ خود کانگرس کے اُن ہندو افراد پر جو ہائی کمانڈ کی منشاء کے خلاف کانگرس کی تحریک کو محدود و نامقبول بناتے جارہے ہیں

اُردو ڈے لکھنؤ کی انجمن بہار ادب نے جو اودھ کی نہایت مقتدر انجمن ہے اپنے ایک جلسہ میں تجویز پیش کی ہے کہ موجودہ ہندی اُردو نزاع کے باب میں ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو متفقہ طور پر اپنی آواز بلند کرنا چاہئے اور زبان کو ثقیل بنانے کے لئے سنسکرت الفاظ کا استعمال جو "ہندوستانی" میں عام ہوتا جارہا ہے، اس سے اُردو کو محفوظ رکھنے کے لئے ایک آل انڈیا تحریک بروئے کار لانا چاہئے چنانچہ ایک سب کمیٹی مقرر کی گئی ہے جو ان مسایل پر غور کرکے اپنی رپورٹ پیش کریگی۔ اسی کے ساتھ یہ بھی طے پایا ہے کہ آیندہ نومبر کی کوئی تاریخ مقرر کرکے تمام ہندوستان میں "یوم اُردو" منایا جائے اور جلسے کرکے صوبوں کی حکومتوں اور کانگرس ہائی کمانڈ کو توجہ دلائی جائے کہ بعض ناعاقبت اندیش ہندوؤں کا سنسکرت کے ثقیل الفاظ کے استعمال پر زور دینا سخت نامناسب حرکت ہے۔ چونکہ اس تحریک کو عام کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ ہندوستان میں جہاں جہاں اُردو انجمنیں قایم ہیں ان سب کو "یوم اُردو" منانے میں شریک کیا جائے اس لئے استدعا کی جاتی ہے کہ ایسی تمام انجمنیں اپنے اپنے پتے سکریٹری صاحب انجمن بہار ادب لکھنؤ یا براہ راست دفتر "نگار" کو لکھ بھیجیں تاکہ یہاں سے ان کو ایجنڈا اور تمام ضروری لٹریچر بھیجدیا جائے اور پورے اتحاد عمل کے ساتھ یوم اُردو منایا جائے۔

حیات و آغازِ حیات

جس طرح ہمیں یہ نہیں معلوم کہ "زندگی کیا ہے" اسی طرح ہم اس سے بھی ناواقف ہیں کہ "اس کا آغاز کیونکر ہوا"، ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ سوائے کرۂ زمین کے فضا میں اور کہاں آثارِ حیات پائے جاتے ہیں اور خود ہمارے کرہ میں حیات کی ابتدا کب اور کیونکر ہوئی۔

عہدِ قدیم کا انسان اس سوال کے مختلف جوابات اپنے دماغ میں رکھتا تھا، لیکن ان سب میں ایک غیر انسانی آسمانی قوت کے احساس کا جذبہ کارفرما تھا اور اس کا یہ اعتقاد "قبضۂ تصرف" کے خیال پر قایم تھا۔ اسی قبضہ و تصرف کے ختم ہو جانے کا نام اس نے موت رکھا تھا اور جب انسان مرجاتا تھا تو وہ سمجھتا تھا کہ کسی غیر معلوم قوت کا قبضہ اس پر ہو گیا ہے۔

ہندوستان کی قدیم اصطلاحات میں دو لفظ ہم کو ملتے ہیں پران اور آتما جن کے معنے مختلف ہیں۔ پران سے مراد وہ قوتِ حیات ہے جو ہر جاندار شے میں پائی جاتی ہے اور آتما سے مراد ان کی یہ تھی کہ ہر انسان میں "حیاتِ کلی" پائی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے حیات کی حقیقت پر کوئی روشنی نہیں پڑتی، اور نہ اس عہدِ ترقی میں بھی کوئی فیصلہ کن جواب اس سوال کا دیا جا سکا ہے (کیونکہ مظاہرِ حیات کا براہ راست مطالعہ ناممکن ہے) تاہم اس مسئلہ پر عقلی گفتگو کا سلسلہ ختم نہیں ہوا ہے اور نہ ہونا چاہئے۔

سنٹ آگسٹاین نہ علم الحیات (بیالوجی) سے واقف تھے نہ علم الکیمیا (کیمسٹری) سے لیکن اس نے محض اپنی عقل و فراست سے کام لیکر یہ نظریہ پیش کیا کہ "حیات کا وجود بے جان مادہ سے ہوا ہے"

تولیدِ غیر ارادی

کئی صدی کا زمانہ گزرا کہ لوگوں نے "تولیدِ غیر ارادی" (Spontaneous generation) کے نظریہ کو مان لیا تھا۔ اس نظریہ کے مطابق حیات کا بیجان مادہ سے پیدا ہونا تسلیم کیا گیا تھا۔ انجیل میں لاش سے شہد کی مکھیوں کی پیدائش کا ذکر پایا جاتا ہے اور یہ بات مشہور ہے کہ تلسی کے پھول کو کچل کر کسی ظرف میں بند کر دیجئے تو بچھو پیدا ہو جائیں گے، اسی طرح سڑے ہوئے گوشت سے پسوؤں کا پیدا ہونا بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن اس نظریہ کو پاسٹور اور ٹنڈال نے غلط ٹھہرا دیا اور اب یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ تولیدِ حیات جراثیم سے ہوتی ہے جو ہمیں نظر نہیں آتے اور اسی بنا پر علم الجراثیم (بیکٹیریالوجی) وجود میں آیا جس کا مقصود جراثیم کی تحقیق ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ حیات کا آغاز کب سے ہوا، سو ابتک اس کا کوئی معقول جواب نہیں دیا گیا۔ بالش بیمیا کا نظریہ یہ ہے کہ

حیات اتنی ہی قدیم ہے جتنا مادہ، اور آفرینش کی ابتدا ہی سے کرۂ زمین پر کاروبار حیات شروع ہو گیا ہے، لیکن کرۂ زمین کی ابتدائی ساخت، آب و ہوا اور درجۂ حرارت کو سامنے رکھ کر یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ اسوقت وہاں حیات کا وجود پایا جاتا ہے، کیونکہ اسوقت نہ آکسیجن پائی جاتی تھی اور نہ سمندر بنے تھے

عام طور پر یقین کیا جاتا ہے کہ جس وقت کرۂ زمین ٹھنڈا ہوتے ہوتے اس قابل ہوا ہوگا کہ اس میں حیات کا وجود نشوونما پائے وہ دفعتہً پیدا ہو گئی ہوگی۔ بعض کہتے ہیں کہ درجۂ حرارت، دباؤ، پانی میں بعض نمکوں کا پایا جانا اور سمندر کے اوپر فضا میں بعض گیسوں کا وجود، یہ سب تخلیق حیات کا باعث ہوئی ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ سرد پانی پر آفتاب کی حرارت و روشنی پڑنے سے زندگی وجود میں آئی، ڈاکٹر اسر ہیڈنگ کہتے ہیں کہ جب کرۂ زمین کی گرم گرم کیچڑ پر پہلا چھینٹا بارش کا ہوا اسوقت زندگی کے آثار پیدا ہوئے اور یہ قطبین کے اولین موسم سرما میں ہوا ہوگا

لارڈ کلون کا اعتقاد ہے کہ کرۂ زمین پر حیات کا باعث شہاب ثاقب ہوئے ہیں، یعنی ہمارے کرہ میں زندگی کے جراثیم دوسرے کروں سے منتقل ہو کر آئے ہیں۔ دنیا کے نہایت مشہور سائنس داں ڈاکٹر کرائل کا بیان ہے کہ زندگی کا وجود برقی قوت کا ممنون ہے۔ امیبا[1] پر ڈاکٹر موصوف نے تجربہ کر کے معلوم کیا کہ ½ وولٹ کے برابر اس میں برقی تغیر ہوتا رہتا ہے۔ یہ تو معلوم ہی ہے کہ انسان کی ہر عضلاتی حرکت سے برقی قوت خارج ہوتی ہے اور جسم انسانی سے ہر وقت برقی رو نکلتی رہتی ہے۔ ایک جانور بجلی کے ذریعہ سے ہلاک کر کے خاک کر دیا گیا، ڈاکٹر مذکور نے اس کے نسیج (Brain tissue) کی راکھ سے ایسے خلایا پیدا کر لئے جن میں آثار حیات کا پتہ چلتا تھا

بہر حال زندگی کا آغاز کسی طرح ہوا ہو، یہ یقینی ہے کہ وہ مادۂ حیات کی نہایت ہی سادہ صورت میں رہا ہوگا۔ عناصر تو جاندار اور بیجان چیزوں میں یکساں ہیں لیکن ایک جاندار جسم کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو ابھارتا ہے۔ مطلق حیات کے وجود کے لئے صرف پانی ضروری ہے لیکن زیادہ ترقی یافتہ حیات کے لئے آکسیجن کا پایا جانا بھی لازم ہے کرۂ زمین کی ابتدائی حالت میں آکسیجن کا وجود کہیں نہ پایا جاتا تھا، بعد کو جب درختوں کا نشوونما یہاں ہوا تو ان سے آکسیجن پیدا ہوئی جس نے سمندروں کے کھاری پن سے ملکر حیات کی ترقی میں بڑی مدد کی

چونکہ بقاء حیات کے لئے ایک قایم درجۂ حرارت کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو طبقات الارض کے اندر انقلابات ہونے کی وجہ سے گھٹتا بڑھتا رہتا ہے، اس لئے انجمادی دور کے بعد پہاڑوں کی تخلیق نے بھی حیات کی ترقی میں بڑی مدد کی ہوگی خود انجمادی دور میں تو زمین کے برف پوش ہونے کی وجہ سے کسی حیات کا امکان نہ تھا لیکن جب اس انجمادی دور میں پندرہ پندرہ کروڑ سال کے وقفہ سے آٹھ انقلاب رونما ہوئے اور ہر انقلاب کے وقت کچھ پہاڑ وجود میں آئے کچھ فنا ہوئے سمندروں نے زمین کے بعض حصوں کو ڈھک لیا اور پھر زمین نے پانی کو پیچھے ہٹا دیا تو اس کشمکش کے ردِّ عمل سے تخلیق

---

[1] (Amoeba) ایک قسم کا خردبینی کیڑا جو ہمیشہ اپنی شکل بدلتا رہتا ہے

حیات میں بہت مدد ملی

زندگی کا اولین ظہور کرۂ زمین پر سب سے پہلے حیات کا ظہور کس صورت میں ہوا۔ اس کے متعلق مختلف نظرئے قائم کئے گئے ہیں۔ بعض ماہرین سائنس کا خیال ہے کہ اول اول اس کا آغاز مادۂ حیات کے قطروں کی صورت میں ہوا جن میں سے اکثر فنا ہو کر چند باقی ماندہ قطروں کی غذا بن گئے

بعض ماہرین کا خیال ہے کہ جب کیمیاوی مادوں پر فوق البنفسجی شعاع پڑی تو اس سے نباتاتی حیات سب سے پہلے پیدا ہوئی۔ بہر حال صورت جو بھی رہی ہو نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے یعنی یہ کہ زندہ سالمے (Living molecules) موجود تھے جن میں محرکاتِ خارجی کے ردِ عمل سے نشو و نما پانے کی صلاحیت پائی جاتی تھی

نفس کی پیدائش آغازِ حیات کے مسئلہ کو نفس کے وجود نے زیادہ پیچیدہ بنا دیا اور سوال یہ پیدا ہوا کہ کیا تمام جاندار اشیاء نفس رکھتی ہیں اور یہ کہ نفس و حیات کیا ایک ہی چیز ہیں۔ تحقیق سے ثابت ہو کہ نفس خود شعور (Self Conscious) صرف انسان میں پایا جاتا ہے اور جانداروں میں تحت شعوری (Sub Conscious) قسم کا نفس پایا جاتا ہے، ایک نوزائیدہ انسانی بچہ بھی نفس رکھتا ہے اور گھریلو جانور بھی۔ چیونٹیوں کی طرف سے جو حرکت عمل ظاہر ہوتی ہے وہ خالص حیات ہی سے تعلق نہیں رکھتی۔ اسی لئے بعض ماہرین سائنس نے دماغی حرکت و عمل اور اُن اعصابی حرکات کو جو برقی رو پیدا کرتے ہیں ایک ہی چیز قرار دیا ہے۔ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اکثر و بیشتر اعصاب کی حرکت سے برقی رو پیدا ہوتی رہتی ہے اور ضایع ہوتی رہتی ہے، لیکن بعض مثالیں اس کے خلاف بھی پائی جاتی ہیں، مثلاً ایل (ایک قسم کی مچھلی بام کی طرح) کہ جو برقی رو اس کے اعصاب کی حرکت سے پیدا ہوتی ہے اس سے وہ فایدہ بھی اُٹھاتی ہے۔ اسی طرح ممکن ہے کہ مادہ کی تبدیلیاں دماغ سے برقی رو پیدا کرتی ہوں اور جاندار اشیاء اس سے فایدہ اُٹھاتی ہوں جس کا ہم نے دوسرا نام نفس (Mind) رکھا ہے

مادۂ حیات بہر حال زندگی اپنا آغاز مادۂ حیات (Protoplasm) سے کرتی ہے اور یہی اسکے جسمانی وجود کا باعث ہوتا ہے۔ یہ ایک نیم رقیق سا مادہ ہے، سادہ، بیرنگ لیکن بے انتہا کیمیاوی پیچیدگیاں رکھنے والا۔ یہ ماحول کی بیجان چیزوں سے غذا حاصل کر کے نشو و نما پاتا ہے۔ وہ حساس بھی ہے، خارجی حالات سے اس میں ردِ عمل بھی ہوتا ہے، بجلی کی قوت اور روشنی سے متاثر ہوتا ہے اور اعضاء اس سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس کا ایک غلاف یا خلیہ (Cell) ہوتا ہے جس میں وہ ٹھہرا رہتا ہے

انسان کا بار آور بیضہ (Ovum) $\frac{1}{125}$ انچ کا قطر رکھتا ہے اور اس خلیہ کے چاروں طرف اور بہت سے خلایا جمع ہو ہو کر مختلف حالتوں میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں

جسم انسانی میں یہ بیضہ یا خلیہ تین خلایا میں تقسیم ہو جاتا ہے، پہلے میں دماغ، حرام مغز، آنکھ، ناک، کان اور پوست

کی تشکیل ہوتی ہے، دوسرے درمیانی خلیہ سے گردے، اعصاب، ہڈی کا ڈھانچہ اور دورۂ خون کا نظام وجود میں آتا ہے اور تیسرے خلیہ سے جگر اور مختلف غدود پیدا ہوتے ہیں۔ دوران تشکیل میں خلایا اپنی مدور صورت چھوڑ دیتے ہیں اور اعضا کی ساخت کے لحاظ سے Tissues بننا شروع ہوتے ہیں۔ اسی طرح دماغ اور خون کے خلایا میں بھی تبدیلی پیدا ہوتی ہے

خون کے خلیات دو قسم کے ہیں، سرخ اور سفید، سرخ ذرات خون دوسرے خلیات کو اپنی غذا بنا کر نشو و نما پاتے ہیں، سفید ذرات ہمیشہ اپنی مدور صورت میں رہتے ہیں اور تنفس میں مدد دیتے ہیں۔ سرخ ذرات بھی ہڈیوں کے مغز میں پیدا ہوتے ہیں اور جب بیکار ہو جاتے ہیں تو طحال (تلی) میں جاکر فنا ہو جاتے ہیں

دماغ کے عملیات میں عجیب و غریب تغیر ہوتا ہے۔ جسم انسانی کے تمام اعضاء اعصاب کے ذریعہ سے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اور ان اعصاب کا تعلق دماغ کے خلیات سے ہے

مادۂ تشکیل حیات

الغرض زندگی کا وجود مادہ سے ہوا ہے اور جاندار و بیجان مادہ کی کیمیاوی ترکیب میں کوئی فرق نہیں ہے، اسی لئے انسانی زندگی غیر فانی خیال کی جاتی ہے اور موت نام ہے صرف حوادث کا ماہرین فن مادۂ حیات کے بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ ایک نہ ایک دن وہ اسے اس قابل بنا سکیں گے کہ حیات کا نشو و نما اس سے ہو سکے۔ مرنے کے بعد انسان کے بعض حصے زندہ رہتے ہیں، چنانچہ موت کے بعد بالوں اور ناخنوں کا بڑھنا تو مشاہدہ ہی ہے۔ ایک ڈاکٹر نے کتے کا سر کاٹ کر تین دن تک اسے زندہ رکھا، ایک ڈاکٹر موت کے بعد قلب انسانی کو ۳۰ گھنٹے تک زندہ رکھنے میں کامیاب ہوا۔ ایک اور ڈاکٹر نے ایک چوزے کے دل سے خلیات کو علحدہ کیا اور بیس سال سے یہ اس کے پاس زندہ موجود ہیں، اس کے پاس چوہوں اور انسانوں کے زندہ خلیات بھی محفوظ ہیں، البتہ دماغ کے خلیات کو زندہ رکھنے میں ابتک کامیابی نہیں ہوئی

ڈاکٹر کیرل کا بیان ہے کہ "موت ایک قیمت ہے جو ہم دماغ کے عوض میں ادا کرتے ہیں ورنہ انسان کا گوشت و پوست یقیناً غیر فانی ہے۔ دماغ سخت قاتل و مہلک چیز ہے جو اپنے مقبوضات ہی کو آخر کار فنا کر ڈالتا ہے"

چونکہ بیجان مادہ کیمیاوی طریقہ سے پیدا ہو کر حرکت و عمل میں آنے لگا، اس لئے قدرت کے ساتھ انسان کی جنگ نصف ختم ہو گئی ہے۔ اب رہا دماغ کے خلیات پیدا کر کے نفس انسانی کو وجود میں لانا، سو اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا، ہو سکتا ہے کہ یہی مسئلہ انسانی شکست کا باعث ہو

اس تمام بحث سے ظاہر ہوگیا کہ جوش کے نزدیک شعر کو حسیاتِ قلبی سے تعلق ہے نہ کہ دماغ سے اور محسوساتِ نفس کی ترجمانی ہی کا نام شاعری ہے

شاعر کی خصوصیات یہاں تک تو صرف نفسِ شاعری سے بحث کی گئی ہے لیکن اس سلسلہ میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شاعر کا فریضۂ حقیقی کیا ہے؟ - اس میں کن کن خصوصیات کا جمع ہونا لازمی ہے اور اور اس کا تعلق کن موجوداتِ عالم سے ہے؟ سب سے پہلے ہمیں آخری سوال پر بحث کرنی چاہئے کیونکہ واقعۃً دوسرے سوالوں کا اسی پر دارومدار ہے

شاعر کی دنیا جوش کے نزدیک تمام عالم سے شاعر کو براہ راست تعلق حاصل ہے اور وہ اپنی مرضی کے مطابق اسکا مطالعہ کرتا رہتا ہے۔ بقولِ نظیری :-

بزیرِ ہر بنِ مو چشمِ روشنیست مرا　　بروشنائی ہر ذرہ روزنیست مرا

یا جیسا کہ جوش خود کہتا ہے :-

رقص کرتا ہے نظامِ دہر میرے ساز پر　　کاروانِ روح چلتا ہے مری آواز پر
ناز سے گلشن میں چلتی ہے ہوا میرے لئے　　جھوم کر آتی ہے ساون کی گھٹا میرے لئے!
حسن کو بخشے گئے ناز و ادا میرے لئے　　ساز سے باہر نکلتی ہے صدا میرے لئے!

شاعر کی تعریف اس طرح کی ہے :-

راستے کا ذرہ ذرہ جس کو دیتا ہو صدا　　"نظم کرتا جا مجھے بھی شاعرِ رنگیں نوا!!"

اکثر بیانیہ اُمور کو استفہامیہ طرز میں ادا کرنے سے ان کا حسن اور اثر دوبالا ہو جاتا ہے۔ جوش اس نکتہ کو بخوبی سمجھے ہوئے ہی چنانچہ مذکورۂ صدر بحث پر محاکمہ کرتا ہے :-

وہ کون منظرِ قدرت ہے آج عالم میں　　جو میرے واسطے آغوش وا نہیں کرتا ؟

شاعر کے فرائض اس تمہید کے بعد ہم کو دیکھنا چاہئے کہ جوش کے نظریۂ شاعری کے مطابق ایک شاعر کے کیا کیا فرائض ہیں یورپین مصنفین نے لٹریچر کی یہ تعریف کی ہے کہ وہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں حیاتِ انسانی منعکس نظر آتی ہے۔ جوش کو اس نکتہ کا پوری طرح احساس ہے لکھتا ہے :-

جس کے دفتر میں ہے اُس کے عہد کی ہر ایک بات　　موسم و ماحول و رسم و راہ و آئین و حیات
جو ایک ایسا آئینہ ہو شاہراہ وقت پر　　چہرۂ ہستی کے خال و خد ہوں جس میں جلوہ گر

انسانی جذبات و احساسات مختلف ہوا کرتے ہیں۔ خوشی و مسرت، غم و اندوہ، لذت و کیف کی مختلف صورتیں ہیں اور

ان میں سے ہر ایک کی جزئیات اس قدر کثرت سے جمع کی جا سکتی ہیں کہ شاعری کا میدان بہت وسیع نظر آتا ہے۔ لیکن سوءِ اتفاق سے ہمارے شعراء نے صرف عشق و محبت کو لیکر اس پر لاتعداد دواوین مرتب کر ڈالے، جوش کو اس سے سخت اختلاف ہے۔ شاعر کی تعریف کے ضمن میں اس امر کی جانب بھی اشارہ کر دیا ہے:۔

چند شعبوں ہی میں گم ہونے نہ پائے جسکی ذات — جس کا موضوعِ سخن ہو کُل نظامِ کائنات!

ایک اس سے بھی زیادہ دلچسپ امر ملاحظہ فرمائیے۔ یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے کہ ہر بشر کی ذہنیت دوسرے بشر سے مختلف ہوتی ہے اسی طرح اس کے جذبات بھی دوسرے بنی نوع انسان سے علٰحدہ ہونا چاہئیں۔ لیکن چونکہ ہماری شاعری کی بنا یکسر فارسی کی کورانہ تقلید پر قایم ہے، اس لئے آپ کسی اُردو شاعر کے کلام کا مطالعہ کرنے سے یہ نہیں اندازہ لگا سکتے کہ اس کے رجحانات اور اس کے معاصرین کے رجحانات میں کیا فرق تھا۔ اس کے نظریئے کیا تھے اور اس کی زندگی کن حوادث کے ماتحت بسر ہوئی مگر جوش اس لایعنی تقلید کا قایل نہیں۔ اُس کے نزدیک ایک شاعر کا کلام ایسا ہونا چاہئے کہ:۔

مہر بن کر جس کے ہر نقطے سے جھلکے اُس کا نام — جس کی سیرت کو مُدوّن کر سکے اس کا کلام،

موجودہ متغزلین کے متعلق جوش نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ممکن ہے بعض اصحاب ان کو سنکر جراغ پا ہوں لیکن ذرا دل پر ہاتھ رکھئے اور فیصلہ کیجئے کہ کیا اس کے یہ اشعار حرف بہ حرف صحیح نہیں ہیں؟

اِن غزلگویوں کا ہے معشوق ایسا نازنیں — نام جس کا دفترِ مردم شماری میں نہیں
یہ فقط رسمی مُقلِّد وامق و فرہاد کے — مر رہے ہیں آج تک معشوق پر اجداد کے!
ان کی سیرت ہے انوکھی، ان کی غیرت ہے عجیب — گڑ نہیں جاتے حیا سے یہ اب و جد کے رقیب!!
آج تک غالب ہے ان پر وہ رقیبِ روسیاہ — کر چکا ہے زندگی جو میرؔ و مومنؔ کی تباہ!
پائی ہے ترکے میں ان لوگوں نے ہر لے، ہر صدا — ان کے لب پر بھی وہی ہے جو ولی کے لب پہ تھا،

بالآخر کہتا ہے:۔

سلسلہ ان کے سخن کا دور تک ہوتا نہیں، — کون ہے ان میں جو بالآخر "کرکک" ہوتا نہیں؟
قلب ان کا قطرۂ شبنم تو ہے، چھالا نہیں — کوئی ان میں زندگی کا دیکھنے والا نہیں!!

آخری مصرع سے واضح ہے کہ جوش کیوں ان "نقالوں" کو بنظرِ استخفاف دیکھتا ہے اور شاید انھیں اسباب کی بنا پر مولوی عظمت اللہ خاں مرحوم نے آج سے ۲۰ سال قبل غزل کی موت کا حکم صادر کر دیا تھا

جوش کی شاعری

متذکرۂ بالا بحث سے یہ تو ظاہر ہو گیا ہوگا کہ جوش کے نزدیک ایک شاعر میں کیا کیا صفات لازمی ہیں اب ہم کو دیکھنا چاہئے کہ اس کی شاعری کے محاسن کیا ہیں، اس کی خصوصیاتِ کلام کیا ہیں اور وہ ان میں کس حد تک کامیاب ہے

محاکات محاکات کے لغوی معنی ہیں " باہم حکایت کرنا" لیکن اصطلاح شاعری میں اس فن کو محاکات سے تعبیر کرتے ہیں جس کے ذریعہ سے مناظرِ قدرت، کیفیاتِ باطنی، احساساتِ قلبی اور دوسرے مواقع کی ہوبہو تصویر کھینچ دی جائے۔ بیان کو پڑھتے ہی نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔ یہ صفت درحقیقت ضروریات شاعری میں ہے۔ قدرت نے جس شاعر کو اس کا جس قدر وافر حصہ ودیعت کیا ہے اتنی ہی اُس کی شاعری بھی مستحسن و بلند ہے۔ جوش اس میدان میں کس حد تک کامیاب ہے۔

مطابقت بہ اصل تصویر کی خوبی یہ ہے کہ وہ اصل سے بالکل ملتی جلتی ہو، اسی تخصیص کے باعث تصویر میں ایک خاص دلاویزی پیدا ہوجاتی ہے، نظر ڈالتے ہی ایک لطف و سرور کی کیفیت کا احساس ہوتا ہے شاعری میں بھی یہ امر ملحوظ رکھنا ازبس ضروری ہے۔ مثلاً ایک حسینہ خواب نوشیں سے بیدار ہوئی ہے۔ یہ اُس کی کسقدر صحیح تصویر ہے

پھیلا پھیلا آنکھ میں کاجل اُلجھا اُلجھا زُلف کا بادل
نازک گردن، پھول سی ہیکل! سُرخ پپوٹے، نیند سے بوجھل!
یہ کون اُٹھا ہے شرماتا!

چوتھے مصرع کو ملاحظہ کیجئے، پڑھتے ہی ایک خاص کیفیت کا سماں آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ پھر لکھتے ہیں:-

نیند کی لہریں، گنگا جمنی، جلد کے نیچے، ہلکی ہلکی،،
آنچل ڈھلکا، مسکی ساری ہلکی منہدی، دھندلی بندی!
یہ کون اُٹھا ہے شرماتا

ذہن میں اس کیفیت کا تصور کیجئے اور پھر ان اشعار سے تطابق کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اگر ہم اس حالت کی تصویر بھی دیکھیں تب بھی وہ کیف و انبساط نہیں حاصل ہوسکتا جو ان اشعار کے پڑھنے سے ہوتا ہے۔

ایک نظم کا عنوان ہے "حسنِ بیمار" اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جوش کو فنِ محاکات میں فی الحقیقت مہارت تامہ حاصل ہے۔ بعض اشعار ملاحظہ ہوں:-

انکسارِ حسن پلکوں کے جھپکنے میں نہاں نیم وا بیمار آنکھوں سے مروّت سی عیاں!
احترامِ عشق کی رو دلنشیں آواز میں ایک پھیکے پن کا سناٹا دیارِ ناز میں!!

اس کے بعد تو بس تصویر کھینچ دی ہے۔ لکھتا ہے:-

چوڑیاں ڈھیلی، دُلائی پر شکن، ماتھے پہ ہات لب پہ خشکی، رُخ پہ سوندھا پن، نظر میں التفات
ہلکی ہلکی جھلکیاں رُخسار پر یوں نور کی، جیسے گُل پر صبح کاذب کی سہانی روشنی!

استقصائے جزئیات

حقیقتاً یہ امر غیر ممکن ہے کہ جب کسی شے کی تصویر الفاظ کے ذریعہ سے پیش کی جائے تو تمام تفصیلات بیان میں آجائیں۔ ایک کامیاب شاعر کا کام یہ ہے کہ موقعہ و محل کی خصوصیات کا مطالعہ کرکے اہم نکات کو منتخب کرلے اور پھر اُن کو دلآویز پیرایہ میں بیان کردے اور جو خلا رہ گئے ہیں ان کا پُر کرنا قارئین پر چھوڑ دے۔

جوشؔ کو اس فن میں کمال حاصل ہے وہ غیر ضروری واقعات کو نظر انداز کردیتا ہے اور صرف ان واقعات کو قلمبند کرتا ہے جو مسئلۂ زیرِ بحث سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً ایک گاؤں کی لڑکی کا نقشہ یوں پیش کیا ہے:۔

غور سے اک طرف جمائے نظر — رکھے رُخسار کو ہتھیلی پر
سر پہ آنچل پڑا ہے ساری کا — داہنے ہاتھ میں ہے جس کا سرا
نرم گردن میں خم، کلائی میں بل — ناک میں کیل[لہ]، آنکھ میں کاجل!
رُخ پہ زلفیں، نگاہ میں بچپن، — جیسی دھیمی پھوار میں گلشن
رُخ پہ موجیں، سی زندگانی کی، — جھلکیاں طفلی و جوانی کی،
شمع سی اک جلائے دیتی ہے — خود بخود مُسکرائے دیتی ہے!!

دیکھئے شروع میں اس کے سکوت کی طرف اشارہ کرنا ضروری تھا جس سے معلوم ہوجائے کہ وہ کس حالت میں بیٹھی ہے لیکن اسکو اگر صرف اس طرح کہا جاتا کہ "وہ ٹکٹکی باندھے ایک جانب تک رہی تھی" تو ذہنی نقشہ نہیں طیار ہوسکتا تھا لہذا ہمارے شاعر نے مطالعۂ جزئیات کرنے کے بعد ایک خاص پوزیشن کی طرف اشارہ کردیا ہے جس سے کل سماں پیش نظر آجاتا ہے، ساری کا سرا بائیں جانب دوش پر ڈالا جاتا ہے لیکن چونکہ بچی کمسن ہے لہذا ساری کا دامن طویل ہونے کے باعث گردن کے پیچھے سے ہوکر دائیں جانب لٹکتا ہوگا۔ ایک تمیز دار بچی کی فطرت کا تقاضی ہے کہ اس کو اپنے داہنے ہاتھ کی گرفت میں رکھے گی، جوشؔ کے صرف اتنا کہدینے سے کہ "داہنے ہاتھ میں ہے جس کا سرا" یہ تمام کیفیت پیشِ نظر آجاتی ہے

یہ بچی چونکہ ابھی کمسن ہے اس لئے اس کے "حُسنِ معصوم" کی جانب اشارہ کئے ہوئے بغیر یہ بیان نامکمل رہ جاتا۔ چنانچہ گردن کی نزاکت اور ملائم کلائی کا بھی ذکر کردیا۔ پھر خیال آیا کہ اس کی زیبایش و تزئین کا حوالہ دینا بھی از بس لازمی ہے لیکن یہ کہنا کہ وہ "جھومر، ٹیکا، پائزیب، کنگن وغیرہ زیبِ تن کئے ہوئے تھی" فی الحقیقت واقعیت سے گریز کرنا ہے۔ یہ تو گاؤں کی ایک نوعمر، غریب اور مفلس لڑکی کا ذکر ہے۔ لہذا کہدیا کہ:۔ "ناک میں کیل آنکھ میں کاجل[لہ]"

غرض یہ کہ ہر مقام پر جوشؔ اس نکتہ کو ملحوظ رکھتا ہے کہ ان خصوصیات کا ذکر کردیا جائے جو موضوعِ زیرِ بحث کا نیچرل مرقع پیش کرسکیں

لہ یہ تصویر نا کتخدا لڑکی کی ہے اور شادی سے پہلے کیل کبھی استعمال نہیں کیجاتی، خاصکر گاؤں میں کہ وہاں تو شادی کے بعد بھی اس کا رواج نہیں ہے (اڈیٹر)

انتخاب الفاظ جوش اس امر کا بھی خاص لحاظ رکھتا ہے کہ کسی شے کا ذکر کرتے وقت محل و موقع کے مطابق الفاظ استعمال کرنے چاہئیں - مرد، عورت، بچہ، بوڑھا، غرض ہر ایک کی گفتگو کا ایک خاص انداز ہوتا ہے اس لئے جہاں ان کے مکالمات و گفتگو کو قلمبند کیا جائے وہاں اصل سے سرِ مو گریز نہیں کرنا چاہئے

شوہر کا پردیس میں چلا جانا اور اُس کی باوفا بیوی کا رو رو کر گھڑیاں کاٹنا خالص ہندوستانی مضمون ہے۔ ہندی شاعری میں اس موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا ہے - جوش نے اُردو میں اس پر طبع آزمائی کی ہے -

اے تر و تازہ جسر تو، بن کی!　　　اے گلابی گھٹاؤ، ساون کی!
جلدی اس دیس سے گزر جاؤ!　　　واری، اک بوند بھی نہ ٹپکاؤ
یوں نہ پاپی پپیہے! تان لگا،　　　جس نگر میں ہیں پی وہیں اُڑ جا
پی کی نگری میں جا کے بھر، جل تھل　　　میرے سر پہ گرج نہ او بادل!
ہائے کیوں کر نہ اختلاج رہے　　　پی ہیں پردیس میں براج رہے
سوجھتا ہی نہیں ہے ہات کو ہات　　　ڈس رہی ہے نگوڑی کالی رات
گھر اکیلا ہے پڑ رہی ہے پھوار　　　کیسا نور کھ ہے، اے سکھی، سنسار

سیج سونی ہے اور برستی رات
باؤلی ہوگئی ہے کیا برسات

لیکن اس کے بالکل برخلاف، جب کسی ذی مرتبت شخصیت کی گفتگو رقم کرتا ہے تو طرز بالکل بدل جاتا ہے۔ امام حسین علیہ السلام فوجِ شام سے دنیوی نعایم کی دنائت پر موعظہ فرما رہے ہیں یہاں طرزِ ادا ایک امام کے شایانِ شان ہے - ملاحظہ ہو -

دنیا جسے کہتے ہیں کثافت کا ہے انبار　　　خنزیر کی ہڈی سے بھی کچھ بڑھ کے ہے مُردار
ناپاک ہے، بد اصل ہے، کم ظرف ہے، بدکار　　　مُردار شکم اس کا، تو پشت اس کی ہے بیمار

مبروص کے داغوں سے عفونت[1] میں سوا ہے
ذلت کا یہ لقمہ ہے، سگوں کی یہ غذا ہے

تو فخر سے کہتا ہے جسے عیش و تنعم　　　وہ خواب کی جنت ہے، وہ فردوسِ توہم
نالہ ہی کی روداد ہے نغمہ کہ ترنم　　　ہے مہرِ فغاں روشنئ ماہِ تبسم

تو جس کو سمجھتا ہے کہ فردوس بریں ہے
دھندلی سی مسرت کا وہ سایہ بھی نہیں ہے!

---

[1] مبروص کے داغوں میں عفونت نہیں ہوتی، مجذوم کے داغوں میں ہوتی ہے - (اڈیٹر)

جوشؔ نے جہاں مولانا محمد علی مرحوم سے خطاب کیا ہے وہاں طرزِ ادا نہ صرف بلیغ ہے بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ قایل کو اپنے مخاطب کا پورا پورا احترام ہے اس لئے حرف حرف سے ادب، عقیدت اور خلوص مترشح ہے :-

اے متاعِ بُردۂ ہندوستان و ایشیار — اے کہ تھا ناخُن پہ تیرے عقدۂ حق کا مدار!

تیرے آگے لرزہ براندام تھی روحِ فرنگ — اے دلِ ہندوستاں کے عزمِ تند و اُستوار!!

تجھ سے آتا تھا پسینہ افسر و اورنگ کو — اے کہ ہمت تھی تری قوت شکن، سُلطاں شکار!

ایک اور نکتہ قابلِ لحاظ ہے، جس مقام پر کسی کا استخفاف یا تذلیل مقصود ہوتی ہے، جوشؔ وہاں کچھ ایسے مخصوص الفاظ استعمال کرتا ہے کہ اُس کا مقصد واضح ہوجاتا ہے مثلاً "شیخ کی مناجات" میں لکھتا ہے :-

تیرے بندوں میں ہیں جو صاحبِ زر — میرے آگے جُھکا دے اُن کے سر

اپنی مخلوق کو جبا، داور! — میرے تعویذ اور گنڈے پر

دے مرے رُخ کو صولتِ الہام — اور مریدوں کو تحفۂ اوہام

میرے ہر عیب کو ہنر کردے — میری داڑھی دراز تر کردے!

حُسن تو خانقاہ کا ہے پھول! — عورتوں میں کچھ اور کر مقبول

مقبروں پر جلال برسادے — میرے عرسوں پہ حال برسادے

میری پیری میں زور رہنے دے! — چشمِ عالم کو کوُر رہنے دے!!

ہیبت و صوتِ الفاظ

اس سے بھی زیادہ پُرلطف بات یہ ہے کہ جس مقام پر وہ کسی خاص حالت کا اظہار کرتا ہے تو اس قسم کے الفاظ لاتا ہے جن سے خود بخود اس حالت کا سماں پیدا ہوجاتا ہے، کہیں دہشت برستی ہے، کسی جگہ کیفیتِ سرور کا اظہار ہوتا ہے۔ حقیقتاً یہ ایک صنعت ہے جسکو انگریزی میں Onamatopoeia کہتے ہیں۔ بعض مثالیں درج کی جاتی ہیں :-

مست بھونرا گونجتا پھرتا ہے کوہ و دشت میں
کاکلوں میں سے کرن پھولوں کو جھمکاتی ہوئی

کلیوں کا کوئلوں کی چٹکنا وہ بار بار — وہ قہقہوں کی گونج، وہ شیریں پہیلیاں

یہ سَنکتے سرد جھونکے کارواں در کارواں — یہ ہمکتی، چُلبلی موجیں قطار اندر قطار!

قمریاں چہکیں، ملے پودے، چلی ٹھنڈی ہوا — جام کھنکے، روئے مینا پر بہار آنے لگی،

آتی ہیں ہوائیں سنسناتی، — پودوں کی دھڑک رہی ہے چھاتی،

پھر اس کے بعد تیز ہوئی تان دفعتاً — اللہ رے زور، گونج اُٹھا گنبدِ کہن

انتخاب الفاظ بعض مقامات پر کوئی کیفیت سپردِ قلم کرتے ہوئے پے درپے چند الفاظ ایسے لے آتا ہے کہ اُن کے مجموعی مطالعہ سے اس چیز کا ہو بہو نقشہ نظر کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ مثلاً "مالن" کے متعلق لکھتا ہے:۔

اینڈتی، مُڑتی، خود اپنی کمسنی سے کھیلتی ۔۔۔ بھاگتی، رُکتی، ٹھٹکتی، بال بکھراتی ہوتی

گنگناتی، مسکراتی، لڑکھڑاتی، جھومتی ۔۔۔ مثلِ ابر اپنے ہی پر خود پیچ وخم کھاتی ہوئی

محفلِ عیش کا ایک موقع ملاحظہ کیجئے:۔

گائیں، ناچیں، لڑکھڑائیں، گنگنائیں تال دیں ۔۔۔ دلبرانِ شوخ وشیریں، مہوشانِ چست وچاق

ایک دلنشیں آواز کا نقشہ یوں پیش کیا ہے:۔

ناآزمودہ غم کی جبیں چومتی ہوئی، ۔۔۔ تپتی ہوئی، لرزتی ہوئی، جھومتی ہوئی،

تشبیہات بعض چیزیں اسقدر غیر معروف ہوتی ہیں کہ جب تک ہم معروف اشیاء کا حوالہ دیکر اُن سے ان کی مشابہت ظاہر نہ کریں، ذہنِ انسانی آسانی سے اُن کی جانب نہیں منتقل ہوتا۔ تشبیہ کا اصل مقصد یہی ہے۔ لیکن بیان میں نُدرت، لطافت اور نزاکت پیدا کرنے کے لئے بھی تشبیہات استعمال کی جاتی ہیں اور غالباً جوش نے آخر الذکر مقصد ہی کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ مثلاً پانی میں کسی خوبصورت سایہ کے لرزنے کی اس سے بہتر تشبیہ نہیں پیش کی جاسکتی:۔

یوں قصر کا عکس ہے سرِ آب ۔۔۔ ارماں جیسے ہو دل میں بیتاب

ایک جگہ سورج کی کرنوں کی تمازت یوں دکھائی ہے:۔

سر پہ کافر دھوپ جیسے، روح پر عکس گناہ ۔۔۔ تیز کرنیں جیسے بوڑھے سود خواروں کی نگاہ

لیکن جب انھیں کرنوں کی لطافت وخوشنمائی کا ذکر کرتا ہے تو طرزِ ادا قطعاً تبدیل ہوجاتا ہے:۔

پھوٹتی ہے یوں کرن جیسے کوئی کمسن عروس ۔۔۔ آرہی ہو کھیلتی کنگن سے، شرماتی ہوئی

بعض اور لطیف تشبیہات ملاحظہ ہوں:۔

لب کو یوں جنبش سی ہو نا نطقِ شرم آمیز سے ۔۔۔ پنکھڑی جس طرح مُڑ جائے ہوائے تیز سے

تیرتا پھرتا ہے یہ بادل کے ٹکڑوں میں ہلال ۔۔۔ یا زمرد کا سفینہ درمیانِ جوئبار

یہ کلی پر قطرۂ شبنم میں ہے نورِ قمر ۔۔۔ آنکھ کی پتلی میں یا غلطاں ہو عکسِ روئے یار

چیتھڑوں میں دیدنی ہے روئے غمگینِ حیات ۔۔۔ ابر کے آوارہ ٹکڑوں میں ہو جیسے آفتاب

سرنگوں ہیں بھول سکتے میں ہیں پیمانے کا رنگ ۔۔۔ اُف یہ نم آلود رخساروں پہ شرمانے کا رنگ

کاکلیں لہرا رہی تھیں روئے عالم تاب پر ۔۔۔ سنبلستاں کا تھا گل پر سائباں کل رات کو

نظر آتا تھا گھبرایا ہوا یوں چاند بادل میں، ۔۔۔ کوئی سہمی ہوئی دوشیزہ شب کو جیسے جنگل میں

شلوکا پہنے ہوئے گلابی ہر اک سبک نکھڑی چمن میں — رنگی ہوئی سرخ اوڑھنی کا ہوا میں پلو سکھا رہی ہے
کلی پہ بیلے کی کس ادا سے پڑا ہے شبنم کا ایک موتی — نہیں، یہ ہیرے کی کیل پہنے پری کوئی مسکرا رہی ہے!

ندرتِ بیان

محاکات کے سلسلہ میں یہ امر بالخصوص قابلِ لحاظ ہے کہ بعض مضمون فی نفسہٖ موثر نہیں ہوتا بلکہ طرزِ ادا سے اس میں تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔ مضمون آفرینی فی الحقیقت قوتِ متخیلہ کا کام ہے۔ قوتِ شعری کا کمال دراصل طرزِ ادا ہی میں مضمر ہوتا ہے۔ شاعر کی خوبی یہی ہے کہ معمولی سے مضمون کو بھی اس طرح ادا کرے کہ لطیف تر معلوم ہو اور سامعین کے دلوں پر اثر کرے۔ جوشؔ نے انتخابِ الفاظ، ان کی تراکیب اور محاورات کی بندش سے بعض مقامات پر بہت دلآویزی پیدا کر دی ہے بعض مثالیں پیش کی جاتی ہیں :-

پتیاں مخمور، کلیاں آنکھ جھپکاتی ہوئی — نرم جاں پودوں کو گویا نیند سی آتی ہوئی
الاماں ٹھنڈی ہوا کے گدگدانے کی ادا — ہر کلی کو آ رہی تھیں ہچکیاں کل رات کو
سرشار جوانی کی وہ بدمست لگاوٹ — بچنے نے چھپائی تو نگاہوں نے بتا دی،
وہ کلی چٹکی، وہ برسا رنگ، وہ پھوٹی کرن — ہنس کے وہ انگڑائی لی دریا نے بہنے کے لئے
آتی ہیں ہوائیں سنسناتی، — پودوں کی دھڑک رہی ہے چھاتی،
سوکھی ہوئی گھانس ہے فسردہ — افسردہ نہ کہئے بلکہ مردہ
گردوں کی جبیں دمک رہی ہے — پودوں کی کمر لچک رہی ہے
پھوٹی ہے کرن جو تلملاتی — شبنم کی دھڑک رہی ہے چھاتی،
چہرہ پھیکا نیند کے مارے — پھیکے پن میں شہد کے دھارے
جو بھی دیکھے جان کو وارے — دھرتی ماتا بوجھ سہارے
یہ کون اٹھا ہے شرماتا

لپیٹے منہ سو رہی تھیں کلیاں، صبا نے آ کر جو گدگدایا — سرک گئے ہیں سروں سے آنچل، تمام گلشن مہک رہا ہے!

نفسیات وذہنیات

فلسفۂ جدید کی دنیا میں نفسیات (Psychology) اور ذہنیات[1] (Psycho-Analysis) اپنی اپنی جگہ پر مخصوص علوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہر افسانہ نگار ڈرامہ نویس اور آرٹسٹ کے لئے ان کا مطالعہ لابدّ اور ناگزیر ہے۔ کیونکہ فنونِ لطیفہ کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ انسانی جذبات واحساسات میں ایک پسندیدہ ارتعاش پیدا کیا جائے تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ ان کی طرف مائل ہو کر لطف اندوز ہو سکیں

---

[1] "تحلیل نفسی" کہئے (اڈیٹر)

ان اُمور کی تکمیل کے لئے یہ لازم ہے کہ ہر اہلِ فن " واقفِ نفسیات" ہو۔ شاعری چونکہ اصولاً جذباتِ انسانی سے براہ راست تعلق رکھتی ہے لہذا ایک شاعر کو فنِ نفسیات سے گہرا تعلق ہے

جوشؔ کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو انسان کی کیفیاتِ نفسی پر کامل عبور حاصل ہے۔ قدم قدم پر اس امر کا احساس ہے کہ انسانی حسیات اور قلبی حوادثات کی صحیح تصویر کیونکر کھینچی جاتی ہے

ایک نظم کا عنوان ہے " پہلی مفارقت"۔ شروع اس طرح کرتا ہے:۔

چاند سے عہدِ وصل کی باتیں ہائے فرقت کی چاندنی راتیں

دوسرا مصرع سنتے ہی سامعین کو تشویش ہونے لگتی ہے کہ دیکھئے اب کیا کہتا ہے؟۔ اس کے بعد لکھتا ہے:۔

آفتیں جمع ہیں خدائی کی، چاندنی رات ہے جدائی کی
کوئی کافر ہی شب کو سوتا ہے رات بھر دل میں درد ہوتا ہے

اس "شب بیداری"، کی مزید تصریح اس طرح کی ہے:۔

اُٹھتی رہتی ہیں بار بار آنکھیں ڈھونڈتی ہیں جمالِ یار آنکھیں
کچھ وہ تکیوں سے آتی ہے خوشبو نیند آتی نہیں کسی پہلو!
چھیڑتا ہے جو کوئی رات کو ساز صاف آتی ہے یار کی آواز
آگ سی پہلوؤں میں جلتی ہے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا جو چلتی ہے

ظاہر ہے کہ جب یہ کیفیت ہوگی تو احباب و اقربا کچھ نہ کچھ تسکین دینے کی کوشش کرتے ہوں گے لیکن اس "تسکین" کا جو اثر ہو سکتا ہے، ظاہر ہے۔ جوشؔ لکھتا ہے:۔

بے نتیجہ ہے صبر کی تلقین، بلکہ دیتا ہے جب کوئی تسکین
شعلۂ غم بھڑکنے لگتا ہے، اور بھی دل دھڑکنے لگتا ہے

نظم کا آخری حصہ بھی نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت اہم اور دلچسپ ہے:۔

اے اودھ کی نسیمِ عقدہ کشا وہ ملیں تو پیام یہ کہنا
آنکھیں دیدار کو ترستی ہیں بادلوں کی طرح برستی ہیں
اُٹھتی رہتی ہے ہوک سی پیہم ہائے وہ رُخ وہ کاکل برہم
ہائے وہ چاندنی، وہ مہتابی مست آنکھوں کی وہ شکر خوابی
برگِ گل پر وہ ماہتاب کی ضو رُخ پہ وہ آمدِ شباب کی رو
خال و خد سے عیاں بصد انوار صبحِ صادق کی چاندنی کا نکھار

ہاں تو اے دلنشیں اودھ کی صبا! وہ ملیں تو پیام یہ کہنا
بادلوں کی طرح برستی ہیں آنکھیں دیدار کو ترستی ہیں!
ایک مدت ہوئی نہیں دیکھا ہائے تیرا وہ چاند سا مکھڑا
اس طرح صبح و شام ہوتی ہے دل دھڑکتا ہے آنکھ روتی ہے!
کھائے جاتا ہے کوئی سینے کو آگ لگ جائے ایسے جینے کو
تنگ ہے سانس آنے جانے سے
اب بلا لے کسی بہانے سے!

ایک بہن کو اپنے حقیقی بھائی سے جو الفت ہوتی ہے، محبت کی دنیا میں اس کا جواب ناپید ہے۔ ہندی شاعری میں "بیرن کی یاد" میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اردو شاعری میں یہ مضمون مفقود نہیں تو کمیاب ضرور ہے، لیکن جوشؔ کے یہاں ایک غمزدہ بہن اپنے پردیسی بھائی سے خطاب کر رہی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

میں دیس میں تم وطن سے باہر! اے بھائی، بہن نثار تم پر! !

"اے بھائی! بہن نثار تم پر" یہ مصرع ایک بہن کے جذبات کا حقیقی آئینہ دار ہے۔
نظم کا بقیہ حصہ بھی سن لیجئے بہن پھر کہتی ہے:۔

انگنائی میں ہو رہا ہے غوغا ساون کی ہے رُت، ہوا ہے پُروا
سائے میں گرجتی بدلیوں کے استادہ ہیں دو شریر بچے
اک موجِ رواں ہے، اک چمن ہے اک خیر سے بھائی، اک بہن ہے
کچھ دیر سے دونوں لڑ رہے ہیں کیا جانئے کیوں جھگڑ رہے ہیں!
میں دیکھ رہی ہوں اور چپ ہوں کس جی سے بھلا فساد کاٹوں،
اس جنگ کے آئنہ کے اندر بچپن ہے ہمارا جلوہ گستر
کرتے تھے شرارتیں اُدھم بھی
لڑتے تھے اسی طرح سے ہم بھی

ان اشعار کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ جوشؔ کی شاعری نفسیاتی نقطۂ نظر سے بھی نہایت اہم پایہ رکھتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو فی الحقیقت جذبات و حسیاتِ انسانی کی مختلف کیفیات سے پوری واقفیت حاصل ہے۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے صحیح فرمایا ہے کہ "جوشؔ کی شاعری نے ہمیں اس قابل بنا دیا ہے کہ آنکھیں نیچی کئے ہوئے بغیر اپنی شاعری کو دنیا کی ترقی یافتہ شاعری کے مقابلہ میں رکھ سکتے ہیں۔ (نقش و نگار)

تاثیر اور دلنشینی شعر کی خوبی یہ ہے کہ سنتے ہی سامع کے قلب میں اُتر جائے۔ سننے والا یہ محسوس کرنے لگے کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے!"۔ تاثیر اور دل نشینی کے لئے روانی، برجستگی اور صداقت ضروری اُمور ہیں۔ جوش کی شاعری کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے حرف حرف میں درد و اثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے شعر خود کہے دیتا ہے کہ جس دل سے نکل کر آیا ہوں وہ غم و اندوہ کا مسکن ہے۔

کسی شے کی تعبیر حقیقتاً ہمارے زاویۂ نگاہ اور ذوق نظر پر منحصر ہے۔ اگر ہماری طبیعت الم پرور ہے تو عمدہ سے عمدہ بات کا اندوہگیں مفہوم لیا جا سکتا ہے۔ جوش کو "کسی" نے بیلے کی کلیاں تحفۃً بھیجی ہیں۔ اس کی توجیہ ملاحظہ فرمائیے :-

بھیجی ہیں کسی نے بہرِ درماں ۔۔۔ بیلے کی چمن فروز کلیاں
کلیوں سے مگر عیاں ہے زردی ۔۔۔ یہ روحِ غم ان میں کس نے بھر دی ؟
گویا ہیں زبانِ حال سے یوں، ۔۔۔ اے شاعرِ خوش نصیب و محزوں!
بھیجا ہے چھپا کے ہم کو جس نے ۔۔۔ جانے اُسے غم دئے ہیں کس نے
یوں زرد وہ روئے دلنشیں ہے ۔۔۔ اک بوند بھی خون کی نہیں ہے!

پھر کلیاں اس غمزدہ، مہجور لڑکی کا پیغام سناتی ہیں، سنئے :-

ہم سے یہ کہا ہے جا کے کہنا ۔۔۔ لازم نہیں اب خموش رہنا
مجھ کو تری یاد نے ڈبویا ۔۔۔ مُرجھائی ہوئی کلی ہوں گویا
بھرتی ہوں چھپا کے شب کو آہیں ۔۔۔ اُٹھتی نہیں چاند سے نگاہیں
شاما جو سحر کو بولتی ہے ۔۔۔ آنکھوں کی گرہ کو کھولتی ہے!
چہرہ سے عیاں ہے دل کی اُلجھن ۔۔۔ ڈھیلے ہیں کلائیوں کے کنگن
اللہ یہ کیا ہوا ہے مجھ کو ۔۔۔ دیکھو جسے، دیکھتا ہے مجھ کو

آخری مصرع میں جو کیفیت پیش کی ہے وہ اسیرِ غم کے جذبات کا نہایت مکمل نقشہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کہنے والی کے قلب پر غم و اندوہ کا ہجوم ہے، وہ نہایت ہی کرب و اضطراب کے عالم میں یہ سب کچھ بیباکی سے کہتی چلی جاتی ہے :-

اب حد سے سوا ہے خستہ حالی ۔۔۔ نزدیک ہے وقت پائمالی
آنا ہو تو آ، کہ دل ہے بیتاب ۔۔۔ ایسے میں ابھی چمن ہے شاداب[1]
جلد آ، کہ فروغ رنگ و بو ہو ۔۔۔ قبل اس کے کہ خون آرزو ہو!!

---

[1] اسی مفہوم کا ایک شعر شادؔ عظیم آبادی کا یاد آگیا :-

مرغانِ قفس کو پھولوں نے اے شادؔ یہ کہلا بھیجا ہے ۔۔۔ آجاؤ جو تم کو آنا ہو ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم (اڈیٹر)

دیکھئے، دوسرے شعر میں "آنا ہو تو آ!"، کہنے کے بعد تیسرے شعر میں "جلد آ!" کی تکرار سے طرزِ ادا میں کتنی بے ساختگی پیدا ہو گئی ہے۔

ہجر و مفارقت کی شکایت کرنا شعراء کی سنت دیرینہ ہے۔ جوش نے بھی اس "دفتر بے پایاں" میں مزید اضافہ کیا ہے لیکن نہایت بامعنی۔ سنئے:۔

تیرے قربان! ارے خواب میں آنیوالے	داستاں عہدِ تمنا کی سنانیوالے
ہاں، ترے حرفِ شکایت سے پشیماں ہوں میں	بخشدے بہر خدا جُرم کہ انساں ہوں میں!

اس "جرم" کی آگے چل کر یوں تشریح کی ہے:۔

یہ مگر وہم ہے اے پیکرِ حسن و تنویر	کہ یہ دل اب ہے کسی اور کی زلفوں کا اسیر

مگر فی الحقیقت یہ "وہم" چند حقایق پر مبنی ہے جن کی توجیہ ہمارے شاعر نے کر دی ہے:۔

ہاں، ترے ہجر میں اک شغل نکالا ہے ضرور	شدتِ کاہشِ آلام کو ٹالا ہے ضرور
قاعدہ ہے نہیں ہوتا ہے فلک پر جب ماہ	لطف اُٹھاتی ہے چمکتے ہوئے تاروں سے نگاہ
بن ترے جب کسی دم چین نہیں پاتا ہوں	میں بھی یوں ہی دلِ افسردہ کو بہلاتا ہوں

مگر اس کے باوجود وفا کا یہ عالم ہے کہ کہتا ہے:۔

تو جو آزردہ ہے جھوٹی بھی تسلی نہ سہی،	رشک آتا ہے اگر تجھ کو تو یہ بھی نہ سہی!

"غریب الوطن کا پیام" جوش کی مشہور نظم ہے۔ یہ بھی شروع سے آخر تک تاثیر میں ڈوبی ہوئی ہے بعض اشعار ملاحظہ کیجئے:۔

جکڑا ہوا پڑا ہوں زنجیر سے دکن کی	سینے میں آرزو ہے بچھڑے ہوئے وطن کی

پھر گزشتہ واقعات و حوادث کا تصور کر کے ان پر یوں تبصرہ کرتا ہے:۔

کس زندگی کی دُھن میں ہم رواں دواں ہیں؟	جو ساتھ کھیلتے تھے وہ لوگ اب کہاں ہیں؟
شاداب تو ہیں میری بچپن کی سیر گاہیں؟	اب ڈھونڈتی ہیں جن کو ترسی ہوئی نگاہیں!
اچھی تو ہیں پروں کو دُھن میں جھٹکنے والی	دیوار پر وہ آکر چڑیاں چہکنے والی
کیا اب بھی جھومتی ہیں کرتی ہوئی اشارے	پتلی سبک ببولیں تالاب کے کنارے؟
بدلی میں گونجتے ہیں آموں کے باغ اب بھی؟	جلتے ہیں جنگلوں میں دُھندلے چراغ اب بھی؟

اس کے بعد چاند سے خطاب کرتا ہے کہ:۔

مغموم جھاڑیوں سے میرا سلام کہنا	آنکھوں میں اشک بھر کر پھر یہ پیام کہنا
کیوں میرا سوزِ فرقت تم کو جلا رہا ہے؟	کیوں مضطرب ہو؟ ٹھہرو، وہ دن بھی آ رہا ہے

جس دن دھڑکنے والے دل کو قرار ہوگا ! سائے میں جب تمھارے میرا مزار ہوگا !!

اشعارِ ذیل بھی تاثیر اور دل نشینی میں لاجواب ہیں :۔

بے خبر مجھ کو زمانے سے کیا ہے جس نے کچھ اُسے میری تباہی کی خبر ہے کہ نہیں ؟
کھائے جاتا ہے مجھے دردِ غریب الوطنی ! دل پہ اُس جانِ وطن کے بھی اثر ہے کہ نہیں ؟
آنکھ کھلتے ہی صبح تیری یاد دل پہ کرتی ہے جا کے کیا بیداد
دل مرا غرقِ یاس رہتا ہے شام تک جی اُداس رہتا ہے !
جبیں پر سادگی، نیچی نگاہیں، بات میں نرمی مخاطب کون کر سکتا ہے تم کو لفظِ قاتل سے !
وہ اپنے حُسن سے محفل، میں اپنے عشق سے بزم ! اُس انجمن کو پھر اِس انجمن میں پہونچا دے !
آنکھوں میں اشک، رُخ پہ تمنّا، لبوں پہ آہ اب اس ادا سے سامنے آتے نہیں ہو تم !
وہاں جفا ہی جفا رہ گئی ہے مدّت سے یہاں جفا پہ وفا کا گمان باقی ہے !
اب خانۂ امید میں ظلمت ہی نور ہے تکلیفِ اہتمام چراغاں نہ کیجئے
دم ہی نہیں ہے جوشؔ میں تجدیدِ شوق کا احسان اب یہی ہے کہ احساں نہ کیجئے !
قفلِ بابِ شوق تھیں ماحول کی خاموشیاں دفعتہً کافر پپیہا بول اُٹھا، اب کیا کروں ؟
مرا رفیق نہیں ہے کوئی خدائی میں زمیں جگہ نہیں دیتی تری جدائی میں
شرط پوری ہو چکی، للّٰہ اب تو رحم کر دیکھ کیا تھا جوشؔ اور کیا ہو گیا تیرے لئے !!

شکوۂ روزگار کچھ عجیب اتفاق ہے کہ دنیا کے تمام باکمال لوگ زمانہ کے شاکی رہے ہیں۔ جوشؔ کے کلام سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ زمانہ کا سخت شاکی ہے، علی الخصوص "فکرِ روزگار" کے باعث غالباً اس کو دلی کوفت ہوئی ہے، لکھتا ہے :۔

آہ، اے دورِ فلک تیرا نہیں کچھ اعتبار مٹ کے رہتی ہے ترے جورِ خزاں سے ہر بہار
نوعِ انساں کو نہیں تیری ہوائیں سازگار فکرِ دنیا اور شاعر ؟ تُف ہے اے لیل و نہار !

موج کوثر وقف ہو اور تشنہ کامی کے لئے !
خواجگی رختِ سفر باندھے غلامی کے لئے !!

ایک جگہ اپنے خاص انداز میں یہی مضمون یوں بیان کیا ہے :۔

ڈالتا ہے بار کوئی شاعرِ مدہوش پر حُسن کے بکھرے ہوئے ہیں بال میرے دوش پر

پھر شکوہ سنجانہ تصریح اس طرح کی ہے :۔

بجلیاں جس نخل پر رقصاں ہوں پھل سکتا نہیں
تیری اس دنیا کا مجھ سے کام چل سکتا نہیں

میں پروں کو تولتا ہوں آشیانے کو سنبھال
یہ ہے دُنیا اور اپنے کارخانے کو سنبھال

"چراغِ عظمت" کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے وہ بھی انھیں خیالات کی آئینہ دار ہے:۔

یہ ہے تیرا ہی چراغ، اے شاعرِ رنگیں صفات
لیکن اس سے فیض اُٹھا سکتی نہیں تیری حیات

اس کو پا سکتا نہیں تو بزمِ عشرت کے لئے
یہ تو ہے نادان تیری لوحِ تربت کے لئے

ہو گی تیری تیرہ قسمت زندگی جب خواب میں
جگمگائے گا یہ تیری موت کی محراب میں

غم کوشی و ایذا پسندی

اُردو شعراء میں جوشؔ کی مخصوص صفت یہ ہے کہ وہ مصائب و آلام سے دل برداشتہ ہو کر مائلِ فریاد نہیں ہوتا۔ اس کو احساس ہے کہ تمام عالم میرے درپئے آزار ہے لیکن پھر بھی وہ ایک تبسم آمیز انداز سے ان تکالیف کا خیر مقدم کرتا ہے:۔

اُٹھی جاتی ہے دل سے ہیبتِ آلامِ رُوحانی
جراحت بہرِ قلبِ زار مرہم ہوتی جاتی ہے

اُسے زمانہ کی کلفتوں کا احساس ضرور ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ یہ کہتا ہے:۔

مانوس ہو چکا ہوں غمِ روزگار سے
اب ذکرِ آب و رنگِ تمنا نہ کیجئے

سینہ مآلِ ذوقِ طرب سے ہے چاک چاک
اب فتنۂ نشاط کا در، وا نہ کیجئے

ایک دوسری جگہ اسی مضمون کو ذرا مختلف الفاظ میں پیش کیا ہے:۔

اب، اے خدا، عنایتِ بیجا سے فایدہ؟
مانوس ہو چکے ہیں غمِ جاوداں سے ہم

تمام شعراء معشوق کی بے التفاتی کے شکوہ سنج ہیں لیکن جوشؔ کا نظریہ ان سب سے مختلف ہے، وہ کہتا ہے:۔

سنتا ہوں دردِ عشق ہے ہر درد کی دوا
آ، اور میرے دردِ جگر کو دو چند کر

بے نیازی اور مستغنی المزاجی:۔

تجدیدِ چاک کی نہیں دامن کو آرزو،
اب نقلِ اضطرابِ زلیخا نہ کیجئے

اب خانۂ امیر میں ظلمت ہی نور ہے
تکلیفِ اہتمامِ چراغاں نہ کیجئے

اب دل کو بزمِ ناز کی حسرت نہیں رہی،
اب عذرِ بد مزاجیِ درباں نہ کیجئے

بالآخر کس لاپرواہی کے ساتھ کہتا ہے:۔

دم ہی نہیں ہے جوشؔ میں تجدیدِ شوق کا
احسان اب یہی ہے کہ احساں نہ کیجئے

(باقی)

یوسف رضا بدایونی

انتخاب کلام نسبتی تھانیسری

(۳)

مولوی فضل حسین صاحب تبسم گزشتہ دو اشاعتوں میں کلام نسبتی پر نہایت محنت و کاوش سے تبصرہ فرما چکے ہیں، اور اب انتخاب کلام پیش کیا جاتا ہے، جس کا حق میں نے اُن سے حاصل کر لیا ہے

تبسم صاحب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے انتہائی محبت و خلوص سے کام لیکر کلیات نسبتی کا مخطوطہ میرے پاس بھیجدیا اور مجھے انتخاب کا موقعہ دیا۔ یہ نسخہ مکمل تو یقیناً نہیں ہے، لیکن اس سے زیادہ مکمل شاید کہیں مل بھی نہیں سکتا اور ملک کو تبسم صاحب کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ ان کی وساطت سے ایک خوش فکر شاعر کا گمشدہ کلام ہاتھ آگیا

نسبتی کی شاعری کے متعلق تبسم صاحب کافی لکھ چکے ہیں اس لئے اب اس میں کسی اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی

نیاز

نے راہ و نہ رسم ست و نہ توفیق نیا را — رہ گم شدگانیم چہ جوئیم خدا را

گلہ امروز تا بہ حال مکن ،، — نسبتی خیر می شود فردا

بدنامیٔ بتازہ برانگیخت است گرد، — طشتے دگر فتادہ ہمانا ز بام ما ؛؛

بگزار تا دلے ز شکایت تہی کنم ، — در سینہ می خلد گلۂ ناتمام ا

زلف یکجا بند یکجا دام یکجا عقدہ است — اندک اندک کردہ ام ایں قصۂ بسیار را

صد گرہ از کار ہر گبر و مسلماں وا شود — نسبتی گر وا کند یک رشتۂ زنار را

نگاہے چند باید کرد تا فارغ کند ما را — یکے جاں می برد از ما یکے دل را یکے دیں را

تو ایجاں در نمی آئی، دل از جا در نمی آید — کسے تا چند بر پا دارد ایں آرام و تسکیں را

اے مرغ چمن نالہ و زار تو جگر سوخت — از نسبتی آموختہ ای طرز نوا را

نے وعدہ نے امید تو خود گو جواب چیست ــــــ پرسند گر ز ما سبب انتظار ما
ورائے عشوہ و نازہ خرام و رعنائی، ــــــ دگر ہزار بلا ہمرہیست بالا را
اے آنکہ بیغانہ روی از کنار ما، ــــــ آگاہ نیستی مگر از انتظار ما
کس نداند کہ کجا حسن تو یکجا کردہ ــــــ اینہمہ خوبی و زیبائی و رعنائی را
اشک ریزاں میروم در وادی آوارگی، ــــــ تا کجا خواہم فشردایں دامن نمناک را
برہم زدہ کار میروی لیک، ــــــ کارست ہنوز با تو ما را
ما از دل و از کام دل خویش گزشتیم ــــــ امروز اجابت نتواں داشت دعا را
بزم جم آخر شد و وقت صبوح ما رسید ــــــ طرح دیگر می تواں انداخت دور جام را
نسبتی اندر دل بے رحم او تاثیر نیست ــــــ نالہائے صبحگاہ و گریہ ہائے شام را
نہ با تو رفتم و نے بے تو در غمت مردم ــــــ یکے ز دست نیامد ازیں دو کار مرا
دل گرفتار و یار بے پروا؛ ــــــ ایں ہماں کوچہ من ہماں رسوا
دل و صد آرزوے خام بہ دل، ــــــ یار و چندیں فریب و من تنہا
خوباں بردید از دل ما ؛ ــــــ آساں بکنید مشکل ما
موقوف بہ خنجر دگر شد ــــــ آسایش نیم بسمل ما،
رفتیم ز کوئے یار اینک ــــــ در دامن ماست حاصل ما
اے بادشہ بتاں خدا را ــــــ در بزم طلب کن ایں گدا را،
در نسخۂ نسبتی ست یک نام ــــــ عنقا و وفا و کیمیا را
قرباں شوم ابروِ بتاں را، ــــــ زورِ دگرست ایں کماں را
چشم خراب آنزد و دل مبتلائے زلفش، ــــــ عیسیٰ بدین عیسیٰ، موسیٰ بدین موسیٰ
چارہ نتواں کرد دردِ کہنہ و دیرینہ را ــــــ دست بر دل می نہادم پارہ کردم سینہ را
در دلِ سنگین آں بے رحم تاثیرے نکرد ــــــ نسبتی بر گریۂ خود خندہ می آید مرا
باز می جویم دلِ افسردہ را ــــــ آں دل و آں خاطر آزردہ را
تو آنہا کردۂ اے شوخ با ما ــــــ کہ نے مومن کند با کس نہ ترسا
میکنم سخت یاد او امروز ــــــ غالباً یاد کردہ است مرا
بیش ازیں بودہ است حال خوشے ــــــ نالہ و اشک و آہ بود مرا

مردیم و بود در دل حرفے کہ با تو گوئیم — درخاک رفت با ما رازِ نہانیِ ما

داشتم زیں پیش با خود اندکے دیوانگی — عقلِ ناداں نسبتی دیوانہ تر کردہ مرا

نمود وعدۂ قتلم دو چشم او لیکن — چہ اعتماد تواں کرد قولِ مستاں را

ہر طبیبے کہ بیاید بسرم بہرِ علاج — او جدا گریہ نماید من بیمار جدا

ہجرش از آب می بر آرد دود، — وصلش از شعلہ می چکاند آب

حال می پرسی و ما را گفتگو ہا کم شدست — بسکہ برہم خوردہ دلہا آرزو ہا گم شدست

مے باقی و ماہتاب باقی ست، — ما را بتو صد حساب باقی ست

سرِ من گر بودت ورنہ بود رنجش نیست — چہ تواں کرد مرا با تو سرے افتادست

بر نسبتی امروز عجب حال غریب ست — چوں گردشِ ایام نہ آرام فتادست

در وصل عیش می کشد و در فراق غم — مانند شعلہ حسن ترا پشت و رُو یکے ست

ابروش از عقدہ و پیشانیش از چیں تہی — نسبتی امروز وقتِ التماس حاجت ست

بر خاکِ تو آمدہ ست جاناں — برخیز کہ وقتِ جانفشانی ست

خرمنِ دل راہماں شمع وفا باید نہ برق — خاطرِ پروانہ از ہر آتشے خرسند نیست

دل باختۂ بہرِ نگاہِ تو نشست است — رہ گم شدۂ بر سرِ راہِ تو نشست است

نالہ بسیار و آہ بسیار است — درد را دستگاہ بسیار است

یک نظر غفلت از رخ تو مباد — اندکے ہم گناہ بسیار است

در ہر کہ بنگرد غلط یار میخورد — چشمِ خطا نظارہ ندانم چہ دیدہ است

داغے شدست لالہ و زخمے شدست گل — ایں ماجرا بہ مرغِ چمن می تواں نشست

نشگفتہ گلے اگر بہ بینی — گل نیست دل ست آنکہ وا نیست

از روز و شب نسبتی احوال چہ پرسی، — ہر صبح گرفتار تو، ہر شام اسیر ست

عمر در کوئے انتظار گزشت — عمر بگزشت و روزگار گزشت

زخمہا دارد تفاوت درمیاں — ورنہ خار و نشتر و مژگاں یکے ست

ما نسبتی از بزمِ طرب بخت نداریم — تہمت بہ خم و بادہ و ساغر نتواں بست

بر رخش کج نشستہ و ترکانہ می رود — بیدرد را کہ ہیچ غم داد خواہ نیست

بیگانگیم عجب مدارید — دیوانہ بہ خویش آشنا نیست

بس کن اے واعظ در آغاز نصیحت لب بند　　نسبتی پایان ایں افسانہ می داند کہ چیست
ز جام جم چہ می پرسی حکایت　　ترا امشب کہ خون دل بہ جام ست
نسبتی یک جرم را صد عذر گفت　　گرچہ تقصیرے کہ می باید نداشت
پیوند دل از ہمہ بریدیم　　دیرست کہ خاطرم بجا نیست
گرد از سر کوئے یار برخاست　　آہے ز دم و غبار برخاست
گل ہمہ گوش ست لیکن صوت بلبل نارساست　　نالہا کوتاہ افتادست جرم گوش نیست
از خون دلم شیشۂ مے زہر بکام ست　　بر حوصلۂ جام جم ایں بادہ حرام ست
در رہِ بادہ نشستیم ہمہ　　چہ تواں کرد کہ بوئے تو خوش ست
بہار رفت وز دیوانگی نہ دانستم　　کدام باغ و کدا ایں چمن کدام گل ست
بگذر تو نسبتی ز جفائے کہ بر تو رفت　　آں شوخ ہم ز تندیٔ آں خو گذشتہ است
سخت میترسم کہ من بسیار میخواہم ترا　　آرزو خوبست اما اینقدرہا خوب نیست
ہمہ جا از تو گفتگوئے ہست　　نیست جائیکہ ماجرائے تو نیست
داد جاں نسبتی و دید ترا　　مفت دید ست رونمائے تو نیست
بادہ ہر چند بود تلخ نہ تلخیش بد است　　یار ہر چند کہ بد خوئے بود بد خو نیست
دی خام بود داغ دل امروز پختہ شد　　فردا امید وعدۂ یک سوز دیگرست
غمت رفتہ رفتہ بدل خو گرفت　　دلم سوختہ سوختہ بو گرفت
تو گفتئے کہ بیا نسبتی و حیرانم　　ز بیدلانِ تو بسیار کس بایں نام است
آمد آں تیر نگہ از سینہ ام پرّاں گزشت　　لیک اندر گوشۂ دل نوک مژگانے شکست
جذبِ نگاہِ اوئے دل بردن منست　　ایں برق را معاملہ با خرمنِ منست
باغ را دستگاہ روئے تو نیست　　گل بسامان رنگ و بوئے تو نیست
ما را کم و بیش از غم عشقت خبرے ہست　　گر زخم دلے نیست خراشِ جگرے ہست
منکہ زینساں فتادہ ام بدرت　　کس چہ داند مرا چہ افتاد است
تا گنج خرابۂ کہ باشی　　بہر تو ہزار دل خرابست
حسن را نبود تفاوت چہ بکنعاں چہ بمصر　　میرود ہر جا کہ یوسف گرمیٔ بازار ہست
داستانِ دگراں رفت زیاد　　قصۂ ما و تو افسانہ شدہ است

قامتش سخت دلکش افتاد است
ور نہ قد بلند بسیار است

بآب داد مرا سیل گریۂ شادی
شبِ وصال مگوئید روزِ طوفانست

بشہر ما نبود نسبتی کسے خوشدل
بخندہ یا لبِ زخم است و یا لبِ چاکست

شمع روشن کن کہ تا روشن شود احوالہا
درتہ بال و پرِ پروانہ چندیں دفتر است

خاموش گشتۂ تو ولے گفتگو بجاست
چندیں حدیث بالبِ خاموش رفتہ است

بہ نیم گام جدائی نبودہ ام راضی
کنوں میانِ من و دل ہزار فرسنگ است

نیست ویراں دلِ خراب امروز
تا بنا کردہ ام خراب شدست

رفت جاناں و کسے از حال ما آگاہ نیست
کس چہ داند غیر دل آنہا کہ برجاں رفتہ است

عذر ستم ترا رسد و بر خلاف آں
تو میکنی جفا و دلم عذر خواہ تست

میروی میبری ز راہ مرا
اینچہ راہ است اینچہ رفتار است

می نماید از شگاف سینہ اش لخت جگر
خلق گوید نسبتی گل در گریباں کردہ است

نسبتی ہر چہ در دل است ز تو
بر زباں آید و ادا نشود

حال پروانہ کہ در شب سوخت
شمع خاموش را تواں پرسید

صد جگر از تو ہست بر آتش،
باش تا یک جگر کباب شود

چوں برگ خزاں باد بویرانہ رساند
مکتوب کہ دیوانہ بدیوانہ نویسد

رسیدن ہماں دل سپردن ہماں
نہ من دیر کردم نہ او دیر کرد

نسبتی گریۂ نیاز مکن،
باش تا خندۂ بناز کند

خواہ مومن خواہ ملحد خواہ کافر خواہ گبر
نسبتی را ہر چہ میگوئیم قائل میشود

بسیار غنچۂ گل شد و بسیار دل شگفت
دلتنگ را خبر ز شگفتن نمی شود

ہر گلے را کہ داغ بر دل نیست
لالۂ نوبہارِ ما نشود

سبکبارِ تمنا میتواں شد
ببوئے گل تسلی میتواں شد

دردِ دل تا با تو گویم دیدہ پرخوں میشود
راز بیروں میتراود جامہ گلگوں میشود

دل را بتو سپردم و شادم دگر چہ ماند
چیزیکہ داشتم بتو دادم دگر چہ ماند

عرقے کز جبینِ ناز چکد
در گریبانِ آفتاب کنید

رو دہد ہر چہ رو دہد زآنرو
نسبتی رو بیار خواہد کرد،

از کوئے تو ہر کجا رود کس ——— شرمندہ رود و خجل نشیند،

بلبلاں ہم مزاجداں نشدند ——— کس چہ داند کہ گل چہ خو دارد

کشتۂ او برہنہ کے ماند ——— لالہ از خونِ خود کفن دارد

بامن چو دل از تو راز گوید ——— گوید سخنے و باز گوید،

چہ قاصد و چہ پیام و چہ مژدہ و چہ خبر ——— بہ ہیچ حیلہ دل امیدوار نتواں کرد

دگر ز چشم تو امیدوار لطف شدیم ——— نگاہ کردی و دل باز در بلا افتاد

ابتدائے پیالہ بیہوشی است ——— آنقدر مے بخور کہ ہوش آید

من زمانِ دگر بہ ہوش آیم ——— لحظۂ انتظار من بکشید،

مے در پیالہ خونِ جگر در کنار بود ——— فصلے کہ من اسیر شدم نوبہار بود

جان بود و مدتے بخشیدم ز ابلہی، ——— چوں بر لبم رسید عجب خوشگوار بود

افسوس کہ سررشتہ ام از دست بدر شد ——— دل بردی و رفتی و مرا دیر خبر شد

بودیم ز خود بے خبر افتادہ ولیکن ——— در سینہ خلیدی و بیکبار خبر شد

مرا بیروں کن از جائیکہ آنجا ——— تو باشی و دل آشفتہ باشد

خلاف وعدہ ندانی دلے بایں طالع ——— بوعدہائے تو امیدوار نتواں شد

ہست کسے باز بدنبالِ من، ——— میروم و دل بقفا میرود

ساغرِ مے سایۂ بیدار نباشد گو مباش ——— خونِ دل در سایۂ دیوار میباید کشید

پیش من یک حکم دارد مہرگان و نوبہار ——— در قفس رانند گرچہ در بہارم زادہ اند

می نداند روشِ بزم دلِ وحشی ما ——— مگذارید کہ دیوانہ بمحفل برود

ریختم از مژہ خونابہ و مے گلگوں شد ——— یادِ لعلِ تو نمودیم و قدح پر خوں شد

ماند است چنیں کہ غنچہ خاموش ——— زاں لب سخنے شنیدہ باشد

گفتا کہ چگونہ میدہی جان، ——— جاناں گفتیم و جاں برآمد

بر عیشِ روزگار زدہ پشت پا بناز ——— خوش وقت آں گروہ کہ غمگیں گزشتہ اند

میرسی و نیستی آگہ چہ بر جان میرسد ——— میروی و ہم نمیدانی چہ بر دل میرود

دردِ تو سزائے دل بیدرد نباشد ——— آزردہ دلی منصبِ ہر مرد نباشد

چہ بلاست ایں ندانم کہ من و تو ہم شرابیم ——— دل تو ہمی کشاید دلِ من نمی کشاید

یار چوں بے حجاب میخندد — گوئیا آفتاب میخندد
کس بے خبر بگو کہ نیاید بکوئے عشق — ما بیخبر شدیم بیاراں خبر رسد
لفردا گفتۂ خونت بریزم — مباد امروز از شادی بمیرم
بگفتی نسبتی گو حال چونست — سرت گردم نہ غمگینم نہ شادم
در کوئے تو بر خاک نشستیم نشستیم — با خاطر غمناک نشستیم نشستیم
دیوانگی ببیں کہ زدنبال کارواں — چنداں دویدہ ام کہ زمحمل گزشتہ ام
کدامیں شب بود یارب کہ آں شب — تو باشی شمع و من پروانہ باشم
ہر کجا دل میرود من درپئے دل میروم — دل اگر دنبال ماند من بمنزل میروم
چہ گل شگفتہ دریں باغ نسبتی کہ مدام — ترا و مرغ چمن را بنالہ می بینم
دگر از خاکِ آں کو بر نخیزم — بخاکِ پائے او سوگند کردم
از گفتگوئے عیش و طرب باز ماندہ ایم — ساز شکستہ ایم ز آواز ماندہ ایم
دیروز بہ بلبلم شب اُفتاد — افسانہ موئے گل شنیدیم
در صید گاہ چشمِ سیاہے نشستام — امیدوار تیر نگاہے نشستہ ام
چوں مرغ سراسیمہ ز پرواز فتادم — برخاستم از پائے گل و باز فتادم
سخن تمام نشد نسبتی و جاں دادم — حدیثِ شوق دراز ست مختصر گفتم
پارۂ دل بر جگر لختِ جگر بر روے دل — پارہ ہا را دوختم اما پریشاں دوختم
دماغم نسبتی آشفتہ گشتہ است — نہ با بلبل نہ با گل می نشینم
بیا ایدل کہ باہم راز گوئیم، — حدیثے بشنویم و باز گوئیم
من و تو ہر دو مرغ بستہ بالیم، — بہم افسانۂ پرواز گوئیم
نیاز دل بگوش گل رسانیم — سلامِ صعوہ با شہباز گوئیم
یاراں ببال شوق پریدند و ما ہنوز — در انتظار شہپرِ عنقا نشستہ ایم
دیوانگی ببیں کہ چو طفلانِ بے خبر — امروز خوش بوعدۂ فردا نشستہ ایم
جز تو گم گشتۂ تو نیست بجو، — خویش را جستہ جستہ پیدا کن
چو ز حال من بستی بہ نگہ سوال کردی — ز ہجومِ گفتگو ہا گلہ پائمال کردی
بہت گفتم برخ برقع گرفتی — مرا از روئے خود شرمندہ کردی

ایک صناع کے نفسیات

(۱)

"دو دوست ایک ہی عورت سے محبت نہ کریں" یہ کسی قانونی دفعہ کا جزو تو ہے نہیں کہ جرم ہو، اور اگر حکیمانہ نظر سے دیکھا جائے تو ایسے دو دوستوں کی محبت میں اضافہ ہو جانا چاہئے۔ کہ باہمی تعلق خاطر کا مدار تو اشتراک ذوق ہی پر ہے۔ بہرحال وسط ہند میں اس مسئلہ پر ایک شاہانہ فلسفہ مرتب ہو گیا ہے۔ مگر ہماری سماج اس کو روا نہیں رکھتی اور نفسیات انسانی کا بھی فیصلہ یہی ہے کہ مذہب محبت میں شرک ناروا ہے۔ رشک و رقابت فطری جذبہ ہے

جوتیش کپیا اور نرمل چندر سین بچپن کے ساتھی اور ہم سبق دوست تھے۔ دونوں نے ایک ساتھ ڈگری حاصل کی تھی۔ بلا دیوی مزمدار بی۔اے کے آخری سال کے لئے اُسی کالج میں داخل ہوئی، اور اگرچہ یہ دونوں دوست تھے لیکن جب بلا سے ربط و ضبط بڑھا تو دونوں کو اُس سے محبت ہو گئی۔ عام مشاہدے کے خلاف ان کی محبت میں یہ خاص بات دیکھنے میں آئی کہ وہ رشک و رقابت کے رکیک جذبے کا شکار نہ بنے۔ بلکہ ایک نے دوسرے سے اپنے احساسات کا حال بیان کر دیا، اور اس پر متفق ہو گئے کہ دونوں میں سے بلا جس کو چاہے منظور کرے

بلا کی زیبائی میں وہ تمام اجزاء شامل تھے جو حسن بنگالہ کو جیتا جاگتا جادو بنا چھوڑتے ہیں، اور اس کی دلربائی میں وہ تمام جاذبیتیں موجود تھیں جو بہترین کلچر ایک لڑکی میں پیدا کر سکتا ہے۔ بلا جتنی حسین تھی اتنی ہی ذہین بھی، اور جسقدر نرم و نازک تھی اسی قدر سوشیل بھی تھی۔ جوتیش وجیہہ و مضبوط قوے کا نوجوان تھا اور باوجود علمی انسان ہونے کے اس کی فطرت میں ہمدردی کا عنصر بھی تھا۔ نرمل شکل و صورت کے اعتبار سے تو اتنا دلکش نہ تھا جتنا اُس کا دوست تھا لیکن ذہن و طبیعت کے اعتبار سے نہایت حسین نوجوان تھا۔ نرمل کو ایک تخیلی انسان کہنا غلط نہ ہوگا۔ اُس میں زندگی کے عوض ربودگی کا عنصر زیادہ تھا۔ اس پرواز طبیعت کے ساتھ اگر تعلیمی مضمون بھی ادب ہو اور پروفیسر ایک شاعر، تو ایسے طالبعلم کا شاعر نہ بنجانا کمال حیرت کی بات ہوگی، چنانچہ نرمل کی شاعرانہ فطرت کو پرواز کا پورا موقعہ ملا۔

بلا کا نسوانی احساس جوتیش کی وجاہت سے متاثر تھا، لیکن اس کا ذوق نرمل پر فریفتہ تھا۔ اس لئے جب نرمل کے فطری ایثار نے پہلا موقعہ جوتیش کو دیا تو بلا نے اس سے کہدیا کہ:- "جوتیش، اگرچہ میں تمھیں بہت پسند کرتی ہوں لیکن

تم میرے ذوق کے معیار پر پورے نہیں اُترتے!" ۔ اس کے بعد نرمل نے اپنی آرزوؤں کو پیش کیا اور ہرچند جوتش کی سی خوبی نرمل کے پاس نہ تھی مگر بملا نے اُسے قبول کرلیا اور اُن کی شادی ہوگئی ۔ بی اے پاس کرنے کے بعد ہی نرمل ایک بڑے ترکہ کا مالک بن گیا۔ لیکن عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ موروثی دولت کی قدر نہیں ہوتی اور جس کی طبیعت میں نرمی اور ہمدردی ہو، وہ دولت کی قدر تو کیا اُس کا صحیح استعمال بھی نہیں جان سکتا چنانچہ نرمل کے اسراف کی کوئی حد نہ تھی، احباب و اقارب کے علاوہ اگر کوئی اجنبی بھی اُس کے پاس اپنی ضرورت لیکر پہونچ سکا تو مایوس نہ پلٹا اور دوستوں شناساؤں میں تو شاید ہی کوئی ایسا ہو جسکی ضرورت نرمل کے علم میں آئی اور رفع نہ ہوگئی ہو۔ البتہ اتنا ضرور تھا کہ غائب دوست اس کے نزدیک غائب ہی ہوجاتا تھا، غرض اُس کی دولت کو ختم ہونا تھا اور وہ ختم ہوگئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ تمام دوستوں سے جدائی ہوگئی، شعر و ادب کے سوا اور کوئی ساتھی اس کی تنہائی کا باقی نہ رہا

شعر کے باب میں نرمل کے خیالات و عقاید کچھ جاپانی نظریات سے متاثر تھے اور مشق و مطالعہ کے ساتھ زندگی کے دلشکن تجربات، نیز اُس کے غمگین حالات نے اُسے نہایت نازک خیال شاعر بنا دیا تھا، نرمل کو اپنے فن سے عشق تھا اور تہذیب و تمدن میں ریاکاری کے سوا اُسے کچھ نظر نہ آتا تھا، اس کی طبیعت کا یہ انداز اُسوقت تکمیل کو پہونچا جب وہ افلاس کی چکی میں پسنے لگا، اور اس حالت نے اسکی طبیعت میں مزید تغیر یہ پیدا کیا کہ اس کا دل انسانی غلط کاریوں پر دُکھنے لگا اور اُس کی معیار ادب میں حکیمانہ پہلو پیدا ہوگیا ۔ جوتش کی زندگی کلرکی سے شروع ہوئی۔ اس معاشی پستی نے اس کے دل سے بملا کو بھی بھلا دیا۔ مگر وہ چونکہ حرکت و عمل کا انسان تھا، اُسے ایک موقعہ ترقی کا مل گیا اُس کا موضوع تعلیم تو اقتصادیات رہا تھا، لیکن ایک بہت بڑی فلم کمپنی سے تعلق ہوگیا اور چونکہ تیز آدمی تھا، بہت جلد فلم ڈائرکٹر بن گیا۔ یہ "سینریو" بھی خود ہی لکھ لیتا تھا، امریکن فلموں سے کاٹ چھانٹ کر فسانے بھی خود ہی مرتب کرلیتا تھا، مختصر یہ کہ اب وہ بڑا آدمی تھا۔ حالات مساعد ہوئے تو جوتش نے نرمل کے ساتھ بھی تعلقات کو تازہ کیا جو جد و جہد کے زمانہ میں بالکل ترک ہوگئے تھے

(۲)

جوتش نے جیب سے سگار کیس نکالکر نرمل کی طرف بڑھا دیا، اور کہنے لگا:۔ "یہ سنکر کہ بملا کو دردِ سر کی شکایت ہے مجھے بہت افسوس ہے" نرمل نے ایک سگار نکال کر میز پر رکھ لیا اور ایسے لہجے میں جس سے عام بیزاری کا اظہار ہوتا تھا کہنے لگا:۔ "یہ شکایت اُسے اکثر ہوجاتی ہے۔ سگار بہت نفیس ہیں ۔ شکریہ!" ۔ آج کل نرمل چاندنی بازار کی اونچی عمارت کے بالائی حصہ میں رہتا تھا، اور جس چھوٹے سے کمرے میں یہ دونوں باتیں کر رہے تھے وہ نرمل کا دارالمطالعہ تھا اور نشست گاہ بھی۔ کمرے کی حالت سے عسرت ظاہر تھی۔ ہر چیز میلی اور گرد آلود تھی، ہر شے بے ترتیبی سے پڑی تھی، کتابیں ہر جگہ بکھری ہوئی تھیں۔ جوتش سگار پیتے ہوئے سامنے دروازے پر نظریں جمائے دیکھ رہا تھا جس کے اندر بملا دردِ سر میں مبتلا پڑی ہوئی تھی وہ پھر کہنے لگا:۔ "نرمل، کیا اس میں کچھ شک باقی ہے کہ تم اپنی شاعری سے معاش پیدا نہیں کرسکتے؟ اور جب تمہاری

زندگی کامیاب نہیں تو تمھارا فن یقیناً زوال پذیر ہے!"۔ نرمل مسکرا دیا اور بولا:۔" ایک شاعر کبھی کسی بات کا اعتراف نہیں کرتا اور فن و ابتلا میں تو خاص ربط ہے!" ۔۔۔۔ "لیکن ایک شاعر کے لئے بھی حرکت و عمل ضروری ہے؟"

نرمل کے سُتے ہوئے چہرہ میں کسی خاص جذبے سے اک چمک سی پیدا ہوتی نظر آئی مگر جوتیش کہتا رہا:۔" تم یہ کہہ سکتے ہو کہ رجعت بھی تو حرکت ہے!" ۔ نرمل کے سانس لینے سے اس کے دماغی انتشار کا اور اُس کے کھانسنے سے اعصابی اختلال کا پتا چلتا تھا۔ وہ کہنے لگا:۔ "تمھیں بڑا گھمنڈ یہ ہے کہ تم زندگی کو کامیاب بنانے کی راہوں سے واقف ہو، اور تم کہہ سکتے ہو کہ نتائج و تجربات انسان کے رہبر بنجاتے ہیں، اور صحیح نتیجہ وہ ہے جو اُنگلیوں سے محسوس کیا جاسکے۔ تمھیں یہ باتیں کہنے کا حق اسوجہ سے ہے کہ اسوقت تمھاری زندگی کامیاب ہے! لیکن سوال یہ ہے کہ جسے تم ترقی و کامیابی سے تعبیر کر رہے ہو وہ تنزل و محرومی تو نہیں!" یہ کہکر وہ کرسی کی پشت سے ٹک گیا اور کھانسا۔ جب ذرا سانس ٹھیری تو جوتیش کے مونھ کے سامنے چٹکی بجا کر کہنے لگا "میرے نزدیک تمھارے استنباط و نتائج کی قدر بس اتنی ہی ہے!"

اس کی اس گفتگو سے جوتیش جھلا گیا، کچھ مکدر سا ہو گیا، لیکن ساتھ ہی اُسے نرمل کے مقابلہ میں اپنی برتری یعنے ایک کامیاب انسان ہونے کا احساس بھی ہوا۔ اور فوقیت کے اس احساس نے اس کے تکدر کو رفع کرکے اُسے ترحم پر آمادہ کر دیا!

" نرمل، میں اس حقیقت کو کہ صرف روپے ہی کا نام کامیابی نہیں، تمھاری رعایت سے نہیں بلکہ دلایل کی بنا پر مانتا ہوں ۔ لیکن یہ تو تم بھی مانوگے کہ خوشحالی ایک طرح کی کامرانی ضرور ہے، اور اس سے تم انکار نہیں کرسکتے کہ یہ چیز روپئے کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔ آئینہ دیکھو گے تو تمھیں کہنا پڑے گا کہ تم اس عمر میں انسان معلوم ہونے کی بجائے انسان کا ایک ایسا خاکہ نظر آتے ہو جو ماند اور پھیکا پڑ گیا ہے!" ۔۔۔ نرمل کی غلافی آنکھیں جن میں گڑھے پڑے ہوئے تھے پھیل گئیں، اور اُس کے زرد چہرے پر فسردگی چھا گئی، جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُس کے احساس کو صدمہ پہونچا ہے:۔

"جوتیش، تمھاری اس گفتگو سے میں خوش ہوں یا اُسے اپنی توہین سمجھوں؟"

" مجھے یقین ہے کہ تم میری اس صاف گوئی کو دلسوزی کے سوا اہانت پر مبنی نہ سمجھوگے، ورنہ میں ایسے نازک مسئلے کو چھیڑتا ہی نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تم ان دو کوٹھریوں کی سکونت کو اُنس مکانی کہوگے، مگر ایسی توجیہیں مجھے مطمئن نہیں کرسکتیں!"

" شاعر کبھی حیلے نہیں تراشتا! اُنس مکانی ایک حقیقت ہے، اور راحت و تکلیف خیال سے وابستہ ہے!"

" بجا ہے! لیکن سوال صرف شاعر کی ذات کا نہیں بلکہ بملا اور شیلا کا بھی ہے! پچھلی بار جب میں ملا تھا تو بملا کمزور اور شیلا مضمحل نظر آتی تھی۔ تم اتنے غیر ذمہ دار کیونکر ہوسکتے ہو؟" جوتیش نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

" اوہو! اب یہ حالت ہے؟ نرمل نے کس بات پر اظہار تعجب کیا، نہیں کہا جاسکتا ۔۔ جوتیش نے ذرا سنبھل کر پھر کہنا شروع کیا:۔" تمھیں یہ بتانا پڑے گا کہ ہنسی خوشی سے رہنے کی آرزو تمھارے دل سے کیوں جاتی رہی، تم وہی کیوں نہیں کرتے جو سب کرتے ہیں؟ اس دنیا میں شاعری کی بھی قیمت ملتی ہے! لیکن وہ شاعری دنیا کی سمجھ میں آنا چاہئے۔ ایک سوگوار اہ

بیزار شاعر ہو ۔۔۔" ۔ نرمل نے "سوگوار اور بیزار شاعر" کو اپنی صحیح داد سمجھ کر ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور کہا :- "تم مجھے بھی اپنے مشین کے پہیے سے باندھنا چاہتے ہو ۔۔۔ جوتیش، یہ دنیا محض اعتبارات کی دنیا ہے، اور ان اعتباری نعمتوں میں جو یہ دنیا پیش کر سکتی ہے تضاد و تخالف ہے، ایک نعمت کے حصول کے لئے دوسری نعمت کو خیرباد کہنا ہی پڑے گا! جس کو تم کامیاب زندگی کہتے ہو سب سے زیادہ ناکام ہے کامیابی میں آخر کچھ تو بے نیازی کا جزو ہونا چاہئے تمہاری کامیاب زندگی میں بس یہی چیز مفقود ہوتی ہے، بصیرت کا تقاضا یہی ہے کہ انسانی زندگی سوگوار رہو اور دنیا سے بیزار تم نے اسوقت نہایت صحیح لفظوں میں داد دیکر مجھے خوش کر دیا"۔ جوتیش کو نرمل کی یہ باتیں "کٹ حجتی" معلوم ہوئیں، وہ غصہ میں آ کر اٹھ بیٹھا اور ٹہلنے لگا :- "تم خود جس طرح چاہو رہ سکتے ہو۔ اس میں کسی کو دخل دینے کا حق نہیں۔ لیکن بلا اور بچی کا خیال نہ کرنا صرف انسانی فرائض کے خلاف بلکہ تقاضائے شاعری کے بھی منافی ہے!"۔ ان فقروں نے نرمل کو دوسرے ہی عالم میں پہونچا دیا، یاد ماضی نے تازہ ہو کر اس کے خشک چہرے پر ایک رنگ پھیر دیا اور بولا :- "ہاں، بلا اور میں ایک وقت سمجھتے تھے کہ ہم دنیا میں بڑے بڑے کام انجام دے سکیں گے ۔۔۔ دنیا کا نظام ہی بدل دیں گے!"۔ اس نے نرمل پر اس وجدانی کیفیت کے طاری ہو جانے کو نہیں دیکھا، مگر جوتیش خود بھی اسی رنگ میں رنگ گیا :- "کانجی مل کی ضمانت میں جب تمہاری جائداد نیلام ہوئی تو بلا کے تاثرات تمہارے علم میں بھی نہ آئے ہوں گے۔ اس نے کسی سے کہا تھا جو خار جلانے بھی سنا کہ محبت دنیا میں ہر چیز کا ۔ فاقے کا بھی نعم البدل ہے، کیونکہ محبت کی یاد سے زیادہ حسین کوئی چیز نہیں ہے، بلا کو جو اعتماد تمہاری ذات میں تھا وہ خود اپنی جگہ مستقل حسن تھا ۔۔۔" "جوتیش، تمھیں جاننا چاہئے کہ دنیا میں حقیقت ایک ہی ہے، صورت بدل جاتی ہے، اسوقت بلا کا اعتماد حسن محض تھا تو آج اس کی سیوا ایک مستقل "روپ" ہے!"

نرمل مسکرایا، جوتیش نے کھڑکی کی طرف نظر اٹھائی، ایک پل بھر کے لئے سگار کا دھواں دونوں کے درمیان حائل ہو گیا، اور پھر جوتیش کے ہونٹ حرکت میں آئے :- "اسوقت بلا نادان تھی، کم سمجھ تھی، زندگی کے تجربوں سے ناآشنا تھی، اور ہم سب بھی ایسے ہی تھے، تمھارے سب دوست، اپنے حلقے میں تم کو قابل ترین مانتے تھے ۔۔۔ اس وقت ہم سب قابلیت و ذہانت کے پرستار تھے، کیا زمانہ تھا! الغرض اب تمھارے دوست، برداشت نہیں کر سکتے کہ تم اس تنہائی میں زندگی گزار دو"

"تنہائی میں عافیت ہے!" نرمل نے جواب میں کہا

"ہو، مگر عافیت اور ذمہ داری دو جداگانہ ہیں ۔۔۔ ذمہ دار انسان عافیت کی تلاش کریگا تو ادائے فرض سے قاصر رہیگا"

"اعتبارات میں اگر ایک اعتبار کو زیادہ اہم ۔۔۔" ۔

"تم اسے مانو گے یا نہیں کہ زندگی کی ادنےٰ ضروریات بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہیں؟" جوتیش نے نرمل کا قطع کر کے سوال کیا

"ہاں، اس بناء پر کہ ادنےٰ چیزوں کی ضرورت ہر وقت پڑتی ہے، ان کو زیادہ اہمیت دیجا سکتی ہے"

"تو تم نے بلا اور شیلا کی ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے کیا سوچا ہے"

اس سوال نے نزمل کو زیادہ متاثر کیا، اور اس کا ہاتھ بے اختیار میز پر رکھے ہوئے کاغذوں پر جا پڑا۔ اسکے ساتھ جوتیش بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ کرسی کے سرکنے اور جوتیش کے قدموں کی چاپ نے نزمل کے اعصاب پر اثر ڈالا۔ نزمل جھلا سا گیا لیکن جوتیش بول اُٹھا۔ "سنو نزمل، تمھیں چاہئے کہ تم گھر سے نکلو، آدمی بنو، آدمیوں سے ملو، اور دنیا کی طرح آدمیوں سے مل جل کر کام نکالو۔ لیکن اگر بیوی بچوں کی ذمہ داری کا احساس بھی تمھیں اس پر آمادہ نہیں کر سکتا تو جب تک تم کوئی صورت پیدا کرو مجھے اجازت دو کہ میں تمھارے حالات کی دیکھ بھال کروں! سنا ہے تم کوئی نظم لکھ رہے ہو ——— کب تک مکمل ہو جائے گی؟" ——— "ایک نظم کبھی مکمل نہیں ہوتی! لیکن ہماری گزر تو ہو رہی ہے ———"

"لغو، مہمل! آپ کے پاس تین جانوں کی گزر کے لئے جتنا ہوگا، اردیشر کی بیوی اپنے موزوں پر اُس سے کہیں زیادہ خرچ کر دیتی ہے!" ——— "اس گفتگو سے اردیشر کو واسطہ؟" ——— "یہ کہ اگر تم خفا نہ ہو تو وہ یہاں حاضر ہو اور تمھاری کسی نظم یا افسانے کا فلم بنانے کی اجازت طلب کرے" ——— نزمل نے ہاتھ کے جھٹکے سے جوتیش کی تجویز کو ناقابل توجہ ثابت کرتے ہوئے میز کے کاغذوں کو چھوا اور بولا: "تمھارے ہی فلسفے کے تحت شاید یہ مثنوی صورت حال کو بدل دے۔"

"احمق نہ بنو، نزمل! تم جانتے ہو کہ محض شاعری ہمارے اُجڑے وطن میں معاشی مشکلوں کا حل نہیں ہو سکتی۔ تاوقتیکہ اُسے تجارتی نہ بنایا جائے، مشکل حل ہو سکتی ہے عمدہ انتظام سے! خوب تیل دی ہوئی مشین ہی خوب چلتی ہے!"

"مگر تمھیں کیا معلوم کہ میں کیا لکھ رہا ہوں؟"

"بس اسقدر معلوم ہے کہ تمھارا کام نہایت خوبی سے انجام پا رہا ہے!"

نزمل نے جوتیش کے فقرے کے اندر مخفی طنز کو نہیں دیکھا اور اپنے کام کے بخوبی انجام پانے کی داد پا کر اس کی بھولی آنکھیں مسرت سے چمک اُٹھیں ——— "خوبصورتی سے انجام پا رہا ہے! جوتی، خوبصورتی میرے لئے سائنس کا درجہ رکھتی ہے۔ ایک حسین نظم، ہاں!" اُس کی گردن مڑ گئی اور وہ اُس دروازے کو دیکھنے لگا جس کے پیچھے اُس کی بیوی اور بچی نیم گرسنہ سو رہی تھیں۔ نزمل کو احساس ہوا اور کہنے لگا۔ "مجھے پروا نہیں کہ کون دکھ اُٹھاتا ہے، کون مصیبت جھیلتا ہے ——— جو مجھ سے وابستہ ہیں، ان کا بھی فرض ہے کہ مجھے پہچانیں، مجھے سمجھیں! میرے لئے میرے فن سے زیادہ حقیقی شے کوئی نہیں! اُن کو صبر سے انتظار کرنا چاہئے۔ صبر سے انتظار کرنا ہی انسان کا حسین ترین فرض ہے"

جوتیش کھڑا ہو گیا، نزمل کی اس وقت کی حالت کو کچھ دیر دیکھتا رہا، اور پھر بولا:— "ہوں، نزمل، میں جانتا ہوں کہ ان حالات کے باوجود تم اپنی ہی سی کرو گے!"

"اگر کوئی مجھے چین سے رہنے دے ——— اپنی سی کرنے دے!"

"ایک زمانہ تھا کہ مجھے تمھاری ہر بات سے اتفاق تھا، لیکن اسوقت ہم دونوں زندگی سے روشناس نہ ہوئے تھے۔ اُس وقت، وقت بھی ہماری تائید کرتا معلوم ہوتا تھا، ہم سمجھتے تھے کہ دنیا کے پہلو میں بھی دل ہے۔ اگر حقیقت

کچھ اور نکلی، نظامِ دنیا ایک بے روح مشین ہے اور بس، اور ہم سب اُسی مشین کے پُرزے ہیں - ہمیں اسی رُخ گردش کرنا پڑے گی جس رُخ پر دُنیا گردش کر رہی ہے - پھر، وسعتِ نظر سے کام لینے کے بعد یہ سوال بھی سامنے آتا ہے کہ فن یا کوئی مشغلہ انسان کو ماورائے بشریت کیونکر بنا سکتا ہے ؟"

"صناعت آدمی کو جہنم میں پہونچا دیتی ہے!" نرمل کی آنکھوں سے غصہ ٹپکنے لگا - جوتیش نے اس کے غصے سے تجاہل برت کر کہا :- "سچ کہتے ہو لیکن بلا نے تنہا ایک صناع سے شادی نہیں کی بلکہ ایک انسان سے بھی کی ہے!"

نرمل ایک ذرا کھانسا - اُس کی کھانسی کا تعلق اعصاب سے تھا - پھر ایک زہرخند کے ساتھ کہنے لگا :- "عورت وصناع کے ساتھ شادی کرتی ہے اور نہ انسان کے ساتھ وہ ایک مرد سے شادی کرتی ہے!"

"نرمل تمھیں سمجھنا چاہئے، ایک جان چھڑکنے والی بیوی اور ایک معصوم بچی ---- اور ہر قسم کی راحت و آرام سے محروم! آخر وہ کیا چیز ہے جو تم لکھ رہے ہو اور جس پر بلا کو اتنا اعتماد ہے ؟"

"ایک ٹریجڈی - ایک حزنیہ ---- حزنیۂ حیات!" ---- "منظوم ؟" ---- "ہاں" ---- "اُسکا تو فلم بھی بن سکتا ہے"

"نرمل نے کھڑکی میں سے نظر آنے والی روشن فضا کی طرف اشارہ کیا جہاں چورنگی کے بازاروں اور تماشہ گاہوں کے چراغاں نے ایک نورانی غبار اُڑا رکھا تھا اور جس کی وجہ سے نرمل ستاروں کی پُرفریب جھلملاہٹ کو نہ دیکھ سکتا تھا :- "تمھارا مطلب ہے کہ میری مثنوی کا فلم بنایا جائے اور وہاں دکھایا جائے ---- وہاں، جہاں ہر وقت ٹین اور لوہا کھٹ کرتا ہے ؟ جہاں مشینیں چلا کرتی ہیں ؟"

جوتیش ہنس کر کہنے لگا :- "یہ بھی تمھاری غلط فہمی ہے، یہ سب جس سے تم نے اپنی بیزاری کا اظہار کیا، ایک طریقہ ہے جس کے ذریعہ سے "آج" اپنے آپ کو ظاہر کر رہا ہے"

"تو مجھے مہربانی کر کے 'کل' پر قانع رہنے دو ---- مجھے تمھارا 'آج' اور اس کا اظہار نہیں چاہئے!"

"فریقین میں ایک ہی حق پر ہوتا ہے!" جوتیش نے طنزاً کہا

"نہیں، دوسرا ہمیشہ احمق ہوتا ہے!" نرمل نے بھی طنز کیا اور اُسکی آنکھوں میں ایک چمک آکر فوراً مٹ گئی، چہرے پر زردی سی چھا گئی - وہ کہتا رہا "جوتیش، تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ یہ ہولناک غبار نور ہر رات مجھ پر کیا ظلم کیا کرتا ہے ---- مجھے اس سے چڑھ ہو گئی ہے، نفرت ہے، یہ شیطانی روشنی ہے!" نرمل کی سانس تیز ہو گئی اور اُس کی نگاہیں اُس روشن فضا پر جم گئیں "یہ روشنی نہیں شیطان کی سانسیں، جب بھی میری نگاہ اس پر پڑ جاتی ہے تو میں اس روشنی کے اندر ہزاروں بے چراغ جھونپڑیاں دیکھتا ہوں یہ روشنی ہر رات مجھ پر طعنہ زنی کرتی ہے کہ تم مجھے گل کرنا چاہتے ہو تو اپنی زندگی کا چراغ بجھا دو!"

نرمل سانس لینے کے لئے رُکا، خشک ہونٹوں پر زباں پھیری، مسکرانے کی کوشش کی، اور بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا "تم مجھے دیوانہ کہو گے لیکن حقیقت یہ نہیں ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تم اور کشیر، اور ایسے تمام انسان، اس خرافات ہی کو

سب کچھ زندگی اور صناعت سمجھ لیتے ہو! تم وہ چیزیں تو بنا لیتے ہو جو روح انسانی کی تسکین کو تاخت و تاراج کر دیں، لیکن ایسی شے تخلیق نہیں کر سکتے جس سے تمھارا نفس تسکین پا سکے! تمھاری روحیں بھی تاجرانہ ہیں! تمھارا ذہن و دماغ بس تمھیں احمق بنانے کی قابلیت رکھتا ہے، کیونکہ تم لوگ اپنے خیال کی خلوتوں میں ان ہفوات ہی کو حیات و صناعت کا نام دے لیتے ہو!" —— جوتیش پھر کھڑا ہو گیا، اُس کی آنکھیں سکڑ گئیں، اور بغلوں میں ہاتھ دبا کر کہنے لگا:۔ "بہت بہت شکریہ!"

"معاف کرنا، جوتی، مگر میں کہوں گا کہ اس مشینی تہذیب، اس صنعتی تمدن، اس سرمایہ داری کے نظام معاشرت نے روحانیت کا گلا گھونٹ دیا ہے، میں ارباب ادب و صناعت کے دعوے سنتا ہوں اور اپنی قوم کے ذہنی افلاس پر ماتم کرتا ہوں — آج ادب اور ادبی صناعت کا جو مفہوم سمجھا جا رہا ہے، تم خود اُس کی ایک زندہ شہادت ہو، انسانی صحبت سے میری وحشت کی بڑی وجہ یہی ہے۔ پرانے دوستوں میں ایک تم ہو جو عنایت کئے جاتے ہو، میں سچ مچ ایک ناکارہ آدمی ہوں — اس دُنیا کے لئے ہرگز موزوں نہیں!" یہ کہکر نرمل ہنسا اور اُس کی آنکھوں میں خوف جھلکنے لگا۔ دونوں کی نگاہیں کھڑکی میں سے باہر کی روشنی کو دیکھنے لگیں اور نرمل نے کہا، یہ تمھاری انسانیت ہے کہ اس ناخوشگوار موسم میں بھی اپنے لطف و تفریح کا خون کر کے میرے پاس آئے، اس عہد میں کسی کو دوسرے کا خیال رکھنے کی مہلت ہی کہاں ملتی ہے آجکل شرافت و انسانیت کا دوسرا نام حماقت ہے — یہ الفاظ تو بس کلام کی زیبایش کے لئے رہ گئے ہیں"۔

نرمل کی نرمی اُس کی برہمی و بیزاری کو دوچند کر کے دکھا رہی تھی، کھانسی کا ٹھسکا پھر اُٹھا۔ جوتیش نے سوال کیا: ——

"اس کھانسی کا کچھ علاج بھی کر رہے ہو؟"

"معمولی کھانسی ہے —— خود چلی جائے گی" نرمل نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"معمولی کھانسی کو تو اتنا شور مچانے کا حق نہیں!"

"معمولی اور ادنےٰ چیزیں ہی تو ہنگامہ آفریں ہوتی ہیں!"

جوتیش سگار کے دم لیتا رہا اور پھر ایک تبسم کے ساتھ جس میں ارادے کی قطعیت شامل تھی نرمل کی طرف نظر اُٹھائی:۔

"اب بس یہی باقی ہے کہ تم مجھے ٹھوکر مار کر باہر نکال دو یا اس کھڑکی میں سے باہر پھینک دو کہ شیطان کی ان تجلیوں کے اندر جا پڑوں"

"نہیں، جوتی، میں تھیں ٹھوکر مار کر نہیں نکال سکتا — میں واقعی احسان مندی کے احساس سے دبا جا رہا ہوں!"

"تو مجھے اس کا بدلا دو —— مجھے اپنا مہاجن بنالو!"

"مجھے بہت افسوس ہے، مگر میں تمھیں خوش نہیں کر سکتا —— واقعی مجھے ضرورت نہیں ہے"

ایک مختصر لمحے کے لئے جوتیش کی نگاہیں پھر ملا کی خوابگاہ کے دروازے پر قایم ہو گئیں۔

"تم ٹھوکر مار کر نہیں نکالتے تو اب مجھے اپنے ہی پاؤں سے جانا چاہئے —— ارولیشر سے قرارداد ہے، وہ ایک ایسا فلم بنانے کے منصوبے کر رہا ہے جو فلمی صنعت کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دے۔ ملا سے سلام کہنا

میں پھر آؤں گا"۔ نرمل کرسی سے اُٹھا، جوتیش کے ساتھ دروازے تک گیا اور پھر دروازہ بند کرکے چند سیکنڈ کے لئے خاموش کھڑا رہا، زینے پر سے جوتیش کے اُترنے کی آواز آتی رہی۔ نرمل دروازے سے ہٹ کر میز کے قریب پہونچا، سگار کو اُٹھا کر دیکھا اور سونگھا۔ پھر اُس کھونٹی پر نظر پڑی جہاں گھر بھر کے کپڑے ٹنگے رہتے تھے، شیلا کی ٹوپی میلی اور پچکی ہوئی تھی، فراک بھی کئی جگہ سے سلی ہوئی تھی، چھتری بانگی ٹیڑہی ٹنگی تھی۔ بے ارادہ ایک ٹھنڈی سانس بھری اور وہاں سے ہٹ آیا، ہاتھ میں سگار تھا اُسے پھر سونگھا۔ "بلا!" آہستہ سے دروازہ کھولکر ہلکے سے آواز دی۔

"کیوں نرمل، خیر تو ہے؟" ۔۔۔ "کچھ نہیں جوتیش آیا تھا۔ تمھیں سلام کہہ گیا ہے"

"ہاں، میں سن رہی تھی" ۔۔۔ "جوتیش نے ایک بہت عمدہ سگار دیا ہے، ذرا ٹہل آؤں ۔ سر کا درد کیسا ہے؟"

"جاتا رہا، آج دن بھر تم لکھتے بھی رہے ہو، ضرور ٹہل آؤ"۔ بلا نے اپنی نرم آواز میں اُتنی ہی دلسوزی کے کے ساتھ کہا جتنا کہ اُس کا نام نرم و ملائم تھا۔

"تم بھی چلو" ۔۔۔ "نہیں پربھو، اب کپڑے پہننا دوبھر معلوم ہوتا ہے شیلا سو رہی ہے، وہ اکیلی رہے گی"

"آج جوتیش نے مجھے بڑی نصیحتیں کیں، میں نے بھی تہیہ کیا ہے کہ ایک دفعہ تو اُسے بھی دکھا دوں ۔ ہوں!"

بلا ہنسی، مگر نرمل نے اُس ہنسی کی لطافت سے لطف نہ اُٹھایا، بلکہ اس ہنسی میں اُسے مضحکے کا پہلو نظر آیا۔

نرمل کی نگاہیں ایکبار پھر کھڑکی میں سے اُس روشنی پر پڑیں، اُس نے اپنی جگہ طے کرلیا وہ ہنسی بلا کی نہ تھی بلکہ شیطان کی تھی اور کھڑکی میں سے آئی تھی۔ غرض وہ ٹہلنے کے لئے نکل گیا، اور اپنے کمرے، کمرے کے لمپ، اونچی کھڑکی اور اُس میں سے نظر آنے والے تمدن کی تاریک روشنی کو اُسی طرح درخشاں چھوڑ گیا

(۳)

بلا کی نیند اُچٹ گئی تھی، وہ پلنگ سے اُٹھکر دوسرے کمرے میں آبیٹھی۔ لمپ کی دھیمی روشنی میں بھی اُس کے سیاہ بال چمک رہے تھے۔ اس کے چھوٹے اور نازنین پاؤں میں سرخ مخمل کی برمی چپل بہت حسین معلوم ہوتی تھی نازک ہاتھوں میں گھر کے کاموں نے وہ نرمی تو باقی نہ رہنے دی تھی، مگر اب بھی اس قابل تھے کہ دل میں رکھ لئے جائیں بلا نے کچھ دیر کے لئے آنکھیں بند کرلیں۔ نرمل کے واپس آنے تک بلا سونا نہ چاہتی تھی۔ دفعتہً کسی نے دستک دی اور بلا نے چونک کر آنکھیں کھولدیں، پہلے تو وہ سمجھی کہ نرمل ہے، مگر نرمل کو دستک کی کیا ضرورت تھی؟

"کون؟" برملا اس کے مونھ سے نکل گیا ۔۔۔ "بلا، میں ہوں جوتیش!" جواب ملا۔

"جوتیش!" وہ حیران ہو کر خود سے کہنے لگی۔ پھر خودبخود بالوں پر ہاتھ جا پہونچا، اور اُس کے دماغ میں ایک بجلی سی چمک گئی، وہ کھڑی ہوگئی، لپک کر دروازہ کھولا اور گھبرا کر پوچھنے لگی: "جوتیش نرمل تو خیریت سے ہے؟"

جوتیش کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا، وہ ہچکچا سا رہا تھا، اندر داخل ہوتے ہوئے کہنے لگا: "ہاں، نرملوں کو کبھی صدمہ

نہیں پہونچتا! مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمھیں خوفزدہ کر دیا" کہکر ہنسا
بلا نے ایک لمبی سانس لی، اُسکی طرف دیکھا انفعال کا احساس ہوا، اور کہنے لگی :۔"میں اسوقت دیکھنے کی چیز ہوں!"
"سچ مچ ہو ــــ بلا تم دیکھنے کی چیز کب نہیں تھیں! تمھارا درد سر؟"
بلا نے تذبذب کی حالت میں اُس کو دیکھا اور کہنے لگی :۔" وہ ایک حیلہ تھا، میں تنہائی اور تاریکی میں سوچنا چاہتی تھی"
اُس نے پھر جوتیش پر ایک متجسسانہ نظر ڈالی " تم جانتے تھے کہ نرل گھر میں نہیں ہے؟"
"ہاں، مجھے معلوم تھا، آج نرل سے باتیں کر کے میری آتما پل گئی ہے، اسی لئے میں اسوقت پھر آیا ہوں، نرل موہوم امیدوں پر جی رہا ہے، آج اُس کے خیالات کی تہ کا پتا چلا۔ میں اُس کے پاس سے اُتر کر نیچے پہونچا تو ایک دوست سے ملاقات ہو گئی۔ اُس سے باتیں کر رہا تھا کہ میں نے نرل کو باہر جاتے دیکھا ــــ"
"نرل کی صحت نہایت ناقابل اطمینان ہے ــــ سارا سارا دن کام میں لگے رہتے ہیں" بلا نے قطع کلام کر کے کہا اور ٹھنڈی سانس بھر کر چپ ہو رہی"
"مگر اس وقت تو نہایت بشاش، سگار کے دھوئیں اُڑاتا جا رہا تھا، یقیناً اُس کے خیالات اسوقت چاند کی دنیا میں ہوں گے۔ میں ایک مدت سے چاہتا تھا کہ تمسے باتیں کروں۔ یہ ایک حسن اتفاق ہے۔ کیا روشنی سے چکا چوند ہوتی ہے؟"
اچانک آنکھیں ڈبڈبا آنے کے باعث بلا نے گردن موڑ کر ہاتھ رکھ لیا تھا اور جوتیش کی دلسوزی و ہمدردی اس کا باعث ہوئی تھی۔ اُس نے بہت ضبط کرنا چاہا مگر آنسو بہ نکلنے کے لئے بیتاب تھے۔ بلا نے جواب میں کہا :۔ "نہیں۔۔۔۔ تو!"
"بلا، میرا خیال ہے کہ نرل بیمار ہے"
"ایسے حالات میں کوئی تندرست کیسے رہ سکتا ہے! وہ ہم سب سے زیادہ خستہ ہیں ــ ان کا دماغ بہت تھکا ہوا ہے!"
"مگر بلا، یہ حالت خطرے سے خالی نہیں!"
"میں جانتی ہوں ــــ سب سے زیادہ خطرہ تو نرل کو ہے!"
"تم اس کھڑکی کو کیلوں سے بند کر دیتیں تو اچھا تھا"
بلا اس کا اصل مفہوم نہ سمجھ کر جوتیش کو حیران نظروں سے دیکھنے لگی :۔" مگر رات میں چورنگی کی روشنی مجھے اچھی معلوم ہوتی ہے، اس کے اندر مجھے روح سی دوڑتی محسوس ہوتی ہے۔ آخر بند کر دینے کی ضرورت؟"
"ہاں، مگر یہ روشنی نرل کے اعصاب کو بہت متاثر کرتی ہے" جوتیش نے سر کو جنبش دیکر اور بلا کو غور سے دیکھتے ہوئے جواب دیا :۔ "اُس نے شاید تم سے نہیں کہا، نرل اس روشنی کو "شیطانی روشنی" کہتا ہے، لیکن مجھے اس سے خوشی ہوئی کہ تمھیں اس روشنی سے نفرت نہیں ہے"
بلا نے ہنسکر اس کا اقرار کیا، اور کہنے لگی :۔ "ایک عورت کے لئے پر مسرت اور جانی پہچانی چیز سے نفرت کرنا

مشکل ہے، عورت کی عقل محدود دماغی گئی ہے اور وہ اتنی عالی خیال نہیں سمجھی جاتی کہ پہچانی ہوئی چیزوں کو فراموش کر سکے! اس حالت میں بھی بعض وقت مجھ پر یہ خیال غالب ہو جاتا ہے کہ تمام خرچوں کو روک کر آخری پائی بھی ان کھیل تماشوں میں صرف کر دوں! مگر پھر عقل آجاتی ہے۔ یہ خواہش اور خیال نرل کے ساتھ غداری ضرور ہے، مگر ایک حقیقت بھی ہے"

"اس کو غداری سے کسی صورت میں تعبیر نہیں کیا جا سکتا" وہ بولا

"بعض وقت متاسفانہ احساس ہوتا ہے کہ نرل کو اگر ایسی بیوی ملتی جو پسند و ناپسند میں بالکل اسکی ہم مذاق ہوتی تو نرل کی زندگی زیادہ خوش گزر سکتی"

"تمھارا یہ خیال ہے ؟" جوتیش نے سوال کیا

"ہاں، یہ میری اس محبت کا خیال ہے جو مجھے نرل سے ہے!"

جوتیش اپنی ٹھوڑی کھجانے لگا، اور پھر سوال کیا: "تم سمجھتی ہو کہ تم لوگ اس مکان میں گرمیاں گزار سکو گے ؟"

"تم بھولتے ہو جوتیش، لاکھوں آدمی ہر سال گزارتے ہی رہتے ہیں۔ خود تم نے کتنی گرمیاں اور برساتیں کلکتے ہی میں گزاری ہیں"

"تم صحیح کہتی ہو، لاکھوں آدمی یہاں کی سڑی گرمی میں بسر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، اور میں نے بھی بسر کی ہے لیکن وہ حالات دوسرے ہوتے ہیں کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں، اور لوگ کچھ عادی بھی ہو جاتے ہیں کہ تبدیلی کی ضرورت محسوس ہی نہیں ہوتی، مگر تم سب کو اس کی ضرورت ہے! بلا بچی کو لیکر ایک مہینہ کے لئے میرے ساتھ شیلانگ چل کر رہو! نرل اگر پسند نہ کرے اسے یہیں رہنے دو"

"نہیں، جوتیش، میں تنہا کہیں نہیں جا سکتی ۔ نرل میرے بغیر کچھ بھی نہ کر سکیں گے، اور اُنھیں اپنی کتابوں سے جدائی گوارا نہ ہوگی جن کو منتقل کرنا ممکن نہیں"

"اسی خیال سے میں نے نرل کو تو شامل بھی نہیں کیا"

"بہت بہت شکریہ، جوتیش، مگر اب تم ـــ"

"بہت اچھا" جوتیش نے ذرا کھسیانہ ہو کر اُسے بات بھی پوری نہ کرنے دی۔

بلا نے اُس کی تالیف قلب کے خیال سے پھر کہا: "میں نے بہت سوچا کہ نرل کو خبر کئے بغیر میں کام کر سکتی گر کوئی صورت سمجھ میں نہ آئی کہ کیا ذریعہ اختیار کروں۔ اس بارے میں نرل کی خودداری یا غرور حد سے زیادہ ہے"

"غرور، ہاں!"

"مگر مجھے کوئی کام نہیں آتا ـــ اور رات ہوتے ہوتے میں بالکل تھک بھی جاتی ہوں!"

"اس دنیا اور اس زندگی پر ہزار لعنت! نرل کی یہ "شیطانی روشنی" ایک معمولی انسان کو جو کچھ دیکھتی ہے تجھے حاصل ہے، لیکن وہ چیز نہیں ملتی جو میں چاہتا ہوں، نرل کو تم مل گئیں ـــ لیکن نرل اس روشنی سے جتنا متفر ہے

اصل میں اتنا ہی اُس کا طلبگار ہے، کسی شے سے ہماری نفرت، ہماری اُس شے کی تمنا کی مناسبت سے ہوتی ہے! بہت سی چیزیں ہیں جن سے ہمیں نفرت نہیں ہے، اسی لئے کہ ہمیں ان کی ضرورت نہیں، ہماری ضرورت کا پورا نہ ہونا ہماری نفرت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے!

"تمھیں بلا، اس کا احساس نہیں ہو سکتا، لیکن ایک حقیقت ہے کہ تم مجھے ایک قاتل، ایک ایسا شخص ہونے کا احساس کراتی ہو جس نے کسی کو دہکتی آگ میں ڈھکیل دیا ہو! تم مجھے جتنی پیاری اُسوقت تھیں اتنی ہی آج بھی ہو۔ بلکہ کچھ زیادہ تمہارا یہ صبر و سکون، تمہاری اچھائی اور سیوا، تمہارا دیویوں کا سا سبھاؤ"

"مگر جوتش، یہ خیال تو تمھیں جب ہی بھلا دینا تھا۔ میں اپنے انتخاب پر کبھی متاسف نہیں ہوئی۔ میں جانتی ہوں کہ اُس وقت اگر میں غلطی کرتی تو ایک دن سکھ کا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ نرمل کے ساتھ فارغ البالی میں مجھے اتنی تسکین روح و قلب معلوم نہیں ہوتی جتنی اس عسرت میں ہوتی ہے (ہنسکر) میری محبت بھی خود غرض ہے!"

"بلا، میں نے تمہارے فیصلے کا ہمیشہ احترام کیا، لیکن مجھ سے یہ توقع نہ کرو کہ تم زندگی کے سمندر میں پڑی تھپیڑے کھاؤ اور میں کنارے پر کھڑا کھڑا تماشا دیکھوں"

"جوتش کرم کرو! اب...... اب......"

"بلا، تمہاری محبت مجھے تمہارے ہر اشارے کی تعمیل کو فرض قرار دیتی ہے، لیکن وہی محبت مجھے مجبور بھی کرتی ہے کہ اب میں تمہاری نارضامندی کی بھی پروانہ کروں — بلا، میں تمھیں اس تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا!" جوتش نے بلا کا ہاتھ پکڑ لیا "کیا تم سمجھتی ہو کہ ذرہ بھر محبت بھی جس کے دل میں ہو وہ یہ دیکھنا گوارا کرے گا کہ تم اس حال میں زندگی بسر کرو، تم اپنی جان کو ایک خود غرض اور اندھے شاعر کے پیچھے کیوں مٹا رہی ہو!

"جوتش تمہارے ان احساسات کی قدر نہ کرنا ایک غیر انسانی فعل ہوگا، لیکن سمجھو تو سہی، تم کیا کہہ رہے ہو؟ غور کرو کہ تمھیں ایسی باتیں ہرگز منھ سے نہ نکالنا چاہئے، پھر یہ کہ تمھیں جس سے محبت کا دعوے ہے، کیا تم چاہو گے کہ وہ اپنی محبت سے دست بردار ہو جائے؟ اسے اگر ممکن سمجھتے ہو تو پہلے خود تجربہ کرو! میں نے تمہارے پرخلوص خیالات و احساسات کو دل میں جگہ دی ہے، لیکن ہم دونوں محبت کے متعلق گفتگو کرنے کے بھی مجاز نہیں! میں مانتی ہوں کہ جس طرح ہوا اور پانی کی تقسیم عام ہے، اُسی طرح محبت کرنے کا حق بھی عام ہے اور محبت، دولت و امارت یا شرافت و نجابت کی شرط سے بھی آزاد ہے، مگر جو محبت کرتے ہیں، وہ تو ہستی قربان کر دینے کو محبت کی معراج باور کرتے ہیں! یاد رکھو عشق کی محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ اب جوتش میرے حال پر رحم کرو اور چلے جاؤ۔ میرے کہنے سے چلے جاؤ!"

"میں تمہارے حکم کی تعمیل تو کروں گا، لیکن مجھ سے کچھ خدمت بھی لو، مجھے موقعہ دو!"

"جوتش، ایک دن میں بالکل آمادہ ہو گئی تھی کہ تم سے کچھ روپیہ قرض لے آؤں — میں جانتی تھی کہ اس سے

تمھیں خوشی ہو گی۔ اسی خیال سے بتا بھی رہی ہوں، اگرچہ میرا جی تمھیں بتانے پر طیار نہ تھا۔ لیکن تمھیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ میری محبت کا راستہ ایک ہی ہے، یعنی بسر کئے جاؤں گی۔ آیندہ سے اس موضوع کی طرف اشارہ بھی نہ ہونا چاہئے۔ شاید تم سمجھ سکو، مجھے اور نرمل کو اتنی تکلیف کسی چیز سے نہیں ہوتی جتنی لوگوں کی عنایت و مہربانی کے اظہار سے ہوتی ہے ایسے موقعہ پر میں انتہائی کمزور ثابت ہوتی ہوں اور ضبط کرنا مشکل ہو جاتا ہے، اب صبح میں واقعی بیمار اُٹھوں گی غریب شیلا پر جھنجلا پڑوں گی، بچوں کی پرورش دراصل بڑا مشکل کام ہے —— اچھا اب جاؤ!"

"ذرا ٹھیرو —— مجھے کچھ اور کہنا ہے" —"وہ بھی جلدی سے کہہ ڈالو" "یہ کہ میں تمھیں گود میں اُٹھا کر اس کھڑکی سے کود جاؤں گا" —— بملا نے نرم سے قہقہے کے بعد کہا "جوتیش میری زندگی کے اس دور میں تم ایک معما بنے جا رہے ہو"

"سُنو بملا، میں نے نرمل سے کہا ہے جب تک اُس کی مثنوی مکمل ہو، مجھے اپنا مہاجن بن جانے دے، لیکن وہ نہیں سنتا۔ کیا تم میری خاطر سے نرمل کو اس پر رضامند نہ کر دو گی؟"

بملا کے چہرے پر کرب و اذیت کے آثار نمودار ہو گئے۔ اس نے کہا: "اس لئے کہ افلاس پر قرض کی لعنت کا بھی اضافہ ہو جائے؟" —— "مگر شیلا کی پرورش اور تعلیم ...."

"تم جانتے ہو کہ نرمل ایک مثنوی لکھنے میں مصروف ہیں — یہ صورت ان کے کام کے لئے بھی مفر ہو گی!"

"مگر میں تو شیلا کو کچھ دینا چاہتا ہوں!" —— "لیکن تم روپیہ دیکر ہمیں ذلیل بھی کرنا چاہتے ہو!"

"بملا! — تمھارا، میرے متعلق یہ خیال ہے؟" —— "غیر سے قرض لینا برا نہیں — لیکن تم سے قرض لینا اور ایک پہاڑ کے نیچے پس جانا برابر ہے، جوتیش اب تم جاؤ" —— "میں اس لئے چلا جا رہا ہوں کہ کوئی دیوانگی نہ کر بیٹھوں، مگر یہ وعدہ کرو کہ جب کبھی تمھارے نقطۂ نظر میں تبدیلی واقع ہو گی تو مجھے ضرور اطلاع دو گی" "ہاں یہ وعدہ ہے، بس اب جاؤ!" —— جوتیش، بملا کی جانب ایک قدم بڑھا، لیکن پھر اچانک مڑا اور رخصت ہو گیا۔ بملا دروازے پر کھڑی اُس کی آوازِ قدم سُنا کی۔ نہ معلوم کیوں، لیکن بملا اس کے پیچھے، اس کے پاس جانا چاہتی تھی۔ یہ کیفیت اور جذبہ آنی اور عارضی تھا۔ وہ دروازے پر سے پلٹی تو کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے اپنی آنکھوں کی جلن مٹاتی رہی اور پھر جا لیٹی۔

(۴)

نرمل پلٹا تو سیڑھیاں چڑھ کر اپنے دروازے کے سامنے دم لینے کے لئے ٹھہر گیا۔ اس کی سانس پھول گئی تھی، دروازے کی دراز سے کان لگایا تو کمرے کے اندر قبر کا سناٹا سنائی دیا۔ لیکن نرمل کا ہاتھ جیب میں پڑا تھا، اور وہ کسی چیز کو بڑی احتیاط سے پکڑے ہوئے تھا۔ اُس نے دروازہ کھولا اور ساتھ ہی کھانسی کا دورہ پڑا جس نے نرمل کو کپکپا دیا اُس نے کھانسی کو دبا دینے کی ناکام کوشش بھی کی۔ پھر سونے کے کمرے پر کان لگا کر سننا چاہا مگر کوئی آواز نہ سنی۔

نرمل ایک ممی کی طرح ساکت تھا اور اس کی نگاہیں کھڑکی پر قایم ہوگئیں۔ نرمل کے ستے ہوئے چہرے اور مرجھائے ہوئے ہونٹوں پر ایک خوف آمیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اُس نے جیب سے ہاتھ نکالا اور جلدی جلدی سر کے بالوں پر پھیرنے لگا۔ پھر کرسی پر بیٹھ گیا، اور جیب میں سے طلائی جالی کا ایک بٹوا نکالا جس میں قیمتی نگینے جڑے ہوئے تھے

لمپ کی روشنی پڑی تو بٹوا اور اُس کے جواہر جگمگانے لگے۔ کچھ کھٹکا سا ہوا۔ نرمل نے فوراً اُس بٹوے کو چھپا لیا۔ پھر خود ہی ہنسا اور بلند آواز سے اپنے آپ کو بزدل کہا۔ بٹوے کو خالی کیا، جس میں ایک نفیس لیس کا چھوٹا سا رومال تھا، ایک طلائی چھلا جس میں تین چار چھوٹی چھوٹی چمکتی ہوئی چابیاں تھیں، تہ کئے ہوئے چند کاغذ تھے، ایک چھوٹی سی سینٹ کی نیلی شیشی تھی، اور ایک چھوٹا سا بٹوا اور تھا۔ نرمل کی اُنگلیاں تیزی کے ساتھ اس بٹوے کو ٹٹولنے لگیں۔ اُسکی نگاہوں میں ایک سوال کی حرارت جھلکنے لگی۔ اُس نے ایک مخفی احساس حسرت کے ساتھ اُسے کھولا۔ پہلے جھانک کر دیکھا، پھر اُسے میز پر خالی کر دیا، کچھ نقدی تھی، جسے اُس نے اچھی طرح دیکھا بھی نہیں، البتہ وہ ایک بہت چھوٹی تہ کئے ہوئے کاغذ میں محو ہو گیا۔ یہ ایک خط تھا۔ نرمل نے اُس کی تہیں کھولیں شکنیں مٹائیں اور مضمون پڑھنے سے قبل دستخط دیکھے تو ایک قہقہہ مار کر ہنسا "جو تیش!" پھر اس کو پڑھا اور تہ کرنے لگا۔ نقدی پر نظر پڑی۔ چار روپے اور کچھ ریزگاری تھی۔ نرمل کے چہرے پر سفیدی چھا گئی تھی۔ کرسی کے ہتوں پر اُس کی گرفت قایم ہوگئی، آنکھیں بند ہوگئیں اور جبڑے لٹک گئے — جیسے زندگی ختم ہو رہی ہو۔ پھر دو چار منٹ کے بعد اُس کی بڑی اور نیلی آنکھیں بزدلانہ طور پر خوابگاہ کے دروازے پر قائم ہوگئیں۔ نرمل کو محسوس ہو رہا تھا کہ اُس کی جان نکل رہی ہے — کوئی خبر گیری کیوں نہیں کرتا؟

کھڑکی پر جو نظر پڑی تو غصے سے اُس کی کیفیت پاگلوں کی سی ہونے لگی۔ پھر اُس نے سب چیزیں بٹوے میں ڈالدیں اور اُسے بند کر کے میز کے کاغذوں پر پھینکدیا، جو افسردہ کمرے کی سوگوار فضا میں ایک سنہرے پھول کی طرح چمک رہا تھا۔ نرمل کھڑا ہو گیا، سر کو ایک ذرا اونچا کیا اور پکارا:- "بملا!" —— "کیوں نرمل؟" جواب ملا — "باہر آؤ!"

"ابھی آئی!" —— بملا جب باہر آئی تو اس کی ہرنی کی سی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ وہ نرمل کی طرف بڑھی مگر ایک آسیب زدہ کی طرح، اُس کی نگاہیں طلائی بٹوے کو دیکھ کر حیران تھیں اور وہ پریشان۔ اس چمکنے والی چیز کو دیکھکر آسیب زدہ بملا کا رنگ اُڑنے لگا تھا، اب یہ دونوں کھوئے ہوئے کھڑے تھے اور ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے پہلے نرمل کی نگاہیں جھک گئیں، اُس کی آنکھوں کے اندر خوف کی پرچھائیاں گزرنے لگیں۔ نرمل کا ہاتھ بڑھا اور بملا کا آنچل پکڑ لیا۔ بملا کھڑی دیکھتی رہی — انتظار کرتی رہی

"کرسی پر بیٹھ جاؤ" نرمل نے بڑی مشکل سے ابتدا کی۔ "بملا، ایک عجیب اور ایک نہایت حیرت انگیز واقعہ — ہر بات تعجب خیز!" وہ رُکا، اُس کی نگاہیں بملا کی پشت پر کتابوں کی الماری پر قایم ہوگئیں۔ "دو انسان محبت کریں، ایک ساتھ بسر کریں، ایک ساتھ جد و جہد کریں، ایک ساتھ فاقے کریں، ایک ہی سی امیدیں قایم کریں، ایک ساتھ

ناامید ہوں، اُن کی گڑیا سی ایک پیاری بچی بھی ہو اور پھر بھی ایک دوسرے کو نہ جان سکیں! حیرت ہے! عجیب و غریب مرحلہ! بلآ، یہ بات دنیا کی، انسان کی زندگی کا سخت حیرت ناک واقعہ ہے!"

بلآ اُس کی طرف دیکھا کی، تکتی رہی، اس تکتے رہنے میں اُس کی روح نے نگاہوں کا قالب اختیار کر لیا تھا۔ اُس کی حالت یہ تھی جیسے وہ چلتے میں سو رہی ہو، سوتے میں چل رہی ہو، کچھ دیر خموش رہکر کہنے لگی: "نرل تم کچھ بیمار ہو؟"

نرل نے اُس کا ہاتھ تھام لیا، سر سے پاؤں تک کانپ گیا، یہ سب اضطراری حالتیں تھیں! لیکن وہ بلآ کو دیکھے جارہا تھا، یہ اُس کا ارادی فعل تھا! پھر آہستہ سے بولا:۔ "ہاں، شاید ہوں — شاید ایک مدت سے بیمار ہوں! لیکن حیرت ہے کہ ہم دونوں کو اس بات کا علم و احساس آج ہو رہا ہے! بلآ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عزیب بلآ!"

بلآ ہاتھ چھڑا کر سیدھی کھڑی ہوگئی۔ طلائی بٹوے پر نظر ڈالی اور دھیمی آواز میں کہنے لگی:۔ نرل، اگر تم نے دوبارہ بھی میرا نام اسی لہجے میں پکارا تو میں چیخ پڑوں گی۔"

یہ سن کر نرل لڑکھڑا گیا، کرسی کا تکیہ پکڑ لیا، اور ایک خوفناک ہنسی ہنسا، پھر کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگا۔

"یہ کیا ہے؟" بلآ نے بٹوے کی طرف اشارہ کر کے پوچھا — "شاید تم پوچھنا چاہتی ہو کہ کس کا ہے؟"

"یہ یہاں کیسے آیا؟" بلآ نے پوچھا — "راستے میں پڑا تھا!" نرل نے کہا — بلآ نے نرل کو نظر بھر کر دیکھا اُس کی کھانسی میں بناوٹ اور چہرے پر فتحمندی کی رونق کو محسوس کیا۔ وہ اسوقت سخت کشمکش میں مبتلا تھی، مگر فوراً اپنے جذبات پر قابو پا کر اپنی فطری شیرینی کے ساتھ پوچھنے لگی:۔ "نرل، تم نے اپنے کام ہی کو اپنی موت بنا لیا، اتنی مشقت تو کوئی بھی برداشت نہیں کر سکتا، ہماری زندگیاں بالکل برباد ہیں!" پھر دفعتہً جذبات سے متاثر ہو کر کہنے لگی "یہ تم نے کیا کیا؟"

اُسے نرل کے بیان پر یقین نہ آیا کہ بٹوا پڑا ملا تھا — وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور آنکھیں موند لیں۔ اُس کے خط و خال درشت اور چالاک نظر آئے:۔ "میں نے کیا کیا؟" وہ ہنسا اور کھنکارا۔ "اپنی کرسی ذرا ادھر لے لو تاکہ ایک دوسرے کو دیکھ سکیں میں بتاتا ہوں کہ میں نے کیا کیا۔"

مشینی حرکت کی طرح بلآ نے اپنی کرسی سرکائی اور ساری کے اندر اُس کی انگلیاں آپس میں گتھ گئیں، نرل نے اُس پر ایک غور کی نظر ڈالی:۔ "بلآ، تم بھی بالکل تھک چکی ہو۔ میرا خیال غلط تو نہیں؟ تمھیں اس طرح گھلتے دیکھ کر برداشت نہ کر سکنے اور جو تیش کے الزاموں نے مجھے خود کو بھول جانے پر مجبور کر دیا۔ مجھے اپنی طبیعت اور تربیت کو پس پشت ڈال دینا پڑا — زندگی بڑی بیرحم آقا ہے، بلآ!" اس نے بلآ کو مغالطے میں ڈالنے کے لئے کہا

"لیکن نرل، اس سے تمھارا مطلب کیا ہے؟ کیا میں نے ادائے فرض میں کوئی کمی کی یا کبھی کوئی شکایت کی؟"

بلآ نے نہایت ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

"مطلق نہیں، کبھی نہیں! لیکن بلآ، میں تمھیں جس حال میں دیکھتا ہوں وہ حالت اپنی جگہ ایک مستقل شکایت ہے"

اُس کے سُننے سے میں کیونکر باز رہ سکتا ہوں؟ اس بٹوے کو کھول کر دیکھو۔"

"لیکن ـــ" ـــ "میں جو کہہ رہا ہوں!" ـــ "کیا واقعی؟" ـــ "اس میں مذاق کا تو کوئی پہلو نہیں جلدی کرو، میں بہت خستہ ہو رہا ہوں" بلاّ نے ہاتھ بڑھا کر بٹوے کو اُٹھایا، لیکن ہاتھ میں دبا لیا۔

"کھول کر دیکھو!" نرمل نے ذرا سخت انداز میں کہا ـــ بلاّ نے تعمیل کی ـــ "سب چیزیں نکال کر دیکھو۔ جلدی کرو ـــ میں بیتاب ہوں"۔ "جوتیش، جوتیش کا خط!" بلاّ دم بخود ہو گئی پھر ایک لمحے کے بعد "چار روپئے گیارہ آنے!" سب چیزیں نکالنے اور نقدی گننے کے بعد آہستہ سے بولی۔

نرمل نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالدیں اور کہنے لگا:۔ "چوری کی زحمت کے مقابلہ میں نہایت حقیر رقم! نہایت ذلیل ـــ ہے نا؟" ـــ "اوہ، نرمل، تمھاری سمجھ کو کیا ہو گیا ہے؟" ـــ "نہیں بلاّ میں دیوانہ ہرگز نہیں، بات صرف اتنی ہے کہ زندگی نے مجھے سخت ٹھوکریں لگائی ہیں۔ آج میں بھی اُسے ایک ٹھوکر مارنے کے قابل ہو گیا! لیکن میری یہ ٹھوکر زندگی کے جسم میں نہیں ہا! ہوا میں لگے گی! یہ بھی میری نارسائی کا ثبوت ہے۔"

"چپ رہو نرمل، پرمیشور!۔۔۔۔ نرمل!" ـــ "تم نے اگر مجھے اس لہجے میں پھر مخاطب کیا تو میں چیخ پڑونگا"

"تم اب سو جاؤ ـــ تم بہت تھک گئے ہو"، ـــ "اسوقت میں ہمیشہ سے زیادہ تھکا ہوا تو نہیں ہوں۔ میں تمھیں سارا قصہ سنانا چاہتا ہوں۔ خموشی سے سنو، ایک شاعر شاید چار روپئے گیارہ آنے کی چوری پر آمادہ نہ ہوگا۔ جرم کیا جائے تو اس میں بھی کچھ ہم آہنگی ضرور ہونا چاہئے"۔ وہ ہنسا اور کہتا رہا "ایک شاعر اگر گرے تو اُسے بہت بلندی سے گرنا لازم ہے"۔ کھانسی کا ایک سخت دورہ پڑا اور نرمل بے حال ہو گیا۔

بلاّ گھبرا کر اُٹھی، احساس فرض نے اس کی ہستی کو چھا لیا۔ اس میں حیرتناک طاقت اور چستی پیدا ہو گئی۔ وہ نرمل کے اوپر جُھک گئی اور کہنے لگی:۔ "نرمل، سنبھلو! اس بٹوے کے خیال کو مطلق بھلا دو، میرے تمھارے سوا کبھی کوئی نہ جان سکے گا۔ اس واقعہ کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دو اور دفن سمجھو۔ میں تمھارے پاس بیٹھی ہوں پورا قصہ کہہ کر دل کا بوجھ ہلکا کر لو۔ کل سے ہم نئی صورت میں نئے انتظام کریں گے، ماضی کو یکسر بھلا دیں گے اور ایک نئی زندگی شروع ہو گی"۔

نرمل کا احساس خودداری بلاّ کے اس معمولی لطف و رافت سے بھی مجروح ہوا۔ وہ کانپ گیا اور اس طرح کہنا شروع کیا جیسے کوئی کراہتا ہو:۔ "بلاّ، میں مرنے کی حد تک تھک گیا ہوں ـــ اتنا رگیدا گیا ہوں! میں نے اپنے مطمح نظر کے ساتھ عہد وفا باندھا اور اُسے نباہا ـــ آہ، وہ میرا پاش پاش مطمح نظر! میں اور میرا آئیڈئل، دو اچھے رفیق تھے ـــ ان جنبی روشنیوں کی جگمگاہٹ کے ہوتے ہوئے چلے جا رہے تھے! کوئی نہیں جانتا تھا، اور کوئی کیوں پروا کرے؟ ہر صبح وہی اُمید اور ہر شام وہی مایوسی ـــ میں نے صرف وہی ایک کام نہ کیا جس کی قابلیت مجھ میں ودیعت ہے اور جس کا نام 'زندگی' ہے!

" شام کو جوتیش آیا اور مجھے ملامت کی، اُس نے مجھے بتایا کہ بملا بہت خستہ ہوگئی ہے اور شیلا مضمحل ہے۔ جیسے میں اِس سے غافل تھا!

" بملا، جوتیش کا یہ ایک لفظ چبھ گیا ہے ۔ میری بچی مضمحل نظر آئے! وہ سمجھتا ہے کہ مجھے شاعری کا حق نہیں، کیونکہ اُس کی قیمت اگر مل بھی سکتی ہے تو اتنی نہ ہوگی کہ میں بملا کو تازہ دم اور شیلا کو مسرور رکھ سکوں اور یہ جبھی ہوسکتا ہے کہ میں جوتیش اور اردیشر کے ساتھ ہوجاؤں ۔ ویسا ہی بنجاؤں، وہ لکھنے لگوں جس کی بازار میں مانگ ہے۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ میں اپنی مثنوی کے ختم ہونے اور اُس کی آمدنی ہونے تک اُس سے قرض لے لوں"۔ یہاں پہونچکر نرمل مسکرایا! کسی خیال پر قربان ہوجانے کی مسرت میں ڈوب گیا۔ یا اُسکی غلطیوں کا زور اُسے بہالے گیا"

وہ کہتا رہا " جوتیش کے جانے کے بعد میں سیر کو نکل گیا اور اُس کا دیا ہوا سگار بیکر مزے لیتا رہا۔ سگار بہت نفیس تھا اور رات کی ہوا بھی پھولوں کی طرح تھی۔ میں میدان کے بدلے چورنگی پر ہولیا، بے ارادہ چلا جارہا اور کمال اطمینان کی حالت میں تھا۔ میں پارک اسٹریٹ میں جا پہونچا۔ گاسٹن مینش کے پھاٹک میں سے دو عورتیں اور ایک مرد برآمد ہوئے ۔ تینوں بہت خوش تھے ۔ ہنستے اور قہقہے لگاتے نکلے اور ایک موٹر میں سوار ہوگئے۔ وہ مرد اردیشر تھا میں نے دور سے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ اُس کی بیوی اور بہن ساتھ تھی، تینوں خوش وخرم تھے ۔ جھوٹی خوشی! یہ بٹوا اُس کی بہن کا ہے، اور جوتیش کا وہ خط رسوائی اور فضیحت کا گھر، مس اردیشر کا منگیتر اس خط کو دیکھے تو کیا کہے ؟ کسی غیر شاعر کے ہاتھ اگر لگتا تو یہ مختصر سا محبت نامہ جو اپنی قسم کے ادب کا عمدہ نمونہ ہے، بڑی رقم کی ہنڈی ثابت ہوتا!"

نرمل پھر ہنسا، کرسی پر سکڑا، سنبھلا اور پھر کہنے لگا:۔ "میرا خیال اردیشر کے بچوں کی طرف گیا، وہ کسی ادنے تربیت کی، کرائے پر رکھی ہوئی عورت کی نگرانی میں سو رہے ہوں گے، کمرے ہوادار اور گدے نرم ہوں گے! لیکن ماں باپ کھیل کود میں مصروف ۔ پھر مجھے تمھارا خیال آیا کہ کام کی تھکن سے نڈھال ہو رہی ہو، پھر یہ بٹوا نظر پڑگیا، میں بڑھا تو یہ پاؤں کے نیچے آگیا۔ میں سوچتا ہوں کہ مس اردیشر کو جب علم ہوگا تو اس کا سارا لطف کرکرا ہو جائے گا۔ نرم گدوں پر بھی بے چین رہے گی!"

اس کے بعد تھوڑی دیر بالکل سکوت رہا۔ بملا نے پھر خموشی توڑی تو اُسے خود اپنی آواز نئی اور عجیب سی معلوم ہوئی۔

" دھن بھاگ! تو سچ مچ یہ تمھیں پڑا ملا! صبح ہی کسی ذریعہ سے مس اردیشر کے پاس پہونچوا دینا چاہئے۔ تم فکر نہ کرو، میں اس کام کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دے لوں گی" ۔۔۔۔۔ " شکریہ، اچھی بملا!"

بملا نے احساس خوف کی حالت میں نرمل کو دیکھا اور پھر اپنی آواز میں رافت و سکون کا اثر پیدا کرکے کہنے لگی:۔۔۔

" نرمل، یہ سب ایک ڈراؤنا خواب تھا۔ جوتیش نے غلطی کی جو تم سے ایسی باتیں کیں، کیونکہ اسے معلوم تھا کہ تم ایک اہم تصنیف میں لگے ہوئے ہو۔ مگر اس کی نیت رنج پہونچانے کی نہ تھی۔ بہرحال اب تمھیں اپنا کام ختم کرنا ہے، اس لئے کسی طرف دھیان دینا ہی نہ چاہئے۔ میں سمجھتی ہوں کہ تمھارے لئے سب سے زیادہ ضروری دماغی سکون ہے۔ مجھے مطلقاً کوئی

شکایت نہیں، شیلا بھی خوش اور چونچال ہے۔ اتنی مدت کی رفاقت کے بعد باقی راستہ طے کرنے میں تمہیں مجھ پر اعتماد رکھنا چاہئیے۔" — نرمل کے ستے ہوئے چہرے پر تبسّم کی جھلک دوڑ گئی۔ وہ کہنے لگا:— "باقی راستہ طے کرنے میں —— بملا پیاری، تم ہمیشہ قابل اعتماد ہو!" —— بملا کے سراپا میں ایک کپکپی دوڑ گئی:— "میں محض اس خیال سے کہتی ہوں کہ تمہیں خاطر خواہ سکون مل سکے، اُسوقت تک کے لئے کہ تمہاری مثنوی شایع ہو، جو تیش سے کچھ قرض لے لو۔ دوستی و رفاقت آخر اور کس کام آسکتی ہے؟ اور تم نے کیا اپنے دوستوں اور خود جو تیش کے ساتھ سلوک نہیں کئے؟" بملا نے نہایت دلنشین لہجے میں کہا—— نرمل کے چہرے پر سے تبسم کا غازہ اُڑ گیا، اور اُس کی طویل سانس سے کمرے کی فضا بھر گئی:—

"کہہ چکیں؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اس سے تمہیں یکسوئی حاصل ہوگی اور تم اعتماد کے ساتھ کام کر سکو گے۔ دوسری طرف جو تیش کی غلط فہمی بھی دور ہو جائے گی، اُسے یقین ہو جائے گا کہ تمہیں اپنی تصنیف پر کتنا اعتماد ہے۔ وہ غالباً تمہارے احسانات کے بوجھ کو ہلکا کرنا چاہتا ہے۔ اب تم آرام کرو۔" بملا رُکی، نرمل کو ایک نظر دیکھا، اور اُس کا یہ دیکھنا اپنی جگہ ایک سوال تھا "اور صبح ایسے تازہ دم اُٹھو کہ گویا تمہیں کوئی فکر ہی نہیں۔ میں تمہارا ہات بٹاؤں گی۔ ہر بات کا زیادہ خیال رکھوں گی۔ بٹوا صبح ہی پہونچا دیا جائے گا اور دوپہر کی فرصت میں جو تیش کے پاس چلی جاؤں گی۔ پہلے فون کر لوں گی ——"

نرمل اس طرح دیکھ رہا تھا گویا کچھ جانتا ہی نہیں۔ دفعتاً بات کاٹ کر بولا:— "بملا، جو تیش کے دل میں تمہاری محبت ابھی تک باقی ہے — محبت اصل میں مٹتی ہی کب ہے! شام کو باتوں میں جب تمہاری طرف اشارہ ہوتا اُسکی آنکھوں کی چمک بڑھ جاتی تھی۔ ہاں، تمہارے خیال سے وہ ہر بات پر آمادہ ہو جائے گا ——"

"میں بھی یہی سمجھتی ہوں" —— "تمہیں احساس ہے؟" —— اس خیال سے کہ نرمل اس کے تاثرات کو پڑھ کر بملا کے خطرات سے آگاہ نہ ہو جائے، بملا نے ہاتھ کی آڑ کر لی اور کہنے لگی:— "ہماری موجودہ ضرورت تھوڑے سے روپیوں سے رفع ہو جائے گی ——" "جب لینا ہے تو اتنا لے لیا جائے کہ پھر تردد نہ ہو — اور لینے کے لئے کم اور زیادہ یکساں ہے؟"

بملا کھڑی ہو گئی اور بھرائی سی آواز میں کہنے لگی:— "نرمل اب بہت دیر ہو گئی ہے، تمہارے لئے نہایت ضروری ہے کہ اپنی طاقت و توانائی کی حفاظت کرو۔ اب ایسی کیا بات ہے جو تم افسردہ ہو؟ اُٹھو، اب سو جاؤ۔" بملا نے آہستہ سے خوابگاہ کا دروازہ کھولا اور ہونٹوں پر اُنگلی رکھکر نرمل کو متنبہ کیا کہ کھٹکا نہ ہونے پائے۔ خود کمرے میں داخل ہو کر موم بتی روشن کی، اور پھر دروازے پر آکر کہنے لگی:— "آؤ، سو جاؤ!" — نرمل کھڑا ہو گیا، میز پر ہاتھ ٹیک کر بکھرے ہوئے کاغذوں پر نظر ڈالی، پھر ہاتھوں کو سر پر حلقہ کر کے ایک انگڑائی لی۔ اُس شام کی کوفت و سوخت نے اُس کے چہرے کا رہا سہا رنگ بھی اُڑا دیا اور وہ بالکل سفید پڑ گیا تھا۔ میز کی دراز کھینچی، اُنگلیوں سے بٹوے کو ٹٹولا اور پھر اُٹھا کر دراز میں ڈال دیا، اُس نے دراز بند کر دی اور بٹوا آنکھوں سے اوجھل ہو گیا—— "آجاؤ، نرمل!" — دفعتہً نرمل غصے کی فوری کیفیت سے کانپ گیا اور بولا:——

"دروازہ بند کرلو، اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو"۔ "مگر تم - بیمار ہو اور زیادہ بیمار ہو جاؤ گے!"

"بلا، جو کہتا ہوں وہ کرو! میں کام کروں گا، اسوقت طبیعت حاضر ہے"۔ بلا کی خود اعتمادی اور قوت ارادی رنج اور خوف سے بدل گئیں وہ اول تو رُکی مگر پھر دروازہ بند کرلیا — نرمل ایک بوڑھے آدمی کے لڑکھڑاتے قدموں سے کھڑکی تک گیا اور سر کی ایک ڈراما ئی جنبش کے بعد باہر کی فضا کو دیکھنے لگا، اور دیر تک دیکھتا رہا۔ دفعتاً وہ "شیطانی روشنی" موقوف ہوگئی۔ نرمل نے "اچھا!" کہا اور نہایت سکون و اطمینان کی حالت میں میز پر پہونچ کر اپنے کام میں لگ گیا۔ نرمل کی مثنوی دراصل پوری ہو چکی تھی مگر تمام نہ ہوئی تھی، کیونکہ خود اسکی "حزنیہ حیات" ابھی ناتمام تھی۔ نرمل نے اُس میں آخری باب کا اضافہ کیا اور اپنی "حزنیہ حیات" کی تکمیل کرنے اُس کھڑکی پر آکھڑا ہوا یہ وہ وقت تھا کہ کلکتہ میں چاروں طرف کی سڑکوں سے مچھلی اور سبزی کی گاڑیاں آنا شروع ہو جاتی ہیں، صبح صادق کی ہوا کے سکون خیز جھونکے سرگوشیوں میں کچھ سمجھانے لگے لیکن نرمل نے کھڑکی میں سے جست کی اور ہوا کے سمندر میں غوطہ لگا کر غائب ہوگیا۔

اُدھر بلا کی آنکھ کھلی تو وہ پکاری: "پیارے نرمل، آکے سوجاؤ — صبح تم بہت تھک جاؤ گے!"

نرمل مقبول ہو یا نہ ہو مگر مشہور شاعر ضرور تھا۔ اُس کی خودکشی کی خبر سے شہر میں ہل چل پڑگئی۔ اخبار کے نامہ نگاروں نے متواتر کئی روز تک ہنگامہ جاری رکھا۔ جوتیش نے اخبار والوں کو ضروری اطلاعات دیکر بلا اور شیلا کو دار جلنگ بھیجدیا، مگر اخباری لوگوں نے وہاں بھی اُس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ ہفتوں اخباروں کے کالم نرمل کے متعلق مضامین شایع کرتے رہے اور اُس کی غیر مطبوعہ مثنوی کے لئے متعدد ناشروں نے تقاضا کیا۔ نرمل کی "حزنیہ حیات" جوتیش کی سپردگی میں دیدی گئی

اس مثنوی میں خود نرمل کی داستان زندگی نظم ہوئی تھی ختم داستان پر نرمل ایک عرصہ تک اُلجھن میں مبتلا تھا، کیونکہ نظم کا اُٹھان اور اُس کے مطالب کا پرواز متقاضی تھا کہ فسانہ الم انجام ہو، لیکن وہ خود تو زندہ تھا! فسانے کے ہیرو کو جھوٹ موٹ مار ڈالنا اُسکی صناعت کی لغت سے خارج تھا۔ نرمل طے کر چکا تھا کہ فسانے کا انجام ناتمام رہے۔ لیکن اُس رات کو جوتیش سے باتیں کرنے میں خود نرمل کے منھ سے "حزنیہ حیات" نکل گیا، جسے اُس نے ایک الہام سے تعبیر کیا اور اُسے "حزنیہ حیات" بنانے کا تہیہ کرلیا۔ ساتھ ہی اُس پر یہ انکشاف ہوا کہ بلا جوتیش سے شادی کرکے زیادہ آرام سے بسر کرسکتی ہے، اُسے کیا حق تھا کہ بلا کو مبتلائے آلام رکھے! — ان احساسات و خیالات نے اُس کے اندر ایک محشر بپا کردیا اور بالآخر اُس نے اپنی کتاب زندگی کو بند کر دینے کا تہیہ کرلیا — جوتیش نے اُس مثنوی کا ایک فلم بنایا جو نہایت مقبول ہوا کتاب شائع کی جس کے کئی ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گئے۔ بلا اور شیلا کو دنیا میں کسی بات کی کمی نہ رہی — اسوجہ سے کہ نرمل نے اس کے واسطے اپنی جان دی تھی! — دوسروں کی زندگی ہمیں بیدار نہیں کرسکتی، جو شے ہمیں بیدار کرسکتی ہے وہ خود اپنی زندگی کا ابتلا ہے، نرمل نے جب خودکشی کی تو گویا اس کی حیات بیدار ہوگئی۔

ل - احمد

بھوک

(ایک چشم دید واقعہ سے متاثر ہوکر)

علی الصباح، کہ دنیا تھی محوِ خواب ابھی — چھپا تھا حجرۂ مشرق میں آفتاب ابھی
فلک پہ انجمنِ شب کا تھا اثر باقی — گھرا ہوا تھا ستاروں میں ماہتاب ابھی
فضائیں گم تھیں دھندلکے میں آخرِ شب کے — عروسِ صبح کے چہرے پہ تھی نقاب ابھی
نہ آئی تھی ابھی سرخی افق کے چہرے پر — شفق نے چرخ پہ چھڑکی نہ تھی شراب ابھی

غنودگی میں فضائیں تھیں سر جھکائے ہوئے
میں جا رہا تھا سڑک پر قدم بڑھائے ہوئے

مگر تھا پیشِ نظر اک مرقعۂ ادبار — دلِ غریب کی صورت اداس تھا بازار
بجز صدائے نفس کے کہیں نہ تھی آواز — بجز ہوائے سحر کے کوئی نہ تھا بیدار
وہ کوٹھیاں وہ طرب خانہ ہائے دولت و عیش — جہاں تھے آخرِ شب تک حیات کے آثار
وہاں بھی موت کے بیٹھے تھے ہر طرف پہرے — نہ شمع تھی، نہ پتنگے، نہ بزم تھی، نہ بہار
گداگروں کے کئی قافلے بحالِ تباہ — پڑے ہوئے تھے سرِ راہ نیند میں سرشار

یکایک ایک طرف اُٹھ گئی جو میری نظر،
عجب طرح کا نظر آیا سامنے منظر

گلی کے موڑ پہ اک آدمی پریشاں حال — کہ جس کی شام جوانی تھی سوگوارِ زوال
جھکی جھکی ہوئی نظریں، رُندھا رُندھا ہوا دل — دھنسی دھنسی ہوئی آنکھیں، سُتے سُتے ہوئے گال
برہنہ جسم، خمیدہ کمر، رمیدہ حواس — بدن نڈھال، طبیعت نڈھال، روح نڈھال
زبانِ "لغزشِ پا" پر فسانۂ شب و روز — سطورِ چینِ جبیں میں حدیثِ ماضی و حال
سمجھ گیا میں اسے دیکھتے ہی حال اس کا — کہ اس کی شکل بیک وقت تھی جواب و سوال
بساطِ خاک پہ بیٹھا ہوا تھا خاک بسر — پڑی تھی سامنے کوڑے پہ کچھ سڑی ہوئی دال
سگِ حریص کی مانند چاٹتا تھا اسے — بُرا تھا بھوک سے کچھ اسقدر غریب کا حال

میں اس مہیب نظارے کی تاب لا نہ سکا
قدم جمے کے جمے رہ گئے اُٹھا نہ سکا

رضا نقوی

غزل :-

فراق گورکھپوری

قصۂ دردِ محبت ہی تو ہے — کیوں نہیں سنتے حکایت ہی تو ہے
جن کو اُن آنکھوں نے غافل کردیا — آج کیوں جاگیں قیامت ہی تو ہے
مل کے اہل غم سے وقتِ عرضِ حال — جُھک گئی چشم مروت ہی تو ہے
درد کے مارے ہوئے بھی سو گئے — چھاگئی ان پر بھی غفلت ہی تو ہے
ہم وہی ہیں اے نگاہِ آشنا — خوش نہیں ہوتے طبیعت ہی تو ہے
عشق کو رہنے دے اپنے حال پر — امتیازِ درد و راحت ہی تو ہے
صبر بھی رکھتے ہیں تیرے بیقرار — کاٹ دیں گے شام فرقت ہی تو ہے
آنکھ جھپکتے ہی اُڑیں چنگاریاں، — شرم ہی تو ہے شرارت ہی تو ہے

راز اس کا کھل نہیں سکتا فراق
درد ہی تو ہے محبت ہی تو ہے

غزل :-

(جگر بریلوی)

کیونکر کہوں زباں سے کہ تو مہرباں نہیں — لیکن میرا نصیب کہ میں شادماں نہیں
کوئی تو نازش صفتِ ماتم بھی چاہئے — میرا وجود تیرا ستم رائگاں نہیں
پھولوں کا رنگ دیکھ رہا ہوں چمن سے دور — افسوس ہے کسی کو خیالِ خزاں نہیں
کیفیت وسرور ہے اور جلوۂ جمال — اب میں نہیں، زمین نہیں، آسماں نہیں

مصروف کارِ عشق خموشی سے ہیں جگر
ہم آشنائے شیوۂ آہ و فغاں نہیں

ہم کو تاثیرِ غم سے مرنا ہے، — اب اسی رنگ میں نکھرنا ہے
جاں نثاری قبول ہو کہ نہ ہو — ہم کو اپنی سی کر گزرنا ہے
اب کوئی زہر دے کہ بادۂ ناب — ایک پیمانہ ہم کو بھرنا ہے
دیکھ لی ہم نے عشق کی معراج — اس سے آگے ابھی گزرنا ہے
حسن ہو عشق ہو جنوں ہو کہ ہوش — سب سے بیگانہ دل کو کرنا ہے

غزل :—

(مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر)

جنوں میں بھی وہی خواب پریشاں دیکھ لیتا ہوں
وفا کا عہد اُن ہونٹوں پہ لرزاں دیکھ لیتا ہوں

معاذ اللہ تیرے حسن روز افزوں کی آرایش
پئے یک جلوہ خونِ صد گلستاں دیکھ لیتا ہوں

نیاز عشق رخصت آنکھ اُٹھانے کی نہیں دیتا
اگر دست طلب میں ترا داماں دیکھ لیتا ہوں

ادا کچھ ملتی جلتی ہے ترے دامن جھٹکنے کی،
گلوں کو دیکھ کر اپنا گریباں دیکھ لیتا ہوں

کبھی ترک تمنا پر، کبھی عرض تمنا پر
محبت کو محبت سے پشیماں دیکھ لیتا ہوں

مجھے کیا کام تھا نظارۂ گلہائے خنداں سے
ستمگر تیری خوئے ناپشیماں دیکھ لیتا ہوں

اثر فکر رسا جب مائل پرواز ہوتی ہے،
فضائے شعر میں نغموں کا طوفاں دیکھ لیتا ہوں

محکمۂ اطلاعات عامہ صوبجات متحدہ کی ایک تحریر

ہمیں موصول ہوئی ہے، جس میں نگار کے بعض اطلاعات کی ان الفاظ میں تردید کی گئی ہے :—

مکرمی _ تسلیم

نگار بابت اگست ۱۹۳۸ء میں " ملاحظات " کے زیر عنوان صوبجات متحدہ میں سینٹری انسپکٹروں کے انتخاب کے سلسلہ میں ڈائرکٹر صحت عامہ (جنھیں نگار نے مسلمان قرار دیا ہے) اور آنریبل وزیر لوکل سلف گورنمنٹ کی جس گفتگو کا حوالہ دیا گیا ہے وہ غالباً کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے

واقعہ یہ ہے کہ موجودہ ڈائرکٹر صحت[1] عامہ مسلمان نہیں بلکہ ہندو ہیں اور جس گفتگو کا ملاحظات میں ذکر کیا گیا ہے وہ وزیر موصوف اور ڈائرکٹر صحت عامہ کے درمیان کبھی نہیں ہوئی۔ ابکی سال ۴۳ سینٹری انسپکٹر مقرر کئے گئے ہیں جن میں ۱۱ مسلمان ہیں

امید کہ جناب " نگار " کی آیندہ اشاعت میں ضروری تصحیح کر دیجئے گا

دستخط ڈپٹی ڈائرکٹر (اُردو)

(نگار) ہمیں یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ آنریبل وزیر لوکل سلف گورنمنٹ سے جس گفتگو کا حوالہ اگست کے نگار میں دیا گیا ہے وہ نہیں ہوئی

---

[1] میں نے غلطی سے ڈائرکٹر لکھدیا تھا، میری مراد محکمۂ صحت عامہ کے ہیڈ اسسٹنٹ سے تھی۔

فیروز شاہ کے عہد میں بڑے بڑے علما پائے جاتے تھے۔ ان میں سے ایک مولانا جلال الدین رومی[1] تھے جو مدرسۂ فیروز شاہی کے پرنسپل تھے۔ دوسرے مولانا عالم آندپتی جن کی نسبت مولانا عبد الحق[2] دہلوی نے لکھا ہے کہ فتاوائے تاتارخانی

[1] مشہور مثنوی کے مصنف مولانا روم دوسرے تھے۔ [2] مولانا عبد الحق بن سیف الدین دہلوی کی تاریخ حقی مشہور کتاب ہے اس میں سلاطین غلام خاندان سے لیکر اکبر تک کے حالات درج ہیں۔ یہ تاریخ ۱۰۰۵ھ؁ (۱۵۹۶-۹۷ء) میں (جب اکبر کی تخت نشینی کا بیالیسواں سال تھا) مرتب ہوئی۔ مصنف کے آبا و اجداد بخارا سے ہندوستان آئے تھے اور دہلی میں مقیم ہو گئے تھے۔ مصنف بادشاہ نامہ لکھتا ہے کہ جب تیمور دہلی کی تاخت سے فارغ ہو کر اپنے وطن واپس گیا تو اسکے ساتھیوں میں سے کچھ لوگ یہاں رہ گئے تھے اور انھیں میں سے کسی کی اولاد میں عبد الحق ہیں۔ لیکن مولوی عبد الحق اپنی کتاب اخبار الاخیار میں لکھتے ہیں کہ "میرا جد اعلیٰ آغا ترک علاؤ الدین خلجی کے زمانہ میں دہلی آیا۔ آغا ترک کا باپ ماوراءالنہر چلا گیا تھا اور پھر وہاں سے تیمور کے ساتھ آیا"

مسٹر مشکات نے اپنے مسودۂ تاریخ دہلی میں لکھا ہے کہ "انکا مورث اعلیٰ بخارا سے دہلی آیا اور یہاں شاہی دربار سے متعلق ہو گیا بہرحال اس میں کلام نہیں کہ مولوی عبد الحق کے آبا و اجداد بخاری تھے۔ اس لئے مولوی عبد الحق کے بیٹے "دہلوی البخاری" کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ مولوی عبد الحق کے والد ایک بزرگ آدمی تھے جن کی تعریف مصنف نے کی ہے۔ مولوی عبد الحق بیس سال کی عمر میں تمام علوم متداولہ سے فارغ ہو گئے اور قرآن بھی حفظ کیا (بادشاہ نامہ عبد الحمید لاہوری) دوران تعلیم کا حال بیان کرتے ہوئے وہ خود اپنی مشہور تصنیف اخبار الاخیار میں لکھتے ہیں کہ وہ دونوں وقت مدرسہ جایا کرتے تھے اور صرف کھانا کھانے کے لئے تھوڑی دیر کو گھر آتے تھے ان کا گھر مدرسہ سے دو میل کے فصل پر تھا اس لئے شوق تعلیم میں یہ روزانہ ۸ میل کا سفر کیا کرتے تھے۔ دہلی چھوڑنے کے بعد کچھ عرصہ تک ملا عبد القادر بدایونی، فیضی اور نظام الدین مولف طبقات اکبری کے ساتھ فتحپور سیکری میں رہے (تاریخ بدایونی) لیکن بعد کو کسی اختلاف کی بناء پر علحدہ ہو گئے اور حج کو چلے گئے بعد فراغ حج عرب میں عرصہ تک قیام رہا اور مدینہ و مکہ کے علماء سے بہت کچھ فیضان حاصل کیا۔ اصول تصوف، مذہب، سیاحت، تفسیر وغیرہ کی بہت سی کتابیں اُن کی تصنیف سے ہیں۔ خود انھوں نے اپنی تصانیف کی تعداد ایک سو بتائی ہے۔ ان میں سے مدینہ سکینہ، مدارج النبوت، جذب القلوب (تاریخ مدینہ) اور اخبار الاخیار بہت مشہور ہیں۔ مولوی عبد الحق ۹۵۸ھ؁ میں پیدا ہوئے اور ۱۰۵۲ھ؁ میں انتقال کیا۔ انھوں نے حوض شمسی کے پاس اپنا مقبرہ اپنی ہی زندگی میں طیار کرا لیا تھا چنانچہ یہیں مدفون ہوئے (یہ مقبرہ اب بھی موجود ہے اور اچھی حالت میں ہے) مولوی عبد الحق بہت صحیح و توانا شخص تھے مولف بادشاہ نامہ کا بیان ہے کہ ۱۰۴۸ھ؁ میں جب کہ اُن کی عمر ۹۰ سال کی تھی اُن کے قواء نہایت اچھے تھے اور اپنے مشاغل تصنیف و تالیف میں اسی طرح مصروف تھے جیسے عالم شباب میں۔ مصنف کا بیان ہے کہ تاریخ لکھنے کا شوق انھیں ضیاء برنی کی تاریخ فیروز شاہی کو دیکھ کر پیدا ہوا چونکہ تاریخ فیروز شاہی میں صرف فیروز شاہ تک کے حالات تھے اس لئے بعد کے سلاطین کے حالات انھوں نے تاریخ بہادر شاہی (مصنفہ سام سلطان بہادر گجراتی) سے مدد لیکر بہلول لودی تک کی تاریخ مرتب کی اسکے بعد یہ خیال پیدا ہوا کہ ان بادشاہوں کا بھی حال لکھنا چاہئے جن کی طرف ضیاء برنی نے اعتنا نہیں کیا ہے۔ اس غرض سے انھوں نے طبقات ناصری سے مدد لیکر فخر الدین سام (محمد غوری) کے حالات سے اپنی تاریخ کو شروع کیا۔ بہلول لودی کے وقت سے عہد اکبری تک کے حالات انھوں نے زیادہ تر زبانی روایات اور اپنے ذاتی معلومات کی بناء پر لکھے ہیں۔ انھوں نے سلاطین بنگال، جونپور، مانڈو، (مالوہ) دکن، ملتان، سندھ و کشمیر کے حالات بھی لکھے ہیں لیکن نہایت مجمل و مختصر۔ تاریخ حقی کمیاب ہے اور ہندوستان میں اس کے قلمی نسخے شاذ و نادر کہیں کہیں پائے جاتے ہیں ایک نسخہ برٹش میوزیم میں ہے اور دوسرا رایل ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ میں۔

کی ترتیب میں انھیں کا خاص حصہ تھا۔ علاوہ ان کے مولانا خواجگی (قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے استاد) مولانا احمد تھانیسری اور قاضی عبد المقتدر (جو علاوہ فاضل ہونے کے بے مثل شاعر بھی عربی و فارسی کے تھے اور جنھوں نے لامعۃ العجم کا جواب لکھ کر شہرت دوام حاصل کرلی ہے) ملک احمد ولد امیر خسرو اور مولانا مظہر کڑوی اور قاضی عابد بھی اپنی اپنی جگہ بے مثل علمار و صاحبان کمال میں شمار کئے جاتے تھے

۱ـ سلطان ابراہیم شرقی بادشاہ جونپور کے عہد میں قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے عروج حاصل کیا، قاضی صاحب اپنے عہد کے اختر درخشندہ تسلیم کئے جاتے تھے اور اس وقت کے تمام علمار انھیں "ملک العلمار" کہا کرتے تھے کیونکہ ان سے زیادہ صاحب فضل وکمال اور کوئی شخص نہ تھا۔ قاضی صاحب کی تصانیف متعدد ہیں جن میں حواشی کافیہ (جو ان کی بہترین تصنیف کہی جاتی ہے) ارشاد، بدیع البیان خاص شہرت رکھتی ہے

۲ـ ملک احمد امیر خسرو کے صاحبزادہ تھے۔ اور مذاق شعری نہایت پاکیزہ رکھتے تھے۔ اگرچہ ان کا کوئی دیوان ایسا نہیں پایا جاتا، لیکن شعرائے متقدمین کے کلام میں جو اصلاحیں انھوں نے دی ہیں وہ کہیں کہیں نظر آجاتی ہیں۔ بدایونی نے چند مثالیں لکھی ہیں مثلاً ظہیر کا شعر ہے :-

کلاہ گوشۂ حکم تو از طریق نفاذ ربودہ از سر گردون کلاہ جباری

انھوں نے ربودہ کو فگندہ سے بدل دیا — بخیل کی ہجو میں ایک شعر مشہور ہے :-

ایں سہل بود کہ گوگرد سرخ خواست گرنان خواجہ خواستے آں راچہ کردمی،

ملک صاحب نے بجائے گوگرد سرخ کے آب حیات کردیا — اسی طرح ایک اور شعر ہے :-

گر مشک خواند خاک درت را فلک مرنج نرخ گہر بطعن خریدار نشکند،

ملک احمد نے پہلے مصرعہ کو یوں کردیا :- "گر لعل خواند سنگ درت مشتری مرنج" (بدایونی ۷۰) - (شعر العجم - ۲ - ۱۲)

۳ـ مولانا مظہر کڑوی کے متعلق بدایونی نے لکھا ہے کہ اس کے زمانہ میں مولانا مظہر کی اولاد لکھنؤ میں موجود تھی۔ مولانا دربار فیروز شاہ میں خاص عزت رکھتے تھے۔ ان کا ایک دیوان بھی ۱۵ ہزار اشعار کا تھا، لیکن چونکہ اُن پر زہد و علم کا رنگ زیادہ غالب تھا اس لئے ملا بدایونی کے نزدیک اُن کے اشعار زیادہ پرلطف اور بامزہ نہ ہوتے تھے

۴ـ قاضی عابد شاعر بھی تھے چنانچہ ان کا یہ قطعہ بہت مشہور ہے اور حقیقتاً نہایت خوب ہے :-

دوستاں گویند عابد با چنیں طبع لطیف چیست کاشعار غزل از تو فراواں برنخاست

ماکر اشعر و غزل گوئیم چوں در عہد ما شاہد موزوں و ممدوحی زر افشاں برنخاست

یہ قطعہ بالکل ترجمہ معلوم ہوتا ہے عربی کے اس قطعہ کا۔

قالوا ترکت الشعر قلت ضرورۃ باب الدواعی والبواعث مغلق

خلت الدیار فلا کریم یرتجیٰ، عنہ النوال و لا ملیح یعشق،

(لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کیا تو نے شعر گوئی ترک کردی۔ میں جواب دیتا ہوں کہ ہاں، کیونکہ اسباب شعر گوئی ناپید ہیں۔ نہ کوئی ایسا سخی ہے جس کی مدح میں شعر کہہ کے بخشش کی توقع قایم کی جائے اور نہ کوئی ایسا سبزہ رنگ معشوق ہی ہے جس کی محبت شعر کہنے پر مجبور کردے)

فنون سے دلچسپی

فیروز شاہ کو تمام فنون کے ساتھ دلچسپی تھی چنانچہ اُستادوں کے ماتحت اس نے اپنے غلاموں کی بڑی تعداد کو مختلف پیشوں اور حرفوں کی تعلیم دلائی۔ اور لوگوں میں مختلف نئی نئی چیزیں بنانے کا ولولہ پیدا کر دیا اس عہد کے ایک مشہور ایجاد طاس گھڑیال ہے جس سے نمازوں کے اوقات روزہ کھولنے کا وقت سایہ کا حال، شب و روز کے گھٹنے بڑھنے کی کیفیت معلوم ہوتی تھی۔ فیروز آباد میں جہاں یہ گھڑیال لگا تھا وہاں اس کے دیکھنے کے لئے ہر وقت لوگوں کا ہجوم رہتا تھا۔ اس ایجاد کو خود فیروز شاہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ ہر جشن کے موقعہ پر جو سال میں چار بار (عیدین، نوروز شب برات) ہوتے تھے اور ہر جمعہ کو نماز کے بعد داستان گو گویّے، ماہرین رقص، پہلوان اور کرتب دکھانے والے جمع ہو کر اپنا کمال اور تماشہ دکھایا کرتے تھے۔ اور بادشاہ سب کو انعام دیکر رخصت کرتا تھا

فیروز شاہ کا عجائب خانہ

فیروز شاہ کو قدیم اور نادر چیزیں جمع کرنے کا بڑا شوق تھا چنانچہ اشوکا کے سنگین ستونوں کا فیروز آباد میں نصب کرنا بھی اسی ذوق کی بنا پر تھا۔ اس نے ایک خاص مکان اس لئے تعمیر کرایا تاکہ یہاں ایسی عجیب و غریب چیزیں رکھی جائیں سراج عفیف نے لکھا ہے کہ اس عجائب خانہ میں ایک پستہ قد شخص ایسا تھا جو صرف ایک گز لمبا تھا لیکن اس کا سر تین آدمیوں کے برابر تھا۔ دو آدمی دراز قامت تھے۔ یہ اتنے لمبے تھے کہ اُس وقت کا طویل سے طویل قد رکھنے والا آدمی ان کی کمر تک پہونچتا تھا۔ دو عورتیں ایسی تھیں جن کی داڑھی بالکل مردوں کی طرح تھی۔ ایک بکری تین پاؤں کی تھی جو خوب دوڑتی تھی۔ ایک سیاہ کوا سُرخ چونچ کا، ایک سپید طوطی سیاہ منقار کی ایک گائے جس کے سُم گھوڑے کی طرح تھے۔ اور علاوہ ان کے اور بہت سی چیزیں اس عجائب خانہ میں تھیں۔ آدمیوں اور ہاتھیوں کی وہ ہڈیاں بھی اس عجائب خانہ میں رکھی ہوئی تھیں، جو سرستی اور ستلج کے درمیان پشتۂ زمین کھودنے سے برآمد ہوئی تھیں۔ بعض ہڈیاں ایسی تھیں جو نصف پتھر ہو گئی تھیں

شکار کا شوق

فیروز شاہ کو کمسنی ہی سے شکار کا بہت شوق تھا محمد شاہ تغلق اسے منع بھی کرتا رہتا، لیکن یہ باز نہ آتا جب عنان حکومت اس کے ہاتھ میں آئی تو اس شوق نے اور زیادہ ترقی کر لی

یہ نہ صرف چیتوں اور سیاہ گوش کے ذریعہ سے شکار کھیلتا تھا بلکہ شیر بھی اس غرض سے اس نے پال رکھے تھے۔ شاہین، باز، جرہ، بحری، وغیرہ کے ذریعہ سے بھی شکار کھیلتا تھا۔

موسم گرما میں دیپال پور اور سرستی کا درمیانی حصہ گورخر کے شکار کے لئے مخصوص تھا۔ اسی طرح موسم سرما میں بدایوں اور آنولہ کے جنگلوں میں نیل گائے کا شکار کیا کرتا تھا۔ اگر کسی جنگل میں شیر آجاتا، تو کوئی اس کا شکار نہ کرتا، بلکہ بادشاہ کو اس کی خبر دی جاتی اور یہ فوراً وہاں پہونچ کر اس کا شکار کرتا

چونکہ فیروز شاہ فطرتاً رحیم المزاج تھا اس لئے فتوحات کے لحاظ سے اس نے کوئی ترقی نہیں کی۔ تاہم اس کی فتوحات میں سے بڑی فتح یہی ہے کہ محمد شاہ تغلق کے زمانہ میں جو طوائف الملوکی اور بدامنی پھیل گئی تھی وہ اس کے عہد میں مفقود

ہوگئی اور سلطنت میں ہر طرف امن وسکون نظر آنے لگا۔ وہ جنگ سے متنفر تھا اور حقیقت یہ ہے کہ جنگی قابلیت اس میں بہت کم تھی۔ دکن، جہاں حسن گنگو نے اپنی خود مختار حکومت بہمنی سلطنت کے نام سے کوہ وندھیاچل کے جنوب تک قایم کرلی تھی، اور جو ۱۸۰ سال تک قایم ہوئی بدستور مطلق العنان رہا۔ بنگال کی طرف ہر چند فیروز شاہ دو مرتبہ گیا، لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

پہلی دفعہ جب ۷۵۴ھ / ۱۳۵۳ء میں وہ بنگال کی طرف گیا تو گیارہ مہینہ تک واپس نہیں آیا۔ اس مہم میں اس کو کامیابی حاصل ہوئی اور ایک لاکھ اسّی ہزار بنگالی افواج قتل کی گیں۔ لیکن جب فیروز شاہ کو معلوم ہوا کہ اسقدر جانیں ضایع گئی ہیں تو اس نے یکڈلہ کے قلعہ کا محاصرہ (جہاں شاہ بنگال بھاگ کر پناہ گزیں ہوگیا تھا) چھوڑ دیا اور دہلی واپس آیا

اس کے بعد ۷۶۰ھ / ۱۳۵۹ء میں وہ پھر بنگال گیا۔ اس وقت ستر ہزار سوار، اور بیشمار پیدل فوج ساتھ تھی (۴۷۰ ہاتھی بھی ہمراہ تھے) لیکن اس مہم کا نتیجہ بھی یہ ہوا کہ صلح ہوگئی۔ واپسی میں بادشاہ ہاتھیوں کا شکار کرنے پدماوی (چھوٹا ناگپور) کے جنگل میں پہونچگیا۔ اور بڑی مشکل سے اپنے ساتھیوں کی جان بچاکر دہلی واپس آسکا۔ اس دفعہ وہ ڈھائی سال کے بعد دہلی آیا اور آخری ۶ ماہ میں تو کوئی خبر ہی بادشاہ کی دہلی تک نہ پہونچ سکی

اس کے بعد اس نے ٹھٹھہ فتح کرنے کا عزم کیا اور نوّے ہزار سوار، ۴۸۰ ہاتھی لیکر بھکر کی طرف روانہ ہوا کچھ فوج ۵۰۰۰ کشتیوں کے ذریعہ سے دریائے سندھ کو عبور کرکے پہونچی اور کچھ بسا حل گئیں۔ اتفاق سے اس زمانہ میں قحط پڑگیا اور رسا، جام (فرمانروائے سندھ) کے مقابلہ میں شکست ہوئی واپسی میں فیروز شاہ نے گجرات کا قصد کیا لیکن راستہ بتانے والوں نے دھوکا دیکر کچھ کی دلدلوں میں پھنسا دیا۔ پھر ۶ ماہ تک بادشاہ کی کوئی خبر دہلی نہیں پہونچ سکی۔ اس مصیبت سے نجات پانے پر بادشاہ نے پھر گجرات میں فوج مرتب کی اور دہلی سے کمک طلب کرکے سندھ پر حملہ کیا اس مرتبہ بادشاہ کو کامیابی حاصل ہوئی اور وہاں کے فرمانروا کو معزول کرکے اس کے بیٹے کو تخت نشین کیا اس کے بعد نگرکوٹ پر حملہ کیا اور وہاں فتح ہوئی

فیروز شاہ کی نیک مزاجی

جب فیروز شاہ، دہلی آکر انتظام سلطنت میں مصروف ہوا تو خداوند زادہ (سلطان محمد تغلق کی بہن) معہ اپنے شوہر کے وہیں ایک محل میں رہتی تھی، فیروز شاہ ہر جمعہ کو اس محل میں جاتا۔ ملک خسرو آگے کھڑا رہتا اور ملک داور (خداوند زادہ کا بیٹا) ماں کے پیچھے بیٹھتا۔ جب بادشاہ رخصت ہونے لگتا تو خداوند زادہ پان دیتی

ہر چند خداوند زادہ، فیروز شاہ کی تخت نشینی پر راضی ہوگئی تھی، لیکن حقیقتاً وہ اس سے خوش نہ تھی ایک بار اس نے فیروز شاہ کو قتل کردینے کی سازش کی اور محل کے اندر حجروں میں زرہ پوش سپاہیوں کو چھپاکر تاکید کردی کہ جب "میں اپنے سر پر دوپٹہ کو درست کرنے لگوں تو فیروز شاہ کا کام تمام کردیں"

جب فیروز شاہ حسب معمول آیا تو داور ملک نے جو اس سازش میں شریک نہ تھا بادشاہ کو چلے جانے کا اشارہ کیا یہ کچھ سمجھ کر فوراً وہاں سے چلدیا۔ خداوندزادہ روکتی رہی مگر یہ کوئی عذر کرکے چلا آیا۔ اس کے بعد جب خداوندزادہ کے محل کا محاصرہ کیا گیا تو زرہ پوش سپاہی گرفتار ہوئے اور انھوں نے سارا حال بیان کر دیا۔ بادشاہ نے خداوندزادہ کو صرف یہ سزا دی کہ وہ گوشہ نشین ہو جائے اور اپنا وظیفہ لیتی جائے اور اس کے شوہر خسرو ملک کو جلا وطن کر دیا

فیروز شاہ کا حلم و انصاف پسندی

جب بادشاہ اول مرتبہ بنگال کی مہم پر گیا تو تاتارخاں بھی ساتھ تھا۔ بادشاہ کبھی کبھی شراب کا شغل کیا کرتا تھا۔ ایک دن صبح کو اتفاق سے تاتارخاں اس کے خیمہ میں پہونچ گیا۔ فیروز اس وقت اسی شغل میں مصروف تھا فوراً شراب کا سامان پلنگ کے نیچے چھپا دیا۔ لیکن تاتارخاں نے دیکھ لیا اور بادشاہ کو نہایت سختی سے زجر و توبیخ کی۔ بادشاہ بہت نادم ہوا اور آیندہ کے لئے عہد کیا کہ میں تمھاری موجودگی میں کبھی شراب نہ پیوں گا

تاتارخاں صرف ایک فوجی افسر تھا۔ لیکن یہ فیروز شاہ کی حد درجہ انصاف پسندی اور سلامت طبع تھی کہ اس نے اپنے ایک معمولی امیر کی جھڑکی سُن لی اور جواب میں سوائے انفعال و ندامت کے اظہار کے اور کچھ نہ کہا

بادشاہ کا آخری زمانہ

جب بادشاہ ضعیف ہو گیا تو اس کو ایک سخت صدمہ تو اپنے وزیر خان جہاں کی وفات کا پہونچا اور دوسرا صدمہ بڑے بیٹے فتح خاں (ولی عہد) کا جس کی وفات وزیر کے تین سال بعد وقوع میں آئی۔ فتح خاں نہایت ہوشیار و قابل لڑکا تھا۔ اس لئے اس کی موت نے بادشاہ کی کمر توڑ دی۔ فیروز شاہ نے خان جہاں کے مرنے کے بعد اس کے بیٹے کو وزیر کر دیا لیکن فیروز کے دوسرے بیٹے محمد کی سازش سے وزیر کو معزول ہو کر جان کے خوف سے بھاگ جانا پڑا۔ اس کے بعد فیروز شاہ نے ناصر الدین کا خطاب دے کر تمام انتظام سلطنت محمد کے سپرد کر دیا۔ چونکہ محمد سخت نالایق تھا اس لئے غلاموں میں اسکے طرز عمل سے سخت ہنگامہ برپا ہو گیا فیروز شاہ کو مجبوراً اپنی خلوت سے نکلنا پڑا اور بمشکل اس شورش کو رفع کرکے اپنے پوتے یعنی فتح خاں کے بیٹے کو تخت نشین کیا اور چند دن بعد ۱۸ رمضان ۷۹۰ھ[1] کو انتقال کر گیا۔ اس کی عمر نوے سال کی تھی اتنے قریب چالیس سال کے حکومت کی اور اپنے غیر فانی نقوش حسن انتظام کے چھوڑ گیا۔ فیروز شاہ، حوض خاص (شمسی) کے پاس مدفون ہوا اس کا مقبرہ اب بھی شکستہ حالت میں موجود ہے۔

---

[1] یہ تاریخ وفات طبقات اکبری بدایونی اور تاریخ مبارک شاہی کے بیان کے مطابق ہے۔ فرشتہ میں شاید کتابت کی غلطی سے ۱۳ رمضان ۷۹۰ھ درج ہے سنہ مسیحی ۱۳۸۸ تھا اور تاریخ ۲۶ ستمبر۔
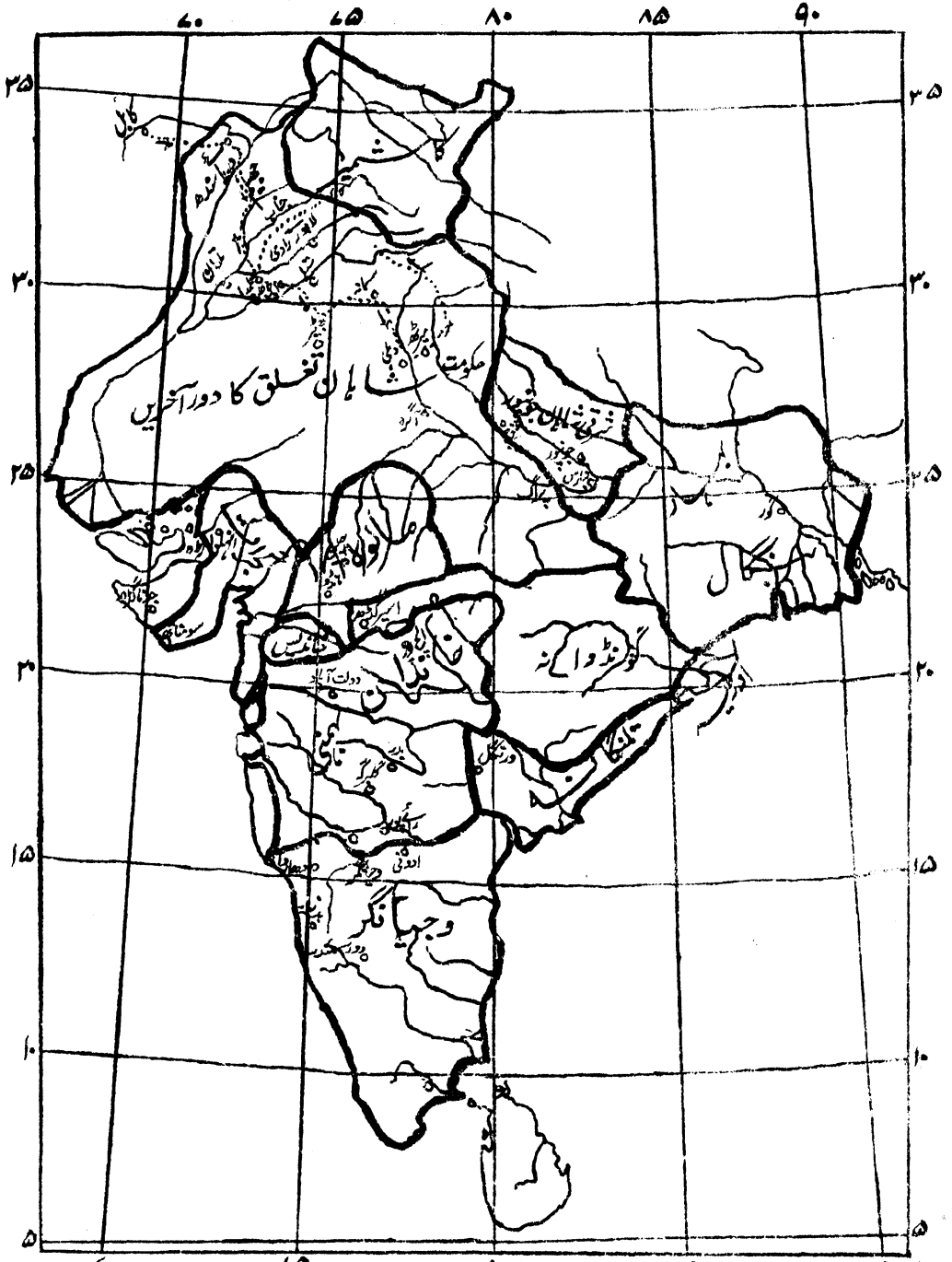
ہندوستان ۸۰۰ھ (۱۳۹۸ء) میں
حکومت شاہان تغلق کا دور آخر میں
بنگال
گونڈوانہ
وجیا نگر
دہلی
انگریزی میل
عہد طوائف الملوک و زوالِ خاندانِ تغلق
تیمور کا حملہ نقطوں کے ذریعہ سے اس طرح (۰۰۰۰۰۰) ظاہر کیا گیا ہے۔

باب یازدہم

سلاطین افاغنہ کا زوال

حکومت ہند کا تجزیہ

اور تیمور کا حملہ

اس میں شک نہیں کہ فیروز شاہ کے طویل عہد حکومت میں جو اپنے امن و سکون، اور حسن انتظام اور خوشحالی کی وجہ سے بہت ممتاز زمانہ خیال کیا جاتا ہے، سلطنت کے تمام عناصر اپنی اپنی جگہ مطمئن تھے، لیکن تخت شاہی کی وہ قوت جو شخصی حکومت کا طرۂ امتیاز خیال کی جاتی ہے تقریباً مفقود تھی

وہ نسل جس نے سلطان غیاث الدین بلبن کی شوکت و جبروت، سلطان علاؤ الدین کے رعب و سطوت اور محمد تغلق کے عزم و ہمت کے تماشے دیکھے تھے، مٹ چکی تھی اور بادشاہ کی ہیبت سے ہر وقت لرزہ براندام رہنا فیروز شاہ کے عہد میں اک بھولے ہوئے خواب سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا۔ فیروز سے لوگ محبت کرتے تھے لیکن اس کی طرف سے ڈرنا بھول گئے تھے اور اس کی نرمی نے لوگوں کے دلوں سے خوف بالکل محو کر دیا تھا

یہ صحیح ہے کہ فیروز شاہ کے عہد میں کوئی بغاوت رونما نہیں ہوئی لیکن اس کی وجہ یہ تھی کہ لوگ شورش و ہنگامہ برپا کرکے اس سے زیادہ کچھ نہیں پا سکتے تھے جو انھیں یونہی بہ حالت امن حاصل تھا۔ فیروز کی ذاتی خصوصیات اور اُسکے وزیر خان جہاں کی فراست و دانائی، حقیقتاً ملوکانہ نہیں بلکہ وہ ملکوتی قوتیں تھیں کہ صلح و آشتی نے ہر دل میں جگہ کر لی تھی اور کسی کا ضمیر ان نعمتوں کو ٹھکرا دینے کی طرف مائل نہ ہو سکتا تھا

اگر فیروز شاہ کے بعد اس کے جانشین بھی انھیں صفات کے حامل ہوتے (فتح خاں اس کے بڑے بیٹے سے

یہ توقع کی جاتی تھی) تو یقیناً سلطنت کا شیرازہ اس قدر جلد منتشر نہ ہو جاتا، لیکن فطرت جس کی بہترین تفریح انقلاب اُمم کا تماشہ ہے ایسی متحمل نہ تھی اور چونکہ اُسے دس سال بعد ہی تاتار کے "ایک مغل زادہ" پر تاج صاحبقرانی رکھ کر سرزمین ہند میں ایک دوسری حکومت (مغلیہ) کے حقوق قایم کرنا تھے، اس لئے فیروز شاہ کے بعد ہی اس نے "سلاطین افاغنہ" (اگر حقیقتاً اسوقت تک کے تمام بادشاہوں کو افغانی النسل کہہ سکتے ہیں) کی تاریخ پر تمت لکھ دینے کا ارادہ کر لیا اور چند کمزور جانشینان فیروز کے مضمحل مناظر پیش کرنے کے بعد آخر کار وہ ورق ہی الٹ دیا

ہندی غلام

یہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ فیروز شاہ کو اپنے غلاموں کے ساتھ بہت شغف تھا اور تمام معاملات میں وہ ان پر حد سے زیادہ اعتبار کرتا تھا۔ ان کی بڑی بڑی جاگیریں مقرر تھیں، ان کے ہاتھوں سلطنت کے بڑے بڑے کام انجام پاتے تھے، تمام محکمے مصافی ہوں یا غیر مصافی انھیں کے سپرد تھے اس لئے دہلی میں بھی وہی ہوا جو بغداد کی قسمت میں لکھا ہوا تھا اور جس طرح بنی عباس کا زوال ترکی غلاموں کے سبب سے رونما ہوا، اسی طرح سلاطین افاغنہ کی حکومت کا انحطاط ہندی غلاموں کی وجہ سے ظہور میں آیا

فیروز شاہ کی مساعی اور ہندو اور مسلم اتحاد

یہ بالکل صحیح ہے کہ فیروز شاہ جب تک زندہ رہا اس کے غلام امراء نے سرتابی نہیں کی، لیکن یہ کیا ضرور تھا کہ وہ اسکے جانشینوں کا بھی وہی احترام ملحوظ رکھتے اور اُن کی کمزوریوں سے فائدہ نہ اُٹھاتے۔ پھر چونکہ یہ غلام اکثر و بیشتر حال ہی کے نومسلم ہندو تھے، اس لئے ان کے فطری جذبات وطن پرستی ابھی مفقود نہ ہوئے تھے اور فیروز شاہ کے بعد ہی انھیں سلطنت دہلی کی طرف سے جو بالکل غیر مذہب اور غیر ملک والوں کے قبضہ میں تھی، کوئی ہمدردی باقی نہ رہی۔ یہ تھا حال اُس نومسلم ہندو طبقہ کا جو تمام شرائین حکومت میں خون کی طرح دوڑ رہا تھا۔ اب دوسری طرف خود ہندو راجاؤں کو دیکھئے کہ ان کا کیا رنگ تھا۔ فیروز شاہ نے جو یقیناً بے تعصب بادشاہ کہلائے جانے کا مستحق ہے، اس کی بہت کوشش کی کہ ہندو مسلمانوں کے درمیان اتحاد قایم ہو جائے چنانچہ اسی غرض سے اس نے خاندان شاہی کے بعض افراد اور چند امراء وارکین کی شادیاں بھی ہندو خاندانوں میں کیں لیکن چونکہ ہندو اپنے مذہب و اخلاق، قومیت و افتاد طبیعت کے لحاظ سے بالکل جدا عنصر ہیں، اس لئے وہ ہمیشہ موقعہ کے منتظر رہے اور اپنی اس خصوصیت کو، کہ جب تک بالکل مجبور نہ ہو جائیں سر اطاعت خم نہ کریں، انھوں نے فیروز شاہ کی مہربانیوں کے زیر اثر بھی فراموش نہیں کیا

فیروز شاہ کے بعد آزادی کی خواہش

جب تک فیروز شاہ زندہ رہا۔ یہ لوگ اُس کے اخلاق سے مرعوب ہو کر خاموش رہے لیکن اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی اُن کے جذبات میں پھر تلاطم پیدا ہو گیا اور تاریخ شاہد ہے کہ اس عہد میں انھوں نے سیاسیات ہند کے اندر کیا انقلاب پیدا کر دیا۔ ایک طرف اگر نومسلم ہندو امراء اپنی بڑی بڑی جاگیروں میں خود مختار حکمراں بنے ہوئے تھے، تو دوسری طرف خالص ہندو طبقہ کے حکمراں افراد بھی اپنی آزادی کے لئے "ناخن و دنداں" کا زور صرف کر رہے تھے

ابوبکر شاہ (۷۹۱-۷۹۲ھ / ۱۳۸۹-۱۳۹۰ء) — تغلق شاہ ثانی (۷۹۰-۷۹۱ھ / ۱۳۸۸-۱۳۸۹ء)

اگر فیروز شاہ کے بعد کوئی قوی عزم کا بادشاہ ہوتا تو اس شورش کو جو آیندہ دس سال کے بعد ایک بڑے زبردست طوفان کی آمد کی خبر دے رہی تھی فرو کر دیتا، لیکن افسوس ہے کہ فیروز کے بعد کوئی اہل شخص تخت نشین نہ ہوا۔ فتح خاں جو فیروز کی تمام تمناؤں کا مرکز تھا، مر گیا تھا۔ دوسرا بیٹا ظفر خاں بھی نہ تھا۔ اس لئے لوگوں نے تغلق شاہ ثانی، فتح خاں کے بیٹے (اور فیروز کے پوتے) کو بادشاہ بنا دیا[۱]

چونکہ یہ ایک بیوقوف نوجوان تھا اور سوائے لہو لعب اور کوئی مشغلہ نہ رکھتا تھا۔ اس لئے امراء اور محل کے غلاموں نے جب کہ اس کی حکومت کو صرف پانچ ماہ اور کچھ دن[۲] کا زمانہ گزرا تھا قتل کر دیا

اس کے بعد ظفر خاں کے بیٹے ابوبکر کو امراء نے تخت نشین کیا[۳]

---

[۱] جس دن فیروز شاہ کا انتقال ہوا اُسی دن فیروز آباد میں تغلق شاہ تخت نشین ہوا اور اپنا لقب غیاث الدین رکھا۔ اُس نے اپنے چچا ناصر الدین محمد شاہ کے خلاف جو فیروز شاہ کی زندگی ہی میں سرمور بھاگ کر چلا گیا تھا، فوج بھیجی۔ وہ سرمور سے نگر کوٹ چلا گیا اور فوج واپس چلی آئی۔ اُس نے اپنے حقیقی بھائی سالار شاہ کو مقید کر دیا اور بہت سی بدعتیں شروع کیں۔ ابوبکر شاہ (ظفر خاں کے بیٹے) نے امراء اور غلاموں کو ملا کر محل پر یورش کی اور ملک مبارک کو قتل کر دیا۔ جب اس کی خبر تغلق شاہ کو معلوم ہوئی تو وہ معہ اپنے وزیر (خان جہاں) کے جمنا کی طرف نکل کر بھاگا۔ مگر باغیوں نے ان دونوں کو پکڑ لیا اور قتل کر ڈالا۔ یہ واقعہ ۲۱ صفر ۷۹۱ھ = ۱۹ فروری ۱۳۸۹ء کا ہے

[۲] بروایت مبارک شاہی ۶ ماہ اٹھارہ دن حکومت کی لیکن یہ صحیح نہیں ہے

[۳] جب غیاث الدین قتل ہو گیا تو امراء و ملوک نے ابوبکر شاہ کو تخت نشین کر دیا چونکہ ابوبکر، رکن الملک نایب وزیر کی وجہ سے بادشاہ ہوا تھا اس لئے اس نے سارا انتظام اُسی کے سپرد کر دیا۔ اس کے بعد ہی رکن الملک کے دل میں اور زیادہ تمنائیں پیدا ہوئیں اور خود بادشاہ بن جانے یا کسی خاص اپنے آدمی کو فرمانروا بنانے کے خیال سے ابوبکر کی ہلاکت چاہنے لگا۔ جب غلاموں کو یہ خبر معلوم ہوئی تو انھوں نے رکن الملک اور اس کے بہت سے ساتھیوں کو قتل کر دیا، اسی زمانہ میں سلطان شاہ کو "جو ابوبکر شاہ کی طرف سے سامانہ کا گورنر تھا" وہاں کے امراء نے قتل کر ڈالا۔ اس واقعہ سے ناصر الدین محمد کو جرأت ہوئی اور وہ قلعۂ نگر کوٹ سے جالندھر ہوتا ہوا سامانہ گیا اور یہاں اپنے مراسم تخت نشینی ادا کر کے دہلی کی طرف بڑھا اور ۲۵ ربیع الآخر ۷۹۱ھ۔ (۲۳ اپریل ۱۳۸۹ء) کو اپنی پچاس ہزار جمعیت لئے ہوئے کوشک جہاں نما تک آیا جسے کوشک شکار بھی کہتے ہیں اور اب وہ فیروز شاہ کے کوٹلہ کے نام سے مشہور ہے) صف آرائی شروع کر دی ابوبکر شاہ اسوقت فیروز آباد میں تھا۔ ۲ جمادی الاول کو جنگ شروع ہوئی۔ اتفاق سے اسی دن ناہر میواتی اپنی فوج لئے ہوئے ابوبکر کی مدد کو آ گیا اور ناصر الدین محمد شاہ کو شکست ہوئی اور دوآبہ چلا گیا اس نے پھر موضع جالیسر میں ساحل گنگ پر قیام کر کے اپنے بیٹے ہمایوں کو سامانہ بھیجکر کمک طلب کی اور شعبان کے مہینہ میں دوبارہ دہلی پر حملہ کیا اور موضع کندالی کے پاس لڑائی ہوئی۔ محمد شاہ کو پھر شکست ہوئی اور بہت سا مال، خیمہ و خرگاہ ابوبکر کے ہاتھ آیا محمد شاہ پھر بھاگ کر جالیسر چلا گیا

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۳۶ پر ملاحظہ فرمایئے)

محمد شاہ (۷۹۲ھ)

مگر چونکہ اس کا چچا ناصر الدین محمد جسے فیروز شاہ کے عہد میں غلاموں نے نکال دیا تھا، پنجاب میں سامانہ سے نگر کوٹ تک اپنا کافی اقتدار پیدا کر چکا تھا، اس لئے وہ دہلی کی طرف بڑھا اور کئی بار شکست کھانے کے بعد ۷۹۲ھ/۱۳۹۰ء میں تخت دہلی پر قابض ہو گیا۔ ہر چند یہ چار سال تک حکمراں رہا لیکن اس کے زمانہ حکومت میں ہر جگہ ہندوؤں نے بغاوت شروع کر دی اور جو کچھ اقتدار سلطنتِ دہلی کا باقی تھا وہ بھی مٹ گیا[1]

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۳۵)

اس کے بعد محرم ۷۹۲ھ (جنوری ۱۳۹۰ء) میں شاہزادہ ہمایوں خاں (محمد شاہ کے بیٹے) نے سامانہ کے ملوک و امراء کو جمع کر کے نواح دہلی کو لوٹنا شروع کیا۔ ابوبکر شاہ نے بھی اپنی فوج روانہ کی اور پانی پت کے قریب موضع بسینہ میں جنگ شروع ہوئی۔ اس کا نتیجہ بھی محمد شاہ کے خلاف ہوا اور ابوبکر کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ محمد شاہ اپنی متواتر ناکامیوں سے مایوس ہو گیا تھا اور غالباً وہ اب قسمت آزمائی نہ کرتا، لیکن ابوبکر شاہ نے جمادی الاول کے مہینہ میں خود ہی جلیسر کی طرف پیش قدمی کر کے محمد شاہ کو بالکل نیست و نابود کر دینا چاہا، چنانچہ جب وہ ۲۰ کوس دہلی سے دور ہو گیا تو محمد شاہ چار ہزار فوج لیکر دوسرے راستہ سے دہلی میں داخل ہو گیا۔ جب ابوبکر شاہ کو یہ خبر معلوم ہوئی تو وہ پھر اپنا لشکر لے کر دہلی واپس آیا اور سلطان محمد پھر بھاگ کر جلیسر چلا گیا۔ رمضان میں مبشر حاجب، جو غلامانِ فیروز شاہی میں بہت با اقتدار شخص تھا، ابوبکر سے منحرف ہو گیا اور فیروز آباد میں خاص شورش پیدا ہو گئی۔ چونکہ ابوبکر کے پاس اس کا کوئی علاج نہ تھا اس لئے وہ بہادر ناہر کے کوٹلہ چلا گیا۔ ۱۷ رمضان کو مبشر حاجب اور دیگر امراء نے سلطان محمد کو اطلاع دی اور ۱۹ رمضان ۷۹۲ھ کو وہ جلیسر سے چلکر دہلی پہونچ گیا اور تاج سلطانی سر پر رکھ کر مبشر حاجب کو اسلام خاں کا خطاب دیا۔ چند روز بعد سلطان محمد نے جب اپنا قبضہ مکمل کر لیا، تو غلامانِ فیروز شاہی کو شہر بدر کر دیا جو پھر ابوبکر سے آکر مل گئے۔ ابوبکر نے اس جمعیت سے فائدہ اُٹھا کر پھر محرم ۷۹۳ھ میں اپنا تخت واپس لینے کی کوشش کی لیکن اسلام خاں کی فوج نے اُسے سخت شکست دی۔ ابوبکر اور بہادر ناہر گرفتار ہو کر سلطان محمد کے پاس آئے۔ بہادر ناہر کا قصور معاف کیا گیا اور ابوبکر قلعۂ میرٹھ میں قید کر دیا گیا اور چند دن بعد وہ یہیں مر گیا۔ ابوبکر کی سلطنت ڈیڑھ سال رہی

[1] ۷۹۴ھ/۱۳۹۲ء میں ناہر سنگھ، سردار ہرن سنگھ اور بیر بھان نے بغاوت اختیار کی۔ ناہر سنگھ کی سرزنش اسلام خاں کی فوج نے کی، سردار ہرن کی سرکوبی کے لئے سلطان محمد خود آیا اور وہ قلعۂ اٹاوہ میں محصور ہو گیا۔ بادشاہ یہاں پہونچا تو باغی سردار بھاگ گیا۔ بادشاہ نے دوسرے دن قلعہ اٹاوہ کو مسمار کر دیا اور وہاں سے قنوج اور دلمئو کے باغیوں کی سرکوبی کرتا ہوا جلیسر واپس آیا اور یہاں ایک قلعہ محمد آباد کے نام سے تعمیر کرایا

رجب ۷۹۶ھ میں خواجہ جہاں نے جو بادشاہ کا خاص آدمی تھا اسے اطلاع دی کہ اسلام خاں باغی ہو کر لاہور و ملتان جانا چاہتا ہے۔ بادشاہ یہ سنکر فوراً جلیسر سے دہلی آیا اور اُسے قتل کرا دیا۔ ۷۹۵ھ/۱۳۹۳ء میں سلطان کو معلوم ہوا کہ سردار ہرن، اجیت سنگھ راٹھور، بیر بھان (بھوگاؤں کے مقدم) اور ابھے چند (چاندو کے مقدم) نے سرکشی اختیار کی ہے۔ سلطان نے ملک مقرب الملک کو مقابلہ کے لئے روانہ کیا۔ اس نے مکر سے کام لیکر ان کو مطیع کر لیا اور قنوج لیجا کر قتل کر دیا صرف سردار ہرن بچ کر اٹاوہ چلا گیا۔ اسی سال بادشاہ نے میوات کو تاراج کیا اور جا لیسر میں بیمار ہو گیا۔ اسی بیماری کی حالت میں اسے خبر معلوم ہوئی کہ دہلی کے نواح میں بہادر ناہر نے لوٹ مار شروع کر دی ہے۔ باوجود ضعف و نقاہت کے وہ میوات آیا اور بہادر ناہر بھاگ گیا اس کے بعد سلطان محمد، محمد آباد واپس آیا کہ اپنی ناتمام عمارت کو پورا کرے۔ ربیع الاول ۷۹۶ھ میں اس نے اپنے بیٹے ہمایوں کو شیخا کھوکھر کے مقابلہ میں جانے کا حکم دیا جس نے لاہور میں بغاوت شروع کر دی تھی۔ لیکن وہ ابھی روانہ نہ ہوا تھا کہ ۱۷ ربیع الاول ۷۹۶ھ ۱۵ جنوری ۱۳۹۴ء کو سلطان محمد کا انتقال ہو گیا

سلطان محمد کے بعد اس کا بیٹا ہمایوں[1] (سکندر شاہ کا لقب اختیار کرکے) تخت نشین ہوا اور ڈیڑھ مہینہ کے بعد وہ بھی مرگیا۔ اس کے بعد ہمایوں کا بھائی محمود[2] ۱۸ سال تک حکمراں رہا لیکن اس شان سے کہ تخت سلطنت کبھی قنوج میں

---

[1] سلطان ناصر الدین محمد کی وفات پر ہمایوں اس کا بیٹا تین دن رسم تعزیت ختم کرنے کے بعد سکندر شاہ کا لقب اختیار کرکے تخت نشین ہوا (۱۹ ربیع الاول ۷۹۶ھ) لیکن ۱۵ جمادی الاول کو بیمار پڑا اور ایک ماہ ۱۶ دن حکومت کرکے مرگیا

[2] ۲۰ جمادی الاول ۷۹۶ھ کو محمود شاہ (محمد شاہ کا چھوٹا بیٹا اور ہمایوں کا بھائی) باتفاق امراء بادشاہ ہوا اور ناصر الدین کا لقب اختیار کیا چونکہ اب سلطنت دہلی کا اقتدار بالکل ختم ہوگیا تھا، اسی لئے چاروں طرف بغاوت شروع ہوگئی۔ انھیں باغیوں میں خواجہ جہاں وزیر بھی تھا جس نے جونپور میں شرقی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ ۷۹۷ھ میں سعادت خاں (باربک) نے نصرت شاہ (فتح خاں کے بیٹے اور سلطان فیروز شاہ کے پوتے) کو دعویدار سلطنت بنا کر کھڑا کیا اور فیروز آباد پر قبضہ حاصل کرلیا۔ اس وقت دہلی کہنہ میں مقرب خاں کا قبضہ تھا قلعہ سیری میں ملّو اقبال خاں کی حکومت تھی اور جہاں پناہ پر محمود شاہ کا تصرف تھا علاوہ اس کے تمام نواح دہلی، پنجاب، دوآبہ، وغیرہ میں بغاوتیں برپا تھیں اور ہر امیر اپنی جگہ خود مختار فرمانروا بنا ہوا تھا۔ آپس میں لڑائیاں جاری تھیں، طوائف الملوکی کی بدامنی ہر جگہ نظر آرہی تھی۔ اور محمود شاہ کی سلطنت عبارت تھی صرف سنبھل، پانی پت، جھجر، رہتک اور دوآبہ (یعنی دہلی کے جنوب و مشرقی حصہ) سے اس حالت پر تین سال گزر چکے تھے کہ اقبال خاں نے نصرت شاہ کا ساتھ چھوڑ کر محمود شاہ پر اپنا اقتدار قایم کرلیا اور گویا اس کے نام سے خود ہی حکمراں بن گیا۔ الغرض یہ بدامنی اسی طرح قایم تھی کہ امیر تیمور گورگانی نے ۸۰۱ھ میں حملہ کرکے دہلی میں خون کا دریا بہا دیا۔ جب امیر تیمور واپس گیا تو سلطنت دہلی کی تقسیم اس طرح ہوگئی تھی:۔

دہلی اور دوآبہ	اقبال خاں کے قبضہ میں تھا
گجرات	ظفر خاں 〃
ملتان، دیپال پور اور ساحت سندھ	خضر خاں 〃
مہوبا، کالپی	محمود خاں 〃
قنوج، اودھ، کڑا، دلمئو، سندیلہ، بہرائچ، بہار، اور جونپور،	خواجہ جہاں 〃
دہار	دلاور خاں 〃
سمانہ	غالب خاں 〃
بیانہ	شمس خاں 〃

(تاریخ مبارک شاہی)

تھا کبھی دہلی میں[1]

اور دہلی کا بھی یہ حال تھا کہ ادھر محمود اپنے کو بادشاہ کہتا تھا، اُدھر فیروز آباد میں نصرت شاہ، فتح خاں کا بیٹا حکمرانی کر رہا تھا۔ اس طرح گویا دہلی کے تخت پر دو بادشاہ قابض تھے اور ملک میں حد درجہ بدامنی پھیل رہی تھی۔ الغرض یہ تھا ہندوستان کی سلطنت کا حال جب امیر تیمور صاحبقران نے ۹۲ ہزار سواروں کی جمعیت سے دہلی پر حملہ کیا تیمور کے حملہ کا مفصل حال ظفرنامہ[2]

---

[1] دہلی پر نصرت شاہ نے عارضی قبضہ کر لیا تھا لیکن اقبال خاں نے پھر اسے محروم کر دیا اور آہستہ آہستہ حدودِ سلطنت کو وسیع کرنے لگا۔ ۸۰۴ھ میں محمود شاہ (جو دہلی کی تباہی کے وقت گجرات بھاگ گیا تھا) اقبال خاں کے ساتھ مل گیا۔ ان دونوں نے مل کر ابراہیم شاہ شرقی کے خلاف (جو اپنے بھائی مبارک کے بعد جونپور کے تخت کا مالک ہوا تھا) فوج کشی کی لیکن محمود شاہ، اقبال خاں سے علٰحدہ ہو کر ابراہیم شاہ سے مل گیا اور آخر کار وہ قنوج کا مقامی حکمراں بننے میں کامیاب ہو سکا۔ اسی اثنا میں اقبال خاں اور خضر خاں گورنر ملتان کے درمیان جنگ شروع ہو گئی۔ اس لڑائی میں اقبال خاں مارا گیا (جمادی الاول ۸۰۸ھ) اور دولت خاں لودی اور دیگر ذی اثر امراء نے پھر محمود شاہ کو دہلی بلایا لیکن وہ نہیں آیا اور اس نے ان گورنروں کو باہم دست و گریباں ہونے کے لئے آزاد چھوڑ دیا محمود شاہ رجب ۸۱۵ھ میں انتقال کر گیا

محمود شاہ کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ فرشتہ محمود کی تاریخ وفات ذی قعدہ ۸۱۴ھ، اور دولت خاں لودی کی عنانِ سلطنت ہاتھ میں لینے کی تاریخ یکم محرم ۸۱۶ھ بیان کرتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ظاہر کیا جاتا ہے کہ چودہ مہینے تک تخت دہلی پر کوئی حکمراں نہیں رہا اس لئے ان تاریخوں کا غلط ہونا یقینی ہے۔ مبارک شاہی کا مصنف، جو تاریخوں کے بیان کرنے میں زیادہ اہتمام کرتا ہے۔ محمود کی تاریخ وفات رجب ۸۱۵ھ ظاہر کرتا ہے اور یہی صحیح ہے

اسی مورخ کی روایت ہے کہ محمود شاہ کی سلطنت "بااینہمہ تزلزل و انقلاب بست سال و دو ماہ بود"

ہم بیان کر چکے ہیں کہ ربیع الاول ۷۹۷ھ سے نصرت شاہ فیروز آباد میں تین سال تک حکمراں رہا اور امیر تیمور کے بعد بھی عارضی قبضہ اس کا تخت دہلی پر ہو گیا لیکن اس کے بعد جب اقبال خاں نے اس کو معزول کر دیا، تو پھر اس کے بعد (۸۰۲ھ سے) اس کا پتہ نہیں چلا اور مورخین نے اس کا کوئی حال نہیں بیان کیا۔

[2] مصنف ظفرنامہ کا نام مولانا شرف الدین علی یزدی تھا جن کا انتقال ۸۵۰ھ/۱۴۴۶ء میں ہوا۔ ظفرنامہ میں بالکل تیمور کے حالات درج ہیں اور میر خوند کے نزدیک اس کا شمار بہترین تاریخوں میں ہے۔ یہ کتاب ۸۲۷ھ/۱۴۲۴ء میں لکھی گئی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ملفوظات تیموری سے اس کے ترتیب میں اس قدر کافی مدد لی گئی ہے کہ اگر ہم کہنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ظفرنامہ صرف ملفوظات تیموری کی دوسری صورت ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ یورپ کی اکثر زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اس کا قلمی نسخہ میرے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے۔

ملفوظات تیموری[1] اور مطلع السعدین[2] میں درج ہے۔ لیکن ہم یہاں صرف اس کا ایک خاکہ پیش کریں گے، کیونکہ تیمور[3] کا شمار ہندوستان کے بادشاہوں میں نہیں ہے اور اس لئے اس کے حالات سے جداگانہ بحث کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے

---

[1] ملفوظات تیموری کو تزک تیموری بھی کہتے ہیں اور اس کا مصنف خود تیمور ہے یہ کتاب چغتائی ترکی زبان میں تھی جسے ابو طالب حسینی نے فارسی میں ترجمہ کرکے شاہ جہاں کے نام سے منسوب کیا ہے۔ ترجمے کے مختصر مقدمہ میں ابو طالب نے صرف اس قدر بیان کیا ہے کہ اصل کتاب جو ترکی زبان میں تھی جعفر حاکم یمن کے کتاب خانہ سے دستیاب ہوئی تھی۔ اس میں تیمور کے حالات (سات برس کی عمر سے ۷۴ سال کی عمر تک کے) درج ہیں۔ چونکہ ابو طالب نے اس سے زیادہ کوئی تصدیق اس امر کی نہیں کی کہ اس کا اصل مصنف کون تھا اور علاوہ اس کے ایک ترکی زبان کے نسخہ کا یمن کے کتاب خانہ میں پایا جانا بظاہر اک عجیب بات معلوم ہوتی ہے، اس لئے بعض نے شبہ کیا ہے اور یہ خیال کرتے ہیں کہ ابو طالب نے یہ صرف اس لئے لکھدیا ہے کہ اس کی تصنیف زیادہ باوقعت ہو جائے

میجر ڈیوی جس نے اول بار اس کتاب کی طرف توجہ دلائی۔ اس شبہ کے خلاف ہے کیونکہ کتاب کی ترتیب خود اس بات کی شاہد ہے کہ تیمور اس کا مصنف ہے علاوہ اس کے یہ فطرت کے خلاف ہے کہ ایک شخص اپنی تصنیف کو دوسرے کے نام سے منسوب کرکے اپنی عزت و شہرت کو نقصان پہونچائے۔ اگر خود ابو طالب اسکا مصنف ہوتا تو وہ دوسرے کی طرف کیوں منسوب کرتا

بہرحال یہ شبہ کرنا کہ تیمور اس کا مصنف نہ تھا بالکل لغویات ہے۔ کیونکہ خاندان تیموریہ کے تمام افراد میں اپنے حالات لکھنے کا فطری ذوق پایا جاتا تھا۔ بابر اور جہانگیر نے بھی خود اپنے حالات لکھے ہیں، اور اس خاندان میں اگر کسی نے ایسا نہیں کیا تو دوسروں سے یہ خدمت لی ہے۔ بہرحال تاریخ کی طرف اس خاندان کو خاص توجہ تھی اور غالبًا یہ کافی شہادت اس امر کی ہے کہ ملفوظات تیموری یا تزک تیموری خود تیمور ہی کے دماغ کا نتیجہ ہے

ظفر نامہ، تیمور کے صرف تیس سال بعد مرتب ہوا ہے اور اس میں صراحت کے ساتھ یہ واقعہ درج ہے کہ تمام امراء و ارکین دربار کو تیمور نے سخت تاکید کی تھی کہ وہ روز کے واقعات کو صحیح درج کرتے رہیں خواہ وہ کسی معاملات سے متعلق ہوں (یہاں تک کہ اس میں خود تیمور کی ذات بھی شامل تھی)، چنانچہ تیمور کے سامنے مسودات پیش ہوتے تھے اور جرح اور تعدیل کے بعد وہ فضلاء عصر کو دئے جاتے تھے تاکہ عمدہ زبان (نظم و نثر) میں وہ منتقل کئے جائیں ۔ جب ظفر نامہ کی طیاری کا حکم سلطان ابراہیم (تیمور کے پوتے) نے دیا ہے تو اس کے لئے خاص اہتمام کیا گیا ملک میں جہاں کہیں تیمور کے حالات کی کتابیں تھیں فراہم کی گئیں۔ بہت سے معاون، شرف الدین یزدی (مصنف ظفر نامہ) کو دئے گئے۔ سلطان ابراہیم خود مسودات کو دیکھتا اور نقایص دور کرتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ظفر نامہ کا ماخذ تمام تر وہ تصانیف ہیں جو اس سے قبل (یعنی عہد تیموری) میں مرتب ہو چکی تھیں اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ظفر نامہ میں اکثر جگہ تزک تیموری کی عبارت نقل کر دی گئی ہے تو پھر یہ یقین کرنے کے لئے کہ تزک تیموری، تیمور ہی کے عہد میں لکھی گئی کوئی شبہ باقی نہیں رہجاتا۔ تزک تیموری کا دوسرا ترجمہ فارسی زبان میں محمد افضل بخاری نے کیا تھا۔ یہ عہد شاہجہاں کا ایک فاضل شخص تھا اور بادشاہ کے حکم سے اس نے ابو طالب کے ترجمۂ تزک تیموری پر نظر ثانی کرکے جہاں جہاں کوئی غلطی یا سقم رہ گیا تھا اُسے دور کیا

(بقیہ فٹ نوٹ نمبر ۲ و ۳ صفحہ ۲۴۰ پر ملاحظہ ہو)

تیمور ہندوستان آنے سے قبل تمام عراق و فارس، افغانستان و ایشیائے کوچک کو زیر نگیں کر چکا تھا اس لئے ضروری تھا کہ وہ کسی نہ کسی وقت اس طرف بھی متوجہ ہو، چنانچہ اس نے اپنے فوجی مشیروں کے سامنے ہندوستان کے

(بقیہ فٹ نوٹ نمبر ۲ و ۳ صفحہ ۲۳۹)

سے۵۲ اس کتاب کا پورا نام مطلع السعدین و مجمع البحرین ہے اسکا مصنف کمال الدین، عبدالرزاق بن جلال الدین اسحاق السمرقندی تھا۔ بروایت حبیب السیر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۲ شعبان ۸۱۶ھ (۶ نومبر ۱۴۱۳ء) کو ہرات میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ اسحاق، سلطان شاہ رخ (امیر تیمور کا بیٹا) کے دربار سے متعلق تھا اور عہدۂ قضا و امامت اس کے سپرد تھا۔ عبدالرزاق نے اپنے باپ کی وفات پر عضید الدین یحییٰ کے ایک رسالۂ علم صرف کی شرح لکھ کر حضور میں پیش کی اور یہ اس کے لئے پہلا موقع تھا کہ سلطان شاہ رخ کے دربار میں حاضر ہوا — معلوم ہوتا ہے کہ عبدالرزاق کا تعلق دربار کے ساتھ اسی وقت سے ہو گیا تھا۔ کیونکہ بعد کو جب شاہ رخ نے شاہ بیجا پور کے پاس سفارت بھیجی تو عبدالرزاق ہی کو اس سفر میں بہت تکالیف اٹھانی پڑیں لیکن آخر کار وہ خراسان واپس پہونچا۔ (سفارتِ ہند کا حال حبیب السیر اور روضۃ الصفا میں درج نہیں ہے۔ اس کا ذکر مطلع السعدین کے اس اقتباس میں کیا گیا ہے جسے غالباً مسٹر اولڈ فیلڈ نے شایع کیا تھا۔) سلطان شاہ رخ کی وفات پر وہ عبداللطیف، مرزا عبداللہ اور مرزا عبدالقاسم کی حضوری میں بھی باریاب رہا۔ اور آخر کار ۲ رکم جمادی الاول ۸۶۷ھ (اکتوبر ۱۴۶۲ء) کو سلطان ابو سعید کے عہد میں خانقاہ مرزا شاہ رخ کا مہتمم بنا دیا گیا۔ یہ خدمت اس نے دس سال تک انجام دی اور جمادی الثانی ۸۸۷ھ اگست ۱۴۸۲ء میں انتقال کر گیا۔ صاحب حبیب السیر نے سنہ وفات ۸۸۶ھ تحریر کیا ہے اور حاجی خلیفہ نے وہی ۸۸۷ھ اس کی متعدد تصانیف ہیں "مطلع السعدین" بہترین اور بہت مشہور کتاب ہے اس میں سلطان ابوسعید بہادر خاں کے عہد سے مرزا سلطان ابو سعید گرگان کے قتل تک کے مفصل حالات درج ہیں — مسٹر مارے نے (رایل ایشیاٹک سوسائٹی کی فہرست نسخہ جات قلمی میں) یہ بھی تحریر کیا ہے کہ عبدالرزاق، بہ حیثیت سفیر گیلان بھی بھیجا گیا تھا، لیکن وہ ابھی اس خدمت سے فارغ بھی نہ ہوا تھا کہ مصر کی روانگی کا حکم ہوا لیکن اپنے آقا کی وفات کی وجہ سے وہ نہ جا سکا — ۸۵۶ھ / ۱۴۵۲ء میں جب سلطان ابوالقاسم بابر یزد سے گزرتے ہوئے مشہور مورخ شرف الدین علی یزدی (مصنف ظفر نامہ) سے ملا ہے تو اس وقت عبدالرزاق بھی موجود تھا۔ اس کے دو سال بعد وہ سلطان ابوسعید کی ملازمت میں آگیا۔ اور اسکی نہایت عزت کی گئی — جب ۸۶۳ھ میں سلطان حسین بہادر نے جرجان کی طرف پیش قدمی کی۔ تو عبدالرزاق نے بھی، جو پہلے ہی اس طرف بھیجدیا گیا تھا، اس جنگ کے اکثر واقعات کا مشاہدہ کیا — ہندوستان میں مطلع السعدین کا نسخہ بہت کمیاب ہے۔ لیکن یوروپ میں اکثر لوگ اس سے واقف ہیں۔ ایسٹ انڈیا آفس کے کتاب خانہ میں بھی اس کا قلمی نسخہ موجود ہے۔ رایل ایشیاٹک سوسائٹی کے کتاب خانہ میں بھی اس کا ایک نسخہ تھا (جو اب کھو گیا ہے) اس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ خود مصنف کا قلمی تھا۔ یوروپ کی مختلف لائبریریوں میں اس کتاب کے قلمی نسخے موجود ہیں — اس کتاب کی دو جلدیں ہیں۔ پہلی جلد میں تیمور کے مفصل حالات درج ہیں اور دوسری جلد میں اولادِ تیمور کی تاریخ (سلطان حسین مرزا کے وقت تک) درج کی گئی ہے پہلی جلد اسکی بہت کمیاب ہے — سے۵۳ تیمور کا سلسلۂ نسب چنگیز خاں کے خاندان سے ملتا ہے۔ تیمور کا مورث اعلیٰ چنگیز کے بیٹے چغتائی کا وزیر بھی تھا تیمور ۷۳۶ھ / ۱۳۳۵ء میں پیدا ہوا تو غالباً تیمور، خانِ فارس کے عہد میں کش کا گورنر مقرر رہا — (بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۴۱ پر ملاحظہ ہو)

مسئلہ کو بھی پیش کیا ان سب سے بعض نے کہا کہ پانچ دریاؤں کا عبور کرنا، گھنے جنگلوں سے گزرنا، بڑے بڑے راجاؤں کی خونخوار افواج (جو جنگلوں میں وحشی درندوں کی طرح چھپی ہوئی ہے) سے عہدہ برآ ہونا، آہن پوش ہاتھیوں کو شکست دینا، ایسا آسان کام نہیں ہے[1]۔ بعض نے محمود غزنوی کی مثال پیش کی کہ اس نے صرف تیس ہزار سواروں کی مدد سے ہندوستان کو فتح کر لیا تھا اور ہمارے پاس تو ایک لاکھ جرار فوج موجود ہے اس کے ساتھ شاہزادہ شاہ رخ (تیمور کے بیٹے) نے بھی ہندوستان کی دولت اور یہاں کے کفر و بت پرستی کا ذکر کر کے جہاد پر آمادہ کیا۔ مخالفین نے پھر ایک دلیل پیش کی کہ " اگر وہاں کامیابی ہو بھی گئی ہو تو ہمارے نسل کے لوگ جو وہاں حکمراں ہوں گے ان میں بعد کو یقیناً اختلاط پیدا ہو جائے گا اور وہاں کی آب و ہوا ان کو آرام طلب، عیش پسند اور غیر جنگجو بنا دے گی[2]۔ اس پر تیمور نے کہا کہ میرا مقصد قیام کرنا نہیں ہے[3]

ملتان کا محاصرہ

اس سے قبل پیر محمد جہانگیر (تیمور کا پوتا جو کابل کا گورنر تھا تمام حدود افغانستان کو زیر کر کے ہندوستان کے اندر پہونچ چکا تھا اور دریائے سندھ کو عبور کر کے ملتان کا محاصرہ کئے ہوئے تھا[4]

تیموری دور کا ہندوستان

اتفاق سے اسوقت جبکہ تیمور حملۂ ہندوستان کی طیاریاں کر رہا تھا۔ پیر محمد کی تحریر پہونچی جس میں سلطنتِ دہلی کی بدنظمی طوائف الملوکی وغیرہ کا مفصل حال درج تھا

اس تحریر کو دیکھتے ہی تیمور نے رجب ۸۰۰ھ (مارچ ۱۳۹۸ء) میں اپنے دار السلطنت سمرقند سے ہندوستان کی طرف کوچ کر دیا[5]

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۴۰)

پھر چغتائی خاں سیورغتمش کا وزیر ہو گیا اور ۷۷۱ھ/۱۳۶۹ء سے قبل سارے اختیارات خود حاصل کر لئے (اگرچہ چغتائی خاں اور اسکے جانشین محمود کا ۷۹۰ھ/۱۳۸۸ء تک برائے نام کچھ اثر باقی رہا)۔ ۷۸۲ھ/۱۳۸۰ء میں تیمور نے اپنے فتوحات کا سلسلہ شروع کیا اور سات برس کے اندر ہی اندر خراسان، جرجان، مازندران، سجستان، افغانستان، فارس، آذربیجان اور کردستان پر قبضہ کر لیا۔ اس دوران میں توقتامش نے اس کے سلطنت میں بڑھنا شروع کیا لیکن تیمور نے ایک بار ۷۹۳ھ/۱۳۹۱ء میں اور پھر ۷۹۷ھ/۱۳۹۵ء میں اسے شکست دی۔ اسی اثنا میں وہ بغداد اور عراق پر بھی قابض ہو چکا تھا۔ اس کے چار سال بعد وہ شمالی ہند کی طرف متوجہ ہوا اور ۸۰۱ھ میں کشمیر و دہلی کو غارت کر کے مغرب کی طرف بڑھ گیا ۸۰۳ھ/۱۴۰۰ء میں اس نے اناطولیا پر حملہ کر کے سیواس اور ملیشیا لے لیا۔ ۸۰۳ھ میں شام، حلب اور دمشق پر اسکا قبضہ ہو جانے سے مملوک سلطان مصر نے اس کی اطاعت اختیار کر لی ۸۰۴ھ/۱۴۰۲ء میں بمقام انگورا، عثمانی ترکوں کو شکست دیکر سلطان بایزید کو مقید کر لیا۔ اس کے بعد وہ چین کی طرف متوجہ ہوا۔ لیکن ۸۰۷ھ/۱۴۰۵ء میں بمقام اترار جب کہ اس کی عمر ستر سال کی تھی انتقال کر گیا

[1] تزک تیموری (الیٹ) ۳ = ۳۹۵ — [2] چنانچہ دو صدی بعد زمانہ نے ثابت کر دیا کہ یہ پیشین گوئی کیسی صحیح تھی — [3] تزک تیموری (الیٹ) ۳۹۶-۳

[4] اس وقت ملتان میں سارنگ، اقبال ملو خاں کا بھائی حکمراں تھا — [5] ظفر نامہ۔ (الیٹ) ۔ ۶ ۔ ۴۸۰

اور ۸ محرم کو سرحد کی سنگلاخ زمینوں، کوہستانوں کی چوٹیوں اور وادیوں کو طے کرتا ہوا اس دریائے سندھ پر پہونچ گیا جسے جلال الدین خوارزم نے چنگیز خاں تیمور کے مورث اعلیٰ کے تعاقب سے خوف زدہ ہو کر عبور کیا تھا۔ یہاں پہونچ کر اسنے کشتیوں کا ایک پل دو دن کے اندر طیار کرایا اور ۱۲ محرم کو دریا سے عبور کر کے اپنے پوتے پیر محمد سے مل گیا۔ جس نے اب ملتان پر قبضہ کر لیا تھا

پنجاب کی حالت اسوقت یہ تھی کہ تیموری حملہ کی داستانیں عام ہو گئیں تھیں اور دیپل پور کے لوگ بھاگ کر بھٹنیر کے قلعہ میں پناہ لے رہے تھے تیمور بھٹنیر پہونچا اور وہاں قتل عام کر کے آگے بڑھا اب فتح آباد بھی ویران تھا۔ سرستی کے لوگ بھی شہر چھوڑ کر جنگلوں میں چلے گئے تھے اور تیمور جس طرف سے گزرتا تھا نصرت و کامیابی اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ آخر کار ۴ ربیع الاول کو پانی پت کے مشہور میدان میں پہونچ گیا۔ یہاں کوئی اس کا مقابل نہ تھا۔ اس لئے وہ آگے بڑھا اور ۷ ربیع الثانی کو دہلی پہونچ گیا جہاں محمود شاہ کی فوج اس کے مقابلہ کے لئے آمادہ تھی

امیر تیمور نے اپنی فوج اس طرح مرتب کی کہ پیر محمد اور امیر یادگار وغیرہ کو میمنہ سپرد کیا۔ سلطان حسین اور خلیل سلطان وغیرہ کو میسرہ میں رکھا اور خود قلب میں رہا

محمود شاہ کی فوج میں بارہ ہزار سوار اور چالیس ہزار پیادہ تھے علاوہ اس کے ۱۲۰ ہاتھی بھی تھے جو بالکل آہن پوش تھے اور اُن کے دانتوں میں زہریلی کٹاریں لگی ہوئی تھیں اور ان کے اوپر ہودوں میں تیر انداز اور آتش باز بیٹھے تھے۔

تیمور جب فوج کی ترتیب سے فارغ ہو گیا تو اُس نے ایک بلندی پر چڑھ کر فوج کے مواقع دیکھ کر اپنی فتح کے لئے دعا مانگی اور پھر حملہ کا حکم دیا۔ تیمور کی میمنہ نے ہندی فوج کی میسرہ پر تیروں کی بارش شروع کی اور اُسے پیچھے ہٹا دیا۔ اسی طرح ترکوں کے میسرہ نے دہلی فوج کے میمنہ کو پسپا کر دیا۔ قلب میں چونکہ اقبال خاں اور خود محمود شاہ موجود تھے اسی لئے اس حصہ نے تھوڑی دیر سخت مقابلہ کیا مگر اُسے بھی شکست ہوئی اور یہ دونوں بھاگ کر شہر میں داخل ہوئے اور وہاں سے بھی رات کو چھپ کر پہاڑوں میں چھپ گئے

۸ ربیع الثانی کو فتح کے بعد تیمور نے حوضِ خاص پر اپنا خیمہ نصب کیا۔ تمام امراء و اراکین حاضر ہو کر قدمبوس ہوئے اور علماء و فضلاء بھی آئے جن کی خواہش کے مطابق اس نے قتل عام کا حکم نہیں دیا اور زر فدیہ لے کر سب کو امان دینے کا وعدہ کر لیا۔ دہلی کی جامع مسجد میں امیر تیمور کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور جشن فتح مندی شروع ہو گیا

ایک ہفتہ بعد ۱۶ ربیع الثانی کو زرِ فدیہ کی وصولی میں تیمور کے سپاہیوں کی طرف سے کچھ سختی ہوئی تو اس پر لوگوں میں کچھ ہنگامہ ہوا۔ حتے کہ تیموری فوج جو پہلے ہی سے غارت گری کے لئے کوئی بہانہ تلاش کر رہی تھی برہم ہو کر لوٹ مار پر آمادہ ہو گئی۔ تیمور نے بہت کوشش کی کہ خونریزی نہ ہو لیکن وہ اپنی فوج کے بڑھے ہوئے جوش کو نہ روک سکا، اور پھر مسلسل ۱۹ ربیع الثانی تک سوائے اُن مقامات کے جہاں علماء و فقہاء وغیرہ رہتے تھے۔

پنجاب کی حالت

تیمور کا دہلی پر حملہ

تیمور و محمود کی فوجی قوت

جنگ دہلی

قتل و غارت

مصحفی نمبر طیار ہے، مفصل اشتہار صفحہ ۶۲ پر ملاحظہ ہو

ہندوستان کا اندر سالانہ چندہ پانچ روپے ششماہی تین روپے
ہندوستان سے باہر سالانہ چندہ ساڑھے چھ روپے ششماہی چار شلنگ

نگار

ششماہی چندہ دینے میں نگار کا جنوری نمبر
بوجہ اضافہ ضخامت و قیمت شامل نہ ہوگا

جلد ۳۴ | فہرست مضامین نومبر ۱۹۳۸ء | شمار ۵

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد-۳۴	نومبر ۳۸ء	شمارہ-۵

ملاحظات

پھر وہی تفریقِ بوبکر و علی

کچھ دنوں سے لکھنؤ میں سکون تھا اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید اب سُنّی شیعہ اپنے اختلافات کو چھوڑ کر متفقہ طور پر ملک کے سیاسی حالات کا مطالعہ کریں گے اور سوچیں گے کہ انھیں کانگرس کے موجودہ دورِ حکومت میں کیا طریقِ کار اختیار کرنا ہے، لیکن افسوس ہے کہ یہ خیال غلط نکلا اور فضا پہلے سے زیادہ تاریک ہوگئی۔

اس کی ابتدا مولانا حسین احمد صاحب کے اس اعلان سے ہوتی ہے جس کے ذریعہ سے انھوں نے مدح صحابہ کی اجازت دیدی ہے اور اس باب میں ہر ممکن مشورہ و امداد کا وعدہ کیا ہے۔ مولانائے موصوف کا بیان ہے کہ اسوقت تک انھوں نے اس تحریک کے التوا کی سفارش صرف اس امید پر کی تھی کہ وہ اس دوران میں حکومت سے گفتگو کرکے شاید کوئی صورت ایسی پیدا کرسکیں گے جو سنیوں کے لئے قابل اطمینان ہو، لیکن چونکہ وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے اسلئے انھیں کے کسی سابق فتوے کے مطابق (کہ مدح صحابہ نے اب ایک مذہبی فریضہ کی حیثیت اختیار کرلی ہے) سنیوں کے لئے

سوائے اس کے کوئی چارۂ کار نہیں کہ وہ۔ علے الاعلان سڑکوں پر مدح صحابہ پڑھتے ہوئے گزریں اور قانون کا مقابلہ کریں چنانچہ اس کی طیاریاں ہورہی ہیں اور یہ جہادِ عظیم" رمضان سے شروع کیا جائے گا۔

مولانا حسین احمد صاحب کے اس اعلان کا عام سنی جماعت نے خیر مقدم کیا ہو یا نہ کیا ہو، لیکن ہمارے شہر کے سب سے بڑے ہنگامہ پسند لیڈر ظفر الملک صاحب نے انتہائی جوش وخروش کے ساتھ اس کی پذیرائی کی اور مولانا عبدالشکور صاحب کو اس تحریک کا قائد اعظم مقرر کرکے اعلان کردیا کہ رمضان المبارک سے بہتر مہینہ اس شہادتِ عظمیٰ کے حاصل کرنے کا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ سنا جاتا ہے کہ مختلف مقامات سے والنیٹر طلب ہورہے ہیں، اشتعال انگیز تقریروں سے پبلک کو آمادہ پیکار کیا جارہا ہے اور ایک بھائی کو دوسرے بھائی کے ذبح پر آمادہ کرنے کے لئے تلقین مذہب جاری ہے

اس سے قبل ہم تفصیل کے ساتھ اس مسئلہ پر اظہار خیال کرچکے ہیں اور ہمارے نزدیک حکومت نے جو فیصلہ کیا ہے اس سے بہتر فیصلہ ممکن نہ تھا، لیکن وہ لوگ جو بغیر فتنہ وفساد کے اثباتِ وجود نہیں کرسکتے اور جن کی شہرت کا انحصار ہمیشہ ہنگامہ آرائیوں پر رہا ہے، کیونکر ایسی بات پر راضی ہوسکتے تھے، جو لوگوں کو چین سے بیٹھنے دے اور وہ کیوں قومی مفاد پر اپنے اغراض کی قربانی کرتے۔ وہ صرف موقعہ کے منتظر تھے، بہانہ کی تلاش میں تھے، محض ایک چنگاری چاہتے تھے سو وہ ان کو مل گئی اور مولانا حسین احمد ایسے محترم بزرگ کے ہاتھوں سے ملی

مقامی اخبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ حضرات بھی کافی مشتعل ہوچکے ہیں اور مدح صحابہ کے جواب میں وہ بھی علانیہ تبرا کہنے پر آمادہ ہیں۔ لیکن جس طرح میری رائے میں سُنّیوں کا فیصلہ غلط ہے، اسی طرح شیعوں کا یہ ارادہ بھی درست نہیں۔ اگر دو مخالف جماعتوں میں سے کوئی ایک بھی سنجیدگی و رواداری سے کام لے تو فساد بڑی حد تک رُک جاتا ہے۔ علاوہ اس کے شیعہ حضرات کو یہ بھی سوچنا چاہئے کہ اگر سنیوں کی طرف سے مدح صحابہ کی تحریک جاری کی گئی تو حکومت خود اس کے روکنے کی ذمہ دار ہے اور شیعوں کو اپنی طرف سے کسی انتقامی کارروائی کی ضرورت نہیں

میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ اگر سُنّی واقعی حکومت کے فیصلہ کو خلاف انصاف سمجھتے ہیں اور مدح صحابہ کو وہ فریضۂ مذہبی کی حیثیت دیتے ہیں تو ان کو یہ عزم کرلینا چاہئے کہ چاہے کچھ ہو وہ اس فیصلہ کو مسترد کرا کے رہیں گے، لیکن اس کی تدبیر یہ نہیں ہے کہ چند آوارہ گرد لڑکوں کو پکڑ کر ان کے ہاتھ میں مدح صحابہ کا جھنڈا دیدیا جائے بلکہ اس کی صورت صرف یہ ہے کہ پہلے تمام سربرآوردہ سنی قانون شکنی کریں اگر ان کی گرفتاری سے یہ تحریک ختم ہوگئی تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ یہ سب وقتی جوش تھا اور ایسے غیر حقیقی جذبہ کو ختم ہی ہوجانا چاہئے تھا، لیکن اگر سنیوں میں اس سے اور رہی پیدا ہوگئی تو پھر ممکن ہے کہ حکومت متاثر ہو اور لکھنؤ کی سرزمین میں شیعوں کے علم کے ساتھ ساتھ مدح صحابہ کے جھنڈے کے لئے بھی کوئی جگہ نکل سکے

سچ ہے جب کوئی قوم تباہ ہونے لگتی ہے تو پہلے اس کی عقل پر پردے پڑجاتے ہیں اور وہ نقد و نسیہ کی تمیز کھو بیٹھتی ہے۔ یہ وقت تھا کہ مسلمانوں کی تمام جماعتیں، اپنے فروعی اختلافات کو ترک کرکے متفقہ طور پر سوچتیں کہ کانگرس کے موجودہ دور اقتدار میں ان کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہئے، ان کو اپنے بقا و تحفظ اور ملک کی آزادی کے لئے کیا تدابیر اختیار کرنا چاہئے، لیکن اس کا کیا علاج کہ مسلمان تو صرف نجات اخروی کا طالب ہے اور وہ ایک دوسرے کا خون بہائے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی

گر مسلمانی ہمین ست کہ غالب دارد
وائے گر درپس امروز بود فردائے

کانگرس کے خلاف عام بدظنی

ہمیں حصار سے کامریڈ بدرالدین کا ایک مراسلہ موصول ہوا ہے جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسوقت کانگرس کے خلاف نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ ہندؤں کی دوسری جماعتوں میں بھی کافی بدظنی پیدا ہوگئی ہے

بدرالدین صاحب نے کامریڈ نرسنگھ داس باباجی کے ایک پمفلٹ کا بھی حوالہ دیا ہے جو آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس کے وقت تقسیم کیا گیا تھا اس مراسلہ میں درج ہے کہ:۔

"کامریڈ نرسنگھ داس نے ۱۸ سال تک گاندھی سیوا سنگ میں کام کرنے کے بعد جب یہ محسوس کیا کہ یہ سب دھوکا ہی دھوکا ہے تو انھوں نے ۱۹۳۱ء میں اس سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور اس کی برائیوں کو منظر عام پر لانے کے لئے یہ پمفلٹ شایع کیا

باباجی کا بیان ہے کہ کانگرس کا مقصد تو آزادی کامل حاصل کرنا ہے لیکن موجودہ ورکنگ کمیٹی اور "ہائی کمانڈ لیڈرشپ" پس پردہ برطانیہ سے سازباز میں مصروف ہے۔ چنانچہ بھولابھائی ڈیسائی جو حد درجہ سرمایہ پرست ہیں کھلم کھلا برطانوی شہنشاہیت کے طرفدار ہیں، اس میں مطلق شک کی گنجایش نہیں کہ اس وقت گجرات اور مارواڑ کے چند متمول سرمایہ دار کانگرس پر قابض ہیں اور ورکنگ کمیٹی ہر وقت ان کا منہ دیکھتی رہتی ہے۔ ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوتا ہے تو گھنشیام داس برلا کے مکان پر، ہوائی جہازوں اور موٹروں کا کرایہ ادا کرتا ہے تو وہی برلا۔ لیڈروں کی شاندار دعوتیں کی جاتی ہیں، محفلوں کے فوٹو اخباروں میں شایع کئے جاتے ہیں۔ گاندھی جی کو موٹروں میں لئے پھرتے ہیں اور اس سے مقصود صرف سرمایہ داری کی حفاظت ہے ۔ یہ وہی برلا ہیں، جو سری پرکاشس، کانگرس کینڈیڈیٹ کے مقابلہ میں حلقۂ گورکھپور۔ سے کھڑے ہوئے اور انھیں اپنے سرمایہ کے زور سے کامیاب نہ ہونے دیا، اور یہی وہ برلا ہیں جنھوں نے ڈال چند ہیراچند ایک غیر کانگرسی نمایندہ کی مدد کرکے کانگرسی نمایندہ

کو شکست دی ۔ اسی قسم کے ایک اور سرمایہ دار جمنالال بجاج ہیں جو کانگرس کے خزانچی ہیں اور اپنی دولت کے اثر سے کانگرس کو قابو میں کئے ہوئے ہیں

اسوقت کانگرس ورکنگ کمیٹی بالکل مستبدانہ طور پر کام کر رہی ہے اور جمہوریت کا کوئی جذبہ اس کے اندر موجود نہیں ہے ۔ اُصولاً ہونا یہ چاہئے کہ پریسیڈنٹ، کیبنٹ کا انتخاب کرے، لیکن ہو یہ رہا ہے کہ کیبنٹ پریسیڈنٹ کا انتخاب کرتی ہے اور جو سرمایہ داروں کی حفاظت نہ کرے اسے پریسیڈنٹ نہیں بننے دیا جاتا اور برابر سترہ سال سے یہ کمیٹی ملک کو سبز باغ دکھا رہی ہے اور ملکی ضروریات پورا کرنے میں ناکام ثابت ہوئی ''

یہ ہے خلاصہ بدرالدین صاحب کی تحریر کا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کانگرس اپنا اعتماد ہندوؤں میں بھی آہستہ آہستہ کھوتی جا رہی ہے ۔ مسلمانوں میں جو بدظنی کانگرس کی طرف سے پیدا ہوتی جا رہی ہے اس کا سب سے بڑا ثبوت وہ مظاہرہ ہے جو کلکتہ کے مسلمانوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے خلاف حال ہی میں کیا تھا ۔ انھوں نے صاف صاف کہدیا کہ چونکہ مولنٰنا کانگرس کی مُسلم کش پالیسی کے طرفدار ہیں اس لئے نہ وہ امامت کے اہل ہیں نہ خطبۂ عیدین پڑھنے کے ۔

میں نے جہاں تک غور کیا ہے، مسلمانوں کی اس برہمی کا تعلق صرف اُردو ہندی نزاع سے ہے جو کانگرسی وزراء کی سنسکرت آمیز زبان کی اشاعت سے شروع ہوئی اور جس پر گاندھی جی کی تحریر (موسومہ آنریبل سمپورنانند جی وزیر تعلیم یوپی) نے مہر توثیق ثبت کردی ۔ گاندھی جی نے نہایت صاف الفاظ میں سنسکرت الفاظ کے شمول کی نہ صرف اجازت دیدی ہے بلکہ وہ اسے ضروری و مستحسن قرار دیتے ہیں ۔ دہلی میں ڈاکٹر اشرف کے رزولیوشن کا جو حشر ہوا اس سے بھی پبلک واقف ہے اور مولانا ابوالکلام آزاد نے جس انداز سے اس رزولیوشن کی مخالفت کی وہ بھی سب کو معلوم ہے بہرحال اب کانگرس نے زبان کے مسئلہ میں کھلا ہوا چیلنج دیدیا ہے اور ورکنگ کمیٹی کا یہ فیصلہ کہ ایک عام مشترک زبان کا نام ہندوستانی قرار دینا چاہئے بالکل بے معنی ہو کر رہ گیا ہے ۔ گاندھی جی کے اس بیان نے کہ ہندوستانی زبان میں سنسکرت الفاظ کی کثرت بہت ضروری و مستحسن ہے اب گنجایش کسی کی تاویل کی نہیں رکھی ۔ اگر مولانا ابوالکلام کے خلاف کلکتہ کے مسلمانوں نے احتجاج کیا تو اس کا سبب بھی یہی تھا کہ انھوں نے مسلمانوں کی صحیح نمایندگی اس مسئلہ میں نہیں کی اور اگر مسلمان کانگرس سے کٹ کر مسلم لیگ میں شامل ہو رہے ہیں تو اس کی وجہ بھی کانگرس کی یہی ناعاقبت اندیشانہ پالیسی ہے

صوبۂ بہار، صوبۂ متوسط اور خود ہمارے صوبۂ یوپی میں جن جن صورتوں سے اُردو زبان کے مٹانے کی کوشش جاری ہے، ان کا علم سب کو ہوگیا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ گاندھی جی کی ذہنیت بھی بے نقاب ہوتی جا رہی ہے ودیا مندر اسکیم کے سلسلہ میں مسلمانوں کی شکایت کا جواب جن الفاظ میں انھوں نے دیا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ خود ان الجھنوں کو مٹانا نہیں چاہتے اور ہندؤں کی سنسکرت آمیز زبان کا رواج وہ خود چاہتے ہیں ۔ انکے

نزدیک الفاظ "ودیامندر" میں کوئی بات ایسی نہیں جو مسلمانوں کو ناگوار ہو، کیونکہ ان کے نزدیک مندر کے معنی صرف "مکان" کے ہیں، لیکن مسٹر شکلا کی طرح وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مندر کا لفظ کیوں رکھا گیا ہے اور اس کی تہ میں جو ذہنیت کام کر رہی ہے اس سے خود گاندھی جی بھی مغلوب ہیں۔

یو۔پی میں گرام سدھار کے سلسلہ میں کارکنوں کی ٹریننگ جس زبان میں دی جارہی ہے وہ مسلمان کیا ہندؤں کے لئے بھی ناقابل فہم ہے، لیکن یو پی گورنمنٹ باوجود اس علم کے بھی اس سنسکرت نوازی میں مصروف ہے اور کسی شکایت کا اثر اس پر نہیں ہوتا۔

بہر حال میرے نزدیک اب یہ معاملہ شکوہ و شکایت کی حدود سے گزر گیا ہے اور مسلمانوں کی یہ "ہائے ہائے" مجھے پسند نہیں آتی، اگر وہ سمجھتے ہیں کہ ہندؤں کا موجودہ طرزِ عمل ان کے لئے نقصان رساں ہے، تو انکو دفع مضرت کے لئے کوئی عملی قدم اُٹھانا چاہیئے، کوئی موثر تدبیر اختیار کرنا چاہیئے اور اگر وہ ایسا نہیں کر سکتے ہیں تو انھیں خاموشی کے ساتھ یہ سب کچھ برداشت کرنا چاہیئے۔ یہ روز روز کی شکایت کانگرس یا گاندھی جی سے حد درجہ ذلیل و پست بات ہے اور قطعًا شیوۂ مردانگی کے خلاف

حیدر آباد اور کانگرس تحریک

آخر کار حیدر آباد میں وہی ہو کر رہا جس کی کوشش عرصہ سے جاری تھی اور جس کی تحریک ہندؤں میں ہنگامۂ کشمیر ہی کے وقت سے پیدا ہو گئی تھی۔ ہندوستان میں صرف حیدر آباد ہی ایک ایسی ریاست ہے، جو اپنے نظم و نسق اور بے لاگ انصاف کی وجہ سے اپنی حیثیت تمام ریاستوں سے جدا رکھتی ہے اور وہاں کوئی غیر مسلم جماعت ایسی نہیں ہے جو پوری آزادی کے ساتھ اپنے مراسم و شعائر نہ ادا کر سکتی ہو۔ لیکن جسوقت سے کشمیری مسلمانوں نے اپنی حکومت کے خلاف جد و جہد شروع کی ہے، اسی وقت سے ہندؤں میں جذبۂ انتقام پیدا ہو گیا ہے اور وہ کشمیر کا بدلہ حیدر آباد سے لینا چاہتے ہیں۔ اس باب میں ہندو اخبارات نے بھی اس فرقہ وارانہ تحریک کو اُبھارنے میں کم حصہ نہیں لیا اور کشمیری مسلمانوں کی خالص سیاسی تحریک کو مذہبی رنگ دیکر ہندو مسلم سوال پیدا کر دیا

جس حد تک امن و سکون اور انفرادی یا اجتماعی آزادی کا سوال ہے، کشمیر اور حیدر آباد میں زمین و آسمان کا تفاوت ہے۔ وہاں مسلمانوں کے ساتھ جو ظلم روا رکھا جاتا ہے اور جس بیدردی کے ساتھ اُن کی اقتصادی و اخلاقی حیثیت کو پامال کیا جا رہا ہے، اس کی نظیر دنیا کی کسی حکومت میں نہیں مل سکتی اور ہر وہ شخص جسے ایک بار بھی وہاں جانے کا اتفاق ہوا ہے وہ اس حقیقت سے واقف ہے، برخلاف اس کے حیدر آباد میں جا کر دیکھیئے تو معلوم ہو گا کہ وہاں ہندؤں کو تمام وہی آسانیاں اور آزادیاں حاصل ہیں جو برطانوی ہند میں پائی جاتی ہیں بلکہ اقتصادی حیثیت سے وہ مسلمانوں سے بدرجہا بہتر حالت میں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ملازمت میں ان کا تناسب ان کی آبادی کے لحاظ

سے کم ہو، لیکن اول تو وہ اتنے خوشحال ہیں کہ انھیں نوکری کی ضرورت ہی نہیں اور اگر ہو تو بھی تمام امتحانات مقابلہ میں ان کو آزادی کے ساتھ شریک کیا جاتا ہے اور اسوقت کوئی محکمہ وہاں ایسا نہیں ہے جس میں وہ بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز نہ ہوں

بہرحال ہندوؤں کا یہ پروپاگنڈا کہ انھیں وہاں مذہبی آزادی حاصل نہیں ہے یا یہ کہ اقتصادی و تمدنی حیثیت سے ان کے ساتھ وہاں انصاف نہیں ہوتا، بالکل لغو و بے معنی سی بات ہے، البتہ حیدرآباد کا ایک مسلمان ریاست ہونا اور وہ بھی سب سے بڑی ریاست ہونا بجائے خود ایک ایسا واقعہ ہے جو ہندوؤں کو کبھی خوش نہیں آسکتا اور وہ کوشش کر رہے ہیں کہ اگر وہاں ہندو راج قایم نہیں ہو سکتا تو کم از کم اس کو بیدست و پا کر دیا جائے

کانگرس کا دعویٰ ہے کہ وہ ریاستوں کے اندر ایسی سیاسی تحریکوں سے اپنے آپ کو متعلق کرنا پسند نہیں کرتی، لیکن اسی کے ساتھ چونکہ اس کا نام اس نے جنگ آزادی رکھا ہے اس لئے انسانیت و حریت کے نام سے وہ ہمیشہ اس میں حصہ لیتی ہے جیسا کہ میسور اور ٹراونکور میں دیکھا گیا ہے۔ اس لئے گو حیدرآباد کی کانگرسی جماعت بظاہر آل انڈیا کانگرس کی کوئی مسلّمہ شاخ نہ ہو، لیکن بہرحال اس کے "بچہ شتر" ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور قانون شکنی کے لئے جس ستیاگرہ کا وہاں آغاز ہوا ہے، اسے ایک نہ ایک دن مستقل فتنہ کی شکل اختیار کر لینا ہے

کچھ دن قبل جو ہندو مسلم فساد حیدرآباد میں ہوا تھا اس کے متعلق فی الحال کوئی رائے زنی کرنا مناسب نہیں کیونکہ معاملہ عدالت میں زیر سماعت ہے، لیکن اس کا اقرار کرنا پڑے گا کہ حصول انصاف کے لئے ریاست حیدرآباد نے جو مراعات ہندوؤں کے ساتھ کی ہیں اس کی نظیر کسی حکومت کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ البتہ اسی سلسلہ میں وہاں آیندہ فتنہ کا سدباب کرنے کے لئے ایک قانون ضرور نافذ کر دیا گیا ہے جس کا مدعا یہ ہے کہ فتنہ و فساد پھیلانے والے وہاں نہ آسکیں اور اندرون ملک میں کسی ایسی جماعت کی تشکیل نہ ہو سکے جس سے نقض امن کا اندیشہ ہو۔ یہ کوئی نیا قانون نہیں، کوئی مستبدانہ بدعت نہیں ہے، دنیا کی تمام حکومتوں کا فرض ہے کہ وہ امن و سکون کو قایم رکھیں اور اُن عناصر کی بیخ کنی کریں جو فساد و اشتعال کا باعث ہوا کرتے ہیں۔ حیدرآباد کے کانگرسی خیال کے لوگوں نے اسی قانون کے خلاف احتجاج کیا ہے اور اسی کے توڑنے کے لئے وہاں جتھوں کی روانگی شروع ہو گئی ہے

ایسی صورتوں میں حکومت کا اولین فرض یہی ہوا کرتا ہے کہ وہ سختی کے ساتھ قانون کی پابندی کرے اور ہمیں یقین ہے کہ آنریبل سر اکبر حیدری کی صدارت عظمیٰ میں وہی ہوگا جو ہر لحاظ سے قیام آئین و بقائے سکون کے لئے ضروری ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ہم آل انڈیا کانگرس ورکنگ کمیٹی کو بھی متوجہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور اس سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا ریاستوں میں اس قسم کی تحریکوں کا آغاز اس جدید کانسٹی ٹیوشن کو دیکھتے ہوئے جس کو اہل کانگرس نے قبول کر لیا ہے، مفید ہو سکتا ہے

وفاق کا نفاذ ہونے والا ہے جس میں بڑا اہم عنصر ریاستوں کا ہے اور یقیناً برطانوی ہند اس سے کوئی فایدہ نہیں اُٹھا سکتا اگر ریاستوں کی ہمدردی اسے حاصل نہ ہو۔ اور یہ صرف اسی طرح حاصل ہوسکتی ہے کہ ان کی آزادی پر حملہ نہ کیا جائے اور غالباً یہی وہ مصلحت تھی جس کی بنا پر اس وقت تک کانگرس نے ریاستی رقبوں کو اپنے دائرۂ عمل سے باہر رکھا تھا

بہ سلسلۂ قیام وفاق جو کشمکش ریاستوں اور برطانوی حکومت کے درمیان جاری ہے اس سے کانگرس ناواقف نہیں اور ریاستیں بھی جانتی ہیں کہ کانگرس نے ریاستوں کی شرکت کے لئے ان پر کیا پابندیاں عاید کرنا چاہی ہیں۔ اس لئے بحالت موجودہ برطانوی حکومت، کانگرس اور ریاستیں سب ایک دوسرے سے اُصولی اختلاف رکھتی ہیں اور جس وقت وفاق کا نفاذ ہوگا تو لازماً ان تین قوتوں میں سے دو کا کسی ایک بات پر متحد ہونا ضروری ہے پھر یا تو یہ اتحاد کانگرس اور حکومت برطانیہ کا ہوگا یا حکومت اور ریاستوں کا یا کانگرس اور ریاستوں کا۔ صورت اول میں چونکہ ریاستوں کی آزادی کا سلب ہوجانا یقینی ہے جسے حکومت برطانیہ خود بھی اپنے مصالح کے لحاظ سے مناسب نہیں سمجھتی اس لئے یہ ناممکن العمل ہے۔ دوسری صورت وہ ہے جس سے برطانوی حکومت کے اغراض زیادہ پورے ہوسکتے ہیں اور اسی پر زور دیا جارہا ہے لیکن ملک کی آزادی کے لئے مفید نہیں، اب رہگئی تیسری صورت یعنی کانگرس اور ریاستوں کا اتحاد جس سے واقعی ملک کو فایدہ پہونچ سکتا ہے، سو اس کا حصول اسی طرح ممکن ہے کہ کانگرس ان کی ہمدردی حاصل کرے اور وہاں کسی ایسی تحریک کا آغاز نہ ہونے دے جو ان کی آزادی یا ملوکیت کے منافی ہو۔ یہ طے شدہ امر ہے کہ ہندوستان کو کسی نہ کسی دن پوری طرح آزاد ہونا ہے، لیکن ایسی صورت میں جبکہ کانگرس خود بھی مکمل آزادی کی متمنی نہیں اور برطانوی سایۂ عاطفت کو اپنے لئے ناگزیر سمجھتی ہے، اسے کیا حق حاصل ہے کہ وہ ریاستوں میں کسی ایسی تحریک کا تجربہ کرے جس کے انجام کا کوئی صحیح تخیل خود بھی ابھی تک قایم نہیں کرسکی ہے۔ علاوہ اس کے ہندو مسلم بدمزگی یوں بھی روز بروز بڑھتی جارہی ہے اور اگر یہ سلسلہ ریاستوں میں بھی قایم ہوگیا تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ ملک کی آزادی سے پہلے اس فتنہ کا انسداد ضروری ہوگا اور پھر کون کہہ سکتا ہے کہ برطانوی حکومت اس سے فایدہ اُٹھا کر اپنے کھوئے ہوئے اقتدار کو دوبارہ حاصل نہ کریگی اور ملک کی آزادی کا سوال پھر پچاس سال کے لئے پس پشت نہ ڈالدیا جائے گا

جوش کے کلام کی خصوصیات

(مسلسل)

نئی راہیں اُردو شاعری کا بنظرِ تعمق مطالعہ کرنے سے ایک تلخ حقیقت کا نہایت شدید احساس ہوتا ہے، یعنی یہ کہ ہمارے شعراء نے محض تقلید سے کام لیتے ہوئے محبوب کی بعض مخصوص حرکات و کیفیات پر ہی اپنی توجہ منعطف کی ہے۔ دیگر محاسن تک یا تو ان کی نظر ہی نہیں پہونچی یا مقلدانہ ذہنیت کے باعث کسی قسم کے اجتہاد سے کام لینے میں ان کو جھجک محسوس ہوئی۔ ورنہ سچ پوچھئے تو زلف و ابرو اور چشم و عارض کے علاوہ اور بھی دلکش محاسن محبوب میں موجود ہیں۔ کسی نے صحیح کہا ہے:-

خوبی ہمیں کرشمۂ و ناز و خرام نیست
بسیار شیوہ ہاست بتاں راکہ نام نیست

جوش کو اس نکتہ کا پورا پورا احساس ہے۔ متغزلین کے بارے میں اس کا یہ قول نقل کیا جا چکا ہے کہ:-

پائی ہے ترکے میں ان لوگوں نے ہر لے ہر صدا　　ان کے لب پر بھی وہی ہے جو ولی کے لب پہ تھا
سلسلہ ان کے سخن کا دور تک ہوتا نہیں　　کون ہے ان میں جو بالآخر "کٹ کٹ" ہوتا نہیں

اس کے برخلاف ایک حقیقی شاعر کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:-

راستے کا ذرہ ذرہ جس کو دیتا ہو صدا　　نظم کرتا جا مجھے بھی شاعرِ رنگیں نوا
روز و شب مجبور ہو جو سیر کرنے کے لئے　　ہر نفس اک وادیٔ نو سے گزرنے کے لئے
چند شعبوں ہی میں گم ہونے نہ پائے جسکی ذات　　جس کا موضوعِ سخن ہو کل نظامِ کائنات

اس کا کلام پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل وہ "ہر نفس اک وادیٔ نو" سے گزرتا ہے اور کائنات کا ذرہ ذرہ اس کا موضوعِ سخن ہے۔

محبوب کے "شیوہ ہائے غیر مستحق" پر بھی اُس نے طبع آزمائی کی ہے اور حسینانِ جہاں کے [illegible] ادوں پر

روشنی ڈالی ہے۔ ایک جگہ لکھتا ہے :۔

یوں چپ ہے مجھ سے گویا کچھ کام ہی نہیں ہے　　　یہ وہ ادا ہے جس کا کچھ نام ہی نہیں ہے!

"جنگل کی شہزادی" کی تعریف یوں کرتا ہے :۔

صحرا کی زیب و زینت، فطرت کی نور دیدہ　　　برسات کے ملائم تاروں کی آفریدہ
لوہا تپانے والی جلووں کی ضو فشانی　　　سکّے بٹھانے والی اٹھتی ہوئی جوانی
ڈوبے ہوئے سب اعضا حسن مناسبت میں　　　پالی ہوئی گلوں کی آغوشِ تربیت میں
تصنیف ہوں ہزاروں چھپتے ہوئے فسانے　　　ان انکھڑیوں کی ضد پر کانپیں شراب خانے

ایک نظم کا عنوان ہے "اٹھتی جوانی"۔ اس کے دو بند ملاحظہ فرمائیے اور جوشؔ کی جدت طراز فطنت کی داد دیجئے :۔

سدھی ہوئی اس غضب کی پلکیں　　　کہ آنکھ چلتے ہی دل میں ڈوبیں
منجھی ہوئی اس بلا کی چٹکی
کبھی نہ خالی گیا نشانہ

وہ رخ پہ طوفان کیف شب کے　　　کہ لیکے انگڑائی منھ اندھیرے
ملے جو آنکھیں ہتھیلیوں سے
ٹپک پڑے بادۂ شبانہ

آخری شعر بغور ملاحظہ کیجئے اور دیکھئے کہ اس کے پڑھتے ہی ہمارے قلب پر سرور و انبساط کی ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور تھوڑی دیر کے لئے ہم اپنے آپ کو ایک دوسری دنیا میں متصور کرنے لگتے ہیں۔

متغزلین نے اپنے محبوب کی شان میں دفاتر بے معنی سیاہ کر ڈالے ہیں۔ اس کی توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دئے مگر جوشؔ کی جدت پسند طبیعت نے جو تصویر پیش کی ہے، فطرت اور واقعیت کے لحاظ سے بے نظیر ہے :۔

نوخیز، حسین، بلند، بالا،　　　اوڑھے ہوئے سرمئی دوشالا
فردوس کے در کئے ہوئے باز　　　ٹیکے ہوئے کہنیاں بصد ناز!
رنگین کلائیوں کو جوڑے　　　چہرے کو ہتھیلیوں پہ رکھے
گلدان میں پھول ہنس رہا ہے
قرآں ہے کہ رحل پر رکھا ہے

"بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست" کا بھی جوشؔ دل سے قائل ہے۔ ان "بسیار شیوہ ہا" میں سے بعض ملاحظہ فرمائیے :۔

یہ شہابی رنگ نازک جلد میں رخسار کی　　　خون کا یہ رقص تہ میں عارضِ گلنار کی

سُرخ آنچل کا ڈھلک جانا یہ سر سے بار بار　　　　دونوں ہاتھوں سے چھپا لینا یہ منھ بے اختیار
گفتگو یہ رجھکا کر شرگیں انداز سے　　　　یہ گرہ ہر لفظ میں رکتی ہوئی آواز سے

ذرا ان اشعار کو بغور پڑھئے اور فیصلہ کیجئے کہ کیا جوش کو ندرتِ بیان اور جدّتِ مضامین میں یدِطولیٰ حاصل نہیں ہے؟ غالباً اُردو شعرا میں قدرت نے "فطنتِ شاعرانہ" (POETIC GENIUS) بمشکل کسی دوسرے شاعر کو اس قدر وفور کے ساتھ ودیعت کی ہو اور یہی باعث ہے کہ جوش کی شاعری نہ صرف بلحاظ ندرت ولطافت بلکہ دیگر کمالات شاعری کو معیار قرار دیتے ہوئے بھی کسی بڑے سے بڑے شاعر سے فروتر نہیں ہے۔ شاید انھیں وجوہ کی بنا پر اُردو کے ایک وقیع انشاپرداز نے فرمایا ہے کہ[1]:- "جوش کے کلام کے متعلق کچھ لکھنا ایسا ہی ہے جیسے دن کے وقت یہ کہنا کہ آفتاب نکل آیا ہے"

نظریۂ عشق

عموماً متغزلین کے یہاں عاشق کی ہستی کو زیادہ اہمیت نہیں دیجاتی۔ اُس کی ہر سانس محبوب کی دہلیز میں گزرتی ہے۔ وہ زندہ صرف اس لئے ہے کہ محبوب کے جور وستم برداشت کرے۔ وہ اپنی ہستی کو مستقلاً پست متصور کئے ہوئے ہے۔ روزانہ محبوب کی بارگاہ میں "نیازمندانہ" انداز سے اپنا احوال سناتا ہے لیکن وہ بیدرد اعتنا نہیں کرتا۔ اگر حسن اتفاق سے کہیں محبوب نے اس پر ایک نظرِ التفات ڈال دی تو گویا اس کی معراج ہوگئی مگر جوش کا نظریۂ عشق اس لایعنی اور قبیح خوشامد کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ اس "مغلوبانہ ذہنیت" (DEFEATIST MENTALITY) کا قایل نہیں۔ اس کے نزدیک عاشق کا وجود بھی لابُد اور لازمی ہے۔ اس کی ہستی بھی اتنی ہی بلکہ اس سے زیادہ اہم ہے جتنی محبوب کی۔ اس کا خیال ہے کہ:-

اہانت گوارا نہیں عاشقی کی　　　　غلامی میں بھی سروری چاہتا ہوں

یہ نہیں ہے کہ وہ پرستشِ محبوب کے خلاف ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ "پندارِ عاشقی" بھی ملحوظ ہے:-

مزاجِ تمنائے خوددار، توبہ!　　　　عبادت میں بھی داوری چاہتا ہوں

محبوب کو غلط فہمی ہے کہ اُس کی ذات پر تمام عشاق کی ہستی کا دارومدار ہے، لیکن جوش کا قول ہے کہ حُسن فی الاصل کوئی چیز نہیں صرف عشق کے باعث حُسن حُسن ہوگیا۔ چنانچہ محبوب کی اس غلط فہمی کو یوں رفع کرتا ہے:-

اے حسن! اگر عشق خریدار نہ ہوتا　　　　یہ غلغلۂ گرمیِ بازار نہ ہوتا
اے حسن! داد دے کہ تمنائے عشق نے　　　　تیری حیا کو عشوۂ ترکانہ کر دیا

اس کا عقیدہ ہے کہ حُسن کو جو اہمیت دیجاتی ہے اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ عشق کی توجہ اس کی جانب منعطف ہے چنانچہ کہتا ہے:-

اے حسن! شاد ہو کہ تجھے چشمِ شوق نے　　　　آشوبِ چشم و فتنۂ دوراں بنا دیا

---

[1] نگار - جولائی ۱۹۳۲ء

فیضِ نگاہِ عشق نے اے دفترِ جمال ! تیرے ہر ایک جزو کو قرآں بنا دیا
اے ناز، داد دے کہ سرابِ جمال کو میری نظر نے چشمۂ حیواں بنا دیا !

بالآخر ایک "جذبۂ متعلیانہ" کے ماتحت کہہ اُٹھتا ہے کہ:-

کج کر کلاہِ فخر کہ تیرے شباب کو میں نے خدا اسے عالمِ امکاں بنا دیا!!

محبوب کی بے التفاقی کے خلاف احتجاج کرنا متغزلین کا عام شیوہ ہے - اپنی فریاد و بُکا سے غالباً وہ اہلِ زمانہ کی ہمدردی اپنی موافقت میں حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جوش اس عالمِ مفارقت میں بھی "عاشقانہ وقار" کو قائم رکھتا ہے - وہ اپنا مرتبہ "گدایانہ" نہیں بناتا۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ " وہ اپنے حُسن سے محفل ، میں اپنے عشق سے بزم !! "

بعض مثالیں ملاحظہ ہوں :-

اُس طرف حُسن خود سر و خود بیں اِس طرف عشق ضابط و خود دار
اُس طرف ناز و دلبری کا شکوہ اِس طرف شعرِ بیخودی کا وقار
اُس طرف حسن غرقِ صد نخوت اِس طرف عشق محوِ صد پندار

یہ تو ہجر و مفارقت کی حالت تھی لیکن اگر اُسے محبوب کی خلوت میں بھی باریابی ہوتی ہے تب یہ نہیں ہوتا کہ وہ غلامانہ انداز میں اپنا احوالِ درد و غم سنائے۔ برخلاف اس کے، عاشق کو یہاں بھی اپنی "پوزیشن" کا احساس رہتا ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ کسی طرح عشق کی توہین ہو جائے - سنئے:-

اُس طرف عہد ہے نہ سننے کا اِس طرف بند ہیں لبِ گفتار
مجھ کو یہ کد وہ ہوں تبسم ریز اُن کو یہ ضد کہ یہ کرے اصرار

صدق و وفا | اس تمام بحث سے یہ نہیں متنبط کر لینا چاہیے کہ جوش اُلفتِ محبوب میں اخلاص و صداقت کے خلاف ہے - اس کے بالکل برخلاف وہ ہر وقت مجسّم وفا ہے - اس کی ہر سانس داستانِ اُلفت کی راوی ہے :-

وفا شعار ہوں ترکِ وفا نہیں کرتا کبھی نمازِ صبوحی قضا نہیں کرتا

محبوب کے مظالم کے باوجود وہ یہ کہتا ہے کہ:-

نقشِ خیال دل سے مٹایا نہیں ہنوز بیدرد! میں نے تجھ کو بھلایا نہیں ہنوز

صرف یہ کہ محبوب کو فراموش نہیں کیا بلکہ حقیقتِ امر یہ ہے کہ رشتۂ موانست اسی طرح مضبوط ہے:-

تیری ہی زلفِ ناز کا اب تک اسیر ہوں یعنی کسی کے دام میں آیا نہیں ہنوز

ایک دوسرے مقام پر اسی مطلب کو واضح کرتا ہے :-

یہ مگر وہم ہے اسے پیکرِ حسن و تنویر کہ یہ دل اب ہے کسی اور کی زلفوں کا اسیر

اس نکتہ کی مزید تصریح یوں کی ہے :۔

یادش بخیر جس پہ کبھی تھی تری نظر وہ دل کسی سے میں نے لگایا نہیں ہنوز!

انسان کی فطرت کا تقاضہ ہے کہ جب کوئی شے مفقود ہو جاتی ہے تب اس کی اصل قدر و قیمت کا احساس ہوتا ہے۔ محبوب نے "بزمانۂ التفات" جو الطاف و احسانات کئے تھے وہ اب تک عاشق کے نقشِ ذہن ہیں :۔

گردن کو آج بھی تری بانہوں کی یاد ہے یہ منتوں کا طوق بڑھایا نہیں ہنوز!

اس کو پوری طرح احساس ہے کہ محبوب کی نگاہ بدل گئی ہے ، وہ اب ملتفت نہیں ہوگا۔ لیکن اس کی خوش اعتقادی کا یہ عالم ہے کہ کہتا ہے :۔

وہاں جفا ہی جفا رہ گئی ہے مدت سے یہاں جفا پہ وفا کا گمان باقی ہے

پھر نہایت فخریہ انداز میں کہتا ہے کہ :۔

جفا کا اب نہیں اگلا سا بانکپن قایم مگر وفا کی وہی آن بان باقی ہے

غرض یہ کہ محبوب کے مظالم کے باوجود جوشؔ کے نزدیک ہر حالت میں وفاداری کا ثبوت دینا چاہئے کیونکہ دنیائے محبت میں عشق اور وفا لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اعلائے محبوب

جوشؔ کے نظریۂ عشق کے مطابق ایک عاشق کو خود دار اور باوقار ہونا چاہئے۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک محبوب کا مرتبہ کیا ہے ؟ کیا وہ فرعی اور ثانوی حیثیت رکھتا ہے؟ اور کیا عاشق کے معیار و مرتبہ کے بلند کرنے میں جوشؔ نے محبوب کے مرتبہ کو کسی حد تک فروتر بنا دیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ عاشق کے مرتبہ کو بلند کرنے کے معنی ہی یہ ہوتے ہیں کہ محبوب کا مرتبہ بھی بالاتر ہو جائے کیونکہ جب عشق باوفا ہوگا تو فطرتاً وہ اپنی تمناؤں کے مرکز یعنی حسن کو بھی عظمت و افتخار کی نگاہ سے دیکھیگا۔ وہ محبوب سے نہایت فخریہ انداز سے کہیگا :۔

اپنی رفتار پہ ہے کوثر و تسنیم کو ناز کاکلیں چھوڑ کے شانوں پہ خراماں ہو جا!

ایک دوسری جگہ یہی مفہوم اس طرح ادا کیا ہے :۔

بل ابروؤں پہ ڈال کے زلفوں کو کھول دے کونین کو اسیر کمان و کمند کر!

جوشؔ کو محبوب کی عظمت کا جسقدر احساس ہے اس کا اندازہ اس شعر سے ہو سکتا ہے :۔

کفر سجدے میں گرے ، دین کی نبضیں چھٹ جائیں آج آ ، دوش پہ بکھرائے ہوئے یوں گیسو!

نہ صرف یہ کہ جوشؔ کو اپنے محبوب کی عظمت کا احساس ہے بلکہ اس کا خیال ہے کہ ہر "اہلِ نظر" کو اپنا محبوب اتنا ہی ذی مرتبت اور عزیز معلوم ہوتا ہے۔

آؤ پھر جلوۂ جاناں پہ لٹا دیں کونین   شغل پارینۂ اربابِ نظر تازہ کریں

بالفاظ دیگر، جلوۂ جاناں پہ کونین نثار کر دینا فی الحقیقت عشاق کا شیوۂ دیرینہ ہے!

اس ضمن میں ایک نکتہ لمحوظ رہے۔ جوش نہ صرف اعلائے محبوب کا مُتمنّی ہے بلکہ اس کا عقیدہ ہے کہ محبوب کی عظمت کے باعث جسقدر بھی اشیا، اس سے متعلق ہیں وہ سب ذی قدر ہو جاتی ہیں ایک جگہ لکھتا ہے:۔

ہاں آسمان! اپنی بلندی سے ہوشیار   لے، سر اُٹھا رہے ہیں کسی آستاں سے ہم

محبوب کے باعث اس کے آستانے کا یہ مرتبہ ہو جانا کہ اس پر سر رکھ دینے سے سر بھی اتنا ارفع و اعلیٰ ہو جائے کہ آسمان کو اپنی بلندی سے ہوشیار رہو جانا پڑے ایک ایسا دعویٰ ہے کہ جس کو مبالغہ پر محمول کر سکتے ہیں لیکن اس سے کم از کم یہ تو ظاہر ہو جاتا ہے کہ جوش کے دل میں محبوب کی کس قدر عظمت و مرتبت ہے

التفات محبوب جوش نے اپنا نظریۂ عشق پیش کرتے ہوئے جہاں اور بہت سی اختراعات اور جدتوں سے کام لیا ہے اُن میں ایک یہ بھی ہے کہ اُس کا معشوق محض ظالم، عاشق کش جابر و قاہر اور بے التفات ہی نہیں ہے بلکہ محبوب کو بھی احساسِ محبت ہے اور حقیقت امر یہ ہے کہ ایک حسین و جمیل ہستی کو خواہ مخواہ ظالم قرار دید ینا خود اپنی جگہ پر ظلم ہے۔ جگر نے صحیح کہا ہے:۔

ان شاعرانِ دہر پہ ہو عشق ہی کی مار   اک پیکرِ جمیل کو قاتل بنا دیا

لیکن جوش ان "شاعرانِ دہر" میں نہیں جو اس "پیکرِ جمیل" کو قاتل قرار دیتے ہیں۔ جوش کا محبوب بھی اُس سے ملنے کے لئے اس قدر بیتاب رہتا ہے (بیتاب رہتی ہے؟) جیسا کہ تقاضائے موانست ہے۔ اس سلسلہ میں ارسالِ تحفہ و پیام بھی ہوتا ہے۔ دونوں جانب سے اظہارِ محبت بھی کیا جاتا ہے اور سچ پوچھئے تو یہ نظریہ اس مقلدانہ فرسودہ نظریہ سے زیادہ نیچرل ہے جس میں معشوق کو صیاد سے تعبیر کیا جاتا تھا۔

اس مطلب کو واضح کرنے کے لئے چند مثالیں درج کرنا ضروری ہیں۔ تحفہ و پیام ملاحظہ ہو:۔

یہ کس نے جوش کو بھیجے ہیں نازپرور پھول   شگفتہ پھول، جواں پھول، خلد پیکر پھول!

"زرد کلیاں" جوش کی مشہور نظم ہے۔ وہ بھی اسی نظریہ کی آئینہ دار ہے۔ کلیوں کے ذریعہ محبوبہ نے جو پیام بھیجا ہے وہ بھی ملاحظہ فرمائیے:۔

اب حد سے سوا ہے خستہ حالی   نزدیک ہے وقتِ پائمالی،

آنا ہو تو آ، کہ دل ہے بیتاب   ایسے میں ابھی چمن ہے شاداب

جلد آ، کہ فروغِ رنگ و بو ہو

قبل اس کے کہ خونِ آرزو ہو!

"التفاتِ یار کے دورِ طرب آہنگ میں" موانست و ملاطفت کا یہ عالم تھا کہ :۔

مست راتوں میں بہ فیضِ ارتباطِ حسن و عشق میہمانی کے مزوں میں میزبانی کے مزے
کمسنی کی عوا نگاہوں میں بہ تکمیلِ شوق جُرعہ جُرعہ پی کے مے افسانہ خوانی کے مزے

ظاہر بیں نظروں کو شاید یہ گمان ہو کہ جوشؔ کو اس التفاتِ یار سے سرور و انبساط حاصل ہوتا ہوگا۔ حالانکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ جوشؔ کو اپنے آرامِ جاں کی بے چینی سے اور بھی تشویش و کوفت ہوتی ہے۔ وہ استعجاب آمیز طریقہ سے کہتا ہے :۔

جس کے قدموں پر ہو خود فطرت کا سر وہ پڑھے اور مجھ سے ملنے کو نماز
آہ، وہ اور اس طرح مجھ سے ملے خود اُٹھاتی ہو جوانی جس کے ناز

"جفائے وفا" کے عنوان سے اسی مفہوم کو پیش کیا ہے :۔

دل کی بستی میں کیوں نہ ہو کہرام آہ یہ نامہ، ہائے یہ کہرام
کاش اسوقت مجھ کو موت آجائے آگ میں پھول کس سے دیکھا جائے
کاش وہ یوں نہ باوفا ہوتی، بانیِ ظلم ناروا ہوتی،
بول اے نامہ بر! جیوں کیسے پھر تو دوہرا یہ کیا کہا اُس نے
"آنکھ کھلتے ہی صبح تیری یاد دل پہ کرتی ہے جانے کیا بیداد
دل مرا غرقِ یاس رہتا ہے شام تک جی اُداس رہتا ہے!"

عہدِ تمنا کی یاد

محبوب کی اس لطف آمیز روش کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ بزمانۂ مفارقت عاشق کو یہ سب الطاف و عنایات ایک ایک کر کے یاد آئیں گی۔ وہ متعجب ہوگا اور تلوّنِ زمانہ پر حیرت کریگا کہ :۔

"لوگ ایسے بھی دنیا میں بدل جاتے ہیں!" جوشؔ کے زمانۂ فراق کا بھی یہی عالم ہے اس کو ہر ہر قدم پر محبوب کے عہدِ تمنا کی یاد ستاتی ہے۔ وہ اس کی دیرینہ ملاطفت کو یاد کر کے ایک آہ سرد کھینچتا ہے۔ اگر کہیں محبوب سے خطاب کرتا ہے تو اس امر کی جانب خاص اشارہ کر دیتا ہے :۔

دل نے بخشا تھا تقاضائے زلیخا تجھ کو یاد ہے وہ خلشِ عہدِ تمنا تجھ کو؟

اس "تقاضائے زلیخا" والے عہدِ تمنا کی کس قدر پُر تاثیر تشریح کی ہے :۔

نرگسِ ناز میں یوں اشک بھرے رہتے تھے نظر آتا تھا ورقِ دہر کا دُھندلا تجھ کو!
روزِ باراں میں ستاتا تھا غمِ عشق تجھے شبِ مہتاب میں ڈستی تھی تمنا تجھ کو!
ہر گھڑی میری حضوری کی تمنا تھی تجھے ہر نفس میری جدائی کا تھا کھٹکا تجھ کو

کیا قیامت تھی کہ اس گلبدنی کے باوصف　　　　روزنہ کانٹوں پہ لٹاتی تھی تمنا تجھ کو

پھر ایک آہِ سرد کھینچ کر کہتا ہے :-

جوشؔ سے پوچھ! کہ اب تک ہے اُسے یاد وہ دور　　　　کہ کبھی مہر و وفا کا بھی تھا دعوے تجھ کو!

ایک دوسری جگہ اسی دورِ تمنا کی تصویر اس طرح پیش کی ہے :-

کاوشِ ذوقِ نظر بازی کی راتیں ہائے ہائے　　　　دیدۂ مخمور جب میرے لئے بیخواب تھا

ذرا مختلف الفاظ میں یہی مفہوم ملاحظہ فرمائیے :-

حسن کی بزمِ عشوہ میں شمعِ وفا تھی ضوفگن　　　　عشق کی بارگاہ میں زمزمہ بار یاب تھا
معرکۂ عظیم تھا نازمیں اور نیاز میں　　　　زلف میں بھی تھی برہمی، دل کو بھی پیچ و تاب تھا

کہیں کہیں مصائبِ فراق کا ذکر کرتے کرتے یکبارگی الطافِ دیرینہ کا خیال آجاتا ہے اور استعجاب آمیز انداز میں دریافت کرتا ہے :-

بجھ گیا مہر کا فانوس کہ روشن ہے ابھی ؟　　　　اب ان آنکھوں میں لگاوٹ کا اثر ہے کہ نہیں؟
اب مرے نام کا پڑھتا ہے وظیفہ کوئی ؟　　　　اب مرا ذکر دفا وردِ سحر ہے کہ نہیں ؟
اب بھی تکتی ہیں مری راہ وہ کافر آنکھیں؟　　　　اب بھی در دیدہ نظر جانبِ در ہے کہ نہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ بعض مواقع پر استفہامیہ انداز نسبتاً زیادہ موثر ثابت ہوتا ہے۔ محبوب کے الطاف و احسانات گن گن کر اُس کی موجودہ روش پر ملامت کرنے کی بجائے یہ بہتر اور زیادہ کارگر طریقہ ہے کہ ایک ادائے متعجبانہ کے ساتھ یوں استفسار کیا جائے کہ :-

اے یارِ دلنشیں! وہ ادا کون لے گیا؟　　　　تیرے نگیں سے نقشِ وفا کون لے گیا؟
راتوں کو مانگتا تھا دعا میری دید کی!　　　　وہ منتیں، وہ ذوقِ دعا کون لے گیا؟
پہلی سی وہ مزاج میں نرمی نہیں رہی　　　　گفتار سے مزاجِ صبا کون لے گیا؟

اعتراضات

یہاں تک ہم نے جوشؔ کے محاسن سے بحث کی ہے اور ان پر بالتفصیل روشنی ڈالی ہے۔ غالباً بلکہ یقیناً مجھے جوشؔ کی شاعرانہ عظمت و کمال کا جسقدر اعتراف ہے اتنا بہت کم حضرات کو ہو گا لیکن انصاف اس امر کا متقاضی ہے کہ جس طرح اُس کے کلام کی مستحسن صفات بیان کرنے میں کسی بُخل سے نہیں کام لیا گیا ہے، اُس کے معائب کے اظہار سے بھی گریز نہ کیا جائے۔ اغلاط و اسقام کا پایا جانا تقاضائے بشریت ہے۔ اسی طرح ہم جوشؔ کو بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں متصور کرتے اور اس کے کلام میں بھی غلطیاں پائی جاتی ہیں یہ غلطیاں مختلف النوع ہیں۔ میں نے ان کو تین عنوانات کے تحت میں تقسیم کیا ہے۔ ۱۔ فنی - ۲۔ لسانی - ۳۔ معنوی

فنی غلطیاں

اس کے ماتحت وہ تمام عیوب آجاتے ہیں جو قواعدِ شاعری سے گریز کرنے کے باعث جناب جوش سے سرزد ہوئے ہیں۔ دو بے اعتدالیاں علی الخصوص قابلِ ذکر ہیں۔ (۱) ایطاء (۲) رعایتِ لفظی۔

ایطاء

ایطاء کے لغوی معنی ہیں "پامال کرنا"، لیکن اصطلاحِ شاعری میں ایک ہی قافیہ کو مکرر نظم کر دینے کو "ایطاء" کہتے ہیں۔ دراصل یہ ایک نہایت ہی عامیانہ غلطی ہے اور کاملینِ فن نے ہمیشہ اس سے احتراز کیا ہے۔ عہدِ جدید میں بعض حضرات اس کے جواز کے قایل ہیں۔ واقعۃ الامر یہ ہے کہ ایطاء نہ صرف اُصولاً ناجایز ہے بلکہ مذاقِ سلیم پر ناگوار گزرتا ہے۔ ایک ہی لفظ کو بالتکرار قافیہ نظم کرنے سے سامعین کی طبیعت کو یک گونہ کوفت سی محسوس ہوتی ہے۔ جوش کے یہاں اس کی مثالیں بکثرت پائی جاتی ہیں اور ان میں سے بعض تو بے حد مبتدیانہ ہیں۔ ذرا سی توجہ سے رفع کی جا سکتی تھیں۔ ملاحظہ ہو:-

۱- کب شیشۂ دل گردِ تکدّر کے لئے ہے — ہر رنج میں آرام بہادر کے لئے ہے

۲- مفت میں بیٹھے بٹھائے خون رُلواتے ہو کیوں — اب ان اُجڑی صحبتوں کی یاد دلواتے ہو کیوں

۳- قوم میں ہیں جو کمتر و برتر — ان پہ چھا جائے میرا چھو منتر

۴- اک قصر قریب رودِ جمنا — لہروں کو بنا رہا ہے بینا

۵- ذکر ہوتا ہے مرا پُر ہول پیکاروں کے ساتھ — ذہن میں آتی ہوں تلواروں کی جھنکاروں کے ساتھ

۶- شحنۂ سلطاں کے دل میں گرم ہو داغِ سراغ — جل رہے ہیں دھندلے دھندلے طاقِ سازش میں چراغ

۷- سامنے اک نمایشی دیندار — محوِ تسبیح تھا بصد پندار

۸- علم سے ہر چند تجھ کو کم کیا ہے بہرہ مند — لیکن اس سے ہو نہ اے معصوم عورت، درد مند

۹- روشنائی میں کہیں گھلتی ہے موجِ ماہتاب — یا کوئی اوراقِ گل پر طبع کرتا ہے کتاب

۱۰- جامِ زریں کی کھنک گم ہو گئی گفتار سے — ابر کی سی شوخیاں جاتی رہیں رفتار سے

۱۱- سرنگوں ہیں پھول سکتے میں ساری پیمانے کا رنگ — اف یہ نم آلود رخساروں پہ شرمانے کا رنگ

۱۲- ہوائیں چل رہی ہیں سنسناتی — مہکتی، سرسراتی، گنگناتی

۱۳- شاداب تو ہیں میرے بچپن کی سیر گاہیں — اب ڈھونڈتی ہیں جن کو ترسی ہوئی نگاہیں

۱۴- گلے گزر چکے ہیں سبزہ پڑا ہے روندا — کیا کیا مہک رہا ہے بھولا ہوا گھروندا

۱۵- تھی تو کہنے کو خموشی عالمِ ذرات میں — لیکن ایسی جیسے رن بولے اندھیری رات میں

۱۶- بے تعارف بھی کہن سال مسلماں ابتک — آتے ہی روبرو میرے مجھے کرتے ہیں سلام
سخت حیراں ہوں کہ اس مشقِ گنہ کے باوصف — ثبت ابتک ہے مری شکل پہ مہرِ اسلام

۱۷- اُڑا ہوا ہے رخِ شانِ خسروانہ کا رنگ — قضا کے سائے میں ہو تاج افسر و اورنگ

۱۸ ہم حباب آسا ہیں لازم ہے کہ جب ہم سے ملو | دوستو، باریک بینی سے خدارا کام لو
۱۹۔ اس طرف ہڈیوں سے جامۂ تار | اس طرف جسم جُبّہ و دستار
۲۰۔ پھول چڑھتے ہیں خار زاروں پر | سجدے ہوتے ہیں یاں مزاروں پر
۲۱۔ دے مرے رُخ کو صولتِ ابہام | اور مریدوں کو تحفۂ اوہام
۲۲۔ ان کے آگے ہر نیا میدان ہوگا جلوہ گاہ | اور ترا اسٹیج ہوگا صرف شوہر کی نگاہ
۲۳۔ ان کی راتیں خوف رسوائی سے ہونگی جو بے آز | تیرے سینے میں کسی شب کا نہ ہوگا کوئی راز

رعایت لفظی تقریباً ایک صدی بیشتر تک شعر کی بڑی خوبی یہ سمجھی جاتی تھی کہ کسی طرح کھینچ تان کر اس میں " صنعتِ ایہام" کی گنجایش نکل آئے۔ دراصل یہ تمام تکلفات بار دہ فارسی شاعری نے مستعار لئے گئے تھے اور ہماری متعلمانہ ذہنیت کا نتیجہ تھے۔ جب اہل زمانہ کے دماغ تہذیبِ جدید سے روشن ہوئے تو مذاقِ شاعری میں بھی انقلاب عظیم وقوع پذیر ہوا۔ لوگوں کو اس امر کا احساس ہونے لگا کہ ایک بات کو صاف اور سچل طریقہ سے ادا کرنا نسبتاً اس سے بہتر ہے کہ ایسے پیچیدہ اور متصنع الفاظ کے گورکھ دھندے میں جکڑ دیا جائے اور مطلب بالکل خبط ہو جائے۔ اس ذہنی انقلاب کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ سوسائٹی نے اس قسم کے تمام لایعنی تکلفات کو مسترد کر دیا اور علی الخصوص " رعایتِ لفظی" کو متفق اللفظ ہو کر مردود قرار دیدیا ہے۔ جوش " شاعر انقلاب" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس سے یہ توقع تھی کہ چند قدم اور آگے بڑھ کر بعض دیگر بھی تکلفات کا استرداد کرے گا لیکن نہایت افسوس ہے کہ اس کی شاعری میں بھی بعض جگہ وہی شیخ ناسخ اور میاں امانت کی رعایتِ لفظی والی ذہنیت کارفرما نظر آتی ہے۔ بعض مثالیں نقل کی جاتی ہیں:۔

۱۔ آج تک غالب ہے ان پر وہ رقیب روسیاہ | کر چکا ہے زندگی جو میر و مومن کی تباہ
۲۔ وہ تیری پہلی ملاقات کی روپہلی رات | اُدھر تھا چاند ادھر دیدۂ پر آب ترا
۳۔ اشک بے سوز دروں پانی ہے ایماں کی قسم | قلب شبنم پر شعاعِ مہر تاباں کی قسم
۴۔ غم کے سکتے بہر زرتا کے بٹھائے جائیں گے | کب تک آخر ہم پئے عشرت رُلائے جائینگے
دام پر تا چند یوں دانے گرائے جائیں گے | آنسوؤں سے تاکجا موتی بنائے جائینگے
۵۔ ہر اک صدف ہے آنکھ میں آنسو بھرے ہوئے | یارب نزول قطرۂ نیساں کا واسطہ
۶۔ نہ ہوگا کوئی مجھ سا بھی تیرہ قسمت | کہ بازارِ شب میں سحر بیچتا ہوں،

رعایت لفظی کی ایک اور خرابی ایک عیب اس سے بھی زیادہ اہم ملاحظہ فرمائیے۔ مناجات، فریاد، نالہ و بکا ایسے مضامین ہیں جن میں خلوص، صدق اور سادگی ہی درحقیقت کلام کی جان ہوتی ہے لیکن جوش ان موضوعوں پر بحث کرتے ہوئے " صنعتِ ایہام" کا لحاظ رکھتے ہیں۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سراسر تصنع تر شح

ہونے لگتا ہے بعض مثالوں سے یہ مطلب واضح ہو جائے گا

ایک نظم کا عنوان ہے "التجائے مرگ" یہاں شاعر نے بارگاہ ایزدی میں مرگ کی درخواست کی ہے۔ مطلع ہے:-

کر قطع نخل عمر گلستاں کا واسطہ ! یارب بہارِ عالم امکاں کا واسطہ

تمام نظم میں مختلف اشیاء کا واسطہ دیکر خداوند عالم سے درخواست کی ہے کہ مجھے جلد از جلد موت آجائے لیکن ذرا اشعارِ ذیل بھی ملاحظہ فرمائیے :-

کام و دہن کو موت کی تلخی سے کر دو چار شکر فشانیِ لب خوباں کا واسطہ
اب طولِ زندگی سے مجھے کر نہ شرمسار بالیدگیِ زلفِ پریشاں کا واسطہ
دے روزِ تلخِ زیست کو اب حکم اختصار تجھ کو درازیِ شبِ ہجراں کا واسطہ
اب نشۂ حیات سے دے جوشؔ کو فراغ تجھ کو خمارِ نرگسِ جاناں کا واسطہ
چھلکا مری جبیں پہ عرق کربِ نزع کا رنگیں رخوں کی تابشِ افشاں کا واسطہ
اب فکرِ زندگی سے فراغت کی دے نوید شیریں لبوں کی مستیِ پیماں کا واسطہ

یہ وہ موقع ہے کہ جناب جوشؔ رب العالمین سے التجائے مرگ کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ التجا کرنے میں حرف حرف سے خلوص و صدق کی بو آنی چاہئے لیکن اس نظم کو پڑھتے ہی یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ شاعر کی نظر بجائے مناجات کے "رعایتِ لفظی" پر مرکوز ہے اور شروع سے آخر تک اس صنعت ہی کا لحاظ رکھے ہوئے ہے، دعا کا زیادہ خیال نہیں۔

ایک دوسری خرابی انگریزی کی ایک مثل ہے کہ کسی ایک جرم کے مرتکب ہونے کے معنی بالفاظ دیگر یہ ہوتے ہیں کہ دیگر مختلف النوع جرائم کا ارتکاب کرنا پڑے گا۔ بعینہٖ یہی حال اس جگہ ہے۔ رعایتِ لفظی کے چکر میں پڑکر ہمارے شاعر سے دیگر اہم فنی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ جن کی طرف اشارہ کر لینا لازمی ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اس تمام مناجات کا مخاطب خدا ہے۔ آپ جب کسی سے اپنے حوائج کی تکمیل کے لئے ملتجی ہوں اور ساتھ ہی ساتھ کسی شے کا واسطہ دیں تو آپ کی لیاقت و فرزانگی کا انحصار اس امر پر ہوگا کہ ایسی اشیاء کو واسطہ قرار دیں جن کا شخص مذکور پر نسبتۃً زیادہ اثر ہو اور جن کی سفارشات کو رد کرتے ہوئے اس کو جھجک محسوس ہو۔ یہاں خداوند عالم سے درخواست مرگ کی جارہی ہے اصولاً کچھ ایسی چیزوں کا واسطہ دینا چاہئے جو بارگاہِ ایزدی میں مقبول و پسندیدہ متصور کی جاتی ہوں لیکن جناب جوشؔ کن اشیاء کو واسطہ قرار دیتے ہیں؟ "شکر فشانیِ لبِ خوباں" "بالیدگیِ زلفِ پریشاں،" "درازیِ شبِ ہجراں" "رنگیں رخوں کی تابشِ افشاں" اور ان سب سے زیادہ دلچسپ "شیریں لبوں کی مستیِ پیماں" اور "مست انکھڑیوں کی جنبشِ مژگاں" کا واسطہ ہے۔ خود ہی فیصلہ کیجئے کہ خداوند عالم کو ان اشیاء کا واسطہ دینا فنی اعتبار سے کہاں تک صحیح ہے اور اس نظم سے کس حد تک بوئے اخلاص آتی ہے !!

"آرزوئے محروم" جوش کی مشہور نظم ہے جس میں انھوں نے اپنے محبوب سے ہجر و مفارقت کا شکوہ کیا ہے شروع یوں کیا ہے

فریاد ہے اے خلوتی پردۂ ناموس کب سے ہوں تری دھن میں گریبان دریدہ

ماہرین نفسیات اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ کسقدر نازک موقع ہے۔ محبوب کی جناب میں فریاد و التجا کی جارہی ہے۔ اپنا افسانۂ دل موثر ترین الفاظ میں پیش کرنا چاہیئے۔ ہر لفظ سے خلوص و صداقت ٹپکنا چاہیئے، بس یہ معلوم ہو کہ فریاد کرنے والا دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر اپنے دل کی کیفیات سادہ ترین الفاظ میں بیان کر رہا ہے۔ لیکن جوش صاحب کا رنگین قلم یہاں بھی "صنعت لفظی" سے نہیں چوکتا اور فرماتے ہیں:۔

سونے کو ترستی ہیں برستی ہوئی آنکھیں بیدار ہو اے ترکِ محبت بخشیدہ
وہ سجدہ کہ دل سر ہی نہیں روح بھی جھک جائے دے اذن اگر جنبشِ ابروئے خمیدہ

ہر شعر ایک خاص کیفیت کے ماتحت لکھا جاتا ہے، کبھی دل کو فرحت ہوتی ہے اور کبھی کلفت و افسردگی۔ لہذا شعر بھی ان مختلف کیفیات کا آئینہ دار ہونا چاہیئے۔ جوش کی ایک نظم کا پہلا مصرع ہے:۔ "اے یارِ دلنشیں، وہ ادا کون لے گیا" ظاہر ہے کہ یہ نظم عالم ہجر میں لکھی گئی ہے۔ محبوب کی دیرینہ عنایات یاد دلا کر اس کی موجودہ بے اعتنائی پر ملامت کی جارہی ہے۔ اس لئے اس میں بجز درد و مصیبت کی مخلصانہ کیفیات کے اور کچھ نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن بھلا کیا مجال کہ جوش صاحب "رعایتِ لفظی" کا لحاظ نہ رکھیں۔ چنانچہ رقمطراز ہیں:۔

اب جوش کے لئے ہیں نہ آنسو نہ آہِ سرد اس گلستاں کی آب و ہوا کون لے گیا؟

لسانی غلطیاں

عموماً جوش کا کلام لسانی نقطۂ نظر سے مستحسن اور مرجح سمجھا جاتا ہے لیکن یہ امر نہایت تعجب خیز ہے کہ وہ لسانی اغلاط سے بھی خالی نہیں بلکہ بعض غلطیاں تو ایسی ہیں کہ جوش جیسے عظیم المرتبت شاعر کے شایانِ شان نہیں۔ یہ غلطیاں کئی قسم کی ہیں۔ ایک تو وہ غلطیاں ہیں جو جوش نے عربی و فارسی سے کامل واقفیت نہ ہونے کے باعث کی ہیں مثلاً:۔

(۱) ایک نظم کا مطلع ہے:۔

اے نرگسِ جاناں یہ نظر کس کے لئے ہے؟ یہ شعلہ، یہ بجلی، یہ شرر کس کے لئے ہے؟

پھر ارشاد ہوتا ہے:۔

اے سایۂ کاکل میں جھمکتے ہوئے عارض! ظلمات میں یہ آبِ خضر کس کے لئے ہے؟
اے گیسوئے آشفتہ و اے کاکلِ برہم یہ عمرِ مسیحا و خضر کس کے لئے ہے؟

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

اس راستے کی شمع ہو روح الامیں کی سانس روشن کبھی ہوا نہ چراغ خضر یہاں (قافیہ نظر و سیر)

خضر بکسر خا و سکون ضاد بروزنِ عشق، یا بفتح خا و کسر ضاد بروزنِ خجل ہے۔ خضر بروزنِ شُتر یا خضر بروزنِ علل اُردو جہلا کا تلفظ ہے اور قبیح ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ تینوں جگہ جرکیب فارسی استعمال کیا ہے جو سراسر غلط ہے۔

(۲) ایک نظم کا پہلا مصرع ہے:- "یہ کس نے جوش کو بھیجے ہیں نازپرور پھول" قوافی میں مخمور، معطر وغیرہ پھر لکھتے ہیں:-

پلٹ کے اسے غلش نوکِ خار کے شاکی — اسے بھی دیکھ جیسے ڈس رہے ہیں کافر پھول

"کافر" بفتح فا نہ صرف غلط ہے بلکہ نہایت بھونڈا معلوم ہوتا ہے

(۳) سخت حیراں ہوں مگر اے اُمتِ بدر و حُنین — دیدنی تصویرِ غم کا شیشہ ہو خونِ حسین

"امتِ بدر و حنین" سے کیا مراد ہے؟ بدر اور حنین دو مقامات کے نام ہیں جہاں غزوات وقوع پذیر ہوئے ہیں ان کی امت سے کیا مفہوم ہے؟ جناب رسالتمآب صلعم یا حضرت علی کو "فاتح بدر و حنین" یا "شاہِ بدر و حنین" البتہ کہا جاتا ہے۔ لیکن اس نسبت سے مسلمانوں کو صرف "امتِ بدر و حنین" کہنا کسی طرح درست نہیں

(۴) توبہ توبہ، فصلِ گل ہیں اور میں توبہ کروں — میں کوئی کافر نہیں الحمد ربّ العالمیں

"الحمدللہ" یا "الحمد لربّ العالمین" کی بجائے "الحمد ربّ العالمین" کہنا صحیح نہیں۔

(۵) "سوگوارانِ حُسین سے خطاب":-

ابنِ کوثر پہلے اپنی تشنہ کامی کو تو دیکھ — اپنے ماتھے کی ذرا مہرِ غلامی کو تو دیکھ!

جناب رسول خدا صلعم کو (یا حضرت علی مرتضیٰ کو) ساقیِ کوثر کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ اسی لحاظ سے امام حسین کو علی الخصوص "ابنِ ساقیِ کوثر" کہتے ہیں بنظرِ تعمیم ہر سید کو "ابن ساقیِ کوثر" کہہ سکتے ہیں۔ "ابن کوثر" کوئی معنی نہیں رکھتا۔

دوسری قسم کی غلطیاں وہ ہیں جہاں جوش نے اُردو الفاظ کو روزمرہ کے خلاف یا غلط استعمال کیا ہے۔ مثلاً:-

(۱) کون بہتر ہے ایزد باری — ان کا تقویٰ کہ میری میخواری

"تقویٰ" اور "میخواری" غیر ذی روح اشیا ہیں۔ ان کے لئے "کون" کہنا غلط ہے "کیا" ہونا چاہئے۔ استفہامیہ ضمیر جب کسی غیر ذی روح کے لئے تنہا استعمال کی جائے (یعنی اس کے بعد کوئی اسم نہ ہو) تو "کون" نہیں کہتے بلکہ "کیا" کہتے ہیں۔ مثلاً ہم کہیں گے "اخبار یا رسالہ؟ کیا پڑھنا چاہئے؟" برخلاف اس کے ذی روح کے لئے کہیں گے "زید اور عمر وہیں کون زیادہ تیز ہے"

(۲) بیجا نہیں دل کا محو ہونا — کلیاں ہیں سفید، سبز دونا

دُونا بروزنِ ہونا غلط ہے۔ صحیح لفظ دونا بفتح دال ہے۔

(۳) "وقفۂ حاضر کو تاجِ زر پنہا چکنے کے بعد"۔ تاج پہنایا نہیں جاتا۔ اُڑھایا جاتا ہے۔ لباس وغیرہ پہنتے ہیں۔ تاج و کلاہ اوڑھتے ہیں۔

(۴) "روندتے ہیں جس کو چوپائے جھلستی ہے سموم"۔ "جھلسنا" فعل لازم ہے۔ یہاں اس کا محل نہیں۔ اس کی بجائے "جھلسانا" ہونا چاہئے جو فعل متعدّی ہے۔

(۵) کون یہ اُوڑھے کفن، تا حشر سونے کے لئے جا رہا ہے قبر کی خوراک ہونے کے لئے

موت ہے خوراک میری، موت پر جیتی ہوں میں

اُردو میں خوراک بروزن "سُراغ" مستعمل ہے۔ بروزنِ "طومار" خلاف روزمرہ ہے۔

(۶) وہ مرحمت میں غرق بڑھی بوڑھیوں کی ذات وہ کاٹنا ڈلی کا کہانی کے ساتھ ساتھ

ذات اور ساتھ ہم قافیہ نہیں ہو سکتے۔

افتراقِ محاورہ محاورات جس طرح روزمرہ کی گفتگو میں استعمال کئے جاتے ہیں اگر بعینہٖ اسی طرح نظم کئے جائیں تب ہی صحیح مانے جا سکتے ہیں۔ وگرنہ اس کو ہم محاورہ نہیں کہہ سکتے۔ بعض مقامات پر جناب جوشؔ اس امر کا بھی لحاظ نہیں رکھتے اور ایک محاورہ کو دو ٹکڑے کرکے بالفصل نظم کرتے ہیں جو غلط ہے۔ مثلاً "چال ڈھال" محاورہ ہے۔ جوشؔ صاحب لکھتے ہیں:۔

۱۔ چال انگریزی، ڈھال انگریزی جسم کا بال بال انگریزی!

بھول چوک ہونا روزمرہ کا محاورہ ہے۔ جناب جوشؔ لکھتے ہیں:۔

اک بے پناہ چوک ہے اک سخت بھول ہے (وفاق)

غیر مانوس الفاظ و تراکیب بعض مقامات پر اس قسم کے غیر مانوس الفاظ آتے ہیں جن سے تصنع ظاہر ہوتا ہے اور پڑھنے والے کو کوفت ہونے لگتی ہے۔ مثلاً:۔

۱۔ تو کہے دریا میں تھا غرقِ نمو یار کی کرّیل جوانی کا لہو،

تو یہ کہے کہ ہوش میں دنیا نہیں ہے آج

یہ دراصل "توگوئی" کا ترجمہ ہے لیکن فی زمانہ نہ صرف متروک ہے بلکہ مذاقِ سلیم کو ناگوار گزرتا ہے۔

یزداں شکار

(۱) نگاہ رو برو! اے روحِ نعمت داریں ہوش باش، کہ یزداں شکار ہیں ہم لوگ

(۲) ہر بات ایک افسوں، ہر سانس ایک جادو قدسی فریب مژگاں، یزداں شکار گیسو

(۳) چٹکی سے چھوڑنا وک ہستی شکار کو، مست انگھڑیوں کی جنبش مژگاں کا واسطہ

(۴) ظرفِ گلی میں آب وضو دیکھتا ہے کیا، آ، جامِ زر میں آتشِ دانا شکار دیکھ

(۵) تجھ سے آتا تھا پسینہ افسر داور نگ کو اے کہ ہمت تھی تری قوت شکن، دانا شکار

"یزداں شکار" پر رسالۂ نگار میں نیاز صاحب اور ڈاکٹر عندلیب شادانی کے مابین کافی بحث ہو چکی ہے جناب نیاز فتحپوری

کا خیال تھا کہ اس کے معنی ہیں "شکار یزداں"۔ لیکن ڈاکٹر عندلیب شادانی نے بالاسناد ثابت کر دکھایا کہ شکار کلمۂ فاعلی ہے لہٰذا اس کے معنے ہوئے "یزداں کو شکار کرنے والا"۔ حقیقتاً شادانی ہی کا خیال ٹھیک تھا۔ شکار کلمۂ فاعلی ہے۔ رومی:۔

بہ زیر کنگرۂ کبریائش مردانند فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

لیکن اس سے غالباً عندلیب شادانی کو بھی انکار نہ ہوگا کہ یہ تراکیب اُردو میں بالکل اجنبی اور غیر فصیح ہیں اور حقیقتاً "فصاحت شکار" ہیں۔

دیگر غیر فصیح الفاظ

اس کے علاوہ بھی مذکورۂ ذیل اشعار میں خط کشیدہ الفاظ پر غور فرمایئے کہ کس قدر تصنع سے لبریز ہیں اور خود ہی فیصلہ فرمایئے کہ یہ الفاظ و تراکیب ہماری زبان میں کس حد تک فصیح ہیں:۔

۱۔ یاد کر وہ دن برگِ جوش، جب رازو نیاز دورِ سوز و ساز میں تھے ترجمانِ یکدگر

۲۔ غور کر تو اک عفونت خیز لاشا تو نہیں،

۳۔ ہر جنبش نگاہ ہے اک انقطاع فصل

۴۔ کندہ ہے اس ظرفِ اشکستہ پہ یارب کس کا نام

۵۔ صدائے نے سے پریشاں تھے شیروانِ جہاں لوائے مہر سے لرزاں تھے قاطعانِ طریق

تضادِ بیان

قرآن مجید میں شعرا کے متعلق مرقوم ہے کہ "انہم فی کل وادٍ یہیمون" یعنی وہ مختلف وادیوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ کم از کم جوش کے بارے میں بعض جگہ یہی قول صادق آتا ہے۔ ایک مقام پر خود بھی اعتراف کیا ہے:۔ گونجی ہوئی ازل سے ہے گلبانگ بیخودی یعنی حدیثِ عقل نہیں معتبر یہاں

لیکن ایک وہ شخص جو مستقل فلسفۂ حیات پیش کرنے کا دعویٰ رکھتا ہو جس کو ادعا ہو کہ شاعر حقیقت میں وہ ہو سکتا ہے:۔

جس کا دل ہو در حقیقت وہ رصدگاہ عظیم جو ہو فطرت کی ہر اک کروٹ کا ہمراز و ندیم

اُس کے کلام میں قدم قدم پر تضاد و تناقص پایا جانا فی الحقیقت استعجاب انگیز ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ بعض جگہ ایک ہی نظم میں دو متناقض یا غیر مربوط بیانات نظم کر دئے گئے ہیں بعض مثالیں تحریر کی جاتی ہیں۔ "پہلی مفارقت" جوش کی نہایت مقبول نظم ہے۔ اُس کو اس طرح شروع کیا ہے:۔

چاند سے عہدِ وصل کی باتیں ہائے فرقت کی چاندنی راتیں
کوئی کافر ہی شب کو سوتا ہے رات بھر دل میں درد ہوتا ہے
کچھ وہ تکیوں سے آتی ہے خوشبو نیند آتی نہیں کسی پہلو

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

مُرغ جب صبح کو جگاتے ہیں جو سنتے ہی وہ یاد آتے ہیں

دیکھئے، شروع میں تو لکھا ہے کہ "کوئی کافر ہی شب کو سوتا ہے" اور "نیند آتی نہیں کسی پہلو" لیکن پھر اس کے کیا معنی ہوتے ہیں کہ "مرغ جب صبح کو جگاتے ہیں" "چونکتے ہی الخ" بھلا جب نیند آتی ہی نہیں اور شب کو سوتے ہی نہیں تو مرغ جگاتے کیونکر ہیں؟ اور ایک "شب بیدار" کا خواب سے چونکنا کیا معنی رکھتا ہے؟

۲- ایک نظم کی ابتدا یوں کی ہے:-

اے نرگسِ جاناں یہ نظر کس کے لئے ہے؟ یہ شعلہ، یہ بجلی، یہ شرر کس کے لئے ہے؟

جس میں چشمِ محبوب کے شعلہ، بجلی، شرر پر زور دیتے ہوئے ایک نہایت ہی خوفناک اور مہیب شئے ثابت کیا ہے لیکن پھر لکھتے ہیں:-

اے دیدۂ مے پرور و اے نرگسِ مخمور چھلکا ہوا یہ ساغرِ زر کس کے لئے ہے

یہاں نہایت مناسب اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ اس سے قبل تو شعلہ، بجلی اور شرر سب ہی کچھ محبوب کی نگاہ سے ٹپک رہے تھے لیکن یکایک وہی نگاہ "مے پرور" اور "مخمور" کیسے ہو گئی۔

۳- ایک نظم کا مطلع ہے:-

ہنوز عشق و محبت کی شان باقی ہے وہی زمین وہی آسمان باقی ہے

جس سے مستنبط ہوتا ہے کہ عشق و محبت کی گزشتہ کیفیات میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا ہے۔ لیکن بعد میں تحریر فرماتے ہیں:-

جفا کا اب نہیں اگلا سا بانکپن قایم مگر وفا کی وہی آن بان باقی ہے

وہ جوش چھوڑ چکے ناوک افگنی پھر بھی چمکتا تیر، لچکتی کمان باقی ہے

بالفاظ دیگر، محبوب نے اپنا گزشتہ رویہ بالکل تبدیل کر دیا ہے۔ اس سے پیشتر وہ جفائے شدید کیا کرتا تھا (جو غالباً عاشق کے لئے لذت بخش تھی) لیکن اب اس نے اس روش سے قطعاً کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔ ذرا ان اشعار کو مطلع مذکور (ہنوز عشق الخ) سے منطبق کیجئے اور ملاحظہ کیجئے کہ معانی میں کس قدر زبردست تناقص ہے۔ وہاں لکھا ہے کہ حالات بدستور ہیں لیکن ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ محبوب نے اپنا گزشتہ رویہ بالکل تبدیل کر دیا ہے۔ مگر اس سے بھی زیادہ دلچسپ شعر یہ ہے:-

وہاں جفا ہی جفا رہ گئی ہے مدت سے یہاں جفا پہ وفا کا گمان باقی ہے

اعتراض یہ ہے کہ ابھی تو فرما چکے ہیں کہ "جفا کا اب نہیں اگلا سا بانکپن قایم" اور محبوب نے ناوک افگنی چھوڑ دی ہے یعنی ظلم نہیں کرتا لیکن اب کہتے ہیں کہ "وہاں جفا ہی جفا رہ گئی ہے مدت سے"۔ کیا یہ تعجب خیز تضاد نہیں ہے؟

اب ہم ان متناقص بیانات کی جانب اشارہ کریں گے جو ایک ہی نظم میں تو نہیں لیکن مختلف مقامات پر پائے جاتے ہیں۔ حقیقتاً یہ بھی اسی قدر قبیح ہے۔ جو شاعر ایک مستقل پیام کا مدعی ہو اس کو لازم ہے کہ جس جگہ کوئی بات کہے اپنا اصول مدنظر رکھے ورنہ شاعری کے مخالفین کہہ اٹھیں گے کہ "دروغ گو را حافظہ نہ باشد"۔ بہرحال وہ متضاد اور غیر مربوط بیانات یہ ہیں:-

۱۔ مومنانِ لکھنؤ سے خطاب فرماتے ہیں:۔

ممبر سبطِ نبی پر اور سیاسی شور و شین مجھ سے آنکھیں تو ملاؤ سوگوارانِ حسین

یعنی مجالسِ عزا میں سیاسی مسایل پر مباحثہ و مناظرہ کرنا جوش کے زاویۂ نگاہ کے مطابق مکروہ اور قبیح ہے لیکن جوش کا ایک سلام ہے (جو یقیناً مجالس عزا میں پڑھنے کے لئے ہی لکھا جاتا ہے) اس میں فرماتے ہیں:۔

بستۂ زنجیر محکومی خبر بھی ہے تجھے مہر و مہ پر تجھ کو عزم حکمرانی چاہئے

کوئی پوچھے کہ یہ سب "سیاسی شور و شین" نہیں تو اور کیا ہے؟

۲۔ ایک جگہ عاشقانہ وقار و خودداری کی تصویر یوں پیش کی ہے:۔

میرے جلسے سے اُٹھ آنے پر خفا ہو ہمنشیں! شاعروں کی فطرتِ عالی سے تو واقف نہیں؟

دل ہمارا جذبۂ غیرت کو کھو سکتا نہیں، ہم کسی کے سامنے جھک جائیں ہو سکتا نہیں

اہلِ دنیا کیا ہیں اور اُن کا اثر کیا چیز ہے؟

ہم خدا سے ناز کرتے ہیں بشر کیا چیز ہے؟

اسی طرح ایک دوسری جگہ لکھتا ہے:۔

کیا دیکھتا ہے زُہد کے کوچے میں رعبِ شیخ کوئے مغاں میں جوش کا عز و وقار دیکھ!

پڑھنے والا اس "فطرتِ عالی" اور "عز و وقار" سے بیحد مرعوب ہو جاتا ہے کہ "دل ہمارا جذبۂ غیرت کو کھو سکتا نہیں" لیکن بعض دوسرے مقامات پر اس "فطرتِ عالی" کا مظاہرہ اس طرح کیا گیا ہے (خط کشیدہ ٹکڑے قابلِ لحاظ ہیں):۔

مزاج پوچھ کے اے شاہِ عارض و کاکل گدائے راہ کی بھی آبرو بڑھاتا جا

اگر یہ لطف گوارا نہیں، تو مستِ خرام جبینِ جوش پہ ٹھوکر ہی اک لگاتا جا

پھر آرزوئے شرکتِ بزمِ جمال ہے پھر اہتمام خدمتِ درباں ہے آجکل

بعض دیگر معنوی غلطیاں ملاحظہ فرمایئے:۔

دیکھ کیونکر جی رہا ہوں دلربا تیرے لئے! ہر نفس ہے اک حدیثِ کربلا تیرے لئے

ڈھونڈتا پھرتا ہوں میں اپنے کو تیری راہ میں پوچھتا پھرتا ہوں میں اپنا پتا تیرے لئے

جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انتہائی کرب و اضطراب کا عالم ہے اور ساتھ ہی ساتھ مدہوشی، بدحواسی اور خود فراموشی کی یہ کیفیت ہے کہ اپنا پتہ معلوم نہیں۔ لیکن پھر فرماتے ہیں:۔

آہ، گو اک عمر سے ہوں میں رئیس ابنِ رئیس بن کے نکلا ہوں گدائے بے نوا تیرے لئے

چاک کر کے میں نے آبائی امارت کا لباس زیبِ تن کی ہے غلامی کی قبا تیرے لئے

یہاں نہایت ہی برمحل اور معقول اعتراض یہ ہوسکتا ہے کہ ایک عاشق جو بیحد مضطرب اور بیچین ہے اور جس کی مدہوشی اور خود فراموشی کا یہ عالم ہے کہ اپنا پتہ بھی دوسروں سے پوچھتا پھرتا ہے اس کے متعلق یہ کہنا قطعاً خلافِ واقعیت ہے کہ وہ دعویٰ کرتا ہوگا کہ "میں رئیس ابن رئیس ہوں" اور "میری آبائی امارت چنیں اور چناں تھی" ہر وہ شخص جو نفسیاتِ انسانی سے واقفیت رکھتا ہے دل میں فیصلہ کرسکتا ہے کہ یہ سب کس حد تک ہے !! مولانا جامی نے صحیح کہا ہے:-

بندۂ عشق شدی، ترکِ نسب کن جامی کیں دریں راہ فُلاں ابنِ فُلاں چیزے نیست!

بعض مقامات پر بیان نہایت غیر مربوط ہے مثلاً:-

(۱) اے نرگسِ جاناں یہ نظر کس کے لئے ہے؟ یہ شعلہ، یہ بجلی، یہ شرر کس کے لئے ہے؟
اے زہرہ جبینوں کے لئے پیکِ ہزیمت پیغامبرِ فتح و ظفر کس کے لئے ہے
اے تجھ کو ملے عمر مری شامِ بلا کی یہ زلفِ رسا تا بہ کمر کس کے لئے ہے

شروع میں ظاہر ہوتا ہے کہ نرگسِ جاناں (یعنی چشمِ محبوب) سے خطاب کیا جارہا ہے۔ لیکن تیسرا شعر بھی ملاحظہ فرمائیے کہ (اے تجھ کو ملے عمر الخ) اور غور فرمائیے کہ چشمِ محبوب کو یہ دعا دینا کس حد تک مناسب ہے۔ درا صل اس مصرع کا مخاطب خود محبوب ہے لیکن اس تبدیلِ تخاطب کی تصریح لازمی تھی جو یہاں نہیں کی گئی ہے۔ یہ خامی جوش کی متعدد نظموں میں پائی جاتی ہے:-

(۲) کیونکر نہ کروں شکر خدائے دوجہاں کا بخشا ہے مرے دل کو مزہ سوزِ نہاں کا
یکساں ہے مسرت کا محل ہو کہ فغاں کا ہو نارِ جہنم بھی تو لطف آئے جناں کا
ہوتی ہے خوشی صحت و آزار سے مجھ کو
خلعت یہ ملا ہے تری سرکار سے مجھ کو (آوازۂ حق)

ابتدا میں خدائے دوجہاں صیغۂ واحد غائب میں ہے لیکن پھر تیسرے مصرع میں "تیری سرکار" سے کیا مراد ہے۔ اگر یہ بھی خدا سے خطاب ہے تو وہی متذکرۂ بالا عیب یہاں بھی موجود ہے یعنی تبدیلِ تخاطب کی ہے لیکن اس کی تصریح نہیں کی گئی۔

(۳) "قتل کا تیور" اے سیہ رو، بے حیا، وحشی، کمینے بدگماں اے جبینِ ارض کے داغ، اے دنیٔ ہندوستاں
تجھ کو عورت نے جنا ہے؟ جھوٹ ہے یہ اے لعیں! آدمی کی نسل سے اور تو، نہیں ہرگز نہیں!

یہاں مخاطب ہندوستان ہے مگر ہندوستان کو "عورت نے جنا ہے اور "آدمی کی نسل سے تو نہیں" کہاں تک موافقِ عقل ہے؟ ہندوستان ایک ملک کا نام ہے۔ اس کا نسل آدم سے ہونا یا نہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ مزید براں لفظِ "جنا" نہایت عامیانہ لفظ ہے فصحا کی زبان پر رائج نہیں اور سب سے زیادہ دلچسپ تو یہ مسئلہ ہے کہ ہندوستان کو عورت نے جنا ہے یا نہیں!

تکرار و بے ترتیبیِ بیان | شاعر کا کمال یہ ہے کہ جس شے کا تذکرہ کرے اس کا نقشہ اس طرح کھینچ کرے کہ آنکھوں

کے سامنے اس کی تصویر من وعن کھنچ جائے۔ تبئین کلام میں اس کا بھی لحاظ رکھنا چاہئے کہ جو شے نسبتاً زیادہ اہم اور مرجح ہے اس پر خاص زور ڈالا جائے اور غیر ضروری اور لایعنی اُمور کو نظر انداز کردیا جائے۔ اسی طرح تقدم و تاخر کا بھی لحاظ کرنا ضروری ہے، یعنی اول ضروری اور لازمی اشیاء کا ذکر کردیا جائے بعدہٗ غیر ضروری اور فرعی کا، ساتھ ہی ساتھ اس امر کا بھی خیال رکھنا ازبس لازمی ہے کہ مضامین کا اعادہ و تکرار نہ ہونے پائے۔ جوشؔ کے یہاں بعض نظموں میں یہ باتیں مفقود نظر آتی ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص فنِ تبئین سے ناواقف ہے اور جو شے پیشِ نظر ہے اس کو نہایت بے ترتیبی کے ساتھ بیان کر رہا ہے۔ مثلاً جوشؔ نے "مولوی" کا حُلیہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے:۔

۱-	ہوئی اک مولوی سے کل ملاقات	شبیہ قبہّ و تصویرِ منبر
۲-	وہی ہوں گے جو فردوسِ بریں میں	خدا کے فضل سے حوروں کے شوہر
۳-	عمامہ برسر و مسواک درجیب	اُٹنگا پاجامہ، دلق دربر
۴-	حنا سے ریش سرخ، آنکھوں میں سرمہ	لٹیں مہکی ہوئیں، زلفیں معطر
۵-	جھکے شانے پہ چوخانے کا رومال	عبا کے بند میں تسبیح احمر
۶-	کشادہ صدر اور کوتاہ گردن	شکم پر رعب، قد رشکِ صنوبر
۷-	لٹیں مہکی ہوئیں، آنکھوں پہ عینک	لبیں ترشی ہوئیں، داڑھی شکم پر
۸-	عبا عناب گوں داڑھی عمامہ	گلوری منہ میں، لب خونِ کبوتر

یہاں مولوی سے ملاقات کا تذکرہ تو مقصود نہیں۔ محض اس پر تضحیک و استہزا کرنا اور اس کا استخفاف منظور ہے۔ اسی غرض سے اُس کا "حلیۂ عجیب" بیان کیا ہے لیکن ایک نظرِ غائر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیان میں جابجا بے ترتیبی اور تکرار عیاں ہے۔

سب سے پیشتر آپ "مولوی" کی شکل و شباہت پر غور فرمائیے۔ اس پر نظر پڑتے ہی جوشؔ صاحب کے ذہن میں ایک تشبیہ آئی کہ اس مولوی کا تن و توش قبہّ و منبر سے متشابہ ہے۔ اس تشبیہ کا بہترین استعمال یہ ہوتا کہ جب مولوی کا حُلیہ بیان کر لیتے تو تاثیرِ کلام کے لئے اس تشبیہ کا بھی اضافہ کر دیتے لیکن جوشؔ صاحب نے سب سے پہلے اس تشبیہ ہی کو نظم کیا ہے جو فنی اعتبار سے بالکل بے محل ہے

پھر اس کی ہیئت کی جو تصویر پیش کی ہے اس میں بھی بعض جگہ بالکل لایعنی اُمور معرضِ بحث میں آگئے ہیں۔ جو فنِ تبئین کے خلاف ہے۔ مولوی کے جسم و صورت پر بحث کی جا رہی ہے۔ اس ضمن میں یہ کہنا کہ

وہی ہوں گے جو فردوسِ بریں میں خدا کے فضل سے حوروں کے شوہر

مولوی کے خلاف نفرت و استکراہ اور خشونتِ انتقام کے جذبہ کا البتہ مظہر ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ صرف یہ معلوم

ہوتا ہے کہ شاعر کو اس مولوی سے کوئی خاص عناد ہے اور معاندانہ چشمک کی بنا پر اس کی تذلیل کے در پے ہے۔ وگرنہ اصل مقصد (یعنی مولوی کی شکل و شباہت کی مرقع کشی) سے اس شعر کو کوئی لگاؤ نہیں

اس کے بعد مولوی کا حُلیہ بیان کرنا شروع کرتے ہیں۔ اس کے "فرقِ راس" کے ذکر سے ابتدا کی جاتی ہے اور کہتے ہیں کہ اس کے سر پہ عمامہ تھا۔ اس کے بعد لازم تھا کہ اس کے چہرے وغیرہ کا ذکر کیا جاتا لیکن فوراً ہی "مسواک اور جیب" کہہ کر قارئین کی توجہ جیب کی طرف منعطف کر دی جاتی ہے۔ جیب کے بعد پائجامہ کا تذکرہ فرماتے ہیں۔ پڑھنے والا منتظر ہے کہ اب جوتے وغیرہ کا ذکر کیا جائے گا۔ لیکن یکایک "بہ ہمہ ادائے بے ترتیبی" مولوی صاحب موصوف کی دلق پوشی پر بحث چھڑ جاتی ہے۔ اُصولاً ریش و چشم کا ذکر عمامہ کے بعد فوراً ہی ہو جانا چاہئے تھا جہاں مسواک جیسی لایعنی شے کا بالکل بے محل ذکر کر دیا گیا ہے۔ بہر حال لب شکل و شباہت کی خصوصیات بیان کرتے ہیں کہ سرخ داڑھی، آنکھوں میں سرمہ، معطر گیسو، کاندھے پہ رومال، چوڑا چکلا سینہ، کوتاہ گردن، توندیلا پیٹ وغیرہ وغیرہ

غالباً قارئین سمجھے ہوں گے کہ چہرہ کی خصوصیات بیان کی جا چکیں کیونکہ اب رومال، عبا، تسبیح وغیرہ کا ذکر شروع ہو گیا ہے۔ لیکن نہیں، چشم و گیسو جن پر شعر نمبر ۸ میں "نگاہ مصورانہ" ڈالی جا چکی تھی پھر دوبارہ (نہ معلوم کیوں) تزئین کلام کے دوران میں شعر نمبر ۷ و نمبر ۸ میں جاگزیں ہوتے ہیں۔ اگر گیسوؤں کی مہک کے ساتھ ہی ساتھ اُن کی "پریشانی" کا بھی ذکر ہو جاتا اور جہاں داڑھی کے "احمریں" ہونے کا ذکر کیا گیا ہے وہیں اس کا شکم پر رعب پہ دراز ہونا بھی بیان کر دیتے تو یک گونہ تسلسل اور ترتیب ظاہر ہوتی۔ بصورت موجودہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو ترتیب بیان اور تسلسل کا مطلق لحاظ نہیں۔

بعینہ اسی طرح عبا، عمامہ اور لبوں کا ذکر شعر نمبر ۳ و نمبر ۵ میں کیا جا چکا ہے جہاں ان اشیاء کی بعض خصوصیات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اب شعر نمبر ۷ و نمبر ۸ میں مکرر ان کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اس قسم کی بے ترتیبی نہ صرف خلافِ فصاحت ہے بلکہ پڑھنے والے کی کوفت کا باعث ہوتی ہے

شاعرانہ مصوری کا ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ جہاں کسی شے کا ذکر کیا جائے تو اس کے ساتھ ہی ساتھ اُس کی مابہ الامتیاز خصوصیات کا بھی ذکر کر دیا جاتا ہے تاکہ وہ تصویر مکمل متصور کی جائے۔ جوشؔ کے یہاں بعض جگہ اس خوبی کا بھی فقدان ہے مثلاً عبا کا ذکر شعر نمبر ۸ میں کیا ہے۔ لیکن اس کے بند میں جو تسبیح آویزاں تھی اس کا شعر نمبر ۵ ہی میں تذکرہ کیا جا چکا۔ گویا ابھی یہ بتایا نہیں کہ وہ عبا کس وضع و قماش کی تھی لیکن اس کے لوازمات میں سے ایک شے کا پیشتر ہی ذکر کر دیا۔ یونہی شعر نمبر ۷ میں لبوں کی کیفیت بیان کی ہے لیکن ریشِ دراز، عبا اور عمامہ کا بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ لب خونِ کبوتر کی مانند سُرخ بھی تھے۔ اس افتراقِ بیان سے بجز بے ترتیبی کے اور کچھ تو حاصل نہیں ہوا۔ یہ عیب جوشؔ کی موجودہ نظموں میں علی الخصوص پایا جاتا ہے

بھونڈی تشبیہات | تشبیہ کا حُسن اور اس کی لطافت اس نکتہ میں مضمر ہے کہ مشبہ بہ اس قدر نفیس منتخب کیا جائے

جس کے باعث شئے مشبّہ لطیف تر ہو جائے اور دنیا کی نگاہ میں اس کا حسن دو بالا ہو جائے۔ جوشؔ کے یہاں بعض جگہ اس نکتہ کو نہیں ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اور بعض تشبیہات نہایت غیر شاعرانہ اور بھونڈی ہیں مثلاً:-

نرم ہو جاتا ہے پُلٹس سے جو پک کر پھوڑا — بیشتر نشترِ براں سے ہوتا ہے فگار
فرشِ گل کی یونہی ہو جاتی ہو خوگر جو قوم — ہوتا پڑتا ہے اُسے خارِ مغیلاں سے دوچار
پھاڑتے ہی جیسے میلا چیتھڑا اُڑتی ہو گرد — یونہی وہ دو شخص جو ایک دوسرے سے ہیں خفا
گفتگو کرتے ہیں جب آپس میں ازراہِ نفاق — دیکھتا ہوں اُن کے ہونٹوں سے غبار اُٹھتا ہوا
صبح کے ہنگام جیسے مدرسے کی گھنٹیاں — طفل کے ذوقِ شکر خوابی کو کرتی ہیں نڈھال
یونہی بے تاب و تواں بچوں کے مفلس باپ کی — نیند اُڑا دیتا ہے اے عوابِ اجل! تیرا خیال،
اس طرح تیرگی میں ہوتا ہے — خوف کا قلبِ طفل میں آغاز
جس طرح رات کی خموشی میں، — سائیکل کی اُستار پر آواز

موٹر

جیسے موٹر کی گریزاں روشنی سے راہ میں — نصف لمحے کے لئے ظلمت پہ چھا جاتا ہے نور
یونہی چھو جاتی ہے دم بھر کے لئے موجِ سرور — سرمدی آلام کے مارے ہوئے انسان کو
غبار اک دوسرے پر پھینکتے ہیں تیز رو موٹر — مخالف سمت سے ہمدوش ہو کر جب گزرتے ہیں
یونہی دو بدگہر اشخاص، جب آپس میں ملتے ہیں — نئی تاریکیاں اک دوسرے سے اخذ کرتے ہیں
شاد و فرحاں ہیں نئے احباب تیرے لطف سے — سرد مہری سے قدیم احباب کا رُخ زرد ہے
یہ تری صورت ہو ایسے تیز رو موٹر کی طرح — جس کے آگے روشنی ہے اور پیچھے گرد ہے
وقتِ شب کچھ اور بھی تاریک کر جاتا ہو یوں — اپنی چمکائی ہوئی ظلمت کو موٹر کا غبار
جس طرح کاندھے پہ رکھ کر ہاتھ دم بھر کو خوشی، — دوشِ پر غم کا نیا اک اور رکھ جاتی ہے بار
شب کو اک پرسکون محفل کا — آ کے موٹر مٹا گیا یوں ناز
جس طرح آئے وقتِ بادہ کشی — کان میں مے فروش کی آواز

نسائیت

فصاحت کا خاص عنصر یہ ہے کہ مرد و زن، طفل و جوان، شیخ و شاب ہر ایک کی گفتگو نیچرل طریقہ کے مطابق نظم کی جائے تاکہ واقعیت مترشح ہو۔ جوشؔ نے بعض جگہ اس امر کا بھی لحاظ نہیں رکھا ہے۔ اور مرد کی گفتگو نظم کرتے ہوئے نسوانی الفاظ و محاورات استعمال کر گئے ہیں مثلاً:-

۱- تیغِ بُرّاں اور عورت کا گلا، او بدصفات — چھوٹ جائیں تیری نبضیں، ٹوٹ جائیں تیرے ہاتھ
۲- مرد ہو تو اُس سے لڑ پہلے جو مارے پھر مرے — تو نے بچوں کو چبا ڈالا، خدا غارت کرے

(مسلسل کانپور)

۳- کھائے جاتا ہے کوئی سینے کو آگ لگ جائے ایسے جینے کو (پہلی مفارقت)

خاتمہ لیکن حقیقت امر یہ ہے کہ اس قسم کے تسامحات سے جوش کے کمالاتِ شاعری میں کچھ زیادہ فرق نہیں پیدا ہوتا اس نوع کے اسقام سے کسی شاعر کا کلام خالی نہیں۔ فردوسی سے بڑھکر کون قادر الکلام ہوگا، متاخرین میں قاآنی کا جواب نہیں لیکن ان دونوں کے کلام میں اس قسم کی بے اعتدالیاں کثرت سے ہیں۔ اُردو شاعری میں میرانیس کی مثال پیش کی جاسکتی ہے کہ ان کے مسلمہ کمالات و محاسن کے باوجود، ایک غیر جانبدار نقاد کو ان کا کلام بھی اغلاط سے پاک نہیں نظر آتا۔ یہی حال جوش کا ہے بلکہ اس کے کمالات شاعری بڑی حدتک اس کے اکثر مسامحات کی پردہ پوشی کر لیتے ہیں اور پڑھنے والا ایک خاص استغراق و محویت کی کیفیت محسوس کرنے لگتا ہے اور یہ وہ اختصاص ہے جو جوش کے اکثر معاصرین میں مفقود ہے۔ دوسرے شعرا تقلید کے دائرے سے باہر نہیں نکلتے لیکن جوش کا ایک مخصوص رنگ ہے اور یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اس میں وہ ایک حدتک کامیاب ہے:-

مُرغانِ خوش آہنگ اندر باغِ سخن لیکن
نالیدنِ ایں بلبل شور دگرے دارد

یوسف رضا بدایونی
(ممتاز ہاؤس - علی گڈھ)

(**نگار**) اس مضمون کی کتابت ہو ہی رہی تھی کہ ڈاک سے ہمیں ایک تحریر موصول ہوئی جس میں یہ نہایت دلدوز خبر درج تھی کہ نوجوان مقالہ نگار دفعتہً ۳ ستمبر کو ریل سے کٹ کر مر گئے

مرحوم مسلم یونیورسٹی کے نہایت ہونہار طالب علم تھے اور حال ہی میں انھوں نے نہایت اعزاز کے ساتھ وہاں سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی تھی ــــــ مرحوم کی والدہ پر اس حادثہ سے قبل ہی غم والم کی خاص کیفیت طاری تھی اور جس وقت تار پہونچا تو وہ مبہوت ہو کر رہ گئیں۔ یقیناً کوئی اس غم کا اندازہ نہیں کر سکتا جو ماں کو اپنے جوان بیٹے کی ایسی اچانک موت کی وجہ سے پہونچنا چاہئے اور اس پر جتنا اظہار افسوس کیا جائے کم ہے، لیکن اس کا کیا علاج کہ فطرت جس کے پنجے اور دانت ہمیشہ خون سے رنگین رہتے ہیں، سخت بے رحم ہے اور اس کا مقابلہ پتھر کا کلیجہ بنانے ہی سے ہو سکتا ہے

مرحوم کا یہ غالباً پہلا انتقادی مقالہ ہے جو نگار میں شایع ہوا ہے اور اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نوجوان ادیب میں ترقی کے کتنے امکانات پوشیدہ تھے جو افسوس ہے کہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئے۔ ہمیں مرحوم کے اعزہ و پسماندگان اور خصوصیت کے ساتھ ان کی سوگوار ماں کے ساتھ دلی ہمدردی ہے لیکن سوائے اس کے کہ صبر و ضبط کی لاحاصل تلقین کریں اور کیا کر سکتے ہیں ــــ

"چالیس" کی اہمیت مذاہب عالم میں

"چالیس (۴۰) کے ہندسے کو تمام اقوام و مذاہب میں خاص اہمیت حاصل ہے، چنانچہ مرنے کے بعد چہلم کی رسم، ریاضت و عبادت میں چلہ کشی (یعنی چالیس دن کا اعتکاف)، رسول اللہ کا چالیس سال کی عمر میں مبعوث ہونا، سورۂ احقاف میں اربعین (۴۰ سال) کا ذکر، ایام نفاس کے لئے ۴۰ دن کی تعیین، یہ وہ تمام باتیں ہیں جن سے ہر مسلمان واقف ہے
اسی طرح یہودیوں کے مذہبی لٹریچر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل ۴۰ سال تک خانماں برباد پھرائے ایلیا نبی کو ۴۰ سال تک کووں نے غذا پہونچائی، جس بارش سے طوفان نوح پیدا ہوا وہ بھی چالیس دن تک قایم رہی۔ مصر قدیم میں بھی لاش کی مومیائی کے لئے ۴۰ دن کی مدت مقرر تھی اور انگلستان کے عہد وسطی میں بھی قتل انسان کے جرمانہ کی ادائی کے لئے ۴۰ دن کی میعاد مقرر تھی، جنگ کے دوران میں فریقین کو آرام لینے کے لئے ۴۰ ہی دن کا وقت ملتا تھا اور دارالعلوم کے التوا کے بعد ممبران پارلیمنٹ کو جو مہلت ملتی تھی وہ بھی ۴۰ دن کی ہوتی تھی۔ لیکن ایسا کیوں ہے، دنیا کے تمام اقوام میں ۴۰ کو یہ اہمیت کیوں حاصل ہے اور یہ واقعہ ہماری تحقیق کو ہمیں کس نتیجہ پر پہونچاتا ہے۔ اس پر اس وقت تک کسی نے توجہ نہیں کی۔

یہ تھا وہ معمہ جواب سے تقریباً تیس سال قبل مسٹر ام۔ اس اڈورڈس نے انجمن علم الانسان کے جلسہ میں پیش کیا تھا اور اب مسٹر ریھو نے کامل تحقیق و تفتیش کے بعد ایک مقالہ کے ذریعہ سے اس پر روشنی ڈالی ہے

اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۴۰ کی اہمیت مسلمانوں اور یہودیوں کی طرح زردشتیوں، ہندؤں اور عیسائیوں میں بھی پائی جاتی ہے اور یقیناً یہ ثبوت ہے اس امر کا کہ مشرق و مغرب کی اقوام کا استھان کسی وقت ایک ہی تھا اور یہی سبب ہے کہ بعض روایتیں اور قصے کہانیاں ان سب میں مشترک پائی جاتی ہیں

سب سے پہلے آپ توریت کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ:— طوفان نوح لانے والی بارش ۴۰ دن تک جاری رہی۔ طوفان کے ۴۰ دن کے بعد پہاڑ کی چوٹی نظر آئی — یعقوب کی لاش میں مسالہ لگانے کے لئے ۴۰ دن درکار ہوئے۔ موسیٰ ۴۰ دن تک کوہ حوریب پر بھوکے پیاسے پھرتے رہے — موسیٰ نے چالیس چالیس دن کے دو روزے رکھے۔ ایلیا نبی چالیس دن تک بے آب و دانہ رہے — یہودا کے ۴۰ سالہ گناہ کی یاد میں Elizah ۴۰ دن تک

داہنی کروٹ سے لیٹے رہے۔ Goliath نے اسرائیل فوجوں کا ۴۰ دن مقابلہ کیا۔ نینوا کو توبہ کے لئے ۴۰ دن دئے گئے۔ لڑکا پیدا ہونے کے بعد ۴۰ دن اور لڑکی پیدا ہونے کے بعد ۸۰ دن نفاس کے مقرر کئے گئے۔

کی عمر ۴۰ سال کی تھی جب وہ بطور جاسوس کے روانہ کئے گئے۔ بنی اسرائیل ۴۰ سال تک جنگلوں میں پھرتے رہے۔ بنی اسرائیل کو اہل فلسطین نے ۴۰ سال تک پریشان رکھا۔ سلیمان، داؤد اور Joash نے ۴۰ سال تک حکومت کی۔ یعقوب نے Esau کو ۴۰ گائیں تحفہ میں بھیجیں۔ اسی طرح کے اور بہت سے واقعات توریت میں ایسے درج ہیں جن سے ۴۰ کے عدد کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ زردشت نے ۴۰ سال کے بعد تبلیغ شروع کی۔ ۴۰ دن تک مسلسل اہورا مزدا کے اسماء کا ورد پارسیوں کے نزدیک بہت مفید خیال کیا جاتا ہے۔ سال کے ۳۶۴ ایام کو وہ چلوں میں تقسیم کرتے ہیں اور مذہبی رہنما کو یہ خدمت قبول کرنے سے بھی ۴۰ دن ریاضت کرنا پڑتی ہے

ہندوؤں کے یہاں بھی عورت کے ایام نفاس کے لئے ۴۰ دن مقرر ہیں۔ سندھ کے ہندوؤں میں رواج ہے کہ بچے کی ناف کاٹ کر اسے ۴۰ دن تک ماں کے سرہانے رکھتے ہیں۔ ویدک طریق علاج میں کایا پلٹ کے لئے ۴۰ دن درکار ہوتے ہیں شہزادے کے چالیسویں دن شمبر سے اندر کی ملاقات ہوئی۔ عیسوی روایات میں بھی ۴۰ کا ذکر بہ کثرت نظر آتا ہے۔ مسیح کی ولادت کے ۴۰ دن بعد مریم نے مسیح کو معبد میں پیش کیا۔ مسیح نے چالیس دن کا روزہ رکھا۔ سولی چڑھائے جانے کے بعد مسیح ۴۰ گھنٹے قید میں پڑے رہے۔ احیاء ثانی کے بعد وہ ۴۰ دن تک اسی زمین پر رہے اور پھر اس کے بعد آسمان پر لیجائے گئے۔ شعراء قدیم کے کلام میں بھی ۴۰ کا وجود پایا جاتا ہے اور شیکسپیر کے ڈراموں میں بھی۔

ان تمام روایات سے یہ بات تو یقینی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ تمام اقوام عالم کسی زمانہ میں ایک ہی جماعت سے تعلق رکھتی تھیں جو منتشر ہو کر مشرق و مغرب میں پھیل گئی اور بعض روایات بھی اپنے ساتھ لے گئی۔ لیکن اب سوال یہ ہے کہ کب اور کس حصۂ زمین سے اس جماعت کے افراد ادھر اُدھر منتقل ہوئے اور چالیس کے عدد کو ان کی روایات میں کیوں اتنی اہمیت حاصل ہے۔ انسان سب سے اول کرۂ زمین کے کس حصہ میں رونما ہوا، اس کے متعلق مختلف نظرئے پائے جاتے ہیں اور منجملہ ان کے تلک کا نظریہ یہ ہے کہ عہد قبل تاریخ میں انسان کا سب سے پہلا مسکن وہ تھا جسے اب منطقۂ باردہ یا قطبین کے پاس کا حصۂ زمین کہتے ہیں۔ ہر چند یہ نظریہ بظاہر اس لئے غلط معلوم ہوتا ہے کہ قطبین کے منجمد حصہ میں انسان کیونکر پایا جاتا ہوگا لیکن منطقۂ باردہ کے متعلق جو طبقاتی (geological) جوی (meteorological) اور علمی تحقیق گزشتہ ۳۰ سال کے اندر ہوئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر تلک کا یہ نظریہ غلط نہیں ہے۔

اس منطقہ کے متعلق یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اس کا برفانی یا انجمادی دور کوئی مستقل چیز نہیں تھا، ایک زمانہ انجماد کا آتا تھا اور ختم ہو جاتا تھا اس لئے غور طلب امر یہ ہے کہ اس کا آخری انجماد کب ختم ہوا

علماء طبقات الارض کا بیان ہے کہ سب سے آخری انجماد ۸۰ ہزار اور ۲۰ ہزار سال قبل مسیح کے درمیان پایا

جاتا تھا لیکن اس زمانہ کے دوران میں بھی صدیاں ایسی گزر جاتی تھیں کہ موسم گرم ہو جاتا تھا اور منطقۂ بارده آبادی کا اہل بن جاتا تھا۔ علاوہ اس کے سب سے بڑا ثبوت سرزمین قطبین کے کسی وقت گرم ہونے کا یہ ہے کہ وہاں لوہے اور کوئلے کی بڑی زبردست معدنیں دریافت ہوئی ہیں۔ حال ہی میں روس کے چار علماء اس منطقہ کی تحقیق کے لئے روانہ ہوئے اور وہاں پہونچکر انھوں نے یہ لاسلکی پیام بھیجا کہ "قطب شمالی برف سے بالکل خالی نظر آتا ہے اور ہم سردی کے لئے ترس رہے ہیں" تو دنیا حیرت زدہ ہو کر رہ گئی ـــ الغرض یہ امر پایۂ تحقیق کو پہونچ چکا ہے کہ منطقۂ بارده ہمیشہ برفستانی نہیں رہا ہے اور اس پر گرمی کے دور بارہا گزر چکے ہیں۔ اسی کے ساتھ علماء حال کی تحقیق یہی ہے کہ انڈو آرین اقوام کا اصلی وطن یہی سرزمین قطب تھی اور بعد کو برفانی دور آنے کی وجہ سے وہ اِدھر اُدھر منتقل ہوئیں۔ بہرحال یہ تسلیم کر لینا ضروری ہے کہ انسانی آبادی کا ظہور سب سے پہلے قطبین ہی کی سرزمین میں ہوا ہے۔ لیکن اس کا تعلق ۴۰ کے عدد سے کیا ہے؟ اب اس کو بھی سُن لیجئے۔

اس سے غالباً ہر شخص واقف ہوگا کہ طلوع و غروب کی جو صورت گرم ممالک میں پائی جاتی ہے وہ منطقۂ بارده سے بالکل مختلف ہے۔ ۸۶ ½ خط عرض البلاد پر (جو قطبین کے نیچے سے گزرتا ہے) شب و روز کے ظہور کی یہ کیفیت ہے کہ وہاں ۲۴ دن تک (یہاں دن سے مراد ۲۴ گھنٹے کا زمانہ ہے) تو بالکل تاریکی رہتی ہے، اس کے بعد تقریباً ۲۴ دن تک صبح صادق کی سی کیفیت رہتی ہے اور پچیسویں دن آفتاب کا ایک گوشہ نظر آتا ہے اور چند منٹ کے بعد غائب ہو جاتا ہے (یہی پچیسواں دن ان کے نوروز کا سمجھنا چاہئے) اس کے بعد پندرہ دن تک آفتاب تدریجاً زیادہ بلند ہو ہو کر غائب ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ سولھویں دن پورے ۲۴ گھنٹے تک روشنی دیتا ہے، اس کے بعد روشنی کا تذبذب ہوتے ہوتے سولھویں دن پھر تاریکی ہو جاتی ہے۔ لیکن جب آفتاب ایکبار پوری طرح نکل آتا ہے تو پھر وہ تقریباً ۶ مہینے تک غروب نہیں ہوتا اور سروں پر چلتا رہا کرتا ہے۔ اس ۶ ماہ کے طویل دن کے بعد سولہ دن تک وہ زمانہ رہتا ہے جب آفتاب کبھی غروب ہو جاتا ہے اور کبھی نکل آتا ہے، اس کے بعد ۲۴ دن بالکل اسی طرح گزرتے ہیں جیسے شفق پھوٹی ہو اور پھر ۲۴ دن باری باری طلوع آفتاب اور طلوع شفق کے گزرتے ہیں یہاں تک کہ آفتاب بالکل غائب ہو جاتا ہے اور ۶۵ دن کی طویل رات شروع ہو جاتی ہے ـــ ظاہر ہے کہ جس حصۂ زمین میں اتنی طویل رات ہوتی ہو وہاں طلوع آفتاب کا کس بے صبری سے انتظار کیا جاتا ہوگا اور کیا کیا خوشیاں رات کے ختم ہونے پر نہ منائی جاتی ہوں گی۔ جنھوں نے قدیم اقوام کی تہذیب کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان سب میں آفتاب پرستی پائی جاتی تھی اور اڈونس، اتیس، تموز، مردوک اور اندر سب سورج ہی کے دیوتا کے مختلف نام تھے۔ قدیم یونان و روما میں اتیس کا احیاء ثانی ۲۵ دسمبر کو منایا جاتا تھا اور یہی تاریخ بعد کو عیسائیوں نے مسیح کے احیاء ثانی کے لئے اختیار کی۔ اس ۲۵ کا راز یہی ہے کہ قطبین میں آفتاب (جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے) ۲۴ دن تک ظہور و خفا کے بعد پچیسویں دن پوری طرح طلوع کرتا ہے۔ چنانچہ قطبین کی قدیم آبادی اسی کو نوروز سمجھتی تھی اور خوشیاں مناتی تھی۔

یہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ آفتاب کے اولین طلوع کے بعد جو سولہ دن کے ریاب و ذہاب کے بعد ہوتا تھا پورے ۲۴ دن کے بعد وہ حقیقی دن شروع ہوتا تھا جو ۶۵ دن تک قایم رہتا تھا اور اس لئے گویا پورے ۴۰ دن کے انتظار کے بعد ان کا یوم مسرت شروع ہوتا تھا اور اس طرح چالیس کی اہمیت سب سے پہلے قطبین کی آبادی میں قایم ہوئی ـ پھر اگر ہم مان لیں کہ انسانی آبادی سب سے پہلے قطبین ہی میں ظاہر ہوئی اور بعد کو وہیں سے چاروں طرف منتشر ہوئی تو آسانی سے یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے کہ تمام مذاہب و اقوام میں ۴۰ کو کیوں اتنی اہمیت حاصل ہے۔

دُنیا کی نہایت ابتدائی کتابیں

ادب فی الحقیقت بنی نوعِ انسان کے لکھنا پڑھنا سیکھنے سے بہت قبل وجود میں آگیا تھا۔ فنون لطیفہ میں "رقص" سب سے پُرانا آرٹ ہے۔ عہد عتیق کا وحشی انسان اپنے دشمن پر غالب آنے کے بعد جب الاؤ کے گرد پہلی مرتبہ خوشی سے ناچا کودا اور اُس نے اُچھل کود کر شور مچایا تو گویا سب سے پہلا جنگی ترانہ دنیا میں نمودار ہوا۔ اس کے بعد جیوں جیوں خدا پرستی کا خیال انسانوں میں جڑ پکڑتا گیا، عبادت گزاری کے لئے دعا کا طریقہ بنتا گیا۔ اس کے بعد محض رفاہ عام کے لئے انسان کو لکھنے کا قاعدہ مقرر کرنا پڑا مگر یہ اُسوقت ہوا جب دنیا کسی قدر متمدن ہو چکی تھی اور طرزِ معاشرت و معیشت ایک اُصول کے ماتحت آتی جا رہی تھی

قدیم ترین تحریریں چٹانوں پر بھدّے اور بھونڈے نقوش کی صورت میں تھیں اس کے بعد انسان نے آگ میں پکائی ہوئی خشک مٹی کی ٹکیوں پر لکھنا شروع کیا۔ "کلدانیہ" میں ان گلی کتابوں کے نمونے حفریات کے سلسلہ میں سر ہنری لیرڈ نے دریافت کئے ہیں۔ ان میں سے ایک "برٹش میوزیم" میں موجود ہے اور "طوفان نوح" کے باب میں ہے۔ یہ غالباً دُنیا کی قدیم ترین تحریر ہے جو قریباً چار ہزار سال قبل مسیح لکھی گئی تھی۔ عبرانیوں نے اسی کلدانی روایت کی بنا پر "طوفانِ نوح" کا قصہ توریت کی "کتاب الخروج" میں درج کیا تھا جہاں سے وہ عیسائیوں اور مسلمانوں کے یہاں رواج پا گیا

کلدانی تحریر "میخی" شکل کی ہوتی تھی اور بائیں طرف سے داہنے جانب کو لکھی جاتی تھی۔ جنگی کارناموں کے بیانات اور دعاؤں کے علاوہ کلدانی ٹکیوں پر زراعت و فلاحت، نجوم و سیاست پر بھی تحریریں دستیاب ہوئی ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ مٹی کی ٹکیاں جو لیئرڈ اور دیگر ماہرینِ "اشوریات" نے دریافت کی ہیں مشہور قدیم شہر نینوا میں "سناغرب" کے کتبخانہ کا ایک حصہ تھیں۔ اس کا انتقال ۶۸۱ سال قبل مسیح میں ہوا تھا۔

قدامت کے لحاظ سے مصری ادب کا درجہ کلدانی ادب کے بعد ہی ہے۔ مصری کتابیں "پیپرس"[1] پر لکھی گئیں تھیں۔ سب سے قدیم مصری کتاب "الموتیٰ" سب سے بڑے ہرم مصری کی تعمیر کے وقت معرضِ تحریر میں آئی تھی۔ اِس کتاب کی

---

[1] نرکل کی قسم کا درخت ہے۔ قدیم زمانہ میں اس کی پتیوں پر یا اس کے پتوں سے بنائے ہوئے کاغذ پر لکھنے کا دستور تھا۔ (اڈیٹر)

ایک کاپی برطانوی عجائب خانہ میں محفوظ ہے اور دیوتاؤں، دیویوں، وظایف و اوراد، دعاؤں اور حیات بعد الموت کے حالات پر مشتمل ہے۔ مصری لوگ اس کی ایک نقل ہمیشہ اپنے مُردے کے ساتھ اُس کی قبر میں رکھدیتے تھے تاکہ اس کی دوسری زندگی میں اُس کے لئے ایک دستور العمل کا کام دے اور اُس کی روح کو سیدھے راستہ پر چلائے۔ قدیم مصری ادب بیشتر مذہبی تھا لیکن اس کے علاوہ ایک وہ ادب تھا جسے سرکاری یا دفتری کہنا چاہئے اور تیسرا وہ ہر دلعزیز ادب تھا جسکی بنا عوام کی بولی ٹھولی اور قصے کہانیوں پر قایم تھی۔ چند صدیوں کے اندر مصریوں نے مذہب، اخلاق، قانون، علم کلام، ریاضی، پیمایش، طب سیاحت اور فسانہ نگاری پر عظیم الشان ادب مجتمع کر دیا تھا لیکن افسوس کہ اس میں سے بہت کم محفوظ رہ سکا۔ دوسری مصری کتاب (The Precept of Ptah Hotep) دنیا کی دوسری قدیم ترین کتاب ہے۔ ٹاہ ہوٹیپ ہمیفس میں پیدا ہوا تھا اور ۲۵۵۰ سال ق۔م کے لگ بھگ پایا جاتا تھا۔ یہ کتاب حضرت موسیٰ کی پیدایش اور ہندوستانی مقدس صحایف "ویدوں" کی تالیف سے دو ہزار سال قبل لکھی گئی تھی اور ہومر اور حضرت سلیمان کی پیدایش سے ڈھائی ہزار سال قدیم تر کہی جاتی ہے۔ حضرت سلیمان اور ہمارے درمیان زمانہ اتنا زیادہ نہیں ہے جتنا کہ ٹاہ ہوٹیپ اور حضرت سلیمان کے درمیان تھا۔ یہ کتاب جو "پیپرس" پر لکھی گئی تھی آجکل پیرس کے قومی عجائب خانے میں محفوظ ہے۔

یوروپی ادب کی پیدایش سے سیکڑوں سال پہلے چین میں کتابیں لکھی جاتی تھیں۔ لیکن وہ شخص جس نے درحقیقت چینی ادب و اخلاقیات کی بنیاد ڈالی مشہور چینی فیلسوف و مصلح کنفوشیس تھا جو حضرت عیسیٰ کی پیدایش سے پانچ سو برس پہلے چین میں پایا جاتا تھا۔ قدیم ترین چینی کتابیں بانس کے ریشہ سے بنائی ہوئی تختیوں پر لکھی گئی تھیں۔ الفاظ و حروف یا تو اُن پر پکی روشنائی سے لکھے جاتے تھے یا نوکیلے تیز آہنی قلم سے کندہ کئے جاتے تھے۔ چینی کتابیں ریشم پر لکھی ہوئی بھی پائی گئی ہیں۔ کاغذ کے موجد چینی لوگ ہیں اور چین میں کاغذ سو سال قبل مسیح بننا شروع ہو گیا تھا۔ حضرت مسیح کی پیدایش کے وقت تک چینی لوگ چھپائی کے کام کے ماہر ہو چکے تھے اور اُنھوں نے متعدد اقسام کے ٹائپ بغرض طباعت ایجاد کئے تھے۔ یوروپ میں طباعت کتب کا کام شروع ہونے کے تین سو سال قبل چین میں طباعت کئی ارتقائی مدارج طے کر چکی تھی۔ ابتدائی چینی ادب اخلاقیات پر مبنی تھا۔ دوسری صدی ق۔م کے آغاز میں چینی فغفور شہنشاہ جی ہوانگ ٹی نے حکما کی تمام کتابیں سوائے اُن کے جو علم طب و فن جراحی اور کاشتکاری سے متعلق تھیں جلوا ڈالی تھیں۔ یہ چین کا نہایت افسوسناک اور زبردست قومی و ادبی نقصان تھا۔ تاریخ ادب میں قدیم ترین نسوانی مصنف ایک چینی عورت پاؤ چاؤ نامی تھی جو عیسائیت کے آغاز میں ایک مسلمہ تاریخ داں مانی جاتی تھی۔ چین کا قدیم ادب بہت ضخیم، وسیع اور شاندار ہے لیکن "کلاسکل" مصنفین کے بے پناہ اثر کے باعث چین کی قوم دنیا کی سب سے زیادہ دقیانوسی اور ضعیف الاعتقاد قوم ہو کے رہ گئی ہے اور اسی وجہ سے چینی زبان تاریخ کے آغاز سے لیکر آج تک جوں کی توں بلا کسی ترمیم و تنسیخ کے قایم ہے۔

ہندوستان کی قدیم ترین و مقدس ترین کتاب 'وید' حضرت عیسیٰ سے غالباً ایک ہزار سال قبل لکھی گئی تھی۔
گوتم بدھ چھٹی صدی ق۔م میں زندہ تھا۔ اُس کی تعلیمات نے بہت بڑے پیمانہ پر یہاں مذہبی ادب کی بنیاد ڈالی اور کتابیں یا تو صاف کئے ہوئے چمڑے پر اور یا جھاؤ اور تاڑ کے پتوں پر لکھی گئیں۔ قدیم ترین عبرانی کتب بھی تقریباً ۸۰۰ سال (ق۔م) لکھی گئی تھیں۔ جہاں تک انسانی معلومات کا دخل ہے جاپان اب سے ایک ہزار سال پیشتر کوئی ادب موجود نہ تھا۔ کیونکہ وہاں بھی، چین و یونان کی طرح صدیوں تک مقررین کا دور دورہ رہا اور کتابیں بہت بعد میں لکھی گئیں۔
فینیشی قوم جو سامی نسل سے متعلق تھے اور شمالی افریقہ میں رہتے تھے اُس زمانہ کی سب سے بڑی تجارت پیشہ قوم تھی۔ اُن کا دارالحکومت قرطاجنہ دنیا کا قدیم ترین تجارتی مرکز کہا جاتا ہے۔ اہلِ یونان نے فنِ تحریر انھیں فینیشیوں سے سیکھا۔ اہل یونان نے حروفِ تہجی آٹھویں صدی (ق۔م) میں ایجاد کئے اور پانچویں صدی (ق۔م) سے درس و تدریس کا کام باقاعدہ شروع ہوگیا
اسکندریہ نے یونانی کلچر اور علوم و فنون کے مرکز ہونے کی حیثیت سے ایتھنز کا درجہ گرادیا۔ قدیم مصری فرمانروا جو بطلیموس[1] کے خطاب سے مخاطب کئے جاتے تھے علوم و فنون کے بڑے شیدا اور سرپرست تھے۔ اسکندریہ کی صرف ایک لائبریری میں اُسوقت سات لاکھ یونانی کتب محفوظ تھیں۔ اس لائبریری کا کچھ حصہ رومی فاتح جولیس سیزر نے ۴۸ سال قبل مسیح میں جلا ڈالا تھا۔ بعد ازاں عیسائی مشنریوں نے اسکندریہ کی متعدد لائبریریاں برباد کیں اور اس کا الزام حضرت عمر فاروق کے سر تھوپا گیا
تیسری صدی (ق۔م) میں اسکندریہ، یونانی ادب کا عظیم الشان مرکز تھا اُسی زمانہ میں رومی مصنفین نے ایتھنز والوں کی تقلید میں اپنا ذخیرۂ ادب مرتب کرنا شروع کیا۔ اسکندریہ کی یہ ممتاز ادبی حیثیت، رومیوں کے ہاتھ سے فتح ہونے کے بعد بھی پانچویں صدی عیسوی تک قایم رہی اور اسکندریہ تہذیب و تمدن، علوم و فنون کا گہوارہ بنا رہا۔
ابتدا میں رومی ادب غیروں کی ملکیت تھا۔ جب روم، عسکری و سیاسی حیثیت سے اُس عہد کی متمدن دنیا کا مرکز سمجھا جانے لگا تو اطراف عالم سے علماء و فضلاء وہاں آکر آباد ہونے لگے، ٹھیک۔ اُسی طرح جس طرح کہ اٹھارھویں صدی عیسوی میں مقررین و مصنفین عالم کا اجتماع پیرس (فرانس) میں ہوا تھا۔ بایں ہمہ ایک طویل مدت تک روم کی ادبی زبان یونانی ہی رہی اور جب لاطینی ادب کا نشوونما ہوا تو وہ سراسر یونانی ادب کا چربہ تھا۔ ہومر کا ترجمہ لاطینی میں کیا گیا پہلی صدی قبل مسیح سے پیشتر یعنی "لاطینی ادب کے عہد زریں" کے آغاز سے قبل اکثر لاطینی مصنفین غیر لاطینی الاصل اور نووارد تھے لاطینی ادب کا 'کلاسکل عہد' ایک صدی سے زیادہ قایم نہیں رہا۔ حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے ایک سو سال پہلے سے اُن کی پیدائش کے وقت تک (ایک صدی کے اندر) سسیرو، لکریشیس، سیزر، ہوریس، ورجل، اووڈ اور لوی پیدا ہوئے، اور اپنے ادبی کارناموں کی وجہ سے بہت مشہور ہوئے

---

[1] اسکندر کے زمانہ سے لیکر قلوپطرہ کے عہد تک مصر کے فرمانروا بطلیموس کہلاتے تھے۔ (اڈیٹر)

علم الاصنام، اور بعید از عقل کہانیوں ہی سے ہر قوم کا ابتدائی ادب لبریز رہا ہے۔ کیوپڈ اور سائکی کی کہانی یونانی اساطیر کی نہایت مشہور و دلفریب کہانی ہے۔ اِس کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ ۔۔ سائکی ایک بادشاہ کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔ وہ اس قدر حسین تھی کہ حُسن کی دیوی وینس نے جلکر اپنے بیٹے کیوپڈ کو اُس کے قتل پر مامور کیا۔ کیوپڈ رات کی خموشی و تنہائی میں سائکی کے کمرہ میں داخل ہوا مگر حسن وجمال کے اس زندہ پیکر کو دیکھکر حیران رہگیا اور جو تیر وہ سائکی پر چلانے والا تھا وہ خود اسی کے سینہ میں پیوست ہوگیا، آخرکار کیوپڈ، سائکی سے ملنے لگا مگر اُس نے یہ کہدیا تھا کہ سائکی اُس کا نام معلوم کرنے کی کوشش کبھی نہ کرے گی اور نہ کبھی روشنی میں اُس کا چہرہ دیکھنے کا خیال کرے گی۔ عرصہ تک سائکی اس پر عمل کرتی رہی مگر آخرکار اس سے ضبط نہ ہوا اور ایک رات اپنا لمپ روشن کرکے اُس نے کیوپڈ کے چہرہ کو دیکھا اور اسی گھبراہٹ میں لمپ کا ایک قطرہ ٹپک کر کیوپڈ کے شانہ پر ٹپک پڑا۔ کیوپڈ کی آنکھ کھل گئی اور وہ غائب ہوگیا! اسکے بعد سائکی نے بڑی مصیبتیں برداشت کیں اور آخر میں کیوپڈ پھر مل گیا۔

اِسی قصہ کی نقل ناروے کی وہ قومی کہانی ہے جس میں ایک دولہن فریجا نامی اپنے خاوند اوڈر نامی کی حکم عدولی کرتی ہے۔ ہندوستانی وید میں بھی پرورد ا اور اُروا سی کا قصہ اسی سے ماخذ ہے اور زولو اور جنوبی افریقہ کی زدو قوم میں ایسی ہی ایک حکایت پائی جاتی ہے

کیوپڈ اور سائکی سے زیادہ مشہور کہانی ڈاینا اور انڈمین کی ہے جس کی نقل مختلف زبانوں میں ملتی ہے۔ ڈاینا، چاند کی دیوی، ایک مرتبہ آسمانوں پر اپنے دودھ جیسے سفید گھوڑوں والی گاڑی پر بیٹھی چلی جاتی تھی کہ اُس نے ناگاہ ایک پہاڑی پر انڈمین نامی ایک حسین وجمیل نوجوان گڈریے کو سوتا ہوا پایا۔ اس فانی انسانی حُسن نے اس کو مائل بہ زمین کیا وہ اُتری اور جُھک کر اُس نے جوان گڈریا کا منھ چوم لیا۔ ہر شب کو وہ اسی طرح آسمانوں پر سے اس پہاڑی پر ایک لمحہ کے لئے اُترتی اور انڈمین کا منھ چومکر چلی جاتی۔ بائرن نے اپنی ایک نظم میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اپنے محبوب انڈمین کے حُسن و شباب کو زندہ جاوید کرکے ڈاینا نے اُسے انسانی دسترس سے دور ایک کوہستانی غار میں ابدی نیند سُلاکر لٹا دیا ہے۔ جہاں وہ اُس کا ایک بوسہ لینے کے لئے ہمیشہ شب کو جایا کرتی ہے ۔۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس فسانہ سے آسٹریلیا کے قدیم باشندے بھی واقف ہیں کیونکہ اُن کے یہاں بھی ایک ایسا ہی قصہ بیان کیا جاتا ہے سنگھالی (لنکا کے باشندے) اور بعض افریقی اقوام بھی ایسی ہی روایت بیان کرتی ہیں ۔۔ یہ غیر عقل کہانیاں ادب کی پیدائش سے بہت پیشتر انسان کا واحد ذہنی سرمایہ تھیں اور انھوں نے ہر زمانے اور ہر عہد میں شعراء کو متاثر کیا اور ان کے لئے ذخیرۂ فکر مہیا کیا ہے۔ نہ صرف ہومر اور اوِڈ وغیرہ ان کہانیوں کے ناقل ہیں بلکہ جدید شعراء مثلاً براؤننگ، ہاتھورن، ہیرک، لانگ فیلو میریڈیتھ، ولیم موریس، پوپ، سوئن برن، ٹینی سن خصوصاً بائرن، شیلے، کیٹس اور روزیٹی بھی اپنی نظموں میں ان کو بار بار دُھراتے ہیں۔ علم الاصنام و اساطیر ہی کی وجہ سے بڑے بڑے نقاش ومصور و مجسمہ ساز، مغربی یورپ میں

حیرت انگیز و نادر نمونے اپنے کمالِ فن کے پیش کر سکے اور صدیوں بعد انھیں کہانیوں نے فائیل سے پہلے کے نقاشوں کی قوتِ فکر و پروازِ تخیل کو متاثر کیا تھا - یہ اہم بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ لٹریچر کی ابتدا باہمی تعاون سے ہوئی نہ کہ انفرادی مساعی سے - ستاروں اور سیاروں کی ابتدائی دلچسپ کہانیاں، نیز ابتدائی نغمے جو ماؤں نے اپنے بچوں کو گا گاکر سُنائے سینہ بہ عہد اُلٹتے پلٹتے، بدلتے بدلاتے اُس زمانہ تک جا پہونچے کہ انسان نے لکھنا پڑھنا ایجاد کر لیا اور یہ کہانیاں اور نغمے درختوں کی چھالوں پر کندہ کئے گئے یا پیپرس پر لکھے گئے - جب انسان نے پہلی مرتبہ لکھنا شروع کیا تو سوانح اور تاریخی روایات پر ایک ضخیم مواد لوگوں کے سینوں میں موجود تھا جو بلا دقت معرضِ تحریر میں آتا رہا

انسانی زندگی میں، شادی اور موت کے متعلق بھی خاص خاص رسمیں وجود میں آتی گئیں - تداخلِ فصلیں پر بھی مخصوص رسوم معین ہوئیں، دیوتاؤں اور دیویوں پر چڑھاوے چڑھائے گئے - موسم بہار، فصل کاٹنے کے ایام، کھیتوں میں بیج ڈالنے کا موسم وغیرہ وغیرہ آغازِ تمدن میں انسان کے لئے مخصوص اوقات تھے - ان عادات و رسوم نے ابتدائی تحریرِ انسانی کو بہت متاثر کیا - مزید براں بچوں کو سُلانے اور زچہ خانہ کی کہانیاں، دیوتاؤں وغیرہ کے ڈرامے، قصے، کہاوتیں اور ضرب الامثال وغیرہ بڑی تعداد میں سینہ سے زبان پر اور زبان سے نوکِ قلم پر آکر ابتدائی ادبِ انسانی کا باعث ہوئے "نظم تحریر سے بہت زیادہ پُرانی ہے - اینڈریو لینگ کہتا ہے کہ :-

"نظم کی موجودہ صورت بیشک نسبتاً جدید ہے - مگر نظمیں اور نغمے سیکڑوں برس تک انسان بغیر لکھے پڑھے مزے لے لیکر گاتا رہا زبانیں پیدا ہوئیں، بگڑیں اور سُدھریں لیکن ان لسانی تغیرات نے اُن منظوم تخیلات اور روحانی ترانوں پر کچھ اثر نہ کیا جو تمام دنیا پر چھا گئے تھے اور جن کی پیدائش کی کوئی تاریخ معین نہیں کی جا سکتی "

خوشی کے اوقات میں ناچ ناچکر انسان اپنے منھ سے جو کلمات سُر کے ساتھ نکالتا تھا وہی موجودہ نظم و موسیقی کی ابتدا تھی اور تمدن و تہذیب حاصل کرتے ہی یہی چیزیں مناسب ترمیم و تنسیخ، تغیر و تبدل کے بعد انسان نے لکھنا شروع کیں - واٹس ڈنٹن نظم کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے کہ :- "نظم ذہنِ انسانی کی وہ تراوشِ فکر ہے جو جذبات کی شورش کے عالم میں نپی تُلی زبان میں ادا ہو"

یونان اور روم کے "عہدِ زریں" میں بہت کم آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے - لیکن گاتے سب تھے - اُن "تاریک صدیوں" میں جو سلطنتِ رومتہ الکبریٰ کے زوال کے بعد کتابوں کے پڑھنے والے تھوڑے رہ گئے تھے مگر نغمے پھر بھی گائے جاتے تھے - اس میں شک نہیں کہ بے پڑھے لکھے لوگ ہر زمانہ اپنا ایک لٹریچر رکھتے تھے جو اُنھیں کے سینوں میں دفن رہتا تھا اور یہ امر کسقدر حیرتناک ہے کہ مشرق و مغرب، شمال و جنوب ہر جگہ اور ہر مقام پر قوموں نے اپنا لٹریچر نثر و نظم دونوں میں ایک ہی انداز سے حاصل کیا ہے یہی نہیں بلکہ بعض اوقات مشرقِ بعید کی ایک کہانی مغرب بعید کی کسی کہانی سے ایسی مطابقت رکھتی ہے کہ گویا یہ دونوں ایک ہی وقت میں ایک ہی انسان نے وضع کی تھیں

(ماخوذ)　　　　محمود بریلوی

تاریخ اودھ کا ایک ورق

(مکّا درزی)

اب سے ٹھیک ایک صدی پہلے کی بات ہے۔ حاتم دوراں نصیر الدین حیدر کا عہد حکومت ہے (۱۸۲۷ء سے لیکر ۱۸۳۷ء) اور ہر شخص مسرت و اطمینان کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس عہد زریں میں ہر طرف ہُن برس رہا تھا اور لکھنؤ رشک فردوس بنا ہوا تھا۔ بادشاہ کی داد و دہش کا شہرہ سنکر لوگ دور دور سے بخت آزمائی کے لئے یہاں آتے تھے اور جس کی رسائی ذات شاہانہ تک ہو جاتی تھی وہ واقعی خاک سے پاک ہو جاتا تھا۔ انھیں خوش نصیبوں میں خیر آباد کا مکا درزی بھی تھا جو یا وری قسمت سے شاہ نصیر الدین حیدر کے دربار میں شاہی درزیوں کا جمعدار ہو گیا۔ توشہ خانہ کا تمام سامان اسی کی معرفت خریدا جاتا تھا اور یہ ایک ایک کے دس دس وصول کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مکا کو انگیا کرتی سینے میں کمال حاصل تھا اور یہی بات اُس کی ترقی کا باعث ہوئی۔ اس کا نام اب مکّا سے مکّا خاں ہو گیا، مگر باوجود اس دولت و اقتدار کے وہ بہت ہی ملنسار اور متواضع تھا۔ تمکنت و غرور نام کو نہ تھا۔ ہر شخص سے جُھک کر ملتا تھا۔ کنبہ والوں کی پرورش کرتا تھا۔ غیروں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتا تھا اور سوئی ہمیشہ پگڑی میں لگی رہتی تھی۔ اپنے وطن خیر آباد میں اسنے بہت سی عمارتیں (مسجد، امام باڑہ، خانقاہ، قدم رسول) اور متعدد اونچے اونچے مکان تعمیر کرائے جو اب بھی موجود ہیں۔ مگر وہ ہمیشہ خود کچّے مکان میں رہا تاکہ اگلی حالت اسکو بھول نہ جائے

کرنل سلیمن (Col: Saleemann) رزیڈنٹ اودھ بہ سلسلۂ سیاحت اودھ (۱۸۵۰ء) اپنے سفرنامہ میں تحریر کرتے ہیں کہ:۔ "خیر آباد میں خوشنما عمارتوں کا ایک سلسلہ ہے جس میں مکّا کے باپ کا مقبرہ۔ مسجد۔ امام باڑہ۔ قدم رسول اور دوسری عمارتیں شامل ہیں۔ یہ سب مکّا درزی ملازم شاہ اودھ نصیر الدین حیدر کی تعمیر کردہ ہیں جو اپنے آقا کی نگاہ لطف و کرم کی بدولت بہت ہی دولتمند ہو گیا تھا۔ مکا ابھی زندہ ہے اور عمارتوں کی برابر مرمت کراتا رہتا ہے ان عمارتوں میں گداگروں کے غول کے غول بھرے رہتے تھے اور اُن کی صداؤں سے اتنا شور و شغب ہوتا تھا کہ کانوں کے

پر دے پہنچے جاتے تھے۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ایک ادنےٰ درجہ کے آدمی نے کیسی کیسی عظیم الشان عمارتیں کھڑی کر دی ہیں اور اُن کے قیام و بقا کے لئے جائداد بھی وقف کر دی ہے"

مرزا رجب علی بیگ سرورؔ مصنف فسانۂ عجائب نے جو مکا کے ہمعصر تھے اُس کی آسودگی اور تونگری کا تذکرہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے :- " مکا خیاط مالِ دنیا سے مالامال ہے۔ استغنا کا دم بھرتا ہے۔ سینا تو کیا ٹانکا بھی کم بھرتا ہے۔

روایت ہے کہ شاہ دہلی نے اپنی ایک محبوب بیگم کے لئے ایک لاکھ روپیہ کی لاگت کا ایک بھاری تولوان جوڑا بنوایا تھا شدہ شدہ یہ خبر قدسیہ محل کے کانوں تک پہونچی جو شاہ نصیر الدین حیدر کی بہت چہیتی اور دریا دل بیوی تھیں انھوں نے بھی بادشاہ سے فرمائش کر دی کہ میرے لئے ایک لاکھ روپیہ کا جوڑا طیار کرا دیجئے۔ بادشاہ نے مکا کو جوڑے کی طیاری کا حکم دیدیا۔ مکا حسب ارشاد عالی جوڑے کی طیاری میں مصروف ہو گیا۔ چھ ماہ کی مدت میں دوسرے درزیوں کی مدد اور مشورے سے یہ جوڑا طیار ہوا جس میں لعل اور گوہر ٹنکے ہوئے تھے۔ مکا اس جوڑے کو ایک خوبصورت کشتی میں قرینہ سے سج کر روشن چوکی کے ساتھ درِ دولت پر لے گیا۔ جوڑا بہت پسند کیا گیا اور مکا انعام و اکرام سے سرفراز ہوا۔

ایک روز میاں مکا نقرئی ہودج میں پشت فیل پر سوار کہیں جا رہے تھے۔ خاص بردار جلو میں تھے۔ ایک پٹھان صاحب بازار میں کھڑے تھے وہ ایک درزی کی سواری اس طمطراق سے جاتے ہوئے اور اُسے فیل نشین دیکھ کر آتش حسد سے جل بھنکر خاک ہو گئے اور دل کے جلے پھپھولے پھوڑنے کو پکار کر کہا ہمارا بند ٹوٹ گیا ہے جو ٹانک دیگا اُس کو اُجرت ملے گی۔ یہ سنتے ہی مکا ہاتھی سے اُتر پڑا۔ پٹھان کے پاس آکر بند سی دیا اور دعائیں دینے لگا۔ پٹھان صاحب شرم سے پانی پانی ہو گئے۔ مکا ہاتھی پر بیٹھ کر چلدیا"

راجہ غالب جنگ نے مکا کی بخیہ گری کی کوشش کی تھی مگر اُن کی چال اُلٹ گئی اور صیاد خود صید ہو گیا جس نے دوسرے کی بخیہ اُدھیڑنا چاہی تھی خود اسی کا گریبان چاک ہو گیا اور مکا لالوں کا لال بنا رہا چونکہ اس واقعہ سے اُس زمانہ کے طرزِ حکومت پر بھی روشنی پڑتی ہے اس لئے میں اُس کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہوں

راجہ غالب جنگ قوم کے کوری عہد نصیر الدین حیدر میں مہتمم پولیس تھے اور پیدل فوج کا ایک دستہ بھی اُن کے زیر کمان تھا۔ علاوہ ان عہدوں پر فایز ہونے کے وہ جہاں پناہ کے نظر کردۂ خاص تھے اور ہر وقت سایہ کی طرح اُنکے ہمراہ رہتے تھے حتےٰ کہ بادشاہ کی عیش و نشاط کی نجی صحبتوں میں بھی اُن کو حاضری کا اعزاز حاصل تھا مگر وہ اپنی سخت گیری اور بدمزاجی کے لئے بہت بدنام تھے اور اپنے رسوخ کے گھمنڈ میں وزیر اعظم روشن الدولہ کا بھی موقع بے موقع مذاق اُڑایا کرتے تھے جس سے سب ان کے مخالف ہو گئے تھے۔

بادشاہ نے رنجیت نامی ایک جوان کو بہت منہ لگا رکھا تھا۔ یہ شخص روشن الدولہ کا نمک پروردہ تھا مگر بعد کو بادشاہ کا معتمد خاص ہو گیا تھا اور جو لوگ وزیر اعظم کے درپے تخریب ہوتے تھے اُن کو برطرف کرانے کی اُدھیڑ بُن میں

میں لگا رہتا تھا۔

مکّا خیاط بھی اپنے مفاد کے تحفظ کے لئے غالب جنگ کو نیچا دکھانا چاہتا تھا۔ ان دونوں سے بادشاہ کا دوسرا معتبر ملازم گنگا خواص بھی در پردہ ملا ہوا تھا۔ ان تینوں نے بعض بیگمات کو بھی اپنا ہمنوا بنا لیا تھا جو ان لوگوں کی برابر حمایت کرتی رہتی تھیں۔ بادشاہ بعض اوقات غالب جنگ کی معرفت عورتوں کو بھی بلوایا کرتے تھے۔ ایک روز انھوں نے موگیری نامی ایک عورت کو پیش کرنے کی فرمائش کی۔ جب کافی وقت گزر گیا اور وہ حاضر نہ ہوئی، بہت مضطرب ہوئے دھنیا مہری سے اُس کے حاضر نہ ہونے کا سبب دریافت کیا تو اُس نے باادب کہا۔ خداوند کیا عرض کروں کچھ کہتے بن نہیں پڑتا راجہ بڑے ہی ذات شریف ہیں خود رنگ رلیاں مناتے ہیں اور خدمت عالی میں پیش نہیں کرتے۔ جب دوسرے حاضرین نے بھی جو آپس میں ساز باز کئے ہوئے تھے اس بیان کی تصدیق کی تو بادشاہ آگ بگولا ہو گئے مگر اسوقت غصہ پیکر خاموش ہو رہے اور موقع محل کے منتظر رہے وہ چاہتے تھے کہ کسی دوسری بات کا حیلہ کر کے راجہ سے عوض لیا جائے تاکہ کسی کو یہ نہ معلوم ہو کہ یہ باہمی رقابت کا نتیجہ ہے۔ سلیمن صاحب رزیڈنٹ اودھ ناقل ہیں کہ دھنیا مہری کے بیان میں زرہ برابر کذب و دروغ نہ تھا کیونکہ بعد کو خود موگیری نے تسلیم کر لیا کہ اُس کو راجہ نے روک لیا تھا

۷ راکتوبر ۱۸۳۵ء کو بادشاہ اپنے نجی کمرہ میں کسی سیاسی امر پر غالب جنگ سے گفتگو کر رہے تھے اور میز پر چند تاج چنے ہوئے تھے جو مکّا کی زیر نگرانی تیار ہوئے تھے اور جن کا کل ساز و سامان بھی اُسی کی معرفت خریدا گیا تھا۔ مکّا جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے بادشاہ سے ہر چیز کی دس گنی قیمت لیا کرتا تھا اور اُس کے منھ مانگے دام بے چون و چرا آنکھ بند کر کے ادا کر دئے جاتے تھے۔

غالب جنگ نے دیکھا کہ مکّا کی بد دیانتی ظاہر کرنے کا اس سے بہتر موقع نہیں مل سکتا اس لئے انھوں نے ایک تاج اُٹھا کر اُس کو اپنی اُنگلی پر نچانا شروع کر دیا یہاں تک کہ اُنگلی تاج کے بالائے حصے کو پھاڑ کر باہر نکل آئی جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ مال مسالہ بہت ادنےٰ قسم کا استعمال کیا گیا ہے۔ ایک روایت یہ بھی ہو کہ راجہ نے بوجہ سابقہ بے تکلفی کے بادشاہ کو مخاطب کر کے عرض کیا "حضور تاج میں چھید ہو گیا"، چونکہ بادشاہ کو تاج و تخت بہت منتوں مُرادوں سے نصیب ہوا تھا اس لئے یہ جملہ اُن کے لئے سوہانِ روح ہو گیا اور بغیر کچھ ارشاد کئے وہ اُٹھکر کمرہ کے باہر تشریف لے گئے۔ اُس کے بعد فوراً ہی چند ملازمین نے اندر آکر راجہ کو چاروں طرف سے گھیر کر کہا کہ تا صدور حکم ثانی اپنی جگہ سے جنبش نہ کیجئے گا تقریباً دو گھنٹے تک راجہ اسی مخمصہ اور گومگو کی حالت میں بیٹھے رہے اُس کے بعد چند اور خدام بھی کمرے میں آگئے جنھوں نے راجہ کی پگڑی اُتار کر بغرض اہانت زمین پر پھینک دی اور اُس کو حلال خوروں سے ٹھوکریں دلوا کر کمرہ کے باہر پھکوا دیا۔ اسکے بعد راجہ کو زندان میں بھیجکر دوسرے روز پابزنجیر کر دیا گیا اور اُنکے مکانات پر پہرہ بٹھا دیا تاکہ کوئی شخص راجہ کے خاندان کا نقل و حرکت نکرے اور راجہ کی جایداد بھی ضبط سرکار ہو گئی۔

تیسرے روز راجہ کے تازیانے بھی بہت سختی سے لگائے گئے تاکہ چھپی ہوئی دولت بھی بتا دیں اُسی روز شام کو بادشاہ نے نشہ کی ترنگ میں فرمان جاری کر دیا کہ راجہ کا داہنا ہاتھ قلم کر دیا جائے اور ناک بھی اُڑا دیجائے مگر وزیر اعظم نے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اگر ارشاد عالی پر عمل کیا گیا تو برٹش گورنمنٹ کی طرف سے سخت اندیشہ ہے۔ بادشاہ یہ سُنکر استراحت فرمانے چلے گئے مگر دوسرے روز راجہ کو پھر کوڑے لگانے کا حکم نافذ کر دیا۔

چھ یا سات دن کے بعد راجہ کے کل ملازمین اُن کے پاس سے ہٹا دئے گئے اور حکم ہوا کہ راجہ کے پاس کوئی نہ جانے پائے ۔ ۱۹ اکتوبر سنہ مذکور کو اعلٰے حضرت نے ایک اور فرمان جاری کیا کہ خاندان غالب جنگ کی کل مستورات در دولت تک پیدل لائی جائیں اور سب کے سر مونڈ کر اور ننگا کر کے شارع عام پر نکال دیجائیں۔ یہ حکم دیکر بادشاہ آرام خاص کو تشریف لے گئے۔ کل عورتیں حسب الحکم محلسرا میں لائی گئیں مگر ملازمین شاہی بوجہ اُن کی معصومیت اور بیگناہی کے اُن کے ہمدرد و غمگسار ہو گئے تھے اس لئے بجائے بے پردہ پیدل لانے کے اُن کو پردہ دار ڈولیوں میں سوار کر کے عزت و حرمت سے لائے۔

رزیڈنٹ نے اس اندیشہ سے کہ مبادا ان مستورات کی اور زیادہ توہین و تحقیر کی جائے اور غالب جنگ کو فاقے دے دیکر ہلاک کر دیا جائے۔ مداخلت کا تہیہ کر لیا اور بادشاہ کی خدمت میں عین اسوقت بغرض ملاقات حاضر ہونا چاہا جبکہ وہ بستر استراحت پر تھے۔ بادشاہ کو یہ نہایت شاق گزرا اور وزیر کو بھیجکر رزیڈنٹ سے کہلا بھیجا کہ اگر آپ صرف غالب جنگ کے اہل خاندان کی رہائی کے لئے تکلیف کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ میں حکم دے رہا ہوں کہ کل مستورات اپنے اپنے مکانوں کو واپس کر دیجائیں مگر رزیڈنٹ پھر بھی ملاقات پر مصر ہوئے۔ بادشاہ بالکل خاموش بُت بنے بیٹھے رہے اُن کی جانب سے وزیر اعظم جوابدہی کرتے رہے۔ انھوں نے اس امر سے تو بالکل انکار کر دیا کہ ملزم کو دو روز سے کھانا پانی بالکل نہیں دیا گیا ہے مگر اس کا اقبال کیا کہ اُن کو سزائے تازیانہ دیگئی ہے اور مستورات ابتک محلس میں موجود ہیں مگر اُن کو فوراً آزاد کر کے روانہ کر دیا جائے گا۔ وزیر نے یہ بھی بیان کیا کہ راجہ کی جایداد ضبط کرنے کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ اُن کے ذمہ بڑی بڑی سرکاری رقمیں واجب الادا ہیں۔ اس کے بعد مستورات اپنے اپنے مقاموں کو واپس کر دیگئیں اور غالب جنگ کو اجازت ہوگئی کہ اپنی خدمت کے لئے چار ملازم رکھ لیں

اس کے بعد راجہ درشن سنگھ نے جو بہت ہی با اثر آدمی تھے اور غالب جنگ کے سخت دشمن تھے بادشاہ کی خدمت میں عرضی پیش کی کہ غالب جنگ کو فدوی کے سپرد کر دیا جائے۔ اس تجویز کو بادشاہ اور وزیر دونوں نے بخوشی منظور کر لیا اور وزیر اعظم نے درشن سنگھ سے تین لاکھ روپیہ لیکر غالب جنگ کو اُن کے حوالہ کر دیا اور رزیڈنٹ کو یہ کہکر اطمینان دلا دیا کہ درشن سنگھ غالب جنگ کے دوست ہیں وہ اُن کو اور اُن کے متعلقین کو بہت آرام اور آسایش سے رکھیں گے درشن سنگھ نے غالب جنگ کو ایک آہنی پنجرہ میں بند کرا کے اپنی گڑھی واقع شاہ گنج میں بھیجدیا۔

بعد انتقال نصیر الدین حیدر، غالب جنگ نے چار لاکھ روپیہ ادا کرکے قید و بند سے گلو خلاصی حاصل کی اور وعدہ کیا کہ اگر اپنے منصب پر بحال کر دیا جاؤں گا تو تین لاکھ روپے اور حاضر کروں گا قید سے رہائی پانے پر وہ بمقام کانپور کمپنی کی عملداری میں قیام پذیر ہوئے اور تین ماہ کے بعد جب روشن الدولہ برطرف ہوئے اور خلعت وزارت نواب منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں کو عطا ہوا تو اپنی جگہ پر پھر مقرر کر دئے گئے اور بمقام لکھنؤ بتاریخ یکم مئی ۱۸۵۱ء بعمر تخمیناً اسی سال وفات پائی۔

مکا کے بالائی حصہ جسم کی ایک قلمی تصویر عجائب خانہ لکھنؤ میں موجود ہے۔ سر پر لٹو دار پگڑی اور گلے میں بادامی رنگ کا انگرکھا ہے۔ شانہ پر سہ گوشیہ رومال ہے جس کے دو کونے سینے پر لاکر گرہ دیدی گئی ہے۔ کمر حسب رواج زمانہ کسی ہوئی ہے۔ مسیں بھیگتی ہیں اور سبزہ آغاز ہے چہرہ کتابی اور سڈول ہے۔ آنکھیں بڑی بڑی۔ پیشانی کشادہ اور رنگ گندمی ہے۔ بشرے سے نیکدلی ٹپکتی ہے اور فہم و فراست کے آثار بھی پائے جاتے ہیں

خدا نے مکا کو سب نعمتیں عطا کی تھیں مگر اولاد نرینہ سے محروم رہا۔ اُس نے خیر آباد اپنے وطن میں سفر آخرت اختیار کیا اور وہیں اُس کی دائمی خوابگاہ ہے اُس کی رحلت کے بعد اُس کی بیوہ اور نواسہ علی بخش جایداد کا مالک ہوا لکھنؤ میں باغ مکا اور مکا گنج ابتک اس کی یادگار موجود ہیں۔

شیخ تصدق حسین بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی

"نگار" کے پرانے پرچے

نگار کے مندرجۂ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں جن کی دو دو تین تین کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت ہو طلب کرلیں۔ قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں :۔

(۱۹۲۶ء) جنوری ۵/ — (۱۹۲۷ء) اپریل ۴/ — (۱۹۳۰ء) مئی ۴/ — (۱۹۳۱ء) جولائی تا دسمبر ۴/ فی پرچہ — (۱۹۳۲ء) فروری تا دسمبر (علاوہ اپریل) ۴/ فی پرچہ — (۱۹۳۳ء) فروری و جولائی ۴/ فی پرچہ — (۱۹۳۴ء) فروری ۴/ — (۱۹۳۵ء) فروری، اپریل تا اگست، اکتوبر تا دسمبر ۵/ فی پرچہ — (۱۹۳۶ء) فروری، مارچ، اپریل، مئی، جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۵/ فی پرچہ — (۱۹۳۷ء) مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست، نومبر ۸/ فی پرچہ۔

منیجر نگار لکھنؤ

مثنوی سحرالبیان

گو دلی کے کنارے عشق و عاشقی کے سیکڑوں کھیل کھیلے گئے ہزاروں کہانیاں بنیں۔ لاکھوں شعر کہے گئے لیکن حسن و محبت وصل و جدائی کا افسانہ جیسی میٹھی زبان اور فصیح بول چال میں میرحسن دہلوی نے سنایا کسی دوسرے شاعر یا ادیب کو نصیب نہ ہوا۔ قبولیت عام جسقدر اس مثنوی کے حصہ میں آئی اُردو کی کسی عاشقانہ نظم کو سوائے گلزار نسیم کے نصیب نہ ہوئی۔ جو اسکی شاعرانہ خوبیوں کا لطف اُٹھا سکتے تھے انھوں نے پڑھا اور مزہ لیا۔ جو شعر و سخن کا مذاق نہ رکھتے تھے انھوں نے کہانی کی قدر کی۔ پڑھ نہ سکتے تھے تو دوسروں سے پڑھوا کر سنا اور جو دو چار شعر یاد ہو گئے ان کو الاپنا شروع کیا۔

حسن تخلص۔ میر غلام حسن نام۔ دلی کے رہنے والے تھے۔ بارہ برس کے سن میں اپنے والد کے ساتھ فیض آباد آئے۔ نواب سردار جنگ خلف نواب سالار جنگ بہادر کی سرکار سے پرورش ہوئی۔ کئی برس وہاں رہکر نواب آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ پہونچے اور مثنوی سحرالبیان یہیں تمام کی۔ شعر و سخن سے موروثی ذوق تھا۔ مذاق ستھرا طبیعت مناسب پائی تھی۔ سونے پر سہاگہ کہ وقت بھی اچھا ملا۔ بیگمات کی محفلوں میں رسائی ہوئی۔ امیرانہ تکلفات اور شاہانہ رسوم دیکھنے برتنے کا موقع ملا۔ ناچ رنگ گانے بجانے کے جلسے دیکھے۔ باغوں کی بہار۔ مکانوں کی آرائش۔ شاہی سواریوں کے تماشے نظر سے گزرے۔ خیالات کی بلندی اور طبیعت کی موزونی سے جو کچھ کانوں سنا یا آنکھوں دیکھا اُس کی تصویر نظم میں کھینچکر رکھدی۔

مثنوی سحرالبیان ۱۱۹۹ھ میں تمام ہوئی اور اُس کی تصنیف کو آج ڈیڑھ سو برس سے زیادہ عرصہ گزرا لیکن اسکی زبان قریب قریب وہی ہے جو اسوقت بولی جاتی ہے۔ آصف الدولہ کے عہد کا فیشن اور اس دور کے رسوم و رواج آج بزبانِ حال سحرالبیان میں موجود ہیں۔

قصہ کی رنگینی۔ جواب و سوال کی نوک جھونک۔ انداز بیان کی دلچسپی۔ مضمون کی شوخی۔ قافیوں کی چستی، بندش کی صفائی نے مثنوی میں چار چاند لگا دئے۔ اور سچ یہ ہے کہ اس شان کی مثنوی نہ میرحسن کے وقت سے پہلے

موجود تھی اور نہ اُس کے بعد لکھی جا سکی۔ خود فرماتے ہیں:۔

نئی طرز ہے اور نئی ہے زبان نہیں مثنوی ہے یہ سحر البیان
جو منصف سنیں گے کہیں گے یہی نہ ایسی ہوئی ہے نہ ہوگی کبھی

اس مثنوی کی سب خوبیاں ایک مختصر مضمون میں بیان نہیں ہوسکتیں۔ آج صرف قصہ بیان کیا جاتا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ چند شعر بھی سنائے جائیں گے۔

اگلے وقتوں میں ایک بڑے شان و شوکت کا بادشاہ تھا۔ کئی ملکوں کے راجہ اُس کی پرجا تھے۔ فوج لشکر۔ لونڈی غلام۔ زر و جواہر کی کمی نہ تھی۔ خدا کا دیا سب کچھ موجود تھا مگر اولاد نہ تھی اور ایک چراغ کے نہ ہونے سے گھر میں اندھیرا تھا۔ جب بڑھاپے کے آثار نمودار ہوئے اور کلیجے کی ٹھنڈک نصیب نہ ہوئی تو اُس نے راج پاٹ چھوڑ کر فقیری لینے اور بقیہ زندگی یادِ خدا میں بسر کرنے کا ارادہ کیا۔ وزیروں امیروں نے سمجھایا کہ خدا کی رحمت سے مایوس ہونا اور معبود کی یاد کے لئے دُنیا کا کاروبار چھوڑنا مناسب نہیں ہے

فقیری بھی کیجئے تو دنیا کے ساتھ نہیں خوب جانا اُدھر خالی ہاتھ

بادشاہ کی تسلی کے لئے رمالوں۔ نجومیوں جوتشیوں کو بلوایا اور ان سے دریافت کیا کہ تاج و تخت کا وارث پیدا ہونے کی کب تک امید ہے۔ اُن سب نے بالاتفاق کہا کہ بادشاہ کی تقدیر میں ایک فرزند ہے اور خوشی کا دور جلد آنیوالا ہے۔ پنڈتوں نے جنم پترا دیکھ کر حکم لگایا کہ "چندرمان سا بالک ترے ہوئیگا" لیکن بارھویں سال میں نظر کا ڈر ہے اسلئے بارہ برس تک یہ چودھویں کا چاند محل سے باہر نہ نکلے اور کوٹھے پر نہ چڑھے۔ بادشاہ کو ڈھارس ہوئی۔ سلطنت چھوڑنے کا قصد فسخ کیا اور خدا کی قدرت سے اُسی سال شاہی محل میں ایسا خوبصورت لڑکا پیدا ہوا کہ "اُسے دیکھ بیتاب ہو آفتاب" شہزادہ کا نام بےنظیر رکھا گیا۔ بادشاہ نے جانماز بچھا کر شکرانے کے سجدے کئے۔ مبارک سلامت کے شادیانے بجے امیر و وزیر۔ رئیس و فقیر نذریں لیکر بادشاہ کی خدمت میں مبارکباد کے لئے حاضر ہوئے۔ ہر ایک کو اس کی حیثیت کے مطابق انعام تقسیم ہوا۔

دئے شاہ نے شاہزادے کے ناؤں مشایخ کو اور پیرزادوں کو گاؤں
امیروں کو جاگیر۔ لشکر کو زر وزیروں کو الماس و لعل و گہر
خواصوں کو فوجوں کو جوڑے دئے پیادے جو تھے اُن کو گھوڑے دئے

مبارک سلامت کی دھوم دھام چھٹی تک رہی۔ شاہزادہ محل میں پلنے لگا۔ مکتب میں بٹھانے کا وقت آیا تو ہر فن کے اُستاد اس کی تعلیم کے لئے مقرر ہوئے اور اس کو وہ تمام علوم و فنون پڑھائے سکھائے گئے جو آصف الدولہ کے عہد میں شریفوں اور رئیسوں کے یہاں رائج تھے

جب بارھویں سال کی گرہ پڑی اور پنڈتوں کی بتائی ہوئی خطرہ کی مدت ٹل گئی تو دارالسلطنت آراستہ کیا گیا۔ شہزادہ حمام میں نہاکر اور شاہی لباس پہنکر بڑی دھوم سے شہر کی سیر کو نکلا۔ چار گھڑی کے بعد محل میں واپس آیا۔ شام ہوچکی تھی چودھویں رات کا چاند چمک رہا تھا۔ چاندنی کی بہار دیکھنے کے لئے کوٹھے پر پلنگ بچھنے کا حکم دیا۔ بادشاہ نے یہ سمجھ کر کہ سختی کے دن گزر چکے ہیں اور اب چھت پر آرام کرنے میں کچھ خطرہ نہیں ہے اجازت دی۔ شہزادہ بچھونے پر آتے ہی سو گیا۔

وہ پھولوں کی خوشبو وہ ستھرا پلنگ جوانی کی نیند اور سونے کا رنگ

تھوڑی دیر میں چوکی پہرے والوں کو بھی نیند آگئی اور ہر طرف سناٹا ہوگیا۔ اتفاقاً اُس طرف سے ماہ رخ نام ایک پری کا گزر ہوا۔ شاہزادے پر نظر پڑی اور اس کے حسن و جمال پر ہزار جان سے عاشق ہوگئی۔ اپنا ہوائی تخت پلنگ کے قریب لائی۔ شاہزادے کو اُڑاکر پرستان لے گئی۔ پری کے طلسمی باغ میں شاہزادے کی آنکھ کھلی تو اجنبی جگہ دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ پہلے خیال ہوا کہ خواب ہے

زبس تھا وہ لڑکا تو سہما بھی کچھ ہوا کچھ دلیر اور حیراں بھی کچھ

سرہانے پری کو دیکھ کر پوچھا کہ تو کون ہے اور یہ گھر کس کا ہے؟

پری نے منھ پھیر کر جواب دیا:۔

خدا جانے تو کون ؟ میں ہوں کہاں! مجھے بھی تعجب ہے میں ہوں جہاں،
یہ گھر گو کہ میرا ہے تیرا نہیں، پر اب گھر یہ تیرا ہے میرا نہیں
چھڑا کر ترا تجھ سے شہر و دیار یہ بندی ہی لائی ہے تقصیر وار

شہزادہ مجبور تھا۔ پری کی قید سے رہائی کی کوئی صورت نہ تھی۔ دل کو جوں توں لگایا وہاں۔ اور جو کچھ پری نے کہا منظور کیا۔ شہزادے کے والدین بیٹے کے یکایک گم ہونے سے ادھر اُدھر تباہ حال اور بدحواس تھے۔ ادھر شاہزادہ وحشیوں کی طرح اُداس رہتا تھا۔

بہانے سے دن رات سویا کرے نہ ہو جب کوئی تب وہ رویا کرے

ماہ رخ شہزادے کا جی بہلانے کی لاکھ کوشش کرتی مگر اس کو والدین کی شفقت اور گھر کی دلچسپیاں نہ بھولتی تھیں ایک مدت اسی حال میں گزری اور دل کی کلی نہ کھلی تو پری نے شاہزادے کو ایک طلسمی گھوڑا دیا جو کل کے اشارہ سے ہوا پر چلتا تھا اور اجازت دی کہ وہ اس پر چڑھکر روزانہ ایک پہر تک روئے زمین کی سیر کر آیا کرے۔ سہ پہر کو پری اپنے باپ کی خدمت میں جاتی تھی اس وقت شاہزادہ طلسمی گھوڑے پر چڑھکر دنیا کی سیر کو نکلتا تھا اور پہر بھر ہوا کھاکر پرستان میں واپس آجاتا تھا۔ تقریباً تین سال اسی حال میں گزرے۔ ایک رات اس کا گزر ایک باغ کی طرف

ہوا جمیں سفید رنگ کی ایک بلند عمارت بنی ہوئی تھی۔

وہ چھٹکی ہوئی چاندنی جابجا — وہ جاڑے کی آمد وہ ٹھنڈی ہوا

شاہزادے کو باغ کا منظر بہت پسند آیا۔ گھوڑے سے اُترا اور دبے پاؤں باغ میں آیا۔ ایک طرف چند گنجان درخت لگے تھے اُن کی آڑ سے جھانکنے لگا۔ صحنِ باغ میں فرش بچھا تھا اور مسند پر ایک نہایت حسین و صاحبِ جمال شہزادی بیٹھی تھی۔ اِدھر اُدھر خواصیں کھڑی تھیں اور ستاروں کی طرح چاند کو حلقہ میں لئے تھیں۔ شہزادہ یہ سماں دیکھ رہا تھا کہ ایک خواص کی نظر اُس پر جا پڑی۔ غل شور ہوا شہزادی کو خبر ہوئی کہ کوئی شخص درختوں میں چھپا ہے وہ بھی سہیلیوں کے ساتھ اُس طرف گئی۔ دیکھا کہ ایک حسین نوجوان درختوں کی آڑ میں سج دھج سے کھڑا ہے۔ (ڈیڑھ سو برس پہلے لکھنؤ کے رئیس زادوں کا فیشن دیکھئے:۔

گلے میں پڑا نیمہ شبنم کا ایک — بدن سے عیاں نور عالم کا ایک
طرحدار اک سر پہ بھیٹا سجا — تمامی کا پٹکا کمر سے بندھا
جواہر کا تکمہ گلے میں لگا — ستارہ ہو جوں صبح کا جگمگا
اک الماس کی ہاتھ انگشتری — سراسر حنا دست و پا میں لگی)
برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن — جوانی کی راتیں مُرادوں کے دن

حسن و جمال دیکھکر خواصیں عش عش کرنے لگیں اور شہزادی عشق کے دیوتا کا شکار ہوگئی۔ اس نازنین کا نام بدرِ منیر تھا سراندیپ کے بادشاہ کی لڑکی تھی اور اس باغ میں سیر تماشے کو آیا کرتی تھی۔ بادشاہ کے وزیر کی بیٹی اُس کی ایک سہیلی نجم النسا، نام تھی۔ اُس نے عاشق و معشوق کو بیہوش دیکھ کر گلاب چھڑکا۔ شہزادی کو ہوش آیا تو دالان میں جاکر چھپ رہی۔ (وزیرزادی نے بہلا پھسلا کر راضی کیا کہ وہ مہمان کی خاطر داری کرے:۔

کیا ہے اگر تو نے گھائل اُسے — تو مت چھوڑ اب نیم بسمل اُسے
کہاں یہ جوانی کہاں یہ بہار — یہ جوبن کا عالم رہے یادگار
سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں، — گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں)

نجم النسا شہزادے کو خلوت میں بلا لائی اور بدرِ منیر کو ہاتھ پکڑ کر اُس کے قریب بٹھا دیا۔

(وہ بیٹھی عجب ایک انداز سے — بدن کو چُرائے ہوئے ناز سے
منھ آنچل سے اپنا چھپائے ہوئے — لجائے ہوئے شرم کھائے ہوئے)

تھوڑی دیر تک حجاب رہا۔ اُس کے بعد شراب کے دور چلے اور عاشق و معشوق میں محبت پیار کی باتیں ہونے لگیں۔ شہزادے نے اپنا حسب نسب ظاہر کیا۔ ماہ رخ پری کے پاس اپنی گرفتاری کا حال سنایا اور یہ بھی

کہدیا کہ ایک پہر سے زیادہ غیر حاضری کی اُس کو اجازت نہیں ہے۔ اسی گفتگو میں پہر بھر رات گزر گئی اور شہزادہ دوسرے دن اسی وقت آنے کا وعدہ کرکے رخصت ہوا

سماں شب کا آنکھوں میں چھایا ہوا مزہ دل میں سارا سمایا ہوا
نئی بات کا لطف پانا غضب وہ پہلے پہل۔ دل لگانا غضب

ہجر کا دن رو روکر کٹا اور شام کو فلک سیر گھوڑے پر سوار ہوکر پھر بدرمنیر کے باغ میں پہونچا اور ایک پہر رات گئے تک اپنے معشوق کے ساتھ عیش وعشرت میں مشغول رہا۔

اب معمول ہوگیا کہ ہر روز شام کو بدرمنیر کے باغ میں جاتا اور پہر رات تک ہنس بول کر پری کے طلسمی باغ میں واپس چلا جاتا۔

ایک دن کسی دیو نے شہزادے کو بدرمنیر کے پاس دیکھ لیا اور ماہرخ کو خبر کردی۔ وہ غصہ میں بھری بیٹھی تھی کہ شہزادہ پہونچا۔ اُس کو دیکھتے ہی برس پڑی۔

تجھے سیر کو میں نے گھوڑا دیا کہ اُس مالزادی کو جوڑا دیا
پھر ایسے راتوں کو دلشاد تو کرے گا دنوں کو بہت یاد تو

اور ایک دیو کو حکم دیا کہ شہزادے کو جنگل کے اس کنوئیں میں قید کردے جس پر کئی من کا پتھر رکھا ہوا ہے۔

سر شام کھانا کھلانا اسے اور اک جام پانی پلانا اسے
نہ دیجیو سوا اس کے جو کچھ کہے یہی اس کا معمول دائم رہے

دل سے دل کو راہ ہوتی ہے اُدھر شہزادہ کنوئیں میں قید ہوا اور یہاں بدرمنیر کے دل کو بے چینی شروع ہوئی جب کئی دن گزرے اور شہزادہ نہ آیا تو بدرمنیر بیقرار ہوگئی۔

دوانی سی ہر طرف پھرنے لگی، درختوں میں جاجا کے گرنے لگی،
خفا زندگانی سے ہونے لگی، بہانے سے جاجا کے سونے لگی
نہ اگلا سا ہنسنا نہ وہ بولنا نہ کھانا نہ پینا نہ لب کھولنا
جہاں بیٹھنا پھر نہ اُٹھنا اُسے محبت میں دن رات گھُٹنا اُسے
کہا گر کسی نے کہ بی بی چلو تو اُٹھنا اُسے کہہ کے ہاں جی چلو
جو پوچھا کسی نے کہ کیا حال ہے تو کہنا یہی ہے جو احوال ہے
کسی نے جو کچھ بات کی بات کی یہ دن کی جو پوچھی کہی رات کی
کہا گر کسی نے کہ کچھ کھائیے، کہا خیر بہتر ہے منگوائیے،

جو پانی پلانا تو پینا اسے | غرض غیر کے ہاتھ جینا اسے
غزل یا رباعی و یا کوئی فرد | اسی ڈھب کی پڑھنا کہ ہو جس میں درد
سو یہ بھی جو منہ کو رُسلے کہیں | نہیں تو کچھ اس کی بھی خواہش نہیں
گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل | کہاں کی رباعی کہاں کی غزل

ایک دن باغ میں پریشان بیٹھی راہ تک رہی تھی کہ گانا سننے کو جی چاہا اور عیش بائی ڈومنی کو مجرے کا حکم دیا گیا۔ ڈومنی کی آن بان دیکھئے:-

لٹیں منہ پہ چھوٹی ہوئی سربسر | کہ بدلی ہو جوں مہر کے ایدھر اُدھر
وہ بن پونچھے ہونٹوں کی مسی غضب | کہ منہ پر تھی گویا قیامت کی شب
فقط کان میں ایک بالا پڑا | کہے تو کہ ہالا مہ کے ہالا پڑا
بندھا سر پہ جوڑا پڑی زرد شال | کمر کی لچک اور مٹک کی وہ چال
وہ پشواز اگری و نرگس کے ہار | وہ کم خواب کے
وہ اُٹھی ہوئی چین پشواز کی | وہ مسکی ہوئی چولی انداز کی
وہ مہندی کا عالم وہ توڑے چھڑے | وہ پاؤں میں سونے کے دو دو کڑے
چلی واں سے دامن اُٹھاتی ہوئی | کڑے سے کڑے کو بجاتی ہوئی
وہ آنے لگی کافر اس آن سے | کہ جانے لگا جی مسلمان سے

موسم موافق تھا اور وقت مناسب گانے کا سماں بندھ گیا:-

گھڑی چار دن باقی اُسوقت تھا | سہانا ہر اک طرف سایہ ڈھلا
درختوں کی کچھ چھاؤں اور کچھ وہ دھوپ | وہ دھانوں کی سبزی یہ سرسوں کا روپ
وہ رقصِ بتاں اور ستھری الاپ | وہ گوری کی تانیں وہ طبلہ کی تھاپ
وہ دل پینا ہاتھ پر دھر کے ہاتھ | اُچھلنا وہ دامن کا ٹھوکر کے ساتھ
غرض جو کھڑے تھے کھڑے رہگئے | اڑے جس جگہ تھے اڑے رہگئے

راگ سے پتھر کا جگر پانی ہوتا ہے ۔ چرند و پرند۔ انسان و حیوان ۔ جن و پری سب کا حال غیر ہو گیا۔ بدرمنیر کا دل گھائل تھا وہ آہیں کھینچنے لگی۔ دیر تک آنکھوں پر رومال رکھکر روتی رہی اور اس کے بعد چھپر کھٹ پر جا گری ۔ محفل برخاست ہوئی مگر بدر منیر کا حال دن پر دن بدتر ہونے لگا۔

نہ منہ کی خبر اور نہ تن کی خبر | نہ سر کی خبر نے بدن کی خبر

اگر سر کھلا ہے تو کچھ غم نہیں، جو کُرتی ہے میلی تو محرم نہیں
جو مسی ہے دو دن کی تو ہے وہی، جو کنگھی نہیں ہے تو یونہی سہی
نہ منظور سرمہ نہ کاجل سے کام نظر میں وہی تیرہ بختی کی شام

غرض جب ہجر نے لیلےٰ کو مجنوں بنا دیا تو ایک رات خواب میں دیکھا کہ لق و دق جنگل میں کنواں ہے اور کنوئیں کے مُنھ پر کئی لاکھ من کی سل رکھی ہے اور وہاں سے آواز آتی ہے کہ اے بدرمنیر مجھکو تیری جدائی کا غم ہے

میں بھولا نہیں تجھکو اے میری جاں کروں کیا کہ ہے مجھپہ قیدِ گراں
کوئی دم کا مہماں ہوں آج کل اسی چاہ میں جائے گا دم نکل

بدرمنیر نے جواب دینا چاہا مگر یکایک اُس کی آنکھ کُھل گئی۔ جاگی تو نہ وہ کنواں تھا نہ وہ آواز۔ خود باؤلی ہو رہی تھی۔ نجم النسا نے یہ قصہ سُنا تو جوگن کا بھیس بنا کر شہزادے کو ڈھونڈھنے نکلی۔ رخصت کے وقت بدرمنیر رونے لگی :۔

وہ رو رو کے دو ابرِ غم یوں ملے کہ جس طرح ساون سے بھادوں ملے

شہروں شہروں جنگل جنگل پھرتی اور شہزادے کا نشان ڈھونڈھتی تھی لیکن کہیں پتہ نہ چلتا تھا۔ ایک رات جنگل میں مرگ چھالا بچھائے اکتارا بجا رہی تھی۔ جنوں کے بادشاہ کا لڑکا فیروزشاہ نام اُدھر سے گزرا اور جوگن کی صورت دیکھتے ہی عاشق ہو گیا

یہ سمجھا بناوٹ کا کچھ بھیس ہے لگا کہنے جوگی جی آدیس ہے

جوگن نے بھی نظر پہچان لی

کہا ہنس کے جوگن نے ہر بول ہر جہاں سے تو آیا چلا جا اُدھر

کچھ دیر باہم لطیفے ہوئے اور اس کے بعد پریزادے کے اصرار سے جوگن نے بین بجانا شروع کی۔ رات بھر بین بجاتی رہی اور فیروز سُنتا رہا۔ صبح کے وقت جوگن نے بین کاندھے پر رکھی۔ پریزادے نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر ہوائی تخت پر بٹھایا اور پرستان لے گیا۔ چند روز تک مہمان رکھا اور مطلب کی بات زبان پر نہ لایا۔ مگر جب دل بے قابو ہو گیا تو ایک دن قدموں پر گر پڑا۔ جوگن نے کہا کہ تم میرے مطالب بر لاؤ تو اپنی مراد بھی پاؤ۔ شہزادی بدرمنیر کی عاشقی کا قصہ۔ پری کی محبت اور بے نظیر کے قید کئے جانے کا حال بیان کر کے فیروزشاہ سے کہا کہ تم شہزادے کا پتہ چلاؤ تو تمھارا مقصود بھی حاصل ہو۔ فیروزشاہ کے حکم سے پرستان میں ہر طرف شہزادے کی تلاش ہونے لگی۔ ایک خادم کا اس کنوئیں کی طرف گزر ہوا جہاں بے نظیر قید تھا۔ معلوم ہوا کہ ماہرخ پری کا قیدی ہے۔ فیروزشاہ نے ماہرخ کو ڈرا دھمکا کر بے نظیر کو قید سے نجات دلوائی اور دوسرے دن ہوائی تخت پر بٹھا کر نجم النسا اور بے نظیر کو

اسلام و بانی اسلام کی توہین کرتے ہیں اور دوسرے یہ کہ جو طریقہ احتجاج کا مسلمان اختیار کرتے ہیں وہ مفید ہے یا نہیں۔

۱۔ غیر مسلم مصنفین دو قسم کے ہیں ایک وہ جو خود بھی کسی مذہب کے پابند ہیں اور دوسرے وہ جو کوئی مذہب نہیں رکھتے اور جنھیں آزاد خیال (Free thinkers) کہتے ہیں۔ یقیناً ان دونوں کے زاویہ ہائے نگاہ میں فرق ہوتا ہے اور رہونا چاہیئے۔ وہ جماعت جو کسی مذہب کی پابند ہے اور کورانہ تقلید کے ساتھ پابند ہے، وہ تو قصد کرکے تعلیمات اسلام میں نقص نکالتی ہے اور سیرۃ نبوی و تاریخ اسلام کا مطالعہ صرف اس نکتہ چینی کی غرض سے کرتی ہے، اور اسے کرنا چاہیئے۔ اس عیب سے مسلمان بھی پاک نہیں، کیونکہ وہ بھی جب غیر مذاہب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیشہ انھیں باتوں کو اُبھارتے ہیں جو قابل اعتراض ہوتی ہیں

اب رہ گئی دوسری جماعت جو صرف تحقیق حق کی غرض سے مذہبی انتقاد کی طرف مایل ہے، اسکے متعلق یہ خیال کرنا کہ بالارادہ اسلام یا بانیِ اسلام کی توہین کرتی ہے، درست نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ایسے مورخین کو اسلام کیا کسی مذہب سے بھی دلچسپی نہیں، لیکن کسی امر سے دلچسپی نہ ہونا اس کو مستلزم نہیں کہ اس کی مخالفت بھی کی جائے اور اس لئے ان کی مخالفت کو بغض و عناد سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا

افسوس ہے کہ خود مسلمانوں کی جماعت بھی اس باب میں انصاف سے کام نہیں لیتی اور چونکہ وہ اندھی تقلید میں مبتلا ہے اس لئے خود اس کو اپنے معائب یا اپنی کمزوریوں پر نگاہ ڈالنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ غیر مسلم لوگ جو اعتراضات اسلام پر کرتے ہیں یا نقایص سیرۃ نبوی میں نکالتے ہیں، ان کی بنیاد کیا ہوا کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں یا جو نتیجہ نکالتے ہیں اس کا ماخذ اسلامی روایات ہی ہوتی ہیں، ایسا تو وہ کر نہیں سکتے کہ دوسرے مذاہب یا دوسری اقوام کی کتابوں سے استناد کرتے ہوں۔

"رنگیلا رسول" کا ماخذ بھی آپ ہی کا مذہبی لٹریچر تھا اور ٹسڈل نے جو انتقاد قرآن پر کیا ہے وہ بھی احادیث ہی کی بنا پر ہے۔ اس لئے فی الحقیقت قابل الزام تو خود ہمارے ہی جامعین احادیث، ہمارے ہی مفسرین قرآن اور ہمارے ہی مورخین اسلام ہیں جنھوں نے روایات کو پرکھے بغیر انھیں صحیح تسلیم کرلیا اور اس قدر انھیں رواج دیا کہ اسلام کا مفہوم سوائے اوہام پرستی و غیر عاقلانہ معتقدات کے اور کچھ نہ رہا

اب رہا ایسی تصانیف کے خلاف اس قسم کا احتجاج جیسا کہ عام طور پر رائج ہے، سو میری رائے میں اس سے زیادہ اظہار کمزوری کا مسلمانوں کی طرف سے اور ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر ایک شخص رسول اللہ کے کیرکٹر کو بدنما ظاہر کرتا ہے تو ہمارا فرض صرف یہ ہے کہ اس کے استدلال کو غلط ثابت کریں۔ کسی کو مار ڈالنا یا جھنڈے اور جلوس نکالنا نہ کوئی منطقی استدلال ہے، نہ علمی حجت ہے۔ اس سے زیادہ سے زیادہ آپ یہ ثابت کرسکتے ہیں کہ آپ کو مذہب سے محبت ہے اور اس کے باب میں جان لینے اور جان دینے سے بھی احتراز نہیں کرسکتے لیکن اس طریق عمل سے

نہ آپ دوسروں میں اسلام کی محبت پیدا کرسکتے ہیں اور نہ اہل علم و عقل پر اس کی صداقت ثابت ہو سکتی ہے۔

اسوقت تک آریوں اور مشنریوں کی طرف سے بکثرت ایسی کتابیں شایع ہو چکی ہیں جن میں رسول اللہ کی سیرت کو داغدار اور قرآن مجید کو ناقص و نامکمل تصنیف ظاہر کیا گیا ہے اور ان سب میں اسی روایاتی لٹریچر سے مدد لی گئی ہے جو مسلمانوں کے یہاں مستند سمجھا جاتا ہے (مثلاً روایات بخاری وغیرہ) اس لئے جواب کی معقول صورت یہی ہو سکتی ہے کہ یا تو مسلمان خود ان روایات کی تکذیب کریں یا اپنی کتابوں سے نکالدیں۔ لیکن یہ کام مولویوں کا ہے جو انھوں نے کبھی نہیں کیا اور نہ آیندہ کریں گے۔

پھر جب حالات یہ ہیں تو مسلمانوں کو چاہئے کہ جب کوئی اس قسم کا الزام اسلام یا بانی اسلام پر قایم کیا جائے تو وہ مذہبی علماء سے جواب کا مطالبہ کریں پھر اگر انکا جواب معقول ہوگا تو دنیا خود اسے تسلیم کرلیگی اور اگر نہیں ہے تو یہ خود اپنی کمزوری ہے جس کو تیغ و خنجر یا شور و واویلا سے دور نہیں کیا جا سکتا۔

مسلمانوں کا یہ مجاہدانہ جذبہ کہ وہ ہر مخالف اسلام کے درپئے آزار ہو جاتے ہیں، حد درجہ جاہلانہ و سفیہانہ جذبہ ہے اور اس سے مخالفین کو اور زیادہ یہ سمجھنے کا موقعہ ملتا ہے کہ اسلام کی تعلیم ہی خونریزی ہے اور خونریزی ہی سے اس کی اشاعت ہوئی ہے۔

تاریخ اسلام کا وہ واقعہ آپ کے سامنے ہوگا کہ عہدنامہ کی عبارت میں لفظ محمد کے بعد "رسول اللہ" کے الفاظ پر فریق ثانی اعتراض کرتا ہے اور آنحضرت خود اپنے ہاتھ سے اسے قلمزد کر دیتے ہیں۔ لیکن آج مسلمان کی ذہنیت یہ ہے کہ جو شخص محمد کو رسول اللہ نہ مانے وہ واجب القتل ہے۔ اسی سے آپ کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ عہد نبوی کا اسلام کیا تھا اور آج کل کا اسلام کیا ہے

گزشتہ جنگ عظیم

(جناب کرم الٰہی صاحب ۔ کانپور)

اہم تاریخی واقعات اور جغرافی معلومات کو نہایت مختصر الفاظ میں قلمبند کر دینے کا جو سلسلہ باب الاستفسار میں شروع ہوا ہے اور جس سلسلہ میں انقلاب فرانس اور ہندوستان پر آپ نے معلومات فراہم کی ہیں، بہت مفید ہیں۔ براہ کرم اسی انداز سے گزشتہ جنگ عظیم پر بھی اظہار خیال فرمایئے۔

(نگار) جنگ عظیم سے وہ بین الاقوامی جنگ مراد ہے جو اگست سنہ ۱۹۱۴ء سے نومبر سنہ ۱۹۱۸ء تک دنیا میں جاری رہی

اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ سراجیو (Serajevo) میں جو یگوسلیویا کا مشہور شہر ہے، فرانسیس فرڈننڈ (Francis Ferdinand) کو سربیا کے ایک باشندے نے قتل کر دیا۔ آسٹریا نے انتقاماً جولائی ۱۹۱۴ء میں سربیا پر حملہ کر دیا۔ روس سربیا کی مدد پر آمادہ ہو گیا اور جرمنی، آسٹریا کی حمایت پر۔ چونکہ فرانس و روس کا اتحاد تھا اس لئے فرانس کے خلاف بھی اعلان جنگ کر دیا گیا اور بلجیم پر حملہ کرنے کی وجہ سے برطانیہ کو بھی اس میں حصہ لینا پڑا۔ لڑائی شروع ہونے کے بعد ترکی اور بلغاریہ بھی جرمنی کے ساتھ شریک ہو گئے۔

ان فریقین میں، اتحادیین (یعنی فرانس، برطانیہ و روس) کے ساتھ ۱۹۱۵ء میں جاپان اور اٹلی نے اور ۱۹۱۶ء میں رومانیا نے بھی شرکت کر لی۔ بعد کو پرتگال بھی ساتھ ہو گیا اور اپریل ۱۹۱۷ء میں امریکہ بھی۔

اس جنگ میں ۴۰ کرور مسلح سپاہیوں نے حصہ لیا اور جتنا روپیہ اس میں صرف ہوا اس کی نظیر تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ اس جنگ کے دو محاذ تھے شرقی اور غربی۔ مغربی محاذ میں جرمنی کے مقابل برطانیہ و فرانس تھے اور مشرقی محاذ میں روس۔ اٹلی کے حدود میں جو لڑائیاں ہوئیں انھیں مغربی محاذ ہی کا حصہ سمجھنا چاہئے اور بلقان کی جنگ کو مشرقی محاذ کا حصہ۔ ترکی نے گیلی پولی اور عراق میں اتحادیین کو الجھائے رکھا۔

جرمنی کے مستعمرات پر بھی حملہ کیا گیا۔ چنانچہ جاپان نے کیاؤچو پر قبضہ کر لیا اور افریقی مستعمرات بحر جنوب کے جزائر پر برطانیہ قابض ہو گیا۔

اتحادیین اور خصوصیت کے ساتھ برطانیہ کے بحری بیڑے نے بڑا کام کیا، کیونکہ بغیر اس کے افواج اور سامانِ حرب کی نقل و حرکت دشوار تھی۔ اس بیڑے نے جرمن بیڑے کو باہر نہ نکلنے دیا اور تمام جرمن بندرگاہوں کا راستہ مسدود کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ جرمن آبدوزوں نے ۱۹۱۶ء اور ۱۹۱۷ء میں اتحادیین کے جہازوں کو بہت نقصان پہونچایا لیکن اس سے کوئی مفید نتیجہ نہ نکلا۔

۱۹۱۴ء میں جرمن افواج پیرس کے قریب تک پہونچ گئیں اور روس مشرقی پروشیا اور آسٹریا پر حملہ آور ہوا لیکن یہ دونوں اقدامات ناکام رہے۔ ۱۹۱۵ء میں زیادہ تر خندقوں کی لڑائی ہوئی جو ساحل بلجیم سے لیکر سوئٹزرلینڈ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اسی سال برطانوی افواج نے گیلی پولی پر قبضہ کر لیا لیکن اختتام سال سے قبل ہی انھیں واپس ہونا پڑا۔ عراق میں جنگ کرنے کے لئے ہندوستانی فوج بھیجی گئی تھی لیکن وہ بھی ناکام رہی۔ روس کی کامیابیاں بھی عارضی ثابت ہوئیں اور پولینڈ پر جرمنی افواج چھا گئیں۔ سربیا کا بھی یہی حشر ہوا اور اٹلی بھی آسٹریا کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔

۱۹۱۶ء میں برطانیہ میں وہ مشہور حملہ کیا جو جنگِ سوم کے نام سے مشہور ہے اور فرانس اور جرمن میں وردون کے قبضہ کے لئے نہایت سخت جنگ ہوئی۔ جرمن نے رومانیا کو فتح کر لیا اور برطانیہ کو عراق میں شکست ہوئی

روس بھی بہت کمزور پڑگیا اور اٹلی تو خیر پہلے ہی سے مضمحل تھا۔

۱۹۱۷ء کا خاص واقعہ امریکہ کی شرکت اور روس کا ڈھیر ہوجانا ہے جس نے آخری بار اپنی پوری کوشش ختم کردینے کے بعد جرمن سے صلح کرلی اور اپنا پیچھا چھڑالیا۔ اسی سال اٹلی کی مدد کے لئے برطانوی اور فرانسیسی افواج بھی روانہ کی گئیں کیونکہ اُسے آسٹریا کے محاذ میں شکست ہوئی تھی۔

۱۹۱۸ء میں اپنی آخری جارحانہ جنگ میں انگریزوں کو سخت شکست دی اور فرانسیسیوں کو پیرس تک بھگا چھوڑا، لیکن امریکن افواج کی آمد نے ہوا کا رُخ بالکل بدلدیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی اور اس کے ساتھیوں کو ہر جگہ شکست پر شکست ہونے لگی۔ جرمنی کے ہاتھ سے تمام مفتوحہ علاقے نکل گئے، آسٹریا، اٹلی سے مغلوب ہوگیا، ترکی فوجیں بھی تباہ ہوئیں اور بلغاری سپاہ بھی۔ آخرکار انھوں نے یکے بعد دیگرے صلح کی درخواست کی اور ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو یہ جنگ ختم ہوگئی۔

شرایط صلح پیرس میں بیٹھکر طے کئے گئے اور جس صلحنامہ کی رو سے یہ لڑائی ختم ہوئی اس کا نام صلحنامۂ ورسیلز ہے۔
اس جنگ سے جرمنی کو یوروپ میں جو سخت نقصان پہونچا اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ۲۷۲۵۰ مربع میل ملک اور ساڑھے چھ ملین آبادی اس کے ہاتھ سے نکل گئی یوروپ سے باہر ۱۱۲۸۰۰۰ مربع میل زمین اور تیرہ ملین آبادی اس کی حکومت سے علٰحدہ ہوگئی۔

اس صلحنامہ کی رو سے السا ک اور لورین، فرانس کو ملے، زیرین سلیشیا، پولینڈ کو دیا گیا، اضلاع میمل، لیتھونیا کو دئے گئے، شلسوگ کا ایک حصہ، ڈنمارک کو ملا اور متعدد سرحدی اضلاع بلجیم کو۔ سواحل رہائن کو غیر مسلح کردیا گیا، سار کا علاقہ بین الاقوامی کمیشن کے انتظام میں دیدیا گیا اور مستعمراتی مقبوضات اتحادیین کے ہاتھ آگئے۔

آیندہ جنوری ۱۹۳۹ء کا نگار

یعنی مصحفی نمبر طیار ہے

اور اپنی جامعیت کے لحاظ سے اُردو شاعری کی تاریخ میں بالکل پہلی چیز ہے — مصحفی کا مرتبہ اسوقت تک لوگوں نے نہیں پہچانا اور اب بالکل پہلی مرتبہ آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ کیسی غیر معمولی ہستی تھا —

مصحفی کے غیر مطبوعہ دواوین اور غیر مطبوعہ مثنویوں کا انتخاب — مصحفی کی غزلیات پر بالکل جدید اُصول انتقاد کے لحاظ سے تفصیلی تبصرہ — مصحفی کے شاگردوں کے متعلق ایک عالمانہ ریسرچ مصحفی کے تذکروں اور دیگر تصانیف پر ایک فاضلانہ انتقاد — اور اسی طرح کے بہت سے عنوانات پر بے مثل مضامین آپ کو اس نمبر میں نظر آئیں گے۔ ضخامت کا اندازہ ۲۰۰ صفحات کیا گیا ہے لیکن ممکن ہے اس سے بڑھ جائے۔ غیر خریداران نگار کے لئے اس نمبر کی قیمت دو روپیہ مقرر ہے — اگر آپ نگار کے خریدار ہیں تو خریداری کے سلسلہ کو جاری رکھئے تاکہ یہ نمبر آپ کو مل سکے —

منیجر نگار۔ لکھنو

غم

تجھے اے فطرتِ انساں مسرت کی تمنا ہے
نشاط و عیش ہی تیرے لئے سب کچھ ہیں دنیا میں
مگر ناداں یہ تیری بھول ہے، یہ تیری غفلت ہے
نشاط و عیش کے مفہوم سے نا آشنا ہے تو
ابھی اک دائمی عشرت سے نا واقف ہی دل تیرا
ابھی محروم ہے تو لذتِ غم کی لطافت سے
ابھی پیدا نہیں ہے سوزِ فطرت تیرے سینے میں

اسی کو حاصل عمر دو روزہ تو نے سمجھا ہے
نہیں کچھ اور گنجایش تری چشم تماشا میں
جسے تو نے سمجھ رکھا ہے عشرت، وجہ کلفت ہے
فریبِ زندگی کی شعلہ رنگی پر فدا ہے تو
تجھے بڑھنے نہیں دیتا ہے ذوقِ مضمحل تیرا
ابھی تاباں کہاں ہے دل ترا دردِ محبت سے
ابھی مصروف ہے تو بادۂ بے کیف پینے میں،

جو ہو جائے رسا تیری نظر غم کی حقیقت تک
تو اک دن تو پہونچ جائے وقارِ آدمیت تک

اگر ہے روح تیری تشنہ و مضطر تو جرأت کر
وہ خوش قسمت ہے جس کو نعمتِ غم شاد کرتی ہو
نیازِ عشق میں ہوتی ہے غم سے دلکشی پیدا
ظہورِ غم سے جذبے روح کے بیدار ہوتے ہیں
جسے عرفانِ غم حاصل ہوا سب کچھ ملا اس کو
خلش غم کی رسا ہوتی ہے جب سازِ رگ جاں تک
نمودِ غم سے عزت بڑھ گئی انساں کی ہستی کی
یہ وہ میخانہ ہے جس کی شرابِ تند پینے سے
بطورِ خاص یہ دولت عطا ہوتی ہے انساں کو
نشاطِ غم سے تکمیلِ طلب ہوتی ہے دنیا میں
یہ وہ آتشکدہ ہے جس میں کوثر کی لطافت ہو
یہ وہ مضراب ہے جو چھیڑتی ہے ساز کے پردے
خزانے ہیں اسی لذت میں پنہاں زندگانی کے
یہی قوت رسا تا حدِ نورِ عرش ہوتی ہے

نشاطِ زندگی کو مستقل کرنے کی صورت کر
یہ وہ دولت ہی جس سے روح کی دنیا سنورتی ہو
جبینِ شوق سے ہوتا ہے نورِ بندگی پیدا
سلیقے نالہ و فریاد کے ہموار ہوتے ہیں،
جو سچ پوچھو تو حاصل ہو گیا قربِ خدا اسکو
تو پہونچاتی ہے انساں کو تجلی گاہِ یزداں تک
حقیقت ماند ہو کر رہ گئی عشرت پرستی کی
کثافت کے نقوشِ تیرہ دھل جاتے ہیں سینے سے
یہ وہ نعمت ہے جو دیتی ہے تسکیں چشمِ گریاں کو
بہاریں خود چلی آتی ہیں آغوشِ تمنا میں
یہ ہے وہ پھول ہر پتی میں جس کی ایک جنت ہے
یہ وہ جذبہ ہے اُٹھ جاتے ہیں جس سے راز کے پردے
دکھاتی ہے یہی جلوے حیاتِ جاودانی کے
یہی طلعت ہے وہ جس میں خدا کی یاد سوتی ہو

غزلیات :-

سکندر علی وجد بی-اے (عثمانیہ)

(۱)

یہ راز اہلِ ہوس کی سمجھ میں آنہ سکا
جو پاس آنہ سکا، تجھ سے دور جا نہ سکا

جو دل کہ فاش کنِ رازہائے ہستی تھا
حریمِ ناز کا پردا کبھی اُٹھا نہ سکا

ملے تو زہرِ ہلاہل سمجھ دلِ ناداں!
وہی تو آبِ بقا تھا، جو ہاتھ آنہ سکا

وفورِ غم کا بُرا ہو میں آج پیشِ حبیب
طلوعِ شمس و قمر پر بھی مُسکرا نہ سکا

کیا تھا عشق نے بھی آج اہتمامِ فریب
پتہ کی بات مگر رنگِ رخ چھپا نہ سکا

بیانِ غم میں بڑی احتیاط لازم ہے
تمام عمر وہ مجھ سے نظر ملا نہ سکا

سدا جنوں کو سمجھتا رہا کمالِ حیات
شریرِ عقل کے پھندے میں وجد آنہ سکا

(۲)

کہاں تھی مجھ میں سکت زور آزمانیکی
اُٹھائیں عشق نے سب سختیاں زمانے کی

مری نظر نے کیا کام گُدگُدانے کا،
نگاہِ ناز تھی تمہیدِ مُسکرانے کی

مآلِ جذبۂ تکمیل اسے معاذ اللہ!
عجیب چیز تھی دُھن آشیاں بنانے کی

اُسی ادا سے پھر اک بار کوند اے بجلی،
چمک کے رہ گئی تقدیر آشیانے کی

رہیگا وجد بیاں، عشق کا سدا یکساں
بدلتی جائیگی سرخی فقط فسانے کی

سیری، جہاں پناہ اور دہلی کہنہ خونریزی اور غارتگری کا نہایت ہولناک منظر بنے رہے۔ اس لوٹ میں اس قدر زر، جواہر نقرئی وطلائی برتن، زیورات، اور قیمتی کپڑے ہاتھ آئے کہ شاید اس سے قبل کبھی تیموری فوج کو نصیب نہ ہوئے تھے۔ علاوہ اس کے قیدیوں کی تعداد اتنی تھی کہ ہر شخص کو بیس سے لیکر ایک سو غلام تقسیم ہوئے۔ تیمور نے دہلی کے بہت سے پیشہ ور دستکار اور حرفہ جاننے والے لوگوں کو سمرقند روانہ کردیا تاکہ وہاں کے لوگوں کو ان فنون کی تعلیم دیجائے۔

دہلی سے روانگی

تیمور کو پندرہ دن دہلی میں قیام کئے ہوئے ہوگئے تو اُسے خیال آیا کہ وہ یہاں ٹھیرنے نہیں آیا تھا بلکہ اسکا مقصود تو صرف جہاد تھا اس لئے وہ ۲۲ ربیع الثانی ۸۰۱ھ کو دہلی سے روانہ ہوا۔ اور قلعہ فیروز آباد میں نماز پڑھکر میرٹھ گیا۔ اس کو تباہ وبرباد کرکے ہردوار پہونچا اور یہاں بھی اُسے فتح حاصل ہوئی۔ اس کے بعد دریائے گنگ کو عبور کرکے کسوتی کے نیچے کوہ سوالک میں نشانات فتح چھوڑتا ہوا اُس نے نگرکوٹ اور جمو کو فتح کیا اور ۱۹ جمادی الآخر کو افغانستان کی وادیوں میں غائب ہوگیا[1]

اقبال خاں کی سرکشی

خدا کا قہر ختم ہوچکا تھا اور اب لوگ اپنی پوشیدہ جگہوں سے نکلنے شروع ہوگئے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی حالت اب تک وہی تھی اور ہر جگہ قحط وتباہی رونما تھی جب تیمور نے اس کو چھوڑ دیا تو اقبال خاں نے نصرت شاہ کو الگ کرکے تخت پر خود قبضہ کرلیا اور اٹاوہ وگوالیار وغیرہ کے ہندو راجاؤں کو جو خود مختار ہوگئے تھے زیر کرنیکی سخت کوشش کی

محمود شاہ دوبارہ ۸۰۲ھ—۸۱۵ھ / ۱۳۹۹-۱۴۱۲ء

محمود شاہ نے قنوج میں اپنی حکومت قایم کی اور ۸۰۸ھ میں اقبال خاں، خضر خاں گورنر ملتان کے مقابلہ میں ملا گیا اس کے بعد ۶-۷ سال تک پھر وہی طوایف الملوکی، گورنروں کی باہم خونریزی قایم رہی۔ یہاں تک کہ جب محمود شاہ نے ۸۱۵ھ / ۱۴۱۲ء میں انتقال کیا تو تخت دہلی پر بیٹھنے کے لئے کوئی نام کا بھی فرمانروا موجود نہ تھا آخر کار لوگوں نے مجبوراً امیر دولت خاں لودی کو فرمانروا بنادیا لیکن اس نے کبھی اپنے کو بادشاہ نہیں سمجھا[2]۔ چند ماہ بعد خضر خاں (گورنر دیپالپور) نے دہلی کا محاصرہ کیا

دولت خاں لودی ۸۱۵ھ—۸۱۶ھ / ۱۴۱۲-۱۴۱۳ء

---

[1] ظفرنامہ ۹۷۴-۵۲۲-۲۲۰ - تزک تیموری ۴۹۴-۷۷۴ — [2] جب ۸۱۵ھ میں محمود شاہ کا انتقال ہوگیا تو لوگوں نے دولت خاں لودہی کو اپنا سردار بنالیا۔ تاریخ مبارک شاہی کا بیان ہے کہ دولت خاں نے کوئی رسم تخت نشینی کی ادا نہیں کی اور نہ جشن وغیرہ کی اجازت دی۔ اس کے بعد مبارک خاں اور ملک ادریس بھی (جو خضر خاں کے معاون تھے) دولت خاں سے مل گئے۔ اس کے بعد محرم ۸۱۶ھ میں دولت خاں کٹھیر (روہیلکھنڈ) اور پسولی (بداؤں سے سات کوس) کی طرف گیا اور وہاں کے راجاؤں کو مطیع بناکر دہلی واپس آیا۔ یہاں خضر خاں نے فوجکشی کی اور آخر ہم ماہ کے محاصرہ کے بعد قلعہ سیری میں ۸ ربیع الاول ۸۱۷ھ کو دولت خاں نے ہتھیار ڈالدیئے اور خضر خاں (سید خاندان کے اول فرمانروا) نے حکومت دہلی کا چارج اپنے ہاتھ میں لے لیا — دولت خاں نے کبھی اپنے کو بادشاہ نہیں سمجھا۔ اس لئے اس نے اپنے نام کا کوئی سکہ بھی نہیں جاری کیا۔ جو سکے اس کے عہد میں مضروب ہوئے اُن میں فیروز شاہ یا اس کے خاندان والوں میں سے کسی کا نام درج کیا گیا۔

اور ۸ ربیع الاول ۸۱۷ھ (۲۳ مئی ۱۴۱۴ء) کو دولت خاں نے قلعۂ سیری اس کے سپرد کر دیا جس سے حکومتِ ہندوستان، سید خاندان میں منتقل ہو گئی۔[1]

محمود شاہ کے عہد کا مشہور شاعر قاضی ظہیر دہلوی تھا جو صاحبِ دیوان ہے اس نے محمود شاہ کی تعریف میں بہت سے قصاید لکھے ہیں۔ ملائے بدایونی کا بیان ہے کہ قاضی ظہیر کے بعد کوئی شاعر اس پائے کا نہیں گزرا۔

---

[1] تاریخ مبارک شاہی (الیٹ) ۴ - ۴۵ -

باب دوازدہم

سیّد خاندان

۸۱۷ھ / ۱۴۱۴ء = ۸۵۵ھ / ۱۴۵۱ء

خضر خاں ۸۱۷ھ تا ۸۲۴ھ / ۱۴۱۴ء تا ۱۴۲۱ء

خضر خاں کی فرمانروائی

خضر خاں، ملک الشرق ملک سلیمان کا بیٹا تھا اور ملک سلیمان "ناصر الملک مردان دولۃ" (گورنر ملتان) کا متبنٰی فرزند تھا اس کے مرنے پر ملک شیخ اس کا بیٹا جانشین ہوا، لیکن قضا نے اس کو بھی چند دن بعد اپنے باپ سے ملا دیا، اسلئے فیروز شاہ نے ملک سلیمان کو اقطاع ملتان کا مالک بنا دیا۔ مگر یہ بھی چند روز زندہ رہا اس لئے اس کے بعد اس کا بیٹا خضر خاں یہاں کا فرمانروا مقرر کیا گیا۔[1] چونکہ ملک سلیمان سید[2] تھا اور خضر خاں اس کا بیٹا تھا اس لئے جو عہدِ حکومت، خضر خاں سے شروع ہوتا ہے[3]، اسے سید خاندان کی سلطنت سے تعبیر کرتے ہیں۔ خضر خاں کو کسی مورخ نے سلطان کے لقب سے یاد نہیں کیا۔ مبارک شاہی میں تخت نشینی کے بعد اس کو "بندہ رائیت عالی" اور تخت نشینی کے پہلے "مسند عالی" لکھا ہے۔ طبقات اکبری میں رایت عالی درج ہے اور ملا بدایونی نے مسند عالی تحریر کیا ہے

---

[1] مبارک شاہی (الیٹ) ۴-۴۶ [2] اس کے سیّد ہونے کے ثبوت میں مبارک شاہی میں یہ واقعہ نقل کیا ہے۔ ایک بار مولانا جلال الدین بخاری ملک مردان کے مکان پر تشریف لے گئے۔ جب کھانا پیش ہوا تو ملک مردان نے سلیمان کو حکم دیا کہ "حضرت کے ہاتھ دھلواؤ" مولانا نے فرمایا کہ یہ سیّد ہے۔ اس سے یہ خدمت لینی مناسب نہیں ہے" علاوہ اس کے خود سلیمان کے اطوار و عادات اس کے موید ہیں کہ وہ سیّد تھا۔

[3] تاریخ "مبارک شاہی" کا مصنف یحییٰ بن احمد بن عبداللہ سرہندی تھا۔ چونکہ مصنف کا مقصود مبارک شاہ ثانی (سید خاندان کے حکمراں) کے مفصل حالات درج کرنا تھا اس لئے اس کتاب کا نام تاریخ مبارک شاہی رکھا گیا۔ اس تاریخ کی ابتدا محمد سام (غوری) [illegible] ہوتی ہے اور جو قلمی نسخہ اس کا دستیاب ہوا ہے اس میں صرف ۸۵۲ھ / ۱۴۴۸ء تک کے حالات درج ہیں (جو سلطان سید محمد کی حکومت کا درمیانی زمانہ تھا) اس لئے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کے بعد اس نے کس عہد کے حالات لکھے تھے۔ (بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۴۶ پر ملاحظہ ہو)

فرشتہ نے صرف "سید خضر خاں" کو ترجیح دی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خضر خاں نے باوجود تخت نشین ہو جانے کے ہمیشہ اپنے کو تیمور کا ماتحت سمجھا اور کبھی بادشاہ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ فرشتہ نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ جب تک تیمور زندہ رہا خضر خاں نے سکوں اور خطبوں میں اسی کا نام رکھا اور تیمور کے بعد شاہ رخ کا۔ یہی بیان آئینِ اکبری میں درج ہے اور نظام الدین احمد (صاحب طبقات اکبری) نے بھی یہی تحریر کیا ہے۔ لیکن حقیقت غالباً یہ نہیں ہے۔ خضر خاں کے متعلق تمام حالات جمع کرنے میں فرشتہ اور نظام الدین احمد نے مبارک شاہی کو اپنا ماخذ قرار دیا ہے اور آئینِ اکبری میں فرشتہ کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ لیکن مبارک شاہی میں جو اس وقت کی سب سے زیادہ مستند تاریخ ہے کہیں اس کا ذکر نہیں ہے کہ خضر خاں نے تیمور اور شاہ رخ کے نام کے سکے جاری کئے، یا خطبہ میں اُن کا ذکر کیا گیا۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے بھی اپنی تصنیف منتخب التواریخ میں صرف اس بیان پر کفایت کی ہے کہ "اسم بادشاہی بر خود تجویز نہ کرد و رایات اعلےٰ خطاب یافت"۔[1]

اڈورڈ طامس نے بھی (جو سکوں کی تحقیق میں بہترین سند قرار دیا جاتا ہے) اس کی مخالفت کی ہے، کیونکہ خضر خاں کے عہد میں جتنے سکے رائج ہوئے اُن میں سے کسی سکے پر تیمور یا شاہ رخ کا نام منقوش نہیں کیا گیا، اکثر ایسا ہی ہوا کہ جو سانچے فیروز شاہ اور اس کی اولاد کے زمانہ میں رائج تھے، انھیں پر اس نے بھی سکے ضرب کرائے اور اگر نئے سانچے بنائے تو بھی خضر خاں نے فیروز شاہ یا اس کی اولاد کا نام درج کرایا۔ چونکہ وہ خود بادشاہ کہلائے جانے کی آرزو نہ رکھتا تھا اس لئے اس کو پروا نہ ہو سکتی تھی کہ سکوں پر کس کا نام ہے البتہ وہ سنہ ضرور درج کرتا تھا جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ فلاں شخص کے عہد حکومت میں یہ سکہ مضروب ہوا۔ بالکل یہی ترکیب ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی کی تھی کہ اول اول شاہ عالم وغیرہ کے نام اپنے سکوں میں منقوش کرائے تاکہ بازار میں ان کا چلن ہو جائے۔[2] الغرض سکہ و خطبہ کے مسئلہ میں فرشتہ نے صرف اپنی ذہانت و اختراع سے کام لیا اور مورخین مابعد نے مزید کاوش کے اس کے بیان کی تقلید کی۔ سوائے ملا عبدالقادر کے کہ اس نے کہیں اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔

خضر خاں سب سے پہلے تاریخ ہند میں بہ حیثیت گورنر ملتان نمودار ہوا۔[3] جب فیروز شاہ مر گیا اور اس کے بعد حکومت میں طوائف الملوکی پھیل گئی تو پھر وہ اس وقت نظر آیا جب سارنگ خاں، ملو اقبال خاں کے بھائی نے قلعۂ ملتان کا محاصرہ کر کے اس کو قید کر لیا (۷۹۸ھ) اس کے بعد خضر خاں کسی طرح قید سے اپنی جان بچا کر بیانہ چلا گیا اور پھر جب تیمور نے

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۴۵)

فیروز شاہ تک کے حالات اُس نے دوسری تاریخوں کی مدد سے لکھے ہیں بعد کے واقعات اُس نے معتبر روایات اور اپنے مشاہدہ کی بناء پر تحریر کئے ہیں۔ اس نے اپنے حالات و تعلقات سے اعتنا نہیں کیا اس لئے نہیں معلوم ہو سکتا کہ وہ کیا تھا اور دربار مبارک شاہ سے اس کا کیا تعلق تھا۔ سید خاندان کے حالات کی واحد معتبر تاریخ یہی ہے چنانچہ سیدوں کی تاریخ لکھنے میں نظام الدین احمد، صاحب طبقات اکبری، نے بالکل اسی سے مدد لی ہے، اور فرشتہ نے بھی اس سے اقتباس کیا ہے اور ملا عبدالقادر بدایونی کا ماخذ بھی یہی ہے۔

[1] بدایونی ۵۔ [2] کرانکلس آف دی پٹھان کنگس مصنفہ اڈورڈ طامس صفحہ ۳۲۹۔۳۳۰۔ [3] عہد فیروز شاہ میں

حملہ کیا تو اس نے اپنی امیدوں کو اس کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ اور آخر کار امیر تیمور کی واپسی پر اس نے ۸۱۷ھ/۱۴۱۴ء میں دولت خاں لودہی کو زیر کر کے دہلی پر قبضہ حاصل کر لیا۔

اس نے سات سال تک حکومت کی اور ہمیشہ اس کوشش میں رہا کہ کسی طرح سلطنت دہلی کا اگلا اقتدار پھر قایم ہو جائے۔ لیکن وہ اس میں صرف اسی قدر کامیاب ہوا کہ قرب و جوار کے راجہ ایک حد تک مطیع تو ہو گئے لیکن بغاوت و شورش بدستور باقی رہی اور جو اجزاء سلطنت منتشر ہو گئے تھے وہ فراہم نہ ہو سکے

۸۱۷ھ میں تخت نشین ہوتے ہی اپنے وزیر تاج الملک (ملک الشرق) کو بدایوں اور کٹیہر کی طرف روانہ کیا یہاں کا راجہ ہر سنگھ کوہستان آنولہ[1] میں بھاگ گیا۔ اور پھر مطیع ہو گیا۔ اسی طرح مہابت خاں امیر بدایونی نے بھی اطاعت اختیار کی۔ اس کے بعد اس نے کالی ندی اور گنگا کو عبور کر کے شمس آباد اور کمپل (کمبلا) کے باغیوں سے خراج وصول کیا اور دہلی واپس آیا لیکن چونکہ راجاؤں اور باغیوں کی یہ اطاعت بالکل عارضی تھی، اس لئے پھر شورش و انحراف کی شکایت رہی اور ۸۱۹ھ/۱۴۱۶ء میں دوبارہ تاج الملک کو بیانہ اور گوالیار جانا پڑا۔ خود خضر خاں کو بھی قلعہ ناگور کی طرف سفر کرنا پڑا کیونکہ سلطان احمد شاہ گجراتی نے وہاں کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ اس سے فارغ ہو کر یہ گوالیار گیا قلعہ تو فتح نہ ہوا لیکن وہاں کے راجہ سے خراج وصول کر کے بیانہ گیا اور یہاں کے حاکم شمس خاں اوحدی، کو بھی زیر کیا

۸۲۰ھ/۱۴۱۷ء میں ملک طغائی اور ترکوں کی جماعت نے بغاوت کی اور سرہند کا محاصرہ کر لیا، خضر خاں نے زیرک خاں حاکم سامانہ کو اس بغاوت کے فرو کرنے کے لئے مامور کیا۔ ملک طغائی نے اطاعت قبول کی اور جالندھر اس کے سپرد کیا گیا۔

۸۲۱ھ/۱۴۱۸ء میں راجہ کٹیہر نے بغاوت کی تاج الملک نے اسے زیر کیا اور اٹاوہ کو تاخت کرتے ہوئے دہلی واپس آیا۔

۸۲۲ھ میں خود خضر خاں کو کٹیہر کی طرف جانا پڑا اور اس نواح کے باغیوں کو زیر کر کے بدایوں کی طرف متوجہ ہوا مہابت خاں حاکم بدایوں قلعہ بند ہو گیا خضر خاں نے محاصرہ کیا اور چھ ماہ تک یہیں پڑا رہا قلعہ فتح ہونے کے قریب تھا کہ دہلی میں شورش ہونے کی خبر معلوم ہوئی اور مجبوراً واپس جانا پڑا

سارنگ خاں کا خروج

اس کے بعد معلوم ہوا کہ ایک شخص نے جو اپنے کو سارنگ خاں کہتا ہے خروج کر کے اقطاع جالندھر میں شورش برپا کر رکھی ہے۔ بمشکل تمام اس کا فتنہ بھی فرو ہوا

خضر خاں کا انتقال

۸۲۴ھ/۱۴۲۱ء میں خضر خاں نے میوات کو زیر کیا اور گوالیار کی طرف روانہ ہوا۔ یہاں سے خراج لیکر اٹاوہ پہونچا اور یہیں بیمار ہو گیا۔ چنانچہ اسی حال میں دہلی واپس آیا اور ۱۷ جمادی الاول ۸۲۴ھ (۱۵ مئی ۱۴۲۱ء) کو مر گیا۔ تاج الملک کا انتقال اس سے چار ماہ قبل محرم میں ہو چکا تھا[2]

آثار الصنادید، کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ۸۲۱ھ/۱۴۱۸ء میں دریا کے کنارے ایک شہر بھی آباد کیا تھا اور

---

[1] طبقات اکبری میں درۂ آنولہ۔ بدایونی میں جنگل آنولہ اور تاریخ فرشتہ میں صرف کوہستان لکھا ہے۔ [2] مبارک شاہی (الیٹ) ۴۔ ۵۴۔ ۵۳۔

وہاں قلعہ و محلات تعمیر کرائے تھے۔ لیکن اب اس قلعہ کا پتہ نہیں ہے ممکن ہے کہ اب جس موضع کا نام خضر آباد ہے وہی جگہ خضر خاں کا آباد کیا ہوا شہر ہو[1]

خضر خاں نے اپنی وفات سے تین دن پہلے اپنے بیٹے کو جانشین مقرر کر دیا تھا، چنانچہ وہ ۱۹ جمادی الاول ۸۲۴ھ کو (یعنی وفات خضر خاں کے تین دن بعد) تخت نشین ہوا

اسی سال شیخا کھوکر کے بھائی جسرت اور طغان رئیس نے بغاوت کی اور یہ شورش اس حد تک بڑھی کہ خود مبارک شاہ کو سفر کرنا پڑا۔ اس جنگ میں جسرت کو شکست ہوئی اور وہ بھاگ گیا۔ لاہور بالکل ویران ہو گیا تھا اس لئے چند دن قیام کر کے اس کو آباد کیا، عمارات بنوائیں اور پھر دہلی واپس آیا۔

۸۲۶ھ (۱۴۲۳ء) میں کٹیہر (روہیلکھنڈ) کی طرف فوجکشی کی اور خراج وصول کیا۔ مہابت خاں، حاکم بدایوں نے بھی حاضر ہو کر معافی چاہی۔ اسی سال بیانہ میں بدامنی پھیلی اور مبارک شاہ نے اُسے فرو کیا۔ ۸۲۹ھ (۱۴۲۵ء) میں میواتیوں نے شورش برپا کی اور لشکر شاہی اس طرف روانہ کیا گیا۔ ابراہیم شاہ شرقی اور مبارک شاہ سے برہان آباد ضلع اٹاوہ کے میدان میں، جنگ ہوئی، لیکن ابراہیم شاہ شرقی جونپور خائف ہو کر چلا گیا اور ۸۳۱ھ (۱۴۲۸ء) میں مبارک شاہ کامیاب دہلی واپس آیا۔ ۸۳۳ھ (۱۴۲۹ء) میں فولاد غلام[2] نے سرہند میں سر اُٹھایا اور مسلسل چار سال تک مبارک شاہ اس کے پیچھے سرگرداں رہا۔ آخر کار رجب ۸۳۷ھ (۱۴۳۳ء) میں، جو مبارک شاہ کا آخری سال تھا، فولاد غلام مارا گیا اور بمشکل تمام پنجاب کی شورش عارضی صورت سے رفع ہو سکی۔

مبارک شاہ اپنے خصائل کے لحاظ سے نیک طینت اور کریم النفس شخص تھا، وہ اکثر و بیشتر خود اپنی فوج کے ساتھ جا کر دشمنوں سے جنگ کرتا تھا اور حد درجہ دلیر و شجاع تھا۔ جو بدامنی اور خرابی پہلے سے چلی آ رہی تھی وہی اس کے عہد میں بھی قایم رہی۔ جونپور اور مالوہ کے صوبوں کی جو سیاسی اہمیت قایم ہو چکی تھی، اس نے مبارک شاہ کو اس قدر تکلیف نہیں پہونچائی جس قدر اقطاع پنجاب نے جہاں اس کا باپ خضر خاں سلطنت دہلی حاصل کرنے کے لئے دولت خاں لودی کے خلاف روانہ ہوا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ محمد بن سام کے جانشینوں کا متبرک پایۂ تخت پہلے ہی ہندوستان میں اپنا

---

[1] آثار الصنادید، سید احمد خاں جلد دوم صفحہ ۲۵-۲۶۔ [2] سید سالم خضر خاں کا بڑا معتمد علیہ امیر تھا اور بڑے بڑے اقطاع مثلاً سرہند، امروہہ، وسرتی وغیرہ اس کی جاگیر میں تھے ـــ جب سید سالم کا انتقال ہوا تو مبارک شاہ نے اس کے بڑے بیٹے کو سید خاں اور چھوٹے بیٹے کو شجاع الملک کا خطاب دیکر جاگیر بدستور بحال رکھی ـــ لیکن سید سالم کے بیٹوں نے مرکز حکومت سے کمزوری اور طوایف الملوکی سے ناجائز فایدہ اُٹھانا چاہا اور فولاد کو جو ان کے باپ کا غلام اور ترک بچہ تھا۔ سرہند بھیجا کہ وہاں فتنہ بپا کرے اور اس جھگڑے میں خود انھیں بغاوت کرنے کا موقع مل جائے۔

اقتدار کھو چکا تھا اور تیمور کے حملہ نے تو ایسی کاری ضرب لگائی کہ بچی کچی بادشاہوں کی جو عزت ہندوستانی آبادی کے دل میں مرتسم تھی وہ دفعتہً زائل ہوگئی

ہندو زمینداروں کی بغاوتیں

کیتھر کے ہندو زمینداروں نے اس کے عہد میں بغاوت کی۔ دہلی کے جنوب میں جو ایک حصۂ ملک نصف دائرہ کی صورت میں مختلف جاگیرداروں، راجاؤں اور امراء کے قبضہ میں تھا اس نے سر اٹھایا۔ مبارک شاہ نے اُن کو دبا کر خراج وصول کیا عارضی طور سے وہ مطیع ہوگئے اور پھر سرکشی اختیار کی الغرض یہی مد و جزر قایم رہا۔ لیکن سب سے زیادہ تکلیف پنجاب کے گکھڑوں یا کھوکروں سے پہونچی جن پر حقیقت یہ ہے کہ تیمور کو بھی برائے نام فتح حاصل ہوئی تھی اور ان تاتاری

گکھڑوں یا کھوکروں کی بغاوتیں

حملوں سے جو شاہ رخ کے گورنر کابل کی امداد سے فولاد نے پے در پے پنجاب میں جاری رکھے اور ان کی سازشوں سے خود دہلی بھی محفوظ نہ رہ سکا

مبارک شاہ کا قتل

مبارک شاہ اپنے نئے شہر مبارک آباد[1] کی مسجد میں تھا کہ خود اس کے وزیر سرور الملک کے اشارہ سے ہندوؤں نے اسے قتل کر ڈالا۔ تاریخ وفات، مصنف مبارک شاہی نے ۹ رجب ۸۳۷ھ (۱۹ جنوری ۱۴۳۴ء) تحریر کی ہے۔

محمد شاہ بن فرید خاں بن خضر خاں ۸۳۷ھ تا ۸۴۹ھ ۱۴۳۴ء تا ۱۴۴۵ء

مبارک شاہ کے قتل ہوتے ہی چند گھنٹے بعد مکار وزیر (سرور الملک) نے محمد شاہ کو جو خضر خاں کا پوتا، فرید خاں کا بیٹا اور مبارک شاہ کا متبنٰی فرزند تھا تخت نشین کر دیا اور چونکہ تخت نشینی بالکل برائے نام تھی اور وزیر خود بادشاہ بننا چاہتا تھا اس لئے اس نے خزانہ و جبیل خانہ پر قبضہ کر لیا اور بڑی بڑی جاگیریں اپنے ہی آدمیوں کو (جن میں سدپال اور سدہارن کھتری قاتلِ مبارک شاہ بھی شامل تھے) تقسیم کیں اور امراء مبارک شاہ میں سے بعض کو قتل اور بعض کو مقید کر دیا۔ چونکہ سرور الملک (جسے اب خان جہاں کا خطاب مل گیا تھا) کی دغابازی اور مکاری کا حال سب کو معلوم ہوگیا تھا اسلئے اُن امراء نے جو خضر خاں کے ممنون تھے (مثلاً الہ داد، کاکا لودی امیر سنبھل، آہار میاں حاکم بدایوں، امیر علی گجراتی، امیر کمیل ترک بچہ) سرور الملک کی مخالفت شروع کر دی۔ اس نے اپنے خاص سرداروں کو ان مخالف امراء کے مقابلہ میں روانہ کیا، انھیں میں ایک کمال الملک بھی تھا جو در پردہ سرور الملک کا سخت دشمن تھا اور مبارک شاہ اپنے آقا کے خون کا بدلہ اس سے لینا چاہتا تھا۔ یہ لوگ برن (بلند شہر) پہونچے تو کمال الملک کے ساتھی امراء کو معلوم ہوا کہ یہ تو خود ہمارا ہی دشمن ہے، اس لئے انھوں نے سرور الملک کو اس کی اطلاع کی۔ سرور الملک نے اس کا انسداد کرنا چاہا تھا

---

[1] ۱۷ ربیع الاول ۸۳۳ھ کو مبارک شاہ نے جمنا کے کنارے پر ایک شہر کی بنیاد رکھی اور اس کا نام مبارک آباد رکھا۔ سرسید احمد خاں نے آثار الصنادید میں لکھا ہے کہ مبارک آباد غالباً وہی تھا جسے اب مبارک پور کہتے ہیں اور مبارک شاہ کا مقبرہ بھی یہیں ہے اس لئے مبارک آباد کی تلاش موضع اوکھلا میں کرنی چاہیئے جہاں خضر خاں کا مقبرہ بھی پایا جاتا ہے۔

مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہوا اور اسی اثنا میں کمال الملک نے ملک اللہ داد وغیرہ موافق امراء کو ساتھ لیکر دہلی کا رُخ کیا اور قلعۂ سیری کو محصور کر لیا۔ یہ محاصرہ تین ماہ تک قایم رہا۔ بادشاہ کو بھی سارے حالات معلوم ہو چکے تھے اسلئے اس نے سرور الملک کو جبکہ وہ خود بادشاہ کے قتل کی فکر میں تھا ہلاک کرا دیا اور اس کے ساتھیوں کو بھی عبرتناک سزائیں دیں۔ اب محمد شاہ کے لئے یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اپنے تئیں خود مختار بادشاہ سمجھا۔ اس کے بعد ۸۴۴ھ ۱۴۴۰ء میں بادشاہ سامانہ گیا اور وہاں کے گکھروں کے خلاف ایک فوج روانہ کی جو تاخت و تاراج کے بعد واپس آئی

خاتمۂ سلطنت اور عیش و عشرت

محمد شاہ نے ان جھگڑوں سے فارغ ہو کر کچھ دنوں تک انتظام سلطنت کی طرف توجہ کی، لیکن پھر عیش و عشرت میں مشغول ہو گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں پھر وہی بدامنی شروع ہو گئی اور قرب و جوار کے خود مختار فرمانرواؤں نے اس سے فایدہ اُٹھایا، چنانچہ ابراہیم شاہ شرقی (جونپور) نے بہت سے اضلاع کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ مالوہ کے فرمانروا محمود خلجی کی جرأت تو اس حد تک بڑھ گئی کہ اس نے خود دہلی پر حملہ کیا۔ ان مصائب سے آزاد ہونے کے لئے محمد شاہ نے بہلول لودی کو طلب کیا جو لاہور اور سرہند کا گورنر (لیکن حقیقتاً وہاں کا حکمراں) تھا۔ اس کی مدد سے یہ خطرات اسوقت دور ہو گئے بادشاہ نے بہلول لودی کو اپنا بیٹا بنایا اور خان خاناں کا خطاب دیا۔ ہر چند اس کے بعد اسی بہلول نے خود محمد شاہ کو معزول کرنے کی غرض سے دہلی پر حملہ کیا لیکن کامیاب نہیں ہوا۔

محمد شاہ کی وفات

محمد شاہ بن فرید خاں [1] ۸۴۷ھ میں اپنی طبعی موت سے مرا۔

علاؤالدین بن محمد شاہ ۸۴۹-۸۵۵ھ ۱۴۴۵-۵۱ء

محمد شاہ کے بعد تمام امراء نے سوائے بہلول لودی کے علاؤالدین کے ہاتھ پر بیعت کی اور اسے دہلی کا حکمراں تسلیم کیا، لیکن اس نے تخت نشین ہوتے ہی اپنی عادت و اطوار سے ظاہر کر دیا کہ اس میں حکمرانی کی اہلیت بالکل نہیں ہے، اسوقت سلطنت دہلی کی تفریق و انتشار کی یہ حالت تھی کہ:۔

(۱) دکن، گجرات، مالوہ، جونپور، بنگال، کے گورنر خود مختار بادشاہ تھے اور اپنے نام کا سکہ و خطبہ انھوں نے جاری کر رکھا تھا

(۲) پنجاب میں پانی پت سے لاہور، دیپال پور اور سرہند تک بہلول لودی کی حکومت تھی

(۳) مہرولی اور میوات میں (دلی سے سات کوس تک) احمد خاں میواتی قابض تھا

(۴) سنبھل سے حدود دہلی تک دریا خاں لودی کی فرمانروائی تھی

---

[1] محمد بن فرید خاں کی تاریخ وفات میں مورخین کا اختلاف ہے۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ محمد شاہ نے بارہ سال تک حکومت کی اور زمانہ حکومت کا تعین ۸۳۹ھ سے ۸۴۹ھ تک کیا ہے جو صرف دس سال کا زمانہ ہوتا ہے بدایونی نے اس کا زمانہ حکومت ۱۴ سال تحریر کیا ہے۔ (۸۳۷ھ سے ۸۴۷ھ تک) جو بالکل صحیح ہے۔ طبقات اکبری نے بھی صرف دس سال تحریر کئے ہیں۔ مبارک شاہی کا کوئی مکمل نسخہ ایسا نہیں مل سکا جس میں یہ تاریخ درج ہوتی جو اجزاء مبارک شاہی کے دستیاب ہوئے ہیں ان میں صرف ۸۳۸ھ تک کے حالات درج ہیں۔

علاؤالدین کے عہد میں سلطنت دہلی

علاؤالدین کی غلطیاں

دہلی پر بہلول کا قبضہ

(۶) کمپلا اور پٹیالی میں، پرتاب سنگھ کی حکومت تھی

(۷) بیانہ میں داؤد خاں لودی کا تصرف تھا۔

(۸) گوالیار، دھولپور، بھدورا میں جدا جدا راجہ فرمانروا تھے

(۹) راپری اور اس کے مضافات میں قطب خاں افغان حکمراں تھا[1]

چنانچہ تاریخ خانِ جہاں[2] لودی میں لکھا ہے کہ اس وقت علاؤالدین کی سلطنت کے متعلق عام طور سے یہ فقرہ ضرب المثل ہوگیا تھا کہ "بادشاہی شاہ عالم۔ از دہلی تا پالم[3]"۔ الغرض سلطنت دہلی کے حدود یہ رہ گئے تھے کہ ایک جانب صرف ایک میل اور باقی اطراف میں ۱۲ میل سے زاید زمین نہ تھی۔ پھر اس کے ساتھ یہ طرہ ہوا کہ بادشاہ کو بدایوں کی آب ہوا زیادہ اچھی معلوم ہوئی اور دارالحکومت اس کو بنانا چاہا۔ ہر چند امرا نے منع کیا لیکن وہ باز نہ آیا اور باوجود اس کے کہ اس اثنا میں دو بار بہلول لودی حملہ کرچکا تھا (ہرچند وہ حملے کامیاب نہ ہوئے) بادشاہ نے اپنا عزم پورا کیا اور دہلی میں اپنے دو سالوں کو حکومت سپرد کر کے بدایوں چلا گیا۔ یہ پہلی غلطی علاؤالدین کی تھی۔ دوسری حماقت یہ ہوئی کہ اسنے اپنے وزیر حمید خاں کو دشمنوں کے کہنے سے مقید کرلیا جو بعد میں بداؤں سے بھاگ کر دہلی آگیا۔ اس نے علاؤالدین سے انتقام لینے کے لئے بہلول لودی کو دہلی میں آنے کی دعوت دی۔ یہ پہلے ہی سے طیار تھا۔ فوراً دہلی آگیا اور قبضہ کرلیا۔

---

[1] Erskin's lives of Baber & Humayoon I 405.

[2] تاریخ خان جہاں لودہی اور مخزن افاغنہ کا الگ الگ ذکر کیا جاتا ہے لیکن حقیقتاً یہ ایک ہی کتاب کے دو نام ہیں۔ اور کوئی فرق ان دونوں میں سوائے اس کے نہیں ہے کہ مخزن پر جب دوبارہ نظرثانی کی گئی تو کچھ حذف و اضافہ کے ساتھ تاریخ خان جہاں بن گئی۔ چونکہ اس تاریخ میں بطور ضمیمہ کے خان جہاں لودہی کے بھی حالات درج کردئے گئے ہیں (جو جہانگیر کا مشہور جنرل تھا اور عہد شاہجہاں میں باغی ہوجانے کی وجہ سے مارا گیا) اس لئے اس کا نام "تاریخ خان جہاں لودہی" ہوگیا۔ جہانگیر کے بھی کچھ مختصر حالات اس میں شامل ہیں۔

اس کے مصنف کا نام نعمت اللہ تھا۔ یہ دربارِ جہانگیر کا وقایع نویس تھا مصنف نے اپنے باپ خواجہ حبیب اللہ ساکن ہرات کے متعلق لکھا ہے کہ وہ ۳۵ سال تک اکبر کی ملازمت میں رہا ـــ اس کتاب کی ترتیب و تالیف میں "سامانہ" کے نواب ہیبت خاں سے اسکو بہت مدد ملی چنانچہ خود نعمت اللہ، مخزن کے دیباچہ میں لکھتا ہے کہ "میں نے یہ کتاب خان جہاں لودھی کے حکم سے مرتب کی اور اس کی ترتیب میں سامانہ کے ہیبت خاں بن سلیم خاں نے (جو خان جہاں لودہی کی ملازمت سے وابستہ تھا اور جس نے افغانوں کی منتشر تاریخ کو یکجا فراہم کیا تھا) مجھے بہت مدد دی۔ یہ کتاب برہانپور میں لکھی گئی اور اس کتاب کی ترتیب ۱۰۲۱ھ ۱۲۱۶ع میں ختم ہوئی۔

مسٹر ڈورن نے مخزن کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے۔ اُن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ نعمت اللہ فرشتہ کا ہم عہد تھا۔

[3] پالم، دہلی کے قریب ایک چھوٹا سا صوبہ یا ضلع تھا۔

علاؤالدین کی وفات اور سید خاندان کی حکومت کا خاتمہ

لیکن علاؤالدین کا نام خطبہ اور سکہ میں بدستور جاری رکھا[1] بعد کو جب اس کا پورا اقتدار قایم ہوگیا تو اس نے حمید خاں کو قید کرکے علاؤالدین کو اطلاع دی۔ بادشاہ نے لکھ بھیجا کہ میرے باپ نے تمھیں بیٹا بنایا تھا اس لئے تم میرے بھائی ہو۔ دہلی کی سلطنت میں تمھیں دیتا ہوں اور خود بدایوں پر قناعت کرتا ہوں۔ اس کے بعد ۸۵۵ھ میں اس نے خطبہ سے علاؤالدین کا نام خارج کرادیا اور چتر شاہی سر پر رکھ کر دہلی کا بادشاہ ہوگیا۔

علاؤالدین، بدایوں میں ۸۸۳ھ تک زندہ رہا اس نے دہلی میں سات سال چھ ماہ تک حکومت کی اور بدایوں میں ۲۸ سال تک۔ اس کے ساتھ ہی سید خاندان کی حکومت کا بھی خاتمہ ہوگیا اور بہلول لودی کے وقت سے دہلی کے تخت پر ایک اور جدید خاندان نظر آنے لگا جسے خاندانِ لودی کہتے ہیں۔

---

[1] یہ بیان فرشتہ کا ہے۔ بدایونی اور طبقات اکبری میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے

باب سیزدہم

لودی خاندان

(۸۵۵ھ / ۱۴۵۱ء = ۹۳۲ھ / ۱۵۲۶ء)

بہلول لودی کا عہد (۸۵۵ھ - ۸۹۴ھ)

فرشتہ نے بہلول کے خاندانی حالات کی صراحت کرتے ہوئے ظاہر کیا ہے کہ لودی، افغانوں کی ایک جماعت تھی جو ہندوستان میں بہ سلسلۂ تجارت آمد و رفت رکھتی تھی۔ بہلول کا دادا ملک بہرام، فیروز شاہ کے عہد میں ملتان آیا اور یہاں کے حاکم مردان دولت کا ملازم ہوگیا۔ اس کے پانچ بیٹے۔ ملک سلطان شہ، ملک کالا، ملک فیروز، ملک محمد، ملک خواجہ بھی اس کے ہمراہ تھے[1]

جب ملتان کا حاکم خضر خاں ہوا تو ملک شہ اس کا ملازم ہوگیا اس نے خضر خاں کی طرف، ملو اقبال سے جنگ کی اور اس کو قتل کر دیا۔ اس صلہ میں خضر خاں نے اسلام خاں کا خطاب دیکر سرہند کی حکومت اس کے سپرد کر دی۔

بہلول لودی کا ابتدائی عروج

ملک شہ کا بڑا بھائی ملک کالا، جو دوراہ کا حاکم تھا، ایک جنگ میں مارا گیا۔ لیکن اس کی بیوی حاملہ تھی۔ وضع کے دن قریب تھے کہ اتفاق سے ایک مکان کی چھت گر پڑی۔ وہ تو مر گئی لیکن جنین زندہ رہا، جو اسوقت ماں کا پیٹ چاک کرکے نکالا گیا۔ یہی تھا وہ یتیم فرزند (ملو) جس کی قسمت میں آیندہ بہلول لودی ہونا لکھا تھا۔

اس بچہ کی تربیت اس کے چچا اسلام خاں نے کی۔ جب بہلول جوان ہوا تو اسلام خاں اس کی خدمات سے اسقدر خوش ہوا کہ اپنی بیٹی اس سے منسوب کر دی اور اپنے بعد اس کو جانشین کر گیا۔ اسلام خاں کا اقتدار اس قدر بڑھ گیا تھا کہ بارہ ہزار افغانی سپاہیوں کو وہ اپنے پاس سے تنخواہ دیتا تھا۔ ہر چند اسلام خاں کے بعد اس کے بھائی (ملک فیروز) اور بیٹے (قطب خاں) نے بہلول کا مقابلہ کیا لیکن کامیاب نہیں ہوئے اور بہلول کا اقتدار بڑھتا گیا۔

[1] فرشتہ۔ ۱۷۳

بہلول لودی کی سلطنت کی پریشانی

یہ آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ بہلول لودی سلطنت دہلی حاصل کرنے کے لئے عرصہ سے بیتاب تھا، اور متواتر حملے بھی اس نے کئے تھے۔ چنانچہ جب حمید خاں وزیر نے اس کو بلایا تو وہ فوراً چلا گیا اور وہاں حمید خاں کو قید کر کے ۸۵۵ھ؁ [۱] ۱۴۵۱ء میں خود مختار بادشاہ بن بیٹھا

بہلول لودی کو سلطنت دہلی جس حال میں ملی تھی اس کا حال ہم ابھی بیان کر چکے ہیں کہ کس طرح تمام صوبے خود مختار ہو گئے تھے اور حکومت دہلی گویا صرف شہر دہلی سے تعبیر کی جاتی تھی۔ لیکن باوجود اس بد امنی و انتشار کے بہلول لودی نے جس قابلیت اور عزم و ثبات سے اک مٹی ہوئی سلطنت کا اقتدار دوبارہ قایم کیا وہ تاریخ کا حیرتناک واقعہ ہے۔

بہلول لودی کے شاہانہ عزائم

بہلول لودی نے ۳۸ سال تک حکومت کی اور اس طویل زمانہ میں ایک بار بھی اس نے کسی ایسے طرز عمل کو پیش نہیں کیا جو شاہانہ عزایم و ملوکانہ خصایل کے منافی ہوتا۔

تخت نشین ہوتے ہی اس نے سب سے پہلے پنجاب کی طرف توجہ کی اور دہلی کا انتظام اپنے بیٹے بایزید اور دیگر امراء کے سپرد کر کے، دیپال پور کی طرف روانہ ہوا۔ محمود شاہ فرمانروائے جونپور نے اس فرصت کو غنیمت جان کر اپنی بیوی کے اصرار سے (جو علاؤ الدین، سید خاندان کے آخری حکمراں کی بیٹی تھی) دہلی پر حملہ کر دیا۔ بہلول یہ خبر سنکر پنجاب سے دہلی آیا اور افغانوں کی ایک بڑی جماعت اپنے ساتھ اطراف پنجاب سے فراہم کر لایا۔ ہر چند اس مقابلہ میں محمود شاہ کو شکست ہوئی اور وہ جونپور چلا گیا۔ لیکن بعد کو مسلسل ۲۶ سال تک بہلول لودی اور فرمانروایان جونپور کے درمیان آتش جنگ مشتعل رہی اور آخر کار بہلول لودی نے ۸۹۳ھ؁ ۱۴۸۷ء میں سلطنت جونپور کی جداگانہ ہستی کو ہمیشہ کے لئے مٹا کر سلطنت دہلی میں شامل کر لیا اور حسین شاہ شرقی کو (جو سلطنت جونپور کا آخری فرمانروا تھا) ایسی سخت شکست دی کہ پھر وہ سر نہ اٹھا سکا۔

فرمانروایان جونپور کا خاتمہ اور شکست

حسن تدبیر

ہر چند جونپور کے لئے اُسے بہت کوشش کرنی پڑی اور تمام وقت اسی میں صرف ہو گیا، لیکن وہ سلطنت کے دیگر اقطاع سے بھی غافل نہیں رہا۔ اس نے تمام ملک کا دورہ کیا اور اپنے حسن تدبیر سے سلطنت دہلی میں پھر وسعت پیدا کر دی۔ میوات جا کر اس نے احمد خاں، حاکم میوات کو اطاعت پر مجبور کیا اور سات پرگنے اس سے نکال کر دہلی میں شامل کر لئے، اسی طرح بلند شہر میں جا کر دریا خاں لودی حاکم سنبھل سے سات پرگنے لے لئے، یہاں سے فارغ ہو کر سلطان کول میں آیا اور عیسے خاں سابق حاکم کو اپنی جگہ بحال کر کے برہان آباد میں اپنا اقتدار قایم کیا۔ پھر راجہ پرتاب سنگھ کو زیر کر کے صرف بھوگاؤں اس کی جاگیر میں رکھا اور باقی سب مقامات سلطنت دہلی میں شامل کر لئے۔ یہاں سے چل کر قلعہ رابری اور چندوار کو فتح کیا اور اٹاوہ کے حاکم کو بھی مطیع بنا لیا

سلطنت میں وسعت

---

[۱] بدایونی ۸۵۴ھ؁ تحریر کرتا ہے۔

علاوہ اس کے حسب روایت تاریخ سلاطین افاغنہ[1] اس نے رانا اُدے پور کو بھی شکست دیکر تمام اقطاعِ اجمیر پر قبضہ کر لیا اور سندھ میں احمد خاں کو شکست دیکر حدودِ سلطنت کو وہاں تک وسیع کر لیا[2]۔

الغرض ۳۸ سال کے اندر بہلول لودی نے کڑہ، بہرائچ، لکھنؤ، کالپی، بدایوں، دوآبہ کا تمام حصہ، اٹاوہ، گوالیار، سندھ، ادے پور، سنبھل، میوات، کول، (علی گڑھ) برہان آباد، کو پھر سلطنت دہلی میں شامل کر لیا اور پنجاب میں بھی وہی اقتدار قایم کر دیا جو اس سے قبل کسی وقت پایا جاتا تھا

یقیناً یہ امر حیرت ناک معلوم ہوتا ہے کہ ایسی مردہ سلطنت میں کیونکر بہلول لودی پھر نئی روح پھونک سکا، لیکن اس کا جواب صرف اس کے خصایل کے بیان سے دیا جا سکتا ہے جنھیں صاحب تاریخ داؤدی[3] نے تفصیل کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ بہلول لودی مذہب کا سخت پابند اور بے انتہا سخی و شجاع بادشاہ تھا۔ رحم و رافت اس کی فطرت تھی، اور احکام شرع کی پابندی اس کا نصب العین۔ وہ اکثر علماء و مشایخ کو اپنی صحبت

---

[1] تاریخ سلاطین افاغنہ کا مصنف احمد یادگار تھا۔ دیباچہ میں لکھتا ہے کہ وہ شاہان سور کا دیرینہ خادم تھا اور داؤد شاہ نے اسے سلاطین افاغنہ کی تاریخ لکھنے کا حکم دیا (جس طرح منہاج السراج اور ضیاء برنی نے اپنے عہد کے بادشاہوں کے حالات لکھے تھے) یہ تصنیف بہلول لودی کے حالات سے شروع ہوتی ہے اور ہیمو کے واقعۂ قتل پر ختم ہو جاتی ہے۔

مصنف نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ اس کا باپ امرزا عسکری کا وزیر تھا (جب اس نے ہمایوں کی طرف سے گجرات پر حملہ کیا ہے) اس کتاب کی صحیح تاریخ تصنیف کہیں درج نہیں ہے۔ لیکن چونکہ داؤد شاہ کے حکم سے اس کی ترتیب ہوئی تھی (اور داؤد شاہ کا انتقال ۹۸۴ھ میں ہوا ہے) علاوہ اس کے چونکہ مصنف نے طبقات اکبری کا بھی حوالہ دیا ہے جو سنہ ۱۰۰۱ھ میں لکھی گئی ہے، اس لئے ظاہر ہو کہ وہ اس زمانہ کے بعد اور مخزن افغانی سے پہلے (جو سنہ ۱۰۲۰ھ میں لکھی گئی ہے) مرتب کی گئی۔ فن تاریخ کے لحاظ سے یہ کتاب زیادہ باوقعت نہیں ہے۔ تاہم اس میں بہت سے ایسے واقعات ملتے ہیں جو دوسری جگہ دستیاب نہیں ہوتے ہمایوں کا حال لکھنے میں احمد یادگار نے بالکل طبقات اکبری کو نقل کر دیا ہے۔ یہ کتاب بھی کمیاب ہے۔

[2] تاریخ سلاطین افاغنہ (الیٹ) ۵ صفحہ۔ ۵ - ۷

[3] تاریخ داؤدی کے مصنف کا نام عبداللہ تھا۔ مصنف نے نہ تاریخ ترتیب کہیں لکھی ہے اور نہ اپنے حالات کا ذکر کیا ہے۔ تاہم اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ عہد جہانگیر میں اور غالباً اس کے اولین سال تخت نشینی میں مرتب کی گئی۔ یا چند دن اس کے بعد مصنف لکھتا ہے کہ "افغانی سلاطین ہند کے حالات چونکہ منتشر تھے اس لئے میں نے اُن کو یکجا مرتب کرنا چاہا اور بہلول لودی سے ابتدا کی اور چونکہ یہ تاریخ داؤد شاہ کے حالات پر ختم ہوتی ہے جو اس خاندان کا آخری بادشاہ تھا اس لئے اس کا نام تاریخ داؤدی رکھا۔

یہ تاریخ ضبطِ واقعات کے لحاظ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ لیکن چونکہ اس میں بہت سے واقعات ایسے درج ہیں جن سے سلاطینِ افاغنہ کے خصائل و عادات پر کافی روشنی پڑتی ہے اس لئے اس اعتبار سے بہت زیادہ قابل قدر ہے۔

مذہبی پابندی - طرز عمل - فضول اصراف کی ممانعت - ضبط و تحمل - شوق تعمیر - مدارس کا قیام

میں رکھتا اور غرباء و مساکین کے حالات ہمیشہ تحقیق کرتا رہتا - اس نے کبھی کسی سائل کو محروم نہیں کیا -

وہ پانچوں وقت کی نماز جماعت کے ساتھ مسجد میں ادا کرتا اور لوگوں کی شکایتیں خود سنکر فیصلہ کیا کرتا تھا - وہ بے انتہا دانشمند تھا اور حد درجہ غور و تامل لطف و مہربانی سے کام لے کر انصاف کرتا تھا - (جو کچھ روپیہ، اسباب وغیرہ) اُسے ملتا وہ سب فوج کو تقسیم کر دیتا تھا، اور خود صرف خشک روٹی پر زندگی بسر کرتا تھا - دوستانہ صحبتوں میں وہ کبھی تخت پر نہ بیٹھتا اور نہ رؤسا کو اپنے سامنے کھڑا رہنے دیتا - وہ سب کو اپنے برابر جگہ دیتا اور اگر کوئی امیر ناراض ہو جاتا تو اس کے خوش کرنے کے لئے بعض اوقات یہاں تک ایثار سے کام لیتا کہ اس کے قدموں پر پگڑی تک ڈال دیتا -

اس کی تخت نشینی سے پہلے دہلی کے پٹھانوں میں یہ رسم تھی کہ مردہ کے سیوم میں مٹھائی، شربت اور پان وغیرہ تقسیم کیا جاتا تھا - اس نے اس رسم کو بالکل ممنوع قرار دیا کیونکہ اس رسم میں فضول مصارف ہوتے تھے -

اس کے ضبط کی عجیب و غریب شان وہ ہے جب ایک دن جامع مسجد کے اندر ایک مُلّا نے اس کو اور اس کے خاندان والوں کو صاف طور پر ذریات شیطان سے تعبیر کیا اور اس نے ہنسکر صرف یہ کہا کہ "ملا صاحب ہم سب تو بندگان خدا ہیں"[1] - تعمیرات کا بھی اسے شوق تھا، لیکن اس طرف توجہ کرنے کی فرصت نہیں ملی - تاہم اگر یہ جدید تحقیق صحیح ہے کہ آگرہ کی بنیاد اس نے رکھی تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس لحاظ سے بھی اس نے اپنے کو غیر فانی بنا دیا[2] لیکن تمام مورخین آگرہ کی بنیاد[3] سکندر لودی سے منسوب کرتے ہیں

مآثر رحیمی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے متعدد مدارس بھی قایم کئے[4] - بہلولی سکہ جو پیسہ[5] کے قایم مقام رائج ہوا اسی کی یادگار ہے -

انتقال

اٹاوہ کی مہم سے فارغ ہو کر دہلی آ رہا تھا کہ راستہ میں بیمار ہوا اور بعد اولی (ضلع سیکٹ) میں پہونچکر ٨٩٤ھ / ١٤٨٨ع میں مرگیا - اس نے ٣٨ سال ٨ ماہ - ٨ روز حکومت کی -

---

Keen's Article medieval India.

[1] تاریخ داؤدی (ایلیٹ) - ۴ - صفحہ ۳۶ - ۳۷ - [2] Cal. Review. LXXIV P. 71 (1884)

[3] تاریخ داؤدی میں لکھا ہے کہ - آگرہ نے شہر کی حیثیت سکندر لودھی کے زمانہ میں اختیار کی - اس سے قبل وہ صرف ایک گاؤں تھا ہندوؤں کا بیان ہے کہ راجہ کنس فرمانروائے متھرا کے عہد میں آگرہ ایک مضبوط قلعہ تھا اور یہاں قیدی رکھے جاتے تھے - جب سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اس [illegible] نے آگرہ کو بھی تباہ کیا حتے کہ وہ ایک معمولی گاؤں رہ گیا - اس کے بعد پھر سلطان سکندر لودھی کے عہد سے اس میں دوبارہ ترقی شروع ہوئی - یہانتک کہ اکبر کے زمانہ میں دہلی دارالحکومت قرار پایا - (تاریخ داؤدی (ایلیٹ) ۴ - ۵۰ -

[4] Promotion of Learning India P. 72. [5] ایک روپیہ کے چالیس بہلولی پیسہ ملا کرتے تھے - ایک بہلولی کا وزن ایک تولہ ٨ ماشہ ۷ رتی ہوا کرتا تھا - بہلولی کو دام بھی کہتے تھے -

بہلول لودی نے اپنی وفات سے پہلے ہی نظام خاں کو اپنا جانشین نامزد کر دیا تھا، اس لئے وہ تھوڑی سی مخالفت[1] کے بعد سلطان سکندر کا لقب اختیار کر کے تخت نشین ہو گیا

جب سلطان بہلول نے ۸۸۳ھ/۱۴۷۹ء میں ملک کے مختلف صوبوں پر گورنروں کا تقرر کیا تو اسی سلسلہ میں جونپور کی حکومت اپنے بیٹے باربک کو سپرد کر دی تھی

جب سکندر تخت نشین ہوا تو اس نے اپنے بھائی (باربک) سے کہا کہ خطبہ میں اس کا نام پڑھا جائے، لیکن باربک نے انکار کیا۔ مجبوراً سکندر کو اس کے خلاف فوج بھیجنی پڑی اور باربک کو مغلوب کرنے کے بعد پھر بدستور اسی عہدہ پر بحال رکھا گیا

سکندر کا سارا عہدِ حکومت باغیوں اور سرکشوں کی سرکوبی میں صرف ہو گیا۔ ان میں بیانہ، جونپور اور اودھ کی مہمیں خاص طور سے اہمیت رکھتی ہیں۔ جن میں سکندر کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ بیانہ کے قلعہ پر قبضہ کر لیا گیا اور جونپور و اودھ کی بغاوتیں بھی پوری طرح فرو کر دی گئیں

۹۰۰ھ/۱۴۹۴ء میں سکندر نے سلطان حسین کو (جو جونپور کی سلطنت کا آخری فرمانروا اور زیرِ حمایت علاؤالدین شاہِ بنگال بہار میں پناہ گزیں تھا) مفتوح و معزول کر کے بہار تک اپنی سلطنت وسیع کر لی اور سلطان علاؤالدین فرمانروائے بنگال سے حدودِ سلطنت و حقوقِ حکمرانی کے متعلق باہمی مفاہمت ہو گئی

علاوہ اس کے دھولپور، چندیری اور گوالیار کے راجپوتوں نے بھی اس کی اطاعت اختیار کر لی اور تمام پنجاب، دوآبہ جونپور، اودھ، بہار، ترہت اور ملک مابین ستلج و بندیلکھنڈ اس کے قبضہ میں آ گیا

---

[1] سلطان بہلول، نظام خاں کو اپنے بعد تخت نشین کرنا چاہتا تھا لیکن چونکہ اسکی ماں سُنار کی بیٹی تھی اس لئے بعض امرائ بہلول کے بڑے بیٹے باربک کو فرمانروا بنانا چاہتے تھے جو پٹھانی کے پیٹ سے تھا۔ جب سلطان بہلول کا انتقال ہوا تو یہ اختلاف پیدا ہوا۔ نظام خاں کی ماں نے جس کا نام زیبا تھا اپنے بیٹے کے حقوق کو افضل ثابت کرنا چاہا اس پر عیسیٰ خاں لودھی نے جو بہلول کا برادر عمزاد تھا، زیبا کو کچھ برا بھلا کہا۔ خانخاناں فرملی کو، جو امرائ میں سب سے زیادہ با اختیار تھا، یہ بات ناگوار ہوئی اور اس نے عیسیٰ خاں سے کہا کہ تمھیں شرم نہیں آتی "کل سلطان کا انتقال ہوا ہے اور آج تم اس کے حرم کو گالیاں دے رہے ہو"۔ عیسیٰ خاں نے کہا "تو ایک نوکر ہے۔ تجھے بادشاہوں کے عزیز و اقارب کے معاملہ میں گفتگو کا کیا حق حاصل ہے؟"۔ یہ سنکر خانخاناں نے جواب دیا کہ "میں صرف سلطان سکندر (نظام خاں) کا نوکر ہوں اور کسی کا نہیں"۔ یہ کہکر وہ باہر آیا اور اسی وقت بادشاہ کی لاش اٹھوا کر قصبہ جلالی میں چلا آیا۔ یہاں نظام خاں گیا۔ چنانچہ جمعہ کے دن ۸ شعبان ۸۹۴ھ کو اس نے نظام خاں کو (جب کہ اس کی عمر صرف ۱۸ سال کی تھی) کالی ندی کے کنارے تخت نشین کر دیا۔ تخت نشین ہونے کے بعد اس نے اپنے باپ کا جنازہ تو دہلی بھیجدیا اور خود عیسیٰ خاں کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوا لیکن چونکہ سلطان سکندر لودی فطرتاً رحیم المزاج تھا۔ اس لئے عیسیٰ خاں کو مغلوب کر کے اس کا قصور معاف کر دیا اور خود بھی دہلی واپس آ گیا۔ (فرشتہ)

خصایل و عادات اسکندر

محمد تغلق اور فیروز شاہ کے بعد جو تفریق سلطنت دہلی کے تمام اجزا میں پیدا ہوگئی تھی اس کا حال آپ کو علاؤ الدین بن محمد شاہ سید خاندان کے آخری فرمانروا کے ذکر کے سلسلہ میں معلوم ہوگیا ہوگا اور کون کہہ سکتا تھا کہ پھر یہ تمام اجزا یکجا ہو جائیں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ سلطان بہلول لودی نے اپنے عزم و ثبات و دیگر ملوکانہ خصایل سے دہلی کے مردہ سلطنت میں از سر نو جان ڈالنی شروع کی اور سکندر کے عہد میں تریب قریب وہی اقتدار پھر قایم ہوگیا، جو اس سے قبل کسی وقت عہد تغلق میں پایا جاتا تھا۔ اس کا سبب سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا کہ بہلول لودی کے تمام خصائل مع شئے زائد اس کے اندر پائے جاتے تھے۔ اور اس نے اپنی محنت و جانفشانی، انصاف و بیدار مغزی، اخلاق و عادات کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ اس کا تمام ماحول متاثر ہوگیا اور اس کے علوی صفات کے سامنے تمام قوتیں جو سلطنت سے منحرف ہوگئی تھیں جھک گئیں۔

سکندر کی فتوحات

سلطان سکندر کے تمام فتوحات، نہایت شرح و بسط کے ساتھ تمام کتب تاریخ میں درج کئے گئے ہیں، لیکن ہم ان کی تفصیل کو غیر ضروری اور غیر دلچسپ خیال کرتے ہوئے، صرف اپنے موضوع کے لحاظ سے سکندر کے خصایل و عادات آئین عدل و حکمرانی، تہذیب و شایستگی، علم پروری و ہنر شناسی کو ذرا واضح طور پر دکھانا چاہتے ہیں جو حقیقی اسباب تھے اس کی کامیابی کے

سکندر کی خصوصیات

سلطان سکندر، اپنی ظاہری صورت کے لحاظ سے جس قدر حسین و جمیل تھا[1] اُس قدر اس کا باطن پاکیزہ تھا۔ وہ اپنے باپ کی طرح حد درجہ سادگی پسند تھا اور کبھی شاہانہ تکلفات میں اپنا وقت ضایع نہ کرتا تھا۔ اس کی فطرت نہایت سلیم اور اس کی طبیعت رافت و عطوفت کی طرف ازبس مائل تھی وہ خدا سے ڈرتا تھا اور بندگانِ خدا پر ہمیشہ رحم کرتا تھا

جیسا وہ شجاع تھا ویسا ہی عادل بھی تھا۔ انتظام سلطنت، تصفیۂ معاملات میں وہ ہندو مسلمان، قوی و ضعیف کو برابر سمجھتا تھا اور چاہتا تھا کہ سرِمو انصاف سے احتراز نہ ہو۔

بادشاہ ضبط اوقات کا بے انتہا پابند تھا اور جو معمول اس نے اپنے یا کسی اور کے لئے مقرر کر دیا، اس میں کبھی تبدیلی پیدا نہیں کی۔

بادشاہ کا معمول تھا کہ وہ نماز ظہر ادا کر کے مجلس علما میں جاتا اور قرآن مجید کی تلاوت کرتا، مغرب کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کر کے حرم سرا میں جاتا اور ایک گھنٹہ وہاں قیام کر کے خلوت خاص میں جاتا اور وہاں لوگوں کے استغاثے سنتا امورِ سلطنت کی اصلاح کرتا۔ فرامین تحریر کرتا اور سلاطین معصر کے نام خطوط لکھتا۔ رات کو بہت کم سوتا۔ بڑے جید اور زبردست سترہ عالم خلوت خاص میں اس کے پاس رہتے اور نصف شب تک مذہبی احکام وغیرہ ان سے دریافت کرتا رہتا۔ اس کے بعد کھانا چُنا جاتا۔ اس کی ساری عمر گزر گئی لیکن یہ معمول کبھی ترک نہیں ہوا۔

---

[1] مصنف تاریخ داؤدی نے لکھا ہے کہ اس کے حُسن کا یہ عالم تھا کہ جو شخص دیکھتا تھا متحیر رہ جاتا تھا۔

ایک ضروری اطلاع

تاریخ اسلامی ہند کی پہلی جلد "حملۂ بابرؔ تک" اس مہینے میں ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن اس جلد کا نہایت ضروری ضمیمہ علحدہ شایع کیا جا رہا ہے، یعنی سنہ ۱۵ھ (سنہ ۶۳۶ء) سے لیکر سنہ ۹۳۲ھ (سنہ ۱۵۲۶ء) تک کی سلسلہ وار توقیت (Chronology)

یہ نقشہ یا سلسلہ وار تاریخی واقعات کا تختہ "نگار" کے ۸۰ صفحات کو محیط ہوگا اور پہلی جلد کے ساتھ اس کا حاصل کرنا ازبس ضروری ہے، کیونکہ یہ ایک قسم کا مفصل تاریخی انڈکس ہے جس سے فوراً یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ کس تاریخ میں کونسا اہم واقعہ پیش آیا۔ اسی کے ساتھ سب سے بڑی خصوصیت ایک یہ بھی ہے کہ انگریزی اور ہجری سنہ دونوں مطابق کرکے درج کئے گئے ہیں۔

اس کی قیمت بہت کم یعنی معہ محصول بارہ آنے رکھی گئی ہے تاکہ تمام قارئین نگار جن کے پاس تاریخ اسلامی ہند کی پہلی جلد پہونچ چکی ہے اس کو آسانی سے حاصل کر سکیں

اس خیال سے کہ بارہ آنے کی رقم بھیجنے میں آپ کو فیس منی آرڈر دو آنہ زیادہ نہ ادا کرنا پڑے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ سال آیندہ کے چندہ کے ساتھ بارہ آنے زیادہ بھیجدیجئے یا اجازت دیجئے کہ جنوری کے وی پی میں اس رقم کا اضافہ کر دیا جائے۔ اس طرح آپ کو بچت ہو گی۔ اس لئے براہِ کرم جو صاحب اس کو پسند فرماتے ہیں وہ ذریعہ کارڈ اطلاع دیدیں تاکہ جنوری کے وی پی میں یہ رقم بڑھا دیجائے۔ جن حضرات کی کوئی اطلاع نہ آئے گی ان کو وہی معمولی رقم کا وی پی روانہ کیا جائے گا۔ توقیت کا نمونہ دوسرے صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

منیجر "نگار"

نمونہ　(صفحہ اول)

توقیت

یعنی سلسلہ وار واقعات تاریخی کا نقشہ

سنہ ۱۵ھ (سنہ ۶۳۶ء) سے سنہ ۹۳۲ھ (سنہ ۱۵۲۶ء) تک

سنہ ۱۵ھ ۶۳۶ء　عثمان بن ابی العاص ثقفی گورنر بحرین و عمان نے عہد خلیفۂ ثانی میں اپنے بھائی حکم کو بحرین میں مقرر کرکے حکم دیا کہ "ہندوستان پر حملہ کریں" اسی زمانہ میں دوسرا حملہ حکم نے بھروچ پر کیا۔ اور اپنے بھائی مغیرہ کو دیبل روانہ کیا جہاں انھوں نے دشمن کو شکست دی۔ پچ نامہ میں لکھا ہے کہ یہ شہید ہوئے۔

سنہ ۲۲ھ ۶۴۳ء　عبداللہ ابن عمرو ابن ربیع نے کرمان پر حملہ کیا، اور پایۂ تخت کو لے لیا، سیستان کو زیر کیا، اور مکران پر حملہ کرکے مکران اور سندھ کی متحدہ افواج کو شکست دی۔ خلیفۂ ثانی نے دریائے سندھ کو عبور کرنے کی ممانعت فرمائی۔ محمد الشیرازی سیستان کا فاتح عمرو ابن التیمی اور عبداللہ ابن عمر خطاب کو ظاہر کرتا ہے۔ اور مکران کا فاتح عبداللہ ابن عبداللہ ابن عثمان کو بتاتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "زنبیل، مکران، اور سندھ دونوں جگہ کا حکمران تھا" بعض مورخوں نے ناموں میں اختلاف کیا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ فتح سنہ ۲۳ھ میں ہوئی ہے۔

سنہ ۳۵ھ ۶۵۵ء　عبدالرحمٰن ابن سمرہ کو گورنر عراق نے سیستان پر حملہ کرنے کے لئے مامور کیا۔ اس نے بُست (Bust) لے لیا اور کابُل تک بڑھتا چلا گیا۔

سنہ ۴۴ھ ۶۶۴ء　عبدالرحمٰن ابن شمر نے مرو سے کابل پر حملہ کیا، اور یہاں بارہ ہزار نفوس کو مسلمان کیا، اس فوج کا ایک افسر مہلب ابن سفرہ ہندوستان پر حملہ کرنے کے لئے مامور کیا گیا۔ یہ ملتان تک بڑھتا چلا گیا اور بہت سے قیدی لیکر خراسان آیا۔

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ
ہندوستان سے باہر سالانہ چندہ آٹھ روپیہ ششماہی پانچ شلنگ

سنہ ۳۹ء کی جنوری میں نگار کا جنوری نمبر
بوجہ اضافۂ ضخامت وقیمت شائع نہ ہوگا

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۳۴	فہرست مضامین دسمبر ۱۹۳۸ء	شمارہ ۶

ملاحظات

عالمِ اسلامی کا حادثۂ عظیم

وہ شخص جس کا نام ماں باپ نے مصطفےٰ رکھا تھا، لیکن مدرسہ میں پہونچکر اپنے ذہنی امتیاز کی وجہ سے مصطفےٰ کمال ہوگیا، جو درۂ دانیال کے معرکہ کے بعد مصطفےٰ کمال پاشا کہلایا، جس نے سنہ ۲۱ء میں یونانیوں کو شکست دیکر قوم سے غازی مصطفےٰ کمال پاشا کا لقب حاصل کیا اور جو آخر میں ان تمام امتیازات سے بلند تر ہوکر صرف اتاترک کہلایا، وہ آج دنیا سے منھ موڑکر عالم اسلامی کو حد درجہ سوگوار و ملول چھوڑ گیا ہے۔

آسماں را حق بود گر خوں بہ گرید بر زمیں

کمال اتاترک اس دور کے انسانوں میں ایک معجزہ کی حیثیت سے ظاہر ہوا اور تھوڑی سی فرصت میں وہی سب کچھ کر گیا جو ایک "مردِ صاحبدل" کر سکتا ہے۔ ترکی قوم زوال و انحطاط کی جس منزل پر پہونچ گئی تھی وہ اسکے عالم احتضار کی منزل تھی اور کوئی صورت اس کے جانبر ہونے کی باقی نہ تھی، لیکن کسے خبر تھی کہ قدرت سالونیکا کے ایک معمولی سپاہی زادہ سے کارِ مسیحائی لینے والی ہے اور ٹھیک اسوقت جبکہ سرزمین ترکی کا ذرہ ذرہ وقفِ مایوسی ہوچکا تھا امیدوں کا نیا آفتاب طلوع ہوگا اور وہ بستی جو صدیوں سے محوِ خواب تھی دفعتاً بیدار ہوجائے گی۔

کمال اتاترک نے اپنی عسکری زندگی اسوقت شروع کی جب سلطنتِ ترکی کا شیرازہ درہم برہم ہوچکا تھا اور نوجوانانِ اتحاد و ترقی نے جنگ عظیم کے سلسلہ میں جرمنی کی طرفداری کا غلط فیصلہ کرکے اپنے ہاتھ سے اپنی گردن پر چھری پھیر لی تھی۔ مصطفےٰ کمال، انور بے کی اس پالیسی کا سخت مخالف تھا اور وہ اس کو خودکشی کہتا تھا، لیکن اُسوقت تو ساری دنیا اس کی دشمن تھی، خود ابناءِ وطن اس کے مخالف تھے، ترکی کا ذرہ ذرہ اس سے برہم تھا، لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری، اور چند خستہ حال ترک سپاہیوں کی مدد سے چناق میں برطانوی فوج کے چھکے چھڑا دئے اور جب سب سے آخر میں یونانیوں کو اس نے سرزمین ترکی سے نکالا ہے تو لائڈ جارج جن کے اشارہ سے یونان نے یہ سب کچھ کیا تھا، حیرت زدہ ہوکر رہ گیا۔

قوموں کی تعمیر کرنے والے دنیا میں اور بھی ہوئے ہیں لیکن مصطفےٰ کمال نے اس قوم کو قوم بنایا جو اپنی اجتماعی صلاحیت بالکل کھو بیٹھی تھی اور اسقدر جلد کہ عقل انسانی باور نہیں کر سکتی۔ ۱۹۱۸ء میں ترکی کی شکستگی و درماندگی کا یہ عالم تھا کہ برطانیہ اس کو اپنی سیادت میں لینے کی تمام طیاریاں کر چکا تھا، لیکن تین سال نہ گزرے تھے کہ ۱۹۲۲ء میں لاسین کے مقام میں اتحادیئین کا ہاتھ پکڑ کر مصطفےٰ کمال نے وہی شرائط لکھوائے جو وہ چاہتا تھا اور ایشیا کوچک میں پھر وہی ہلالی جھنڈا لہرانے لگا، جس کی حفاظت کے لئے ترکی قوم اپنے لاکھوں فرزندوں کا خون بہا چکی تھی۔

کمال اتاترک کی غیر معمولی فراست و فطانت ثابت کرنے کے لئے صرف یہی ایک واقعہ کافی ہے کہ اس نے سب سے پہلے خلافت کا خاتمہ کیا اور تشخص پرستی کی اس دیرینہ روایت کو مٹا کر رکھدیا جس نے تعلیمات اسلامی کے بالکل خلاف نہایت مکروہ قسم کی ملوکیت قائم کر رکھی تھی۔ لیکن اس نے صرف اسی پر قناعت نہیں کی، بلکہ قیام خلافت کے سلسلہ میں جتنے مہلک جراثیم وہاں پیدا ہو گئے تھے، ان سب کو اس نے ہلاک کر ڈالا۔ مساجد و خانقاہ کو علماء و مشایخ کے وجود سے پاک کیا، مذہبی اوقاف کو جو مولویوں کی شکم پری کا ذریعہ تھے ختم کر دیا، تعدد ازواج کو ناجایز قرار دیا، عورتوں کو چار دیواری سے نکالکر آزادی کی فضا میں مردوں کے دوش بدوش کام کرنے کا موقعہ دیا، رسم خط اور لباس بدل کر ممالک یوروپ کے ساتھ سیاسی مساوات کا جذبہ لوگوں میں پیدا کیا، تعلیم کو عام اور مفت کر کے قدامت پرستی کی تاریکی کو مٹایا، اپنی زبان کو تمام اس متعفن و بوسیدہ لٹریچر سے پاک کر دیا جو مذہب کے نام سے واہمہ پرستی پھیلاتا تھا، صنعت و حرفت، زراعت و تجارت کے لئے نئی نئی راہیں کھولدیں اور جدید پایۂ تخت (انقرہ) تعمیر کر کے ترکی تاریخ کو نئی بنیاد پر استوار کرنا شروع کیا۔

حیرت ہوتی ہے کہ کمال اتاترک بارہ سال کی مختصر سی مدت میں وہ سب کچھ کیونکر کر سکا جو صدیوں میں بھی انجام کو نہیں پہونچتا اور تنہا کس طرح وہ اتنے بڑے کام کو پورا کر سکا جو اجتماعی قوت سے بھی اس خوبی کے ساتھ پورا نہیں ہو سکتا۔ دنیا جو چاہے کہے لیکن میں اسے معجزہ کہتا ہوں اور کمال اتاترک کو "صاحب معجزہ" ہی سمجھ کر اس کے مافوق الفطرت قوائے ذہنیہ کے سامنے سر عقیدت جھکاتا ہوں۔

کمال اتاترک اب نہیں ہے، لیکن اس کے کارنامے ہمیشہ باقی رہیں گے، اس کا جسم فنا ہو گیا لیکن اسکی پیدا کی ہوئی روح کبھی فنا نہ ہوگی۔ وہ اس زمانہ کا بطل اعظم تھا، اس دور کے ترکوں کا پیغمبر تھا، گمراہ قوموں کے لئے مشعل ہدایت تھا اور وہ سب کچھ تھا جو انسان کو "نیم خدا" بنا دیتا ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی اور آلۂ مکبر الصوت

آلۂ مکبر الصوت، لوڈ اسپیکر (Loud speaker) کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ سے آواز کئی گنا بلند ہو کر دور و نزدیک ہر جگہ پہونچ سکتی ہے اور مولانا اشرف علی صاحب کو آپ جانتے ہی ہیں، تھانہ بھون کے وہ عالم و

بزرگ ہیں جنھوں نے بہشتی زیور اور بہشتی گوہر لکھ کر عوام میں بہت شہرت حاصل کرلی ہے۔

آپ کی اور خصوصیات یہ ہیں کہ علم تفسیر و حدیث میں بھی آپ کو ملکۂ راسخہ حاصل ہے اور آپ کے مریدوں کا بہت بڑا حلقہ ہندوستان کے ہر گوشہ میں پھیلا ہوا ہے۔ آپ کے پاس مسایل فقہیہ و غیر فقہیہ کے متعلق سیکڑوں خطوط روزانہ آتے ہیں اور آپ ان کا جواب دینے میں ہمیشہ اس تفقہ فی الدین سے کام لیتے ہیں جو دوسرے علماء میں کمتر پایا جاتا ہے اور فہم انسانی سے بیشتر دور ہوتا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں آپ سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ:۔

"آلۂ مکبر الصوت" کے ذریعہ سے خطیب کی آواز کو تمام سامعین تک پہونچانا جایز ہے یا نہیں؟"

اس کا جو جواب مولانا نے دیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

"ہر ایسی مباح چیز کا استعمال جس میں کسی مفسدہ کا احتمال ہو ممنوع ہے، چونکہ خطیب کی آواز کا سامعین بعید تک پہونچانا شرعاً غیر ضروری ہے اور اس آلہ کے استعمال میں احتمال فساد ہے اور لہو و لعب کی صورت پیدا ہوسکتی ہے اس لئے اس کا ترک لازم ہے۔ پھر یہ تو اس وقت ہے جب خطیب سے مراد مطلق واعظ و لکچرار ہو لیکن اگر اس سے مراد جمعہ و عیدین کا خطیب ہے تو اس وقت چونکہ آواز کا سننا ضروری نہیں ہے اس لئے اس آلہ کو مسجد میں داخل کرنا احترام کے خلاف ہے اور تشبّہ ہے مجالس غیر مشروعہ کے ساتھ"

اسی کے ساتھ مولانا نے ایک نقلی دلیل بھی کلام مجید سے پیش کی ہے اور وہ یہ کہ:۔

"حق تعالےٰ نے ارشاد فرمایا ہے" ولا تسبّوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدواً بغیر علم"۔ (یعنی غیر مسلموں کے دیوتاؤں کو بُرا نہ کہو ورنہ اُن کے ماننے والے خدا کو بُرا کہیں گے) ۔ ہر چند دیوتاؤں کو برا کہنا نہ صرف مباح بلکہ ضروری ہے، لیکن محض اس مفسدہ سے بچنے کے لئے کہ خدا کو بھی گالیاں دی جائیں گی منع کردیا گیا"

اس سے مولانا نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جب دیوتاؤں کو بُرا کہنا جو اتنا اچھا فعل ہے فساد کے اندیشہ کیلئے منع کیا گیا تو اندیشۂ لہو و لعب سے تو مکبر الصوت کا استعمال بدرجۂ اولیٰ ناجایز ہونا چاہئے۔ میں نے مولانا کے جواب کی اصلی عبارت نقل نہیں کی ہے، لیکن اس کا مفہوم وہی ہے جو عرض کیا گیا۔ اب اس کو سامنے رکھ کر غور کیجئے کہ کیا اس سے زیادہ ذہنی غلامی کی کوئی مثال اور مل سکتی ہے اور کیا اسی عقل و فراست کا نام شرع میں "تفقہ فی الدین" رکھا گیا ہے اور کیا ایسے علماء کی پیروی تہذیب و انسانیت کے لئے باعث ننگ نہیں؟

چونکہ مولانا نے اس مسئلہ میں عقل و نقل دونوں سے کام لیا ہے اس لئے آئیے ان دونوں کی حقیقت پر بھی غور کریں اور دیکھیں کہ ان سے اور کیا احکام و مسایل متفرع ہوسکتے ہیں

اگر مولانا کے جواب کا تجزیہ کیا جائے تو حسب ذیل نتائج اس سے اخذ ہوتے ہیں:۔

۱۔ جمعہ و عیدین کے خطبہ کے لئے یہ ضروری نہیں کہ لوگ اسے سنیں بھی، صرف ان کا اس جگہ موجود رہنا کافی ہے

۲۔ آلۂ مکبر الصوت کا استعمال لہو ولعب ہے اور تشبہ ہے کفار کے ساتھ۔
۳۔ دوسرے مذاہب کے دیوتاؤں اور خداؤں کو بُرا کہنا نہ صرف مباح ہے بلکہ بعض حالات میں "مندوب" و مستحسن بھی ہے۔

سب سے پہلے شق اول کو لیجئے جس میں خطبہ کا سننا ضروری نہیں ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ از روئے فقہ جمعہ وعیدین کے خطبہ کا سننا ضروری نہیں ہے اور لوگوں کا اختتام خطبہ تک صرف وہاں موجود رہنا کافی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ ان مسایل فقیہ میں سے نہیں ہے جو نصوص قطعیہ سے ثابت ہوئے ہوں، بلکہ صرف وقتی حالات کے تحت متفرع کئے جاتے ہیں اور وقت و زمانہ کے حالات کے لحاظ سے بدلے جا سکتے ہیں۔

اسلام کی روح جو اس کے تمام شعایر سے ظاہر ہوتی ہے صرف اجتماعیت ہے، پھر ظاہر ہے کہ بہترین اجتماعیت خیال و حرکت اور فکر و عمل دونوں کی اجتماعیت ہوا کرتی ہے اور اس کے بعد صرف عمل کی اجتماعیت، محض خیال کی اجتماعیت کوئی چیز نہیں کیونکہ اگر کسی جماعت کے افراد خیال کے لحاظ سے متحد ہوں اور عمل کے لحاظ سے متفرق و منتشر تو یہ بالکل بے نتیجہ بات ہوگی، اسی لئے اسلام نے زیادہ تر عمل پر زور دیا ہے لیکن اس نے فکر و خیال کی اجتماعیت کو نظرانداز نہیں کیا کیونکہ اگر قول و فعل دونوں ہم آہنگ ہوں تو اجتماعیت میں بہت زیادہ رسوخ پیدا ہو جاتا ہے۔

اگر جمعہ وعیدین کے خطبہ کا سننا قرونِ اولیٰ میں ضروری نہیں سمجھا گیا بلکہ صرف وہاں کی حاضری کافی قرار دی گئی، تو اس کا سبب یہ نہ تھا کہ وہ نفس خطبہ کی اہمیت یا اس کے سننے کی افضلیت کے قایل نہ تھے بلکہ صرف اس بنا پر کہ انکے پاس کوئی ذریعہ ایسا نہ تھا جو ہزاروں لاکھوں آدمیوں تک اس آواز کو پہونچا سکتے اور اس لئے بدرجۂ اقل صرف وہاں بیٹھے رہنے ہی کو ضروری قرار دیا تاکہ اس طرح کم از کم اجتماع کی ظاہری کیفیت تو باقی رہیگی اور اس سے لوگوں پر اثر پڑے گا۔ اگر حکم یہ دیا جاتا کہ جو لوگ خطبہ سن سکتے ہیں وہ بیٹھے رہیں اور باقی چلے جائیں تو اجتماعیت میں انتشار پیدا ہو جاتا۔

اب نفس خطبہ کو لیجئے کہ بجائے خود وہ ضروری ہے یا نہیں۔ اس سے مولانا تھانوی کو بھی غالباً انکار نہ ہوگا کہ خطبہ سے مقصود عوام کو تعلیم دینا ہے ان کے اخلاق درست کرنا ہے اور اگر حال کی اصطلاح میں ظاہر کیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اپنے مقاصد کا پروپاگنڈا کرنا ہے، پھر ظاہر ہے کہ ایک خطبہ کا اثر اسی وقت ہو سکتا ہے جب اس کو سنا جائے، محض یہ منظر کہ مولانا اشرف علی صاحب دور ممبر پر کھڑے ہوئے اپنے چشم و لب یا ہاتھوں کو حرکت دے رہے ہیں اور ان کا کوئی لفظ ہمارے کانوں تک نہیں پہونچتا، نہ کوئی دلنشین منظر ہے نہ مفید۔ اس لئے خطبہ کی بہترین صورت یہی ہو سکتی ہے کہ تمام حاضرین اسے سن سکیں، اور اگر یہ کسی ذریعہ سے ممکن ہو تو اس کا اختیار کرنا نہ صرف اقتضائے عقل و مصلحت ہے بلکہ تعلیمات اسلامی کا اسلوب بھی یہی چاہتا ہے۔

اب دوسری شق کو لیجئے۔ مولانا کا یہ ارشاد بالکل درست ہے کہ کسی ایسی نئی چیز کا اختیار کرنا جو باعث فساد ہو یا

جس میں احتمال لہو ولعب ہو مناسب نہیں، لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مکبر الصوت کونسا مفسدۂ لہو ولعب پیدا کرسکتا ہے اگر مولانا اس کا استعمال صرف اس لئے مناسب نہیں سمجھتے کہ غیر مسلم اس کا استعمال کرتے ہیں اور اس طرح تشبہ بالکفار ہوجائے گا، تو پھر اس دلیل کی بنا پر انھیں خود بھی بہت سی باتیں ترک کردینا چاہئے۔

مولانا ریل میں سفر کرتے ہیں، موٹر پر سوار ہوتے ہیں، بجلی کی روشنی میں نماز پڑھتے ہیں۔ ڈبل روٹی مکھن استعمال کرتے ہیں، کفار کی مشینوں کا بنا ہوا کپڑا پہنتے ہیں، خط وکتابت میں کارڈ ٹکٹ استعمال کرتے ہیں جن پر تصویر بنی ہوتی ہے، تار کے ذریعہ سے اپنے پروگرام کی اطلاع اپنے مریدوں کو دیتے ہیں، ولایتی بنی ہوئی گھڑیوں کی مدد سے افطار واسحار کے اوقات کی تعیین کرتے ہیں اور اسی طرح کی بہت سی وہ باتیں کرتے ہیں جن میں (انھیں کی دور از کار تاویل کی بنا پر) تشبہ بالکفار بھی پایا جاتا ہے، مفسدۂ لہو ولعب کا اندیشہ بھی، لیکن حیرت ہے کہ مولانا ان سب کو تو جایز سمجھتے ہیں اور مکبر الصوت کے استعمال کو ناجایز بتاتے ہیں ۔۔ لہو ولعب یا کسی اور مفسدہ کا احتمال ہر اچھی سی اچھی بات میں پایا جاسکتا ہے اور اسکا تعلق ہر شخص کی انفرادی نیت سے ہے۔ نماز سے زیادہ مقدس عمل کوئی نہیں، لیکن وہ بھی لہو ولعب ہوسکتی ہے، اگر کوئی شخص اس کو کھیل سمجھ کر کرے، قرآن شریف کی تلاوت ترتیل کے ساتھ نہایت اچھا فعل ہے، لیکن اگر اس سے کوئی موسیقی کا لطف اُٹھانے لگے تو وہ بھی لہو ولعب میں داخل ہوجائیگا۔ صدقہ وزکوٰۃ کے فضایل ظاہر ہیں، لیکن اگر اس سے مقصود ریا ونمود ونمایش ہو تو یہ بھی مفسدہ میں داخل ہوجاتا ہے، الغرض تشبہ بالکفار ایسی بات ہے جس سے مولانا خود بھی نہیں بچ سکے اور احتمال لہو ولعب ایسی وسیع چیز ہے کہ نماز روزہ بھی اس کے حدود میں آسکتا ہے چہ جائیکہ مکبر الصوت۔ اس لئے ایسے معاملات میں ہمیشہ افادی پہلو کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنا چاہئے اور ایک نئی چیز کو اختیار کرنے سے اس لئے باز نہ رہنا چاہئے کہ وہ اس سے پہلے نہ پائی جاتی تھی، دیکھنا یہ چاہئے کہ وہ ہمارے لئے مفید ہے یا نہیں اور اس سے جایز فایدہ اُٹھانے کی کیا صورت ہے ۔۔ مولانا نے اپنے اسی فتویٰ میں جو دلیل نقلی پیش کی ہے، وہ نہ صرف اس لحاظ سے کہ اسکا کوئی تعلق مسئلۂ زیر بحث سے نہیں ہے بلکہ اس حیثیت سے بھی کہ مولانا نے اپنی طرف سے بھی اس کے مفہوم میں اضافہ فرمایا ہے، بالکل ساقط الاعتبار ہے ۔۔ مولانا نے کلام مجید کی جو آیت پیش کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے مذاہب کے دیوتاؤں یا خداؤں کو بُرا کہنا اسلام نے منع کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اسکی وجہ بھی ظاہر کردی ہے کہ اس سے فساد کا اندیشہ ہے، لیکن مولانا نے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فرمایا ہے کہ باطل معبودوں کو گالیاں دینا نہ صرف مباح ہے بلکہ بعض صورتوں میں افضل بھی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ حضرت مولانا نے یہ استنباط کہاں سے کیا ہے اور اسکے اظہار کا کیا موقعہ تھا۔ میرے نزدیک تو پیش کردہ آیت سے قطعاً اسکی ممانعت کردی گئی ہے اور ایسی صورت میں اسکو مباح یا افضل بتانا سراسر نصِ قطعی کی مخالفت ہے، ہوسکتا ہے کہ کلام مجید کی بعض آیات سے وہ اسکا جواز بھی ثابت کرسکیں، لیکن یہ جواز بالکل اسی قسم کی تاویلات بارہ کا نتیجہ ہوگا جس قسم کی تاویلات سے مکبر الصوت کے استعمال کو ناجایز بتایا گیا ہے ۔۔ یہ ہے ہمارے علماء کرام کی وہ قدامت پرستانہ ذہنیت اور کورانہ تقلید جس نے قوم کی قوم کو تباہ کرکے رکھدیا اور یہی ہیں وہ بُت جن کو توڑنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔

نظیر اکبرآبادی کی غزل گوئی

اور

ان کا غیر مطبوعہ کلام

نظیر اکبرآبادی ان شعراء میں سے ہیں، جن کی عظمت امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہے۔ نظیر اسوقت تک صرف نظم نگار کی حیثیت سے مشہور تھے اور ان کے رنگِ تغزل سے لوگ ناواقف تھے

ہمارے عزیز دوست جناب لطیف اکبرآبادی نے اُن کی غیر مطبوعہ غزلوں کو سامنے رکھکر جو اتفاق سے انکے ہاتھ آگئی ہیں یہ مقالہ سپردِ قلم کیا ہے اور جس تفصیل کے ساتھ نظیر کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے وہ اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے

لطیف صاحب کے سامنے نظیر کے متعلق اور بھی بہت سے کام ہیں جن کو وہ فی الحال خاموشی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ اس لئے اگر کوئی صاحب نظیر کے متعلق کوئی معلومات رکھتے ہوں تو براہ کرم اُن سے آگرہ کے پتہ پر مراسلت کریں۔　　(اڈیٹر)

تمہید　زندگی حرکت سے عبارت ہے، اُس کے کسی شعبے میں ٹھیراؤ آجانے کی مثال "بند پانی" کی سی ہے جس میں بوئے فساد آجاتی ہے۔ شعر و ادب زندگی ہی کا ایک شعبہ ہے، اُس کا بھی کسی ایک نقطے پر قایم رہ سکنا محال ہے۔ شعر و ادب اگر ترقی نہیں کرتا تو یقیناً پست ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ مسلۂ ارتقا کے مطابق اُردو زبان میں ایسے ارباب کمال پیدا ہوتے رہے جنھوں نے اُردو ادبیات کو صناعت کے درجے تک پہونچایا، مگر انھیں ارباب کمال میں وہ جوہر قابل بھی رونما ہونے لازمی تھے جو دوسروں کی طرح اپنے حال اور ماحول کا آلۂ کار نہ تھے، بلکہ اُن لوگوں میں سے تھے جو عمومیت اور تقلید سے بغاوت کرکے اپنی راہ الگ بناتے، اور اس طرح مستقبل کی زبان بن جاتے ہیں۔ چونکہ ایسے لوگ اپنے عہد سے مختلف ہوتے ہیں، اس لئے اُن کے معاصر اور معاشر اُنھیں سمجھ نہیں سکتے اور وہ مردود کردئے جاتے ہیں۔ لیکن جلد یا بدیر

وہ وقت آجاتا ہے جب اُن کے جوہر اور قابلیت کی قدر کی جاتی، اور اُن کی پرستش ہونے لگتی ہے۔ یہی زمانہ اُن افراد کا حقیقی عہد ہوتا ہے۔ ڈاکٹر جونسن نے ایسے ہی نفوس کے متعلق کہا ہے:-

"ہر وہ شخص جسے لکھنا پڑھنا آتا ہے، قلم اُٹھا سکتا ہے اور اُٹھاتا ہے۔ لیکن ایسے لوگوں کی کثرت، زبان کو اُسی صورت و حالت میں استعمال کرتی ہے، جس صورت و حالت میں کہ زبان اُنکے سامنے آتی ہے، یا جس صورت و حالت میں کہ وہ زبان کو پاتے ہیں لیکن اس کے برخلاف ایک فطین شخص زبان کو اپنے مقصود اور نہایت کا ماتحت بنا لیتا اور اپنی خصوصیت کے سانچے میں ڈھال لیتا ہے اُسکے دماغ میں عندیات (concepts) کا جو ہجوم اور تواتر ہوتا ہے، اُس کے اندر جو احساس و خیال، تخئیل و آرزو، ہمرنگی و تضاد، رونما ہوتے رہتے ہیں، امتیازات و تصورات جو اُس کے لئے فطری ہیں، زندگی و آداب زندگی کے متعلق اُسکی رائے، تواریخ کے باب میں اُس کا فیصلہ، اُس کی جدت و ظرافت (لغوی معنے میں) کی مشق اور اُسکی قابلیت و فرزانگی کا عمق، یہ تمام ناقابل شمار مخلوق اور خود اُس کے ذہن کی تیک، اُس کے دماغ میں متشکل ہوجاتی ہیں اور وہ ان سب کو مناسب الفاظ اور موافق زبان میں، اپنے مخصوص انداز بیان میں، پیش کرتا ہے۔ اُس کی یہ زبان اظہار اُس کے ذہنی بطون سے مشابہ اور اُسی طرح کی کثیر الاشکال ہوتی ہے، وہ ایسی زبان اختیار کرتا ہے جو اُسکی شخصیت کے زور کا قرار واقعی اظہار اور اُس کا عکس و پرتو ہوتی ہے"

عہد متاخرین تک اُردو ادبیات کی تاریخ میں صرف دو ہستیاں ایسی نظر آتی ہیں جن پر جونسن کی یہ تعریف صادق آسکتی ہے یعنی نظیر اور غالب، ان دونوں نے عام مسالک کو ترک کرکے اپنے لئے نئی راہ پیدا کی اور دونوں ہمیشہ مطعون رہے۔ اُن کے زمانہ میں اُن کی قدر ہونا ناممکن تھا، اگر ہوتی بھی تو بالکل غلط بنیاد پر۔ لیکن اُن کا اصلی عہد بھی آگیا۔

باوجود تاخر، غالب کی قدر نظیر سے پہلے پہچانی گئی۔ یعنی غالب پچاس ساٹھ سال اور نظیر سو سال زمانۂ مابعد کی زبان تھے۔ اس تقدم و تاخر کی وجہ شاید یہ ہو کہ جدید تعلیم نے فلسفیانہ خیالات کی قدر کرنا ہمیں پہلے سکھایا اور صحیفۂ فطرت کے مطالعہ کا درس بعد میں دیا۔ اگست ۳۹ء میں "یوم نظیر" کی تقریب پر، دلی ریڈیو اسٹیشن سے میں نے ایک مختصر گفتگو میں میاں نظیر کی غزل گوئی پر روشنی ڈالی تھی، اس موقع پر اُسی موضوع کے متعلق تفصیلی اظہار خیال مقصود ہے۔ نظیر اسوقت تک جس بنا پر مشہور و معروف ہیں وہ اُنکی نظمیں ہیں، اور اُنکے متعلق مخالف یا موافق آرا کا مدار اُنکا وہی کلام رہا ہے جو مشاہدۂ فطرت یا مناظر قدرت کی شاعری سے موسوم ہے۔ نظیر کا غزلیہ کلام نشر و اشاعت نہیں پاسکا۔ اس کی ایک توجیہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ اُن کی غزل گوئی اُن کی نظموں کی شہرت سے دب گئی اور دوسری یہ کہ اُن کا غزلیہ کلام عدم اشاعت کے باعث منظر عام پر نہ آسکا، اس لئے کہ اُن کے متداول کلیات میں پچیس کے قریب غزلیں شامل تھیں اور پروفیسر شہباز کو بھی، جنھوں نے واقعتاً نظیر کو دوسرا جنم دیا، تقریباً سو غزلیں دستیاب ہوسکیں۔ لیکن سید عابد علی صاحب اکبر آبادی نے گزشتہ دس سال کی مسلسل جستجو کے بعد کچھ غیر مطبوعہ نظموں کے علاوہ غزلیہ کلام کا جو ذخیرہ فراہم کرلیا ہے، آج اُس کی تعداد چھ سو غزلوں سے اوپر ہے۔ سید صاحب نے حقیقتاً اُردو زبان اور نظیر کے معترفین پر زبردست احسان کیا ہے، لیکن قوم کی پست ہمتی کو دیکھتے ہوئے کیا امید ہو سکتی ہے کہ یہ مجموعہ یا اُس کا ایک عمدہ انتخاب ہی

طبع و اشاعت پا سکے گا؟ اس مضمون کی ترتیب کے وقت میرے سامنے نظیر کا ایک قلمی نسخہ ہے جس میں تقریباً دو سو غزلیں اور اسی نظمیں شامل ہیں۔ نظموں میں اکثر مطبوعہ اور غزلوں میں بیشتر غیر مطبوعہ ہیں۔

اوائل عمر میں نظیر نے نادر گردی کا زمانہ دیکھا تھا اور زندگی کے تقریباً سو سال پورے کرنے میں ہندوستان کے قصر شہنشاہی کے بام و در گرنے کا نظارہ کیا تھا۔ امرا و شرفا کی خانہ ویرانی بھی دیکھی اور غاصبوں اور غداروں کا عروج پانا بھی۔ زندگی کے نشیب فراز کے ان مناظر کا سامنے آنا اور زمانے کی اس سفلہ پروری سے دو چار ہونا، ہر صحیح الفکر انسان کو غور و تامل پر مجبور کر دیتا ہے۔ نظیر کی حکیمانہ نظر نے عالم کی بے ثباتی اور زندگی کی حقیقت کو بے نقاب دیکھا۔ معلمی کے پیشے نے طبیعت میں قناعت اور استغنا پیدا کر دیا۔ شاہی درباروں کا طمع اور امیرانہ جاہ و حشمت کی قلعی اگر نظیر کے سامنے اس طرح نہ کھلتی تو شاید لکھنؤ حیدر آباد اور بھرتپور کے بلاوے مسترد نہ ہوتے۔ غرض نظیر حصول مال کی طرف سے بے پروا اور تحسین و آفرین سے بے نیاز تھے

دولت سے نفرت، فلسفیانہ طبیعت کا اور شان و مرتبت سے بے پروائی، شاعرانہ بصیرت کا نتیجہ ہے۔ نظیر نے کسی کی حاشیہ نشینی قبول نہ کی، کیونکہ وہ خود طبیعت کے بادشاہ تھے۔ جب طبیعت اور مزاج کا یہ عالم ہو تو ایک شخص کا خوش خلق اور منکسر المزاج ہونا بھی فطری سی بات ہے۔ چنانچہ ان حالات و اسباب کا اقتضا یہی ہو سکتا تھا کہ میاں نظیر کی صحبت میں عام طبقے کے لوگ زیادہ نظر آئیں۔ ماحول کا اثر مسلم ہے۔ نظیر کے شعری اکسائز نے وہی موضوع منتخب کئے جو عام دلچسپی اور لگاؤ کی چیز تھے اور وہی انداز اختیار کیا جو عام فہم ہو سکتا تھا۔

نظیر کا انتخاب موضوعات ایک خاص نکتہ ہے جس کو سمجھ کر ہم ایک طرف تو ان کی تحریک شعری کی صداقت کو سمجھ سکتے ہیں اور دوسری طرف خود اُنکے نفس و مزاج کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اُن کے موضوعات شعری کی نوعیت پر غور کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ نظیر گو طبقۂ متوسط سے متعلق تھے جو سماجی قوانین کی جکڑ بندیوں میں زیادہ اُلجھا ہوتا ہے، لیکن اپنے رجحان شعری کے مقابلہ میں وہ اپنے سماج سے ایک ذرہ بھر مرعوب نہ تھے۔ اُن کی شاعری اُن کی طبیعت کا تقاضا تھا جس میں اُن کی فطرت جھلکتی تھی۔ شاعری ان کے لئے وجہ تفاخر یا ذریعۂ معاش نہ تھی۔

ایک حقیقی شاعر کی داخلی زندگی اُس کے شعر میں پوری طرح منعکس ہوتی ہے، لیکن کسی شاعر کے کلام سے اُسکی خارجی زندگی مرتب کرنا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔ رہن سہن کا طریقہ یقیناً اتنا دلچسپ نہیں ہو سکتا جتنا رہن سہن کی آرزو اور احساس دلچسپ ہو سکتے ہیں، کیونکہ وہ اصل شاعر ہوتا ہے۔ ایک شاعر کا اپنا کردار جس قدر اُس کے جذبات میں جھلک سکتا ہے اُتنا افعال میں نمایاں نہیں ہوتا کیونکہ اکثر جذبات فعل کی صورت اختیار کرنے سے رہ جاتے ہیں۔ لیکن ایک سچا شاعر فکراً وحساً اور عملاً و فعلاً مختلف نہیں ہوتا۔ چنانچہ نظیر کی داخلی و خارجی زندگی، یعنی اُنکے جذبات و حسیات اور فعل و عمل میں شدید قسم کی مطابقت پائی جاتی ہے۔ اور چونکہ میاں نظیر زندگی کے نقاش ہیں اور زندگی بھی سامنے کی، یہی سبب ہے کہ اُن کے یہاں مقامی رنگ اس کثرت اور اس خصوصیت کے ساتھ نظر آتا ہے۔

نظیر کی مبتذل گوئی میاں نظیر کی شاعری کے متعلق اظہار خیالات سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ اُن کی ابتذال نویسی کی حقیقت پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ جہاں تک نفسِ اعتراض کا تعلق ہے، میری نظر سے اور بہت سے شعرائے فارسی و اُردو کا ایسا ہی کلام گزرا ہے، پھر تعجب ہے کہ صرف نظیر ہی ہدفِ ملامت بنانے کے لئے کیوں چھانٹا گیا؟ میں جس نتیجہ تک پہونچ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ ابتذال کا لفظ بہت ہی محدود معنے میں نظیر کے کلام کی نسبت استعمال کیا جاسکتا ہے۔ نظیر نے تقلید ترک کرکے تصنع سے بغاوت کی فطانت نے اُن کو حقیقی شاعری کا مسلک سمجھایا اور اُنھوں نے سامنے کے مظاہر زندگی کو اس طرح بیان کیا کہ عوام میں مقبول ہوگئے۔ چونکہ اُنھیں عوام سے سندِ قبول ملی، اس لئے لوگوں نے آنکھ بند کرکے اُن کے کلام کے پوچ اور مبتذل ہونے کا فتویٰ صادر کردیا۔ یہ اُن کے عہد کے سماج کا قانون تھا کہ اجلاف جس بات کو پسند کرتے، اشراف میں معیوب سمجھی جاتی تھی۔

ممتاز اور قابلِ ذکر افراد میں سب سے پہلے نواب شیفتہ نے یہ اعتراض وارد کیا تھا۔ پھر مؤلف آبِ حیات نے نظیر کے استخفاف پر کمر باندھی اور اُن کے بعد مولانا شبلی نے شیفتہ کی رائے اور آزاد کے خیال کی تائید کی۔ آجکل کے بعض نوجوان "ادیب" بھی اسی رائے اور خیال سے متاثر ہوکر نظیر کو فحش گو اور مبتذل نویس کہتے ہیں۔

مجھے شیفتہ کی رائے سے کوئی تکرار اور حجت نہیں۔ اول تو وہ ذاتی رائے تھی، کہیں سے مستعار نہ تھی اور رائے آزاد ہے۔ دوسرے یہ کہ شیفتہ جس سماج کے فرد تھے اُس کے بازار میں امارت کی ٹکسال میں ڈھلی ہوئی شرافت کا سکّہ چلتا تھا، اس لئے اُس عہد کا ادب بھی اُسی طبقے کے مزاج و مذاق کا آئینہ تھا۔ ادنےٰ طبقے "اجلاف" کے نام سے موسوم تھے جن کی زندگی زندگی نہ تھی کہ ادب میں جگہ پائے، یا جس کا ذکر ادب کہلائے۔ یہ بات چونکہ متانت یعنی امارت یا شرافت سے خارج تھی، اس لئے ادب سے بھی خارج تھی اور حقیقت تو یہ ہے کہ اُس عہد میں زندگی و ادب کے مابین تعلق کا خیال ہی کب پیدا ہوا تھا! لہٰذا شیفتہ کی رائے اُسوقت کے معاشری رجحان اور ادبی میلان کی پوری طرح آئینہ داری کرتی اور اُسے کامل صداقت کے ساتھ پیش کردیتی ہے۔ اُس زمانہ کا معیارِ شعر و شرافت نظیر کی شاعری پر یہی تنقید کرسکتا تھا

شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد کا خیال قابلِ افسوس ہے۔ وہ نئے رجحانات ادب کے مبلغ تھے۔ حیف ہے کہ اُنکے مذاق فطرت پرستی کو نظیر کے تمام سرمایۂ شاعری میں چند ہی شعر ایسے نظر آئے جو میر کے کلام سے ٹکر کھاتے تھے!

لیکن یہ ماجرا بہت زیادہ افسوس ناک ہے کہ مولانا شبلی نعمانی کی بالغ نظر بھی نظیر کی شاعری میں کوئی حسن و خوبی نہ دیکھ سکی اور وہ شیفتہ اور آزاد کے ہمنوا ہو گئے۔ حالانکہ مولانا کا زمانہ شیفتہ کے زمانہ سے مختلف تھا۔ جدید خیالات کافی طور پر پھیل چکے تھے۔ ادب اور صناعت کے نظریوں کی کافی اشاعت ہوچکی اور اُن میں وسعت آچکی تھی۔ شیفتہ کے عہد کی تنگ نظری باقی نہ تھی۔ مولانا خود جدید علوم پر نظر رکھتے تھے

میرا قیاس یہ ہے کہ مولانا نے نظیر کے کلام پر نظر ڈالے بغیر اپنے پیشروؤں پر اعتماد کیا۔ لیکن اس طرزِ عمل سے اُن پر

ایک غیر ذمہ دارانہ اظہار رائے کا الزام عاید ہوتا ہے اور شبلی سے عالم و فاضل کے لئے یہ ایک کمزوری ہے۔ بایں ہمہ شاید اس کی کوئی تاویل ہو سکتی، مگر اس کا کیا جواب ہے کہ اپنے قیام حیدر آباد میں مولانا نے پروفیسر شہباز سے یہ سن کر کہ وہ نظیر پر کچھ کام کر رہے ہیں، اُن کی اس سعی و کاوش کو فعل عبث سمجھا اور اگرچہ پروفیسر صاحب کی توجیہ کرنے پر مولانا نے اُن سے اتفاق رائے کر لیا، لیکن نظیر کے متعلق مولانا کی اصلی رائے "موازنۂ انیس و دبیر" میں موجود ہے اور اُس میں کسی ترمیم کا علم کم از کم مجھے نہیں ہو سکا ہے۔

گریجویٹ اُدبائے جدید کے اعتراض کی حقیقت بس اتنی ہے کہ پچھلے زمانوں کے مقابلہ میں آج کل انسانی مصروفیتیں چونکہ بہت زیادہ ہیں، نیز یہ عہد مشینی کہلاتا ہے، اس لئے کفایت وقت کی خاطر ہم اپنی بہت سی ضرورتیں "طیار" چیزیں خرید کر پوری کرنے میں سہولت دیکھتے ہیں۔ ممکن ہے کہ سیاسیات قسم کے شعبوں میں اخبارات اور لیڈروں کی رائیں اپنا لینا شاید مضایقے کی بات نہ ہو، مگر زندگی کے ہر شعبے میں اس سہولت پر عمل کرنا بہت پر خطر ثابت ہو سکتا ہے

شعر کی بحث میں آکر لفظ ابتذال کا مفہوم کچھ وسیع اور نوعیت کچھ مختلف ہو جاتی ہے۔ معنوی ابتذال سے شاید ہی کسی شاعر کا دامن پاک رہا ہو، لیکن لسانی (لفظی) ابتذال بھی نہایت ثقہ شاعروں کے کلام میں موجود ہے۔ سعدی کی گلستاں کا باب پنجم خاص و عام کی زبان پر ہے۔ امیر خسرو کی مثنوی "عشقیہ" میں زفاف کی تفصیل، حکیم سنائی کی مذمتوں میں خواہر و دختر کی مذمت، اور صدہا شعرا کی ہجو و ہزل ہمارے سامنے ہے۔ چونکہ اکثر اور ثقات شعرا کے یہاں بھی ایسا ادب پایا جاتا ہے، اس لئے ہم یہی ایک نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ "واقعیت نگاری" سے قطع نظر، اس قسم کا کلام اظہار قدرت و کمال کے تحت عالم وجود میں آتا تھا اور جب یہ حال ہے تو تنہا نظیر کو مطعون کرنا کہاں کا انصاف ہو سکتا ہے؟

نظیر کے کثیر ذخیرۂ شاعری میں چند نظمیں یا اشعار ایسے ہیں جن پر یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے۔ لیکن اُن چند نظموں میں بھی دو چار ہی ایسی ہیں، جو کسی ادبی قدر کے بغیر پست ہیں، ورنہ باقی نظموں میں کوئی نہ کوئی ادبی قدر اور صناعتی قیمت پائی جاتی ہے۔ لیکن نظیر کے کلام پر نظر ڈالتے وقت ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ وہ مطالعۂ حیات کرنے والا شاعر ہے، اور یہ بھی فراموش نہ ہونا چاہئے کہ زبان کے مرتبہ کا موضوع کے رتبہ سے بلند و پست ہونا اُصول فن کے خلاف ہے۔ پھر یہ بھی سامنے رکھنا ہے کہ آج کا نظریۂ صناعت موضوع کے ثقہ یا غیر ثقہ ہونے کو مہمل سی بات سمجھتا ہے۔ اس باب میں صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ موضوع کے ساتھ پورا انصاف کیا گیا ہے یا نہیں۔ آج شاعر کا مسلّم منصب یہ ہے کہ جو موضوع اُس کی توجہ کو جذب کر سکے اور ایک شاعر میں وسعتِ نظر و خیال لازمی ہے۔ وہ کامل صداقت اور انتہائی صفائی سے اُس کا اظہار کرے ایک شاعر اگر کسی مبتذل موضوع کا اظہار پوری صداقت اور کامل حسن سے کر دیتا ہے تو اُسے صناعت ہی کہا جائے گا

نظیر کی مبتذل گوئی کے ذیل میں ایک اہم اور واقعاتی نکتہ یہ ہے کہ اُن کے کلام کا ایک معقول جز و فرمائشی اور بدیہی ہے۔ منجملہ اور روایتوں کے آگرہ میں یہ بھی مشہور ہے کہ لوگ راہ چلتے میاں نظیر کے ٹٹو کی باگ پکڑ لیتے اور حسب حال شعروں

کی فرمایش کرتے تھے اور چونکہ وہ ہر شخص کے لئے قابل حصول اور فقیرانہ مشرب کے آدمی تھے اور انھیں کسی کی دلشکنی گوارا نہ تھی، فوراً کچھ شعر کہکر لوگوں کو ہنسا دیتے اور خوش کر دیتے تھے۔ دوسرے یہ کہ میاں نظیر کی حُسن پرستی خود اُن کے کلام سے ثابت ہے جُسن کی محفلوں میں جانے کا پروانہ میاں نظیر کے پاس بدیہہ گوئی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا؟ چنانچہ اُن کی بعض نظموں سے صاف اور بین طور سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فرمایشی ہیں اور فی البدیہہ کہی گئی ہیں۔ ایسا کلام لہجہ کے اعتبار سے بھی پست ہے اور اُس میں معائب شعری بھی موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ عوام کی یا بازار حسن کی فرمایشیں پوری کرنے میں، نظیر نقائص شعری دور کرنے کے لئے جان نہ کھپاتے ہوں گے اور ہنسنے ہنسانے کے لئے لہجے میں عمداً عامیانہ انداز رکھتے ہوں گے۔ چنانچہ اُن کے ایسے کلام کو اُس کلام سے جو شاعرانہ تأثر کے تحت وجود میں آیا ہے، بآسانی تمیز کیا جا سکتا ہے باایں ہمہ اُن کی زیست نگاری کی خصوصیت دونوں طرح کی شاعری میں نمایاں رہتی ہے۔

نظیر کے معترض اگر مجموعۂ کلام کو غور سے دیکھتے تو زبان کا اختلاف معیار دیکھ کر اُن کو خود بخود نظر آجاتا کہ "کنھیا جی کا بالپن" اور "شیخ سلیم چشتی" "آدمی نامہ" اور "بھنگ کا پیالہ" "خربوزے" اور "عشق کی ہمہ گیری" کی زبان اور لہجے میں بہت بڑا فرق و امتیاز ہے۔ اگر ایسا کیا جاتا تو نہ صرف یہ کہ وہ اپنے اعتراض کا جواب پا لیتے بلکہ اُن پر نظیر کا کمال فن بھی آشکارا ہو جاتا

نظیر کی شاعری کسی شاعر کے کلام پر تبصرہ کرتے وقت ہمارے یہاں بالعموم مضمون آفرینی، بندش کی چستی، تشبیہ کا حُسن، استعارے کی خوبی اور محاورے کی برجستگی وغیرہ دکھانے میں توجہ صرف کی جاتی ہے۔ میں اس روایتی طریقے کو ترک کر کے نظیر کی بعض ایسی خصوصیات کو اُجاگر کرنے کی کوشش کروں گا جو سرسری مطالعہ میں نظر سے رہ جاتی یا عام نگاہوں میں نہیں آتی ہیں۔ مجھے یہاں یہ بھی اعتراف کرنا چاہئے کہ میرا مقصود کلام نظیر کی تحسین ہے لیکن "تحسین" کا مفہوم "تقریظ" نہ سمجھنا چاہئے۔

فنی اعتبار سے نظیر کی شاعری میں فروگزاشتیں ہیں، لیکن بڑے بڑے مسلم الثبوت شعرا کے یہاں بھی ایسی فروگزاشتیں موجود ہیں۔ شکسپیر کے اغلاط اگر جایز قرار دئے جائیں تو اُن کی ایک جدا لغت تیار ہو سکتی ہے، وہٹ مین (Whitman) اگر "قانون بالذات" کا لقب پا سکتا ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ نظیر بھی مستثنیٰ نہ کئے جائیں۔ شعر کے بہت سے محاسن کو اس بناء پر مسترد کر دینا کہ اُس میں بعض شرطیں پوری نہیں ہوئی ہیں، ایک غیر فلسفیانہ حرکت بھی ہے۔ نظیر کی فنی غلطیوں پر دوسرے مستند شعرا کی مثالیں دے کر پروفیسر شہباز نے ایک جامع بحث کی ہے اور ضروری نہیں کہ یہاں اس موضوع پر اس سے زیادہ بحث کی جائے۔

شیلے (Shelley) نے شعر کی ایک نہایت جامع تعریف کی ہے، وہ کہتا ہے کہ "شعر زندگی کا ہو بہو نقش ہے اور شعر میں زندگی کی خارجی صداقت کا اظہار ہوتا ہے"۔ بالفاظ دیگر شاعر اپنی صناعت میں فطرت انسان کی شکلیں بناتا ہے جو اُن افعال کے فنا ہو چکنے کے بعد بھی جن کی کہ وہ نقل ہیں، بصورت اعجاز باقی رہتی ہیں۔

نظیر فطری و حقیقی شاعر ہیں اور اُن کا تقلید سے بغاوت کر کے زبان سے اپنی غایت کے مطابق کام لینا اُنکو جونسن کے مطابق، ایک فطین شاعر ثابت کرتا ہے اور اس لئے کہ نظیر کی نظر وسیع ہے اور پوری زندگی اُن کے سامنے ہے، انسانی خوبیاں اور خرابیاں یکساں طور پر اُن کی شاعری کا مسالا ہیں اور وہ زندگی کے سچے نقشے کھینچتے ہیں، شیلے کی تعریف اُنھیں حقیقی شاعر بتاتی ہے۔

عام طور پر نظیر کی شاعری ایک چشمے کی مثال ہے۔ اُن کے شعر کی روانی چشمے کی سی روانی ہے اور جس طرح ایک چشمہ کا پانی کہیں گہرا کہیں اُتھلا ہوتا ہے، اور جہاں اُتھلا ہوتا ہے، وہاں تہ کے بلور پارے اور کہیں کہیں جواہر ریزے اپنی رنگینی و دلکشی نمایاں کرتے دکھائی دیتے ہیں، مگر چشمہ کا راگ ہے کہ برابر جاری ہے، بالکل یہی کیفیت نظیر کے کلام کی ہے

نظیر کے پاس شعر کے مسالے کی بہتات ہے۔ اُن کو اپنی شاعری کے موضوع اور مسالے سے کتنا گہرا تعلق اور انہماک ہے؟ وہ اُس سے کس قدر لطف و لذت حاصل کرتے ہیں؟ اس کا اندازہ کر سکنا دشوار ہے۔ ہم اُن کے کلام سے محسوس کرتے ہیں کہ میاں نظیر بسنت کے موسوم میں در و دیوار، زمین و آسمان کو بسنتی دیکھ رہے ہیں، ہولی کے دنوں میں اُنکو عبیر، گلال اور زعفران کی بارش ہوتی دکھائی دیتی ہے، بھنگ اور شراب کے نشے میں چرچے چلے آرہے ہیں، بچوں کے ساتھ کھیلنے میں دنیا و مافیہا کو بھولے ہوئے ہیں، عورتوں کے لباس کی خوشرنگی اور زیور کی زیبائی اُنھیں مسرت کی بہشت میں پہونچائے دے رہی ہے، غرض تیج تہوار، میلے ٹھیلے، رسوم و تقریبات، اُن کے احساس کی نقاشی کے لئے آب و رنگ ہیں، اور اُن کے احساسات و اشارات کا یقینی ذریعہ بن جاتے ہیں۔ چونکہ اُن کے شعر کا مسالا زندگی فراہم کرتی ہے اسلئے اُن کے اظہار میں زندگی کی صداقت جھلکتی ہے۔ مسالہ کی کثرت کا یہ عالم ہے کہ ایک چیز کی تمام قسمیں گنوا، اور اُس کے متعلق اتنی تفصیل پیش کر دیتے ہیں کہ بعض وقت یہی بات اُن کی تعبیر و بیان کو وہ بلندی نہیں ملنے دیتی جو ایجاز کلام سے حاصل ہوا کرتی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ جن واقعات و اشیاء کا بیان کرتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ اُن واقعات و اشیاء کی حسّی و جسمانی زندگی میں ڈوب جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ اُن کے انداز اظہار کو بھی اپنا لیتے ہیں اور یہی احساس کی معراج ہے نظیر جس طرح احساس کرتے ہیں اُسی طرح اظہار کر سکتے ہیں، اور اس اظہار سے سننے یا پڑھنے والے میں بھی وہ احساس اُسی طرح پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ شاعر کے احساس میں مساویانہ شریک ہو جاتا ہے

فطرت پرستی نظیر کی فطرت ہے کسی وقت بھی وہ فطرت کا ساتھ چھوڑتے معلوم نہیں ہوتے۔ وہ جب کسی پرند کی چہکار سنتے ہیں، جب ستاروں کی جگمگاہٹ نظر آتی ہے، جب چاندنی چھٹکی ہوئی دیکھتے ہیں، جب دھنک نکلی ہوئی دکھائی دیتی ہے، تو وہ فطرت سے اُتنے ہی قریب ہوتے ہیں جتنا ابو البشر اُسوقت ہوئے ہوں گے جب اشیاء و انواع نے اسماء کا جامہ نہیں پہنا تھا نظیر ہمیں اپنے سروش غیبی سے ہمکلام ہوتے سنائی دیتے ہیں وہ ہمیں یہ معلوم کرا دیتے ہیں کہ اُن کا ماحول اُن کے لئے ایک جذبہ کی صورت رکھتا ہے، وہ اُسے ایک طلسم زار کی صورت میں دیکھتے اور اُسے

ایک طلسم زار ہی کی طرح محسوس کرکے لطف اندوز ہوتے ہیں

جان درنک واٹر (John Drink Water) کے بقول شاعری دو غالب اثرات سے متاثر ہوتی ہے۔ ایک خود شاعر کی شخصیت سے اور دوسرے اُس زمانہ کی اسپرٹ سے نظیر کی شاعری میں اُن کی شخصیت کے زور کا قرار واقعی اظہار تو ہر جگہ کارفرما نظر آتا ہے، لیکن اُس عہد کی اسپرٹ کے عوض عہد مستقبل کی اسپرٹ زیادہ دیکھنے میں آتی ہے۔ نظیر کی فطانت کی یہی سب سے بڑی دلیل ہو سکتی ہے! کیونکہ یہ بھی ایک مسلم بات ہے کہ ہر شاعر کے ذہن میں ایک نمونہ و مثال ضرور ہوتی ہے جس کے سانچے میں اُس کی شاعری ڈھلتی ہے۔ لیکن نظیر کے سامنے ایسا کوئی نمونہ نہ تھا۔ وہ مشاہدۂ فطرت تک صرف اپنی فطانت کے زور سے پہونچے، جذبات کو انقلابی شکل میں پیش کرنا اور عام زندگی کے تمام پہلوؤں سے اپنے شعر کا مسالہ حاصل کرنا اُنھیں فطانت ہی نے سکھایا۔ اس اعتبار سے نظیر کو غالب پر بھی فوقیت ہے۔

شعر نظیر کی نمایاں صفت بندش کی سادگی اور بیان و خیال کی روانی ہے، جو میر کی سادگی و روانی سے مختلف ہے بلاشبہ میر کا احساس مقابلتاً گہرا ہے، لیکن حسنِ تخلیق اور جمالِ کائنات کے اظہار میں اُردو کا کوئی شاعر نظیر کے مقابلہ میں نہیں لایا جا سکتا اس سے انکار نہیں کہ نظیر کے یہاں میر کی طرح نفسیات کے گہرے رازوں کا انکشاف نہونے کے برابر ہے لیکن نفسیات کا دائرہ جذبات محبت ہی میں محدود نہیں ہے۔ نظیر کے یہاں نفسیات کا انکشاف ہے اور مبادیِ نفسیات تو اُن سے کسی موقعے پر ترک نہیں ہوتے۔ اس لئے کہ وہ عام انسانوں کے شاعر ہیں۔ یہ بھی تسلیم ہے کہ نظیر نے غالب کی طرح فلسفہ کی گتھیاں نہیں سلجھائیں، لیکن نظیر فلسفۂ زندگی کے جسے انگریزی میں (Everyday Philosophy) کہا جاتا ہے، مفسر ہیں اور وہ اُن کے یہاں موجود ہے بلکہ کہنا چاہئے کہ وہی وہ ہے۔ کیونکہ اُن کے پیش نظر سامنے کی زندگی ہے۔

نظیر کی نقاشیِ فطرت کے ضمن میں شعرائے مرثیہ کو خاص کر میر انیس کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن غور کرنے کے بعد واضح ہو جائے گا کہ نظیر اور انیس میں بہت بڑا فرق ہے، دونوں کا نقطۂ نظر ایک نہیں ہے۔ مرثیہ میں جو قدرتی مناظر ہمارے سامنے آتے ہیں وہ شاعر کے عشقِ فطرت اور اُس کے مشاہدے کا نتیجہ نہیں ہوتے۔ بلکہ اُن کے لئے "روایتی بیانات" کا نام زیادہ موزوں ہے۔

نظیر کی شاعری کے متعلق ڈاکٹر فیلن نے مبسوط اظہار خیال کیا، اور اُس کو سچی شاعری اور نظیر کو اعلیٰ پائے کا شاعر تسلیم کیا ہے۔ نظیر کی شاعری کے متعلق ایک خاص بات یہ اور کہنا ہے کہ کسی خاص پائے انداز کی شاعری کے پھلنے پھولنے کے لئے خاص ہی فضاء و ماحول کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ آزادی سے سانس لے سکے۔ مگر نظیر کے انداز شاعری کے لئے اُن کا زمانہ ناموافق تھا، اس لئے اُن کا مسلک شعر پھیل نہ سکا، اُس کا وقت اب آیا ہے۔ عصری رجحانات غمازی کر رہے ہیں کہ ادبی مستقبل نظیر ہی کے ہاتھ ہے۔ عہد حاضر واقعیت نگاری پر فریفتہ ہے، اور نظیر اُس سے بھی

نہیں۔ کم از کم اُسے قومی ادب نہیں کہا جا سکتا۔ چنانچہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ہمارے ادب میں قومی زندگی کا عکس نہیں ہے، تو یقیناً ہمیں چاہئے کہ اپنے ادب کی پیشانی سے یہ داغ دھونے کے لئے اُسے قومی زندگی سے قریب تر کر دیں اور اگر ایسا کرنے میں نفاست یا ادبیت کا کچھ نقصان ہو بھی تو اُس کا خیال نہ ہونا چاہئے۔ اسلئے کہ ثقافت اور ادب یعنی زبان، ذی حیات عضو کہے جاتے ہیں۔ زبان کا معیار بدل دینے کے بعد بھی اُس میں نفاست وادبیت پھر آسکتی ہے اور اس اضافے کے ساتھ کہ اُس کے اندر قوم کی زندگی بڑی حد تک رونما ہو گی اور قوم کا بڑا حصہ اُس سے فیض یاب ہو سکے گا، یعنی ثقافت حاصل کر سکے گا۔

اِس بحث کو ذرا پھیلا دینے سے میرا مقصود یہ بتانا تھا کہ آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے نظیر نے آگرہ میں بیٹھ کر ادب اور زبان کا یہی معیار قایم کیا تھا، درانحالیکہ حاتم کے وقت سے اُن الفاظ کو کاٹنے چھانٹنے کا عمل جاری تھا، جو عوام کی زبان پر چڑھ جاتے تھے۔ نظیر نے وہ زبان پھیلانا چاہی اور وہ ادب پیدا کیا جس کو ہماری اکثریت سمجھ سکتی اور جس میں ہماری اکثریت کی زندگی منعکس تھی۔ لہذا اس اعتبار سے کہ اُنھوں نے ایک قومی زبان اور قومی ادب پیدا کیا، ہمارے تمام شاعروں میں ایک نظیر ہی قومی شاعر کہلانے کے مستحق ہیں۔

جیسا میں نے ابھی عرض کیا، ہماری زبان میں ترک اور تراش کا عمل بہت جلد شروع ہو گیا تھا اور متقدمین کی اس تراش خراش کے عمل نے زبان کا دائرہ ہمیشہ تنگ رکھا اور بہت سے مفید و کار آمد الفاظ کو ساقط الاعتبار کر دیا ——
اس سے انکار نہیں ہو سکتا اس طرز عمل سے اُردو نے شستگی، نفاست اور قابلیت اظہار کا بلند مرتبہ بہت تھوڑی ہی مدت میں حاصل کر لیا، لیکن توسیع زبان کا مسئلہ اپنی جگہ اٹل رہا اور ہے۔ متروکات میں اکثر ایسے سبک الفاظ پائے جاتے ہیں جن کے معنے وسیع اور مفہوم نازک ہیں اور جن کی ہمیں آج ضرورت ہے مگر وہ سکّے اب رائج نہیں۔
اس دور کے بعض شاعروں اور ادیبوں نے اس بات کا احساس کیا ہے کہ پرانے الفاظ زندہ اور نئے الفاظ اور اسلوب وضع کئے جائیں۔ وہ اس طرف بھی مائل ہیں کہ زبان و عروض کی ناروا گرفتیں کچھ ڈھیلی کر دی جائیں

نظیر نے اپنے زمانہ میں صرف کاٹ چھانٹ سے اعراض ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ وسیع پیمانے پر اختراع و تصرف پر بھی بڑی دلیری سے عامل رہے۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو نظیر کی خدمت زبان اندازے سے باہر نظر آتی ہے۔ نظیر کا ذخیرۂ الفاظ تمام اُردو اہل قلم سے زیادہ ہے اور میرا عقیدہ ہے کہ جب بھی ہم خلوص مقصد اور سنجیدگیِ مدعا سے توسیع زبان کے مسئلہ پر غور کرنے بیٹھے تو اسالیب و الفاظ کا بڑا ذخیرہ حاصل کرنے میں کلام نظیر سے ہم کو بہت زیادہ مدد ملے گی

اگر موجودہ معیار پر جانچا جائے تو نظیر کے یہاں زبان کی غلطیاں ہیں وہ فارسی اور ہندی کے الفاظ عطف و اضافت کے ساتھ استعمال کرتے ہیں جیسے "جواں ولڑکے" یا "گھنگر و تال" وغیرہ، اوپر کہا جا چکا ہے کہ وہ عام تلفظ کا اتباع کرتے ہیں جیسے عجوبہ یا سر آنا (بجائے سرہانا) یعنی حروف گرا دیتے ہیں۔ وہ ضرورت پر جمع الجمع بھی بنا لیتے ہیں جیسے "عنایاتیں"

وہ قدیم الفاظ بھی استعمال کر لیتے ہیں جیسے ستی بمعنی سے، "سوتیاں" بمعنی سوتی ہیں، اور "ملونا" بمعنی ملانا۔

لیکن فارسی ہندی الفاظ کی ترکیب اُسوقت کے بعد تک کے شعراء کے یہاں پائی جاتی ہے اور پُرانے الفاظ کا استعمال بھی بالکل متروک نہ ہوا تھا۔ حروف گرادینے کے باب میں میری اوپر کی توجیہ شاید زبردستی کی تاویل نہ سمجھی جائے گی۔ یعنی نظیر کے اُس کلام میں جو فرمائشی اور فی البدیہہ ہے اور جو محض تفریح و تفنن طبع کے طور پر وجود میں آیا ہے یقیناً عروض کی پروا نہیں کی گئی ہے اور نہ صحت لفظی کا خیال رکھا گیا ہے۔ یہ فرو گزاشت اور ناہمواری اسی قسم کے کلام میں زیادہ نظر آتی ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ چند مثالیں جو پیش کی گئی ہیں میرے نسخے میں اسی قدر مل سکیں اور اس لئے وہ قابل لحاظ بھی نہیں ہوسکتیں۔ بااین ہمہ، اعجوبہ سے الف گرا کر عجوبہ لکھنا میرے خیال میں اچھی جدت ہے اور اگر غور و فکر کے ساتھ ایسی کار آمد اور مناسب بدعتوں کو روا رکھا جائے تو شاید زبان کی وسعت و اصلاح کے لحاظ سے بھی مفید ہو۔

اس بحث میں اختراع و اشتقاق نظیر کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت ہے۔ میاں نظیر لفظ گھڑنے میں کسی وقت تامل نہیں کرتے۔ خاص کر قافیے کے باب میں اُن کو مطلق پروا نہیں ہوتی کہ اُن کا سکہ ٹکسال باہر سمجھا جائے گا یا نہیں، بلکہ اُن کے تیور سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یا تو وہ کسی احتساب کا وجود ہی تسلیم نہیں کرتے یا اپنے تئیں اُس سے بالا، یا اپنے آپ کو ہر اجتہاد کا مجاز سمجھتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے زبان کو وسیع کرنے کا خیال پس پشت بھی ڈالدیا جائے، تب بھی شاید اس سے انکار نہ کیا جاسکے کہ اُس طرز عمل کا یہ فایدہ (سہولت) کیا کم ہے کہ شاعر کو خیال کا خون نہیں کرنا پڑتا چنانچہ اس پہلو سے نظیر قافیہ کے بادشاہ ہیں۔ اُن کے بعد یہ مرتبہ انشاء کو حاصل تھا، یا پھر اس عہد میں اکبر الہ آبادی نے یہ خصوصیت پیدا کی تھی۔

زبان کو احساس یا خیال کے اظہار کا واسطہ ہونے کی حیثیت حاصل ہے اور زبان کا ایسا صحیح استعمال جو اظہارِ خیال بخوبی کرسکے اپنی جگہ خود ایک صناعت ہے اور ایک مخصوص نوعیت کی صناعت۔ ہر فن و صناعت کے کچھ ضابطے اور قاعدے ہوتے ہیں اور اگر اُن کی پیروی کامل طور سے کرلی جائے تو نتیجۂ مطلوب مکمل ہوتا ہے۔ لیکن زبان کے استعمال کا ایسا کوئی ضابطہ و نظام نہیں۔ استعمال الفاظ کا فن دیگر فنون کی طرح اکتسابی نہیں اور استعمال الفاظ کی یہی خصوصیت ہے جس نے "اہل زبان" اور "زباندان" کی اصطلاحیں وضع کرادیں۔ زبان کا صحیح استعمال مطالعہ، غور، اور مشق و مزاولت پر منحصر ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ ایک فطری ملکہ ہے۔ اظہار کی سلاست بعض کو بعض کے مقابلہ میں زیادہ حاصل ہوتی ہے اور خوش بیانی و خوش کلامی ایک خداداد بات ہے۔ پھر یہ کہ زباندان ہو یا اہل زبان اور مطالعہ، غور اور مشق کتنی بھی بڑھی ہوئی کیوں نہ ہو، یہ حد درجہ مشکل بات ہے کہ کوئی شخص ہمیشہ اور ہر وقت تمام سلسلۂ خیالات کو صحیح اور قطعی الفاظ میں ادا کرسکے، یا مختلف اور نازک احساس کو اُسی رنگ میں اور اُسی نزاکت کے ساتھ ہمیشہ بیان کرسکے۔

تھی باغ زندگی کی اُسی سے ہی آب و رنگ دیوان عمر کا بھی وہی انتخاب تھا
اپنی تو فہم میں وہی ہنگام دل فروز مجموعۂ حیات کا لب لباب تھا

ترتیب الفاظ کی موسیقی نظیر کا سارا کلام الفاظ کی موافقت و مناسبت یعنی خوش صوتی و ترنم سے مالامال ہے۔ وہ بالعموم بجتی ہوئی بحریں اختیار کرتے اور الفاظ کو اس ڈھنگ سے ترتیب دیتے ہیں کہ جلترنگ کا نقشہ کھنچ کر رہ جاتا ہے۔ الفاظ کو موضوع سے کچھ ایسی ہم آہنگی ہوتی ہے کہ مضمون کانوں سے نظر آنے لگتا ہے۔ صرف ایک غزل ہولی کے بیان میں پیش کی جاتی ہے، ورنہ نظیر کی یہ خصوصیت عام ہے:۔

ہولی کی رنگ فشانی سے ہے رنگ یہ کچھ پیراہن کا جوں رنگا رنگ بہاروں میں ہو حال چمن اور گلشن کا
جس خوبی اور رنگینی سے گلزار کھلے ہیں عالم میں ہر آن چھڑکواں جوڑوں سے ہے حسن کچھ ایسا ہی تن کا
لے جام لبالب بھر دینا پھر ساقی کو کچھ دھیان نہیں یہ ساغر پہونچے دوست تلک یا ہاتھ لپک لے دشمن کا
ہر محفل میں رقاصوں کا کیا سحر دلوں پر کرتا ہے وہ حسن جتانا گانے کا اور جوش دکھانا جوبن کا
اُس گلرو نے یوں ہم سے کہا کیا مستی و مدہوشی ہو نا دھیان ہمیں کچھ چولی کا، نا ہوش تمھیں کچھ دامن کا
جب ہم نے نظیر اُس گلرو سے یہ بات کہی ہنس کر اُس دم کیا پوچھے ہے اے رنگ بھری ہو مست مہینا پھاگن کا

اِن اشعار کی وجدانی کیفیت اپنی جگہ، لیکن تیسرے کا معنوی کنایہ اور واقعیت حیات کا اشارہ وجد آفریں ہے۔

نظیر کا معشوق اُردو فارسی کی شاعری کی روایات قدیمہ کے خلاف نظیر نے اپنا محبوب عورت کو بنایا، اور بے تکلف تانیث کی ضمیر استعمال کی ہے۔ میں نے اس خاص نظر سے اُن کی دو سو غزلیں پڑھیں تو مشکل سے تین چار شعر ایسے ملے جن کا مخاطب امرد ہو سکتا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ اُس عیب کی جو نظیر کے یہاں خصوصیت سے مفقود ہے، جناب مخمور کو شاعرانہ تاویل و اعتذار کی ضرورت محسوس ہوئی، اُن کی نظموں میں دو ایک جگہ اگر اس نوع کا بیان پایا جاتا ہے تو وہ حیات نگاری اور زندگی کی نقاشی کے ذیل میں ہے۔ ایسے بیانات کو نظیر کی ذات خاص سے متعلق کر دینا نقد و درایت صحیح کے منافی ہوگا۔ ہم ایک شاعر کے کلام سے اُس کی پسند و ناپسند، رغبت و نفرت کا اندازہ تو کر سکتے ہیں، مگر اُس کے ہر اظہار خیال کو اُس کا اصل کردار قرار نہیں دے سکتے۔ شاعر تو دوسروں کے تجربات و افتاد، احساس و جذبات کو بھی احساس کے ذریعہ سے اپنا بنا لیتا ہے۔ اس ذکر میں شاید یہ بتانا نتیجہ خیز ہو کہ نظیر کے یہاں ساقی کی شخصیت محبوب سے الگ بھی ہے، ہر چند کہ اُن کا معشوق بھی یہ رسم ادا کرتا ہے:۔

ساقی کو جام دینے میں اُس خوش نگہ کی، آہ ہر دم اشارتیں ہیں کہ "اُس کے تئیں نہیں"

نظیر کا مطمح محبت فلسفۂ قدیم میں ایک یہ نظریہ بھی ملتا ہے کہ انسان اپنی روح کو ملوث کئے بغیر بھی جسم سے گناہ کر سکتا ہے۔ یعنی اگر جسم گناہ کرے تو لازمی نہیں کہ روح بھی ملوث ہو۔ نظیر کا غزلیہ کلام دیکھئے

سے خیال ہوتا ہے کہ غالباً وہ اسی مسلک کے آدمی تھے۔ نظیر نے اپنی کامرانیوں کو "فطرتیت" کے پیرا ذہیں بیان کیا ہے اور ذوق حصول و جرأت رندانہ کے مشرب کو سراہا ہے۔ لیکن جہاں کہیں محبت کے مسئلہ پر اپنے تاثرات وحسیات بیان کئے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی محبت مطحمی اور مثالی تھی۔ یا پھر میاں نظیر کے سامنے روح وجسم کے جداگانہ متاثر ہونے کا نظریہ ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میاں نظیر کی "لذتیت" اور اُن کی مطحمی محبت دونوں اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہوں اور ایک درجہ طے کر لینے کے بعد دوسرے تک پہونچے ہوں۔ یہی زیادہ قرین قیاس ہے کہ ترقی عمر کے ساتھ نظریۂ محبت میں تغیر ہوا ہو۔ افسوس کہ کلام کی تاریخی ترتیب نہ ہونے کی وجہ سے ہم اس بات کو مدلل نہیں کرسکتے۔ الغرض اُنکی محبت کا مقصود "ٹک دیکھ لیا، دل شاد کیا، خوش وقت ہوئے اور چل نکلے" ہے۔ اُنھوں نے اپنے اس نظریئے کو مختلف پیرایوں میں ادا کیا ہے اور اسی کی تفسیر وتشریح کی ہے:-

آ گئے تھے سیر کرتے، تم کو دیکھا، خوش ہوئے　　بس خدا حافظ ہے ہم اے یار رخصت ہو چلے

ایک جگہ اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ اصل عشق، عشق ذات ہے، عاشق صفات کو نہیں دیکھتا:-

فقط جو ذات کے ہیں دل سے چاہنے والے　　اُنھیں کرشمۂ و ناز و ادا سے کیا مطلب

محبت اگر حقیقی ہو تو عاشق کا دل بس جذبۂ پرستش اور احترام سے لبریز ہوتا ہے۔ ایک شعر میں نظیر نے اپنے جذبے کی پاکیزگی اور اپنے محبوب کی نزہت ہی کے مانند ایک پاکیزہ نہایم پیدا کیا ہے۔ وہ نسیم کو مخاطب کرکے اپنی محبت کو اُس کی محبت سے زیادہ مقدس ثابت کرتے اور کنایتاً اُس کی پیہم بوسہ بازی پر ایک طنز کر جاتے ہیں:-

اُس کی جبین پاک پہ اس دم تک اے نسیم　　کافر ہوں، گر پڑی ہونگہ، بے وضو مری

محبت میں دل کی جراحتیں مسلم ہیں اور منھ سے ایک آہ نکل جانا بھی بالکل فطری۔ نظیر خود کو ورائے بشریت ثابت نہیں کرتے۔ لیکن عشق کی وفا پیشگی کو بہر حال مقدم رکھتے ہیں:-

اظہار ہم بھی کرتے احوال دل فگاری　　شرم وفا گر اکدم دیتی زباں کو یاری

محبت میں مدارج ہیں، نظیر کو بھی عشق کے تجربات ہوتے ہیں اور وہ اپنے لئے ایک محفوظ نتیجہ نکال لیتے ہیں:-

دل جس کو چاہتا ہے اُسے بھی خبر نہ ہو　　اپنی تو فہم میں ہے یہی راہ سب سے خوب

نظیر فلسفۂ زندگی کے ماہر ہیں، وہ زندگی کے مختلف مظاہر کو سمجھتے ہیں، اس لئے عشق کا حاصل بھی جانتے ہیں کہ اُس کی انتہا بس ایک آہ دلگداز ہے۔ لیکن وہ اسے بھی پست سمجھتے ہیں اور مطمئن نہیں، کیونکہ اُن کی نظر میں یہ کمالِ عشق (یعنی ایک آہ) بھی طالب اثر ہے اور طلب اثر سے جو ایک تمنا ہے، عشق کو بلند ہونا چاہئے:-

کمالِ عشق بھی خالی نہیں تمنا سے　　ہے ایک آہ تو اس کو بھی ہے اثر کی طلب

محبت کی لذت کو نظیر اپنے ہی لئے رکھنا چاہتے ہیں، اور کسی کو اُس کی خبر دینا اُنھیں گوارا نہیں ہے:-

لطف جو چاہت کے ہیں سو وہ جتانے نہیں		چاہ چھپی کیجئے تا کوئی جانے نہیں،

محبت کرنا اور یہ آرزو نہ کرنا کہ محبوب بھی ہمیں چاہے، بڑا درجہ ہے۔ لیکن محبوب کو یاد کرنا اور یہ چاہنا کہ وہ ہمیں یاد نہ کرے، انتہا ہے۔ نظیر اس آرزو میں کامیاب ہو کر اس خوش قسمتی کا اعلان کرتے اور خوش ہوتے ہیں:-

خوش نصیبی مری اُلفت کی تو دیکھو یارو		یاد کرتا ہوں جسے میں، وہ بھلاتا ہے مجھے!

اِس شعر میں نظیر نے خیال کو اُس بلندی پر پہونچا دیا جہاں پہونچا دینا خیال میں نہ آسکتا تھا۔

علم و حکمت غزل کے شعر میں خصوصاً علمی مسائل کا بیان غیر موزوں سی بات ہے۔ لیکن شاعر اگر عالم بھی ہے تو ناممکن ہے کہ اُس کے شعر ایسے مسائل سے پاک رہیں۔ اُردو شاعری میں فلسفہ کا بیان غالب کی خصوصیت ہے۔ مومن کے یہاں بھی مسائل حکمیہ کی کمی نہیں۔ میرا یہ مقصود تو ہرگز نہیں کہ نظیر کو بھی عالم یا سائنس داں کہہ کر پیش کیا جائے، کیونکہ اگر وہ ایسے ہوتے بھی تو شاعری کے لئے یہ چیز کوئی وجہ تفاخر نہیں ہوسکتی تھی۔ لیکن یہ دکھلانے کے لئے کہ ایک شاعر میں جو بصیرت ہونا چاہئے وہ نظیر کو بخوبی حاصل تھی اور وہ اِن حقیقتوں تک پہونچ جاتے تھے، چند شعر نقل کئے جاتے ہیں۔ نظیر اپنی اس حیثیت سے خود بھی باخبر ہیں۔ کہتے ہیں:-

حکمت کا اُلٹ پھیر نہیں جن کی نظر میں		وہ کہتے ہیں غافل " یہ بقا ہے یہ فنا ہے"

آغازِ حیات پانی سے ہے، نظیر اس نکتہ سے لاعلم نہ تھے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ شاعر کا پانی "آبِ رخ" ہے:-

آبِ رخ کیا، کہ اسی سے ہے حیات ہر شئے		شاہد اس بات کی ہے حی من الماء کی صدا

سورج کی کرنیں زمین پر بسنے والی مخلوق کے ساتھ کیا کیا شعبدہ بازیاں اور کیسی کیسی سحر کاریاں کرتی ہیں؟ زندگی ارض کا مدار آفتاب کی شعاعوں پر کہاں تک ہے؟ یہ سب سائنس کے مسلمات ہیں یہ راز نظیر پر غیر منکشف نہ تھا

خورشید جس سے لعل کی ہوتی ہے تربیت		وہ اُن لبوں کے پان کا ادنیٰ اُگال ہے

خواہش میں اُلوہیت ہے، یعنی طلب اگر صادق ہے تو آرزو کا بر آنا یقینی ہے لیکن ہر آرزو، آرزو نہیں ہوسکتی اور اس کے لئے کوئی پیمانہ و اندازہ ضروری تھا۔ نظیر نے یہ پیمانہ ایک شرط لگا کر پیش کیا ہے، شرط بھی کتنی جامع و مانع! اور ساتھ ہی ایک درس حیات بھی دیدیا ہے:-

آرزو خوب ہے، موقعے سے اگر ہو، ورنہ		اپنے مقصود کو کم پہونچے ہیں بسیار طلب

انگریزی زبان میں ایک جملہ ضرب المثل کے طور پر اکثر بولا جاتا ہے جسکا مفہوم ہے کہ ساغر کے لبوں تک پہونچنے میں چھلک جانیکے بہت سے امکان ہیں نظیر انگریزی تو یقیناً نہیں جانتے تھے، مگر انکی بصیرت اتنی تھی کہ یہ عندیہ اُن کے خیال کی رسائی سے بچ نہ سکا:-

کیا کاسۂ مے لیجئے اس بزم میں اے ہمنشیں		دورِ فلک سے کیا خبر پہونچے گا لب تک یا نہیں

زندگی کی واقعیتیں زندگی اگر عالم رویا کی زندگی ہوتی تو نہایت خوب چیز تھی۔ مگر زندگی نام ہے بیدار لمحوں کا اور بیداری میں زیست کی تلخیاں اٹل اور سخت ہیں۔ ان تلخیوں کے گوارا ہو جانے کا صرف ایک ہی نسخہ ہے اور وہ حکیمانہ نقطۂ نگاہ ہے۔ نظیر نے ان تلخ حقیقتوں کے راز اکثر کھولے ہیں۔ اگرچہ اس قسم کے خیالات کے اظہار کا ذریعہ نظم کو بنایا ہے، مگر غزل کے اشعار میں بھی ایسے خیالات بیان کر جاتے ہیں:۔

دیکھا جو خوب ہم نے، دنیا ہے جائے مطلب
ہو کس طرح نہ ہم کو ہر دم ہوائے مطلب

اُس کو بھی دے چکے ہیں، اکثر برائے مطلب
وہ آبرو کہ جس پر کرتے ہیں جاں تصدق

نہیں اور کسی سے کوئی روٹھنا نہ منانا ہے
ملنا بھی غرض کا ہے لڑائی بھی غرض کی

اے دوست کون پھر کرے ماتم فقیر کا
ہم کیوں نہ اپنے آپ کو رو لیویں جیتے جی،

بن آتی ہے تو ہوتی ہیں سب باتیں ٹھیک ٹھیک
سچ ہے بقول حضرت سید نظیر، آہ،

خوشی کے فلسفہ کی یہ تعریف شاید ملٹن نے کی ہے کہ انسانی مسرت کا ماحصل سب کے لئے یکساں ہے میاں نظیر اس حقیقت سے بھی آگاہ تھے:۔

زیادہ اُن سے ہے ہر بے نوا کو عیش و طرب
اگرچہ اہلِ نوا خوش ہیں ہر طرح، لیکن،

جو شاہ کو ہے، وہی ہے گدا کو عیش و طرب
کمالِ قدرتِ حق ہے نظیر کیا کہئے

نظیر کا فلسفۂ زندگی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تفسیر و تشریح اگرچہ نظیر کے کلام میں ملتی ہے، لیکن مجموعی طور سے اُنھوں نے بھی اُسے "نکشودہ معما" ہی مانا ہے۔ وہ ہر شئے اور ہر حالت کو بڑی شدت سے گزشتنی مانتے ہیں۔ اسی لئے ہر حال میں خوش ہیں۔

ہستیٔ انسان کی حقیقت یا خودی کا احساس نظیر کو کس طرح ہوتا ہے؟ کہتے ہیں:۔

سب غلط ہے یہ جو کہتے ہیں کہ ہم میں کچھ نہیں
کچھ نہیں ہم میں تو ہستی و عدم میں کچھ نہیں

ہستیٔ انسان کی غایت اور مقصود کا اعتراف تو نظیر کرتے ہیں، لیکن انسان کس خاص کام کے لئے پیدا ہوا ہے اسکو ناگفتہ ہی چھوڑ دیتے ہیں:۔

جس کام کو جہان میں آیا تھا تو نظیر
خانہ خراب! تجھ سے وہی کام رہ گیا

ہستیٔ انسان اور زندگی کی کشمکش اور غفلتوں کو نظیر جس طرح سمجھے ہیں، وہ ذیل کی غزل میں ایک جگہ نظر آجاتا ہے اس غزل میں نظیر کا مصلحانہ رنگ بھی ہے جسے میں نے الگ نہیں دکھایا ہے:۔

جو تو کہتا ہے اے غافل "یہ میرا ہے یہ تیرا ہے"
یہ جس کا ہے اُسی کا ہے، نہ تیرا ہے نہ میرا ہے

تو اد دل سوچ تو دل میں کہ تو ہے کون اور کیا ہے
نمازی ہے، شرابی ہے، اُچکا ہے، لٹیرا ہے

کتابوں کی یونیورسٹی

چند سال ہوئے میں آل انڈیا لائبریری کانفرنس کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے جس کا اجلاس لاہور میں ہونے والا تھا علامہ سر محمد اقبال کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے درخواست کی کہ وہ مجلس استقبالیہ کی صدارت قبول فرمائیں علامہ موصوف نے میری استدعا کو نہایت خندہ پیشانی سے سُنا لیکن آپ نے نہایت شائستگی مگر صاف گوئی کے ساتھ فرمایا کہ وہ میری درخواست کو منظور نہیں کر سکتے میں انتہائی مایوسی کے عالم میں وہاں سے رخصت ہونے ہی والا تھا کہ انھوں نے مجھ سے دریافت کیا "کیا کتب خانے کوئی کام کی چیز ہیں اور کیا کتابوں کے مطالعہ سے کچھ فایدہ حاصل ہوتا ہے"۔ ان کے اس سوال کا میں اسوقت کوئی جواب نہ دے سکا اور عرصہ تک میرے دماغ میں یہ سوال گونجتا رہا۔ میں حیران تھا کہ اقبال ایسے فاضل انسان کو کتابوں کے مطالعہ سے اسدرجہ نفرت و گریز کیوں ہے۔ کم از کم علامہ کے سوال سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا اور اس کے کوئی اور معنی نہ سمجھ سکا۔ مجھے امید نہ تھی کہ صاحب موصوف نے میرے ساتھ وہی طرزِ عمل اختیار کیا ہوگا جو ایک ممتحن زبانی امتحان میں کسی طالب علم کے ساتھ اختیار کرتا ہے، ممدوح کا یہ مقصد کبھی نہ رہا ہوگا کہ وہ میری معلومات کا امتحان لیں یا میری قوت تشریح و ترغیب کو پرکھیں، یقیناً سوال میں اس سے کچھ زیادہ گہرائی تھی، اس میں کتابوں اور ان کے مطالعہ کے متعلق اس بے اعتمادی کا اظہار تھا جس کے متعلق اور مفکرین بھی روشنی ڈال چکے ہیں۔

اس سوال پر غور و فکر کے اثناء میں میرے سامنے اور بھی ایسے ارباب فکر آئے جو اس اصول کے قطعاً منکر تھے کہ کتابوں کے مطالعہ سے عقل و دانائی پیدا ہوتی ہے مجھے اسٹیونسن کے "کاہل" کا خیال آیا۔ اس نے اپنے دلچسپ مقالہ "کاہلوں کے لئے ایک اعتذار" میں کتابوں کے مطالعہ کے خلاف ایک زبردست احتجاج کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ "جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے اپنے زمانہ میں بہت کافی لکچر سنے ہیں مجھے ابھی تک یاد ہے کہ لٹو کا گھومنا حرکت کی سکون کی ایک صورت ہے اور یہ بھی یاد ہے کہ حق شفع کوئی مرض نہیں ہے اور نہ طلب حق آسایش کوئی جرم ہے لیکن اگرچہ میں اپنی معلومات علمی کے ان جواہر پاروں سے بخوشی محروم ہونا پسند کروں گا تاہم میں ایک لمحہ کے لئے بھی تیار نہیں ہوں کہ ان معلومات کو وہی اہمیت دوں اور ان کی وہی قدر و قیمت سمجھوں جو میں نے اسکول سے

غائب ہو کر آوارہ گردی میں حاصل کی ہے" اس سے وہ یہ استدلال کرتا ہے کہ کتابوں کا بہت زیادہ مطالعہ فضول ہے، اس کی قدر و قیمت ایک شمعدان کی سی بھی نہیں ہے کیونکہ یہ ہماری زندگی پر (جس طرح ہم اس کو بسر کرنا چاہتے ہیں) بہت کم اثر انداز ہوتی ہے، مزید براں اس کا اعتقاد ہے کہ کتابیں ہم کو زندگی کے اُن مکمل و صحیح تعلقات سے بیگانہ بنا دیتی ہیں، جو فی الحقیقت بہت کار آمد ہیں۔ ایک کتابی آدمی "لیڈی آف شیلاٹ" کی طرح ہے جو زندگی کو اپنے اصلی خد و خال میں بمشکل دیکھ سکتی تھی، بلکہ وہ صرف ان پرچھائیوں پر قانع تھی جو آئینہ میں اسے نظر آتی تھیں ایسا شخص جو مسلسل کتابوں کے مطالعہ میں لگا رہتا ہے، تجربہ اور مشاہدات کا لطف صرف ثانوی حیثیت سے حاصل کرتا ہے، وہ حقایق کی دنیا سے الگ، صرف بھوتوں، پرچھائیوں اور دھندلی شکلوں کی دنیا میں رہتا ہے، وہ ان چیزوں کا مطالعہ کرتا ہے جو دوسروں نے انجام دئے ہیں، جنھیں اوروں نے سوچا اور کیا ہے اور اس حقیقت کو بالکل فراموش کر دیتا ہے کہ اسے خود بھی غور و فکر کی حسّاس زندگی بسر کرنا ہے۔ آگے چلکر وہ کہتا ہے کہ کتابوں کا مطالعہ انسان کو اس عجیب و غریب دنیا سے الگ کر دیتا ہے جس کے محاسن و معائب کا مطالعہ وہ خود اپنی آنکھوں سے کر سکتا ہے۔ کتابوں کا عاشق بالکل تن آسان اور بے حس زندگی کا عادی ہو جاتا ہے وہ اس حقیقت کو فراموش کر دیتا کہ فراہمی معلومات کے لئے اپنے حواس ہی کام میں لائے جا سکتے ہیں۔ اس کے لئے آکسفورڈ کے پرفضا میدانوں کا وجود صرف میتھو آرنلڈ اور رابرٹ برجز کی نظموں میں پایا جاتا ہے اور بلبل کے نغمے صرف حافظ کی مترنم غزلوں میں وہ صرف ان پھولوں کی خوشبو سونگھتا ہے جن کو کیٹس نے اپنی بہاریہ نظم میں پیش کیا ہے اور اس کو کسی صحبت کی مسرتوں کا اندازہ اسی وقت ہوتا ہے جب وہ اسکا ذکر کسی تذکرہ یا سیاحت میں پڑھتا ہے، الغرض دنیا کی بہترین چیزوں سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت اس سے مفقود ہو جاتی ہے اور کائنات کے گوناگوں مناظر و مظاہر اس کے لئے بالکل ناممکن الفہم۔

کتابیں صرف ہماری قوت مشاہدہ ہی کو معطل کر دیتی ہیں بلکہ وہ اکثر ہماری آنکھوں کو زندگی کے عملی پہلو کی طرف سے بند کر دیتی ہیں اور نپٹ مکتبی اور ملاّ بنا دیتی ہیں، تورو نے نہایت واضح اور مدلل طور پر اپنی کتاب والڈن میں اس موضوع پر بحث کی ہے۔ یہ امریکی مصنف جو عصر جدید کی میکانکی اور مذموم تہذیب سے قطعاً کوئی ہمدردی نہیں رکھتا تھا، صرف اُصول فطرت تبلیغ کرتا تھا اس نے اپنے وطن کو جو عہد حاضر کے جملہ اسباب عیش و نشاط سے آراستہ تھا، خیرباد کہکر ایک تالاب کے قریب رہنا اختیار کیا، اور یہاں جدید طرز زندگی کے شور و غوغا سے علٰحدہ ہو کر اس نے جدید تہذیب کی اساس و بنیاد پر غور کرنا شروع کیا اور اس نتیجہ پر پہونچا کہ یہ سب مکر و فریب ہے۔ اُس نے ان تمام اداروں کا تجزیہ شروع کیا جن کو آج کل کا مہذب انسان اجتماعی روشن خیالی کے ادارے ظاہر کرتا ہے اور اس نے محسوس کیا کہ یہ سب بے حقیقت ہیں۔ اس نے امریکہ کے رائج الوقت نظام تعلیم کو جس میں

کتابوں کے ذریعہ سے علم سکھانے پر زور دیا جاتا ہے. بالکل ناقص قرار دیا۔ یہ کتابی تعلیم زندگی کے حقایق سے قطعاً محروم کر دیتی ہے اور اس لئے بالکل بے معنی ہے۔ اس نے ایک خطیبانہ انداز سے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے "نوجوان کیونکر بہتر زندگی بسر کرتے ہیں؟ اس کی صورت صرف یہ ہے کہ وہ ابتدا ہی سے ذاتی تجربات حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اگر میں یہ چاہوں گا کہ کوئی لڑکا فنون و علوم سے واقفیت حاصل کرے تو میں رائج الوقت روش کبھی اختیار نہیں کروں گا جس کے معنی صرف یہ ہیں کہ ایک بچے کو کسی پروفیسر کے پڑوس میں رکھا جائے جہاں زندگی گزارنے کے فن کے سوا اور تمام باتیں بتلائی اور سکھلائی جاتی ہیں اور جہاں دنیا کا صرف سطحی مشاہدہ کرایا جاتا ہے۔ جہاں علم الکیمیا سکھلایا جاتا ہے لیکن یہ نہیں بتلایا جاتا کہ اس کی روٹی جو وہ روز مرہ کھاتا ہے کس طرح بنتی ہے، یا جہاں میکانیک کی تعلیم دیجاتی ہے لیکن یہ نہیں سکھایا جاتا کہ معاش کس طرح حاصل کی جاتی ہے یا جہاں نیچون سیارہ کے نئے چاندوں کا دریافت کرنا سکھایا جاتا ہے لیکن یہ نہیں بتلایا جاتا کہ وہ خود اپنی آنکھ کے تنکے کا کس طرح پتہ لگائے۔ آپ کے سامنے دو بچے ہیں، ایک وہ جس نے اپنا جیبی چاقو اس دھات کے ٹکڑے سے بنایا ہو جسے اس نے خود کھود کر نکالا تھا اور رگلا کر صاف کیا تھا لیکن پڑھا صرف اتنا ہی تھا جتنا کہ اس کام کے انجام دینے کے لئے ضروری تھا اور دوسرا لڑکا وہ ہے جس نے معدنیات پر بہت سے لکچر سنے ہوں اور اپنے شفیق باپ سے ایک چاقو بطور انعام پایا ہو۔ پھر آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ ان دونوں لڑکوں میں سے کون زیادہ کارآمد ہے۔ میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب مجھے اپنے کالج کے ایام کے اختتام پر بتلایا گیا کہ مجھے فن جہاز رانی سکھلایا گیا ہے درانحالیکہ اگر میں نے کسی جہاز کے اندر کام کرکے بندرگاہ کے گرد ایک چکر بھی لگا لیا ہوتا تو مجھے اس سے کہیں زیادہ معلومات حاصل ہو جاتیں، ایک طالبعلم کو معاشیات و اقتصادیات کی تعلیم تو دیجاتی ہے لیکن زندگی کیونکر کفایت شعاری کے ساتھ بسر کی جاتی ہے اسکی تعلیم نہیں دیجاتی، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے والدین کو ناقابل ادا قرض کی مصیبت میں گرفتار کر جاتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ کتابوں کے مطالعہ کے خلاف اس سے زیادہ پرزور احتجاج شاید ہی کسی نے کیا ہو تورو کے قول کے مطابق کتابیں فی الحقیقت خود اپنے ہی مقاصد کو شکست دے دیتی ہے کیونکہ یہ ہم کو حقایق کی دنیا سے نکال کر محض خیالی شکلوں اور غیر حقیقی صورتوں کے عالم میں گم کر دیتی ہیں۔

کتابوں کا مطالعہ دوسرے قسم کے خطرات میں بھی مبتلا کر دیتا ہے، ولیم ہیزلٹ نے اپنے ایک نہایت مشہور مقالہ موسومہ "علما کی جہالت" میں ان خطرات کو واضح طور پر بیان کیا ہے لکھتا ہے کہ:۔

"غیر معمولی تبحر علمی ایک ایسا خطرہ ہے جس میں بہت سے علما گرفتار ہیں۔ ان کی نظر کوتاہ ہوتی ہے اور فکر دوررس نہیں ہوتی ان کی دلچسپیوں کا حلقہ بہت محدود ہو جاتا ہے اور ان کی حالت اتنی ہی قابل رحم ہوتی ہے جتنا

کسی کارخانہ کے اس کاریگر کی جس کو صرف آلپنوں کے سروں کے بنانے کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے اول تو پنوں کا بنانا ہی خود کوئی عقل کو بڑھانے والا کام نہیں ہے اس پر طرہ یہ کہ اس کو چھوٹے سے کام میں سے بھی بہت چھوٹا سا حصہ انجام دینا پڑتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کاریگر اپنی ساری زندگی اپنے کام میں صرف کر دیتا ہے جو ذہنی سکون پیدا نہیں کر سکتا - یہ نام نہاد علما صرف الفاظ کے غلام بن جاتے ہیں اور قدرت کے مشاہدہ کے لئے ان کے پاس بینائی باقی نہیں رہتی وہ اشیاء کا ادراک دوسرے اشیاء کے ذریعہ سے کرتے ہیں انکی کتابیں انکے اور اشیاء کائنات کے درمیان حجاب بن جاتی ہیں - کتابی کیڑا ایک قسم کی تن آسانی اور بے حس زندگی کا عادی ہو جاتا ہے - وہ ایک گراموفون ہے جو صرف دوسروں کی کہی ہوئی باتوں کو چالاکی سے دہراتا رہتا ہے -
ایسے لوگ دوسروں کی آنکھوں سے دیکھنے ان کے کانوں سے سننے اور ان کے اعتقادات پر اپنے عقاید کی بنیاد رکھنے کے شایق ہوتے ہیں - انھیں ناموں اور تاریخوں کا علم ضرور حاصل ہوتا ہے لیکن انسان اور اشیاء عالم کا علم بالکل نہیں ہوتا وہ ہنڈؤں اور قلماقی تاتاریوں کے ذات پات کا مطالعہ تو نہایت شغف کے ساتھ کرتا ہے، لیکن اپنے ہمسایہ کے حالات سے بے خبر ہوتا ہے - وہ قسطنطنیہ اور پیکن کے طول و عرض سے بخوبی واقف ہے، لیکن اپنے پڑوس کی گلیوں کی اسے خبر نہیں ہوتی وہ خود اپنے احباب کے حالات سے آگاہ نہیں ہوتا لیکن تاریخ کے مخصوص افراد پر بہت پرزور لکچر دے سکتا ہے"

کتب بینی کے خطرات کا ذکر صرف مقالہ نگاروں ہی نے نہیں کیا ہے بلکہ بعض افسانہ نویسوں اور ناول نگاروں نے بھی اس پر روشنی ڈالی ہے، چیخوف نے اپنے افسانہ "معلم الادبیات" میں ایک معلم کی کردار نگاری کی ہے، یہ بیچارہ جغرافیہ کا معلم تھا اس کو اپنے مخصوص مضمون میں اسدرجہ انہماک تھا کہ اور تمام چیزوں سے دلچسپی ختم ہو گئی تھی اسکا ایک رفیق عشق میں مبتلا ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ اپنے دوست کو داستان دل سنائے لیکن اسے ہمت نہیں ہوتی. اس معلم نے کائنات کو صرف دو چیزوں میں محدود کر دیا تھا تاریخ اور نقشے ... زندگی کے معاملات میں اسکی حیثیت ایک احمق سے زیادہ نہ تھی، وہ بالعموم خاموش رہتا اور جب کبھی گفتگو کرتا بھی تو نہایت خشک اور عامیانہ.
اناطول فرانس نے بھی ان علما کا دبی زبان سے مضحکہ اڑایا ہے اور ان لوگوں پر طنز کیا ہے جو بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھتے ہیں - اس نے اس سلسلہ میں ایک کہانی بیان کی ہے کہ ایک شاہزادہ عجم کے تخت پر متمکن ہوا تو اس نے تمام علماء کو بلایا اور ان سے فرمایش کی کہ وہ بہت جلد ایک ایسی تاریخ عالم مرتب کر دیں جو سلطنت کے انتظام میں اسکے لئے مفید ہو - علماء اور عقلا بیس سال گزرنے پر بارہ اونٹوں کے قافلہ کے ساتھ دربار میں پہونچے، وزیر نے بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا کہ علماء سلطنت تاریخ کی چھ ہزار جلدیں مرتب کر کے لائے ہیں اور اس عظیم الشان تاریخ کا صرف دیباچہ پانچسو جلدوں پر مشتمل ہے، بادشاہ نے وزیر سے کہا یہ تصنیفات حکومت کے محافظ خانے میں محفوظ رکھدیجائیں اور علماء سے

کہا جائے کہ وہ اتنی مختصر کتاب لکھیں کہ اس تھوڑے سے وقت میں جو میرے پاس ہے میں اس کو پڑھ سکوں۔ علماء بیس سال کے بعد پھر آئے اور اس مرتبہ وہ صرف ۱۵۰۰ جلدیں لائے۔ بادشاہ نے کہا میرے پاس ان کے پڑھنے کا بھی وقت نہیں ہے کیونکہ اب میں ضعیف ہو چکا ہوں، انھیں اور مختصر کیا جائے، علماء دس سال بعد پھر واپس آئے اور پانچسو جلدیں اپنے ہمراہ لائے لیکن بادشاہ نے پھر وہی جواب دیا کہ اس کے پاس پانچسو جلدیں پڑھنے کا بھی وقت نہیں ہے علماء پھر واپس چلے گئے اور پانچ سال کے بعد ایک جلد لیکر آئے لیکن اسوقت بادشاہ بستر مرگ پر پڑا تھا۔ اس افسانہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کتابیں لکھنے کا کام کسقدر تضیع اوقات ہے اور ان کا مطالعہ بھی کس قدر دشوار ہے ایک آدمی بغیر زیادہ پڑھے ہوئے بھی حقیقی و ضروری عقل حاصل کر سکتا ہے۔

ابھی تک تو میں گویا شیطان کی نیابت کر رہا تھا اور کتاب بینی کے خطروں کی تفصیل پیش کر رہا تھا اور ایسا کرنا ضروری بھی تھا کیونکہ میں چاہتا تھا کہ کتب بینوں کو ان گڑھوں اور گھاٹیوں سے آگاہ کر دوں جو مطالعۂ کتب کے دوران میں سامنے آتے ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ دنیا بڑی حد تک کتابوں کی رہین منت ہے اور بہت سے لوگوں کی زندگی اس سے سدھر گئی ہے۔

اسٹیونسن کو افسانہ میں رشد و ہدایت کا سرچشمہ نظر آتا ہے اور اسی لئے وہ (Three Musketeers اور Pilgrims Progress) کا بڑا مداح ہے۔ اس نے شکسپیر کے ڈراموں سے بھی کافی فایدہ اٹھایا۔ گیٹے کی سوانح میں اسے روحانی غذا ملی۔

ارباب عمل نے بھی کتابوں کے مطالعہ کو بہت مفید بتایا ہے، لارڈ گرے کا عقیدہ تھا کہ کتب بینی بہترین تفریح ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "جب میں معتمد امور خارجہ تھا تو سخت تھکا دینے والے کام کے بعد تفریح کی سب سے بہتر صورت میں نے یہ نکالی تھی کہ اپنے تصبیاتی کتب خانہ میں پہونچ جاتا۔ ارل آف بالڈون نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ وہ کلاسیکی ادب کا بہت منت پذیر ہے اس کے خیال میں ہوریس، ہومر، اور ورجل کا مطالعہ اخلاقی حیثیت سے بھی ارفع و اعلیٰ ہے۔

بعض اوقات کتابوں نے لوگوں کو نیا عزم و استقلال بخشدیا ہے اور زندگی کے دھارے کا رخ بدلدیا ہے جان اسٹورٹ مل نے اپنی خود نوشت سوانح میں لکھا ہے کہ ایک بار میں زندگی میں سخت مایوس ہو گیا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر چیز باطل ہے۔ اتفاق سے مجھے ورڈس ورتھ کی نظموں کا ایک نسخہ ہاتھ آگیا میں نے اسے بغور پڑھا تو خوشی محسوس کرنے کی صلاحیت پھر عود کر آئی اور ایک کامیاب زندگی بسر کرنے کا ولولہ میرے اندر پیدا ہو گیا۔

جس طرح ورڈس ورتھ کی نظموں نے مل کو ایک نئی شاہراہ زندگی پر لگا دیا اسی طرح رسکن اور ٹالسٹائے کی چند کتابوں نے مہاتما گاندھی کی زندگی کا رنگ ہی بالکل بدلدیا وہ کہتے ہیں کہ "ٹالسٹائے کی کتاب" ایشور کا راج

خود تمھارے اندر ہے،، نے مجھے مبہوت و مسحور بنا دیا اور اس کی آزاد خیالی، عمیق مذہبیت اور صداقت کے سامنے تمام دوسری کتابیں پھیکی نظر آنے لگیں"۔

مسولینی کو کبھی یہ حیثیت نہ حاصل ہوتی اگر کارل اور نیٹشے کا مطالعہ اس نے نہ کیا ہوتا، لینن کو سماج کی تعمیر جدید کا شوق کارل مارکس کے مطالعہ سے پیدا ہوا۔ الغرض مطالعۂ کتب کے فایدہ سے انکار نہیں ہوسکتا لیکن یہ حقیقت ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ اپنی تعلیم آپ، ہر اس تعلیم سے بہتر ہے جو دنیا کی کسی یونیورسٹی میں دیجاتی ہے۔ اس سے یہ مقصد ہرگز نہیں کہ جو تعلیم اسکولوں یا یونیورسٹیوں میں دیجاتی ہے وہ لغو ہے بلکہ صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ اپنا پسند کیا ہوا طریقہ تعلیم بدرجہا بہتر ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایسی تعلیم کے لئے نصاب کیا ہونا چاہئے۔ میں اس سلسلہ میں کتابوں کے نام نہیں گنواؤں گا بلکہ اصولاً صرف یہ ظاہر کروں گا کہ اگر انسان کو صحیح معنی میں انسانی زندگی بسر کرنا ہے تو اسکو دنیا کی مختلف قوتوں کے سمجھنے کی کوشش کرنا چاہئے، اس کے لئے تھوڑی سی تاریخ پڑھنا ضروری ہے مگر صرف اپنے ہی ملک کی نہیں بلکہ سارے عالم کی۔ اسی کے ساتھ ان جلیل القدر لوگوں کے سوانح حیات پڑھنا چاہئے جنھوں نے دنیا میں ذہنی انقلابات پیدا کئے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ تاریخی ناول بھی پڑھنا چاہئے جو ماضی کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کر دینے والے ہیں اور فلسفہ کے مطالعہ کی بھی کوشش کرنا چاہئے خاصکر نفسیات اور اخلاقیات کا مطالعہ کہ یہ سائنس کے مطالعہ کا بھی ذوق پیدا کریگا ساتھ ہی ساتھ عمرانیات، اجتماعیات اور سیاسیات کا مطالعہ بھی کرنا چاہئے۔ اس طرز کے مطالعہ کے لئے کتابیں گنانا بے سود ہے پڑھنے والے کو خود اپنے مقاصد کا صحیح اندازہ کرنا چاہئے کہ نقادوں نے کتابوں کی تین قسمیں کی ہیں، معلوماتی کتابیں، تفریحی کتابیں اور الہام بخش کتابیں اور ان سب کا مطالعہ ضروری ہے۔

پروفیسر دیوان چند شرما — سید محمد عبدالعلیم ہاشمی

نگار کے پُرانے پرچے

نگار کے مندرجۂ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں جن کی دو دو تین تین کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت ہو طلب کریں قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں:-

(سنہ ۲۶ء) جنوری ۵ر۔ (سنہ ۲۷ء) اپریل ۴ر۔ (سنہ ۳۰ء) مئی ۴ر۔ (سنہ ۳۱ء) جولائی تا دسمبر ۴ر فی پرچہ۔
(سنہ ۳۲ء) فروری تا دسمبر (علاوہ اپریل و اکتوبر) ۴ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۳ء) فروری و جولائی ۴ر فی پرچہ۔
(سنہ ۳۴ء) فروری و اکتوبر ۴ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۵ء) فروری، اپریل تا اگست، اکتوبر تا دسمبر ۵ر فی پرچہ۔
(سنہ ۳۶ء) فروری، مارچ، اپریل، مئی، جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۵ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۷ء) مارچ اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست، نومبر ۸ر فی پرچہ۔

منیجر نگار لکھنؤ

دارالعوام میں سرمایہ داری کی بڑی زبردست مرکزیت پائی جاتی ہے۔ ۳۴ء میں دارالعوام کے ۱۷۰ ممبر ۷۵۰ کمپنیوں کے ڈائرکٹر تھے اور ایک ممبر پارلیمنٹ تو ۴۳ کمپنیوں کا ڈائرکٹر تھا۔ دارالامراء (ہاؤس آف لارڈز) میں ۷۲۹ امراء ہیں جن میں ۲۴۶ بڑے زمیندار ہیں، ۱۱۲ بیمہ کمپنیوں کے ڈائرکٹر ہیں، ۴۷ صرافہ کے کاروبار کے ڈائرکٹر ہیں، ۶۷ بنکوں کے ڈائرکٹر ہیں، ۴۴ ریلوے کمپنیوں کے اور ۴۹ جہاز بنانے والی کمپنیوں کے۔ اس سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ منجملہ ۷۲۹ امراء کے نصف سے زیادہ ایسے ہیں، جنھوں نے ۱۹ء سے ۳۱ء تک کسی مباحثہ میں حصہ نہیں لیا اور ۱۱۱ نے کسی اخلاقی مسئلہ میں کوئی رائے نہیں دی۔ اسی طرح گویا اوسطاً صرف ۸۳ امرا نے کام میں حصہ لیا۔

انگریزی قوم ہرچند بہت سی قوموں کا مجموعہ ہے لیکن انگلستان کی جائے وقوع اور اس کی جغرافی خصوصیت نے سب کا نقطۂ نظر ایک ہی کر دیا ہے۔ ایک جزیرہ کا باشندہ ہونے کی حیثیت سے ان میں بہت پیش بینی پیدا ہوگئی ہے اور وطنیت کا جذبہ قوی ہوگیا ہے۔

انگلستان اپنی پیداوار کے لحاظ سے زیادہ خوش قسمت نہیں ہے، وہ اپنی غذائی ضرورتوں کا صرف ۱/۳ حصہ پیدا کر سکتا ہے اور خام پیداوار جس پر اسکی صنعت وحرفت قایم ہے وہاں صرف ۲۰ فی صدی ہوتی ہے۔ لوہا، کوئلہ، اور فولاد البتہ وہاں بہت کافی پیدا ہوتا ہے، اسی لئے وہ یورپ بھر میں سب سے بڑا صنعتی ملک مانا جاتا ہے اور اس کی تجارت ۷۰ فی صدی برآمد کی تجارت ہے۔

وہاں کی حکمراں جماعت سب کی سب تجارت کرتی ہے اور اسی سے دولت کماتی ہے۔ انگریزی قوم تجارت کا اتنا زبردست احساس رکھتی ہے کہ کمائی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ یہاں تک کہ شاہی جواہرات سے بھی کچھ نہ کچھ فایدہ اُٹھا لیا جاتا ہے اور وہ یہ کہ اُن کے دیکھنے کے لئے بھی چھ پنس ادا کرنے پڑتے ہیں مشہور ہے کہ ایک انگریز ہفتہ میں چھ دن بنک انگلستان کی پوجا کرتا ہے اور صرف ایک دن گرجا کی اور یہ بھی اس لئے کہ وہاں مذہب کی قوت بڑی حد تک ہنوز باقی ہے وہاں آزادی کا احساس بھی بڑا قوی ہے اور آزادی حاصل کرنے کے لئے انھوں نے فرانسیسیوں کی طرح بڑی قیمت ادا کی ہے، یہاں تک کہ متعدد بادشاہوں کی گردنیں محض آزادی کے لئے کاٹ ڈالی گئیں۔

وسٹ منسٹر کا پارلیمنٹری نظام اتنا عجیب وغریب ہے کہ ہر قوم اس پر رشک کرتی ہے اور بجا رشک کرتی ہے، ڈکٹیٹر شپ میں شخص واحد خادم قوم کی حیثیت رکھتا ہے اور ڈماکریٹک حکومتوں میں حکومت، افراد کی خدمت کرتی ہے، اس حقیقت کو کوئی انگریز کبھی نہیں بھولتا اور ایک کھیل کی طرح اس پر عامل ہے۔ جسوقت انتخاب کی منزل ختم ہوجاتی ہے تو دونوں مخالف اس طرح ایک دوسرے سے ہاتھ ملاتے ہیں، گویا یہ کوئی ٹینس کا کھیل تھا۔ جب مسٹر بالڈون پہلی مرتبہ وزیر اعظم ہوئے تو سب سے پہلے انھوں نے لارڈ آکسفورڈ ہی سے مشورہ طلب کیا جو انتخاب میں ان کے نہایت شدید

مخالف فریق تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ انگریزی قوم انگلستان کے مسئلہ کو جماعتی سیاسیات سے بالکل علحدہ ہو کر دیکھتی ہے۔ جس وقت لارڈ کرزن کا انتقال ہوا (جو سخت ٹوری تھا) تو لیبر پارٹی کے ممبروں نے دارالعوام میں اس کی بہت تعریف کی ۱۹۲۶ء میں جب ویلس کے اندر عام اسٹرایک ہوا ہے تو پولیس اور اسٹرایک کرنے والے دونوں فٹ بال ساتھ ساتھ کھیلتے تھے۔

حکومت و وطن کے ساتھ وفاداری وہاں بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے آدمی میں پائی جاتی ہے۔ باہر کے لوگ جو وہاں جاتے ہیں انھیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ ملک انقلاب سے کیونکر بچا ہوا ہے جہاں اتنی غیر متوازن تقسیم دولت کی پائی جاتی ہے اس وقت انگلستان میں ۲۰ لاکھ آدمی بیکار ہیں جن میں نصف ایسے ہیں جو کسی کام کے قابل نہیں ہیں لیکن حیرت کی بات ہے کہ جب رائے دینے کا وقت آتا ہے تو ان بیکار غریبوں کی جماعت کنسرویٹو ممبری کے حق میں رائے دیتی ہے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ متوسط طبقہ لیبر جماعت کی اہلیت کی طرف سے مطمئن نہیں ہو اور دوسرے یہ کہ حکومت ان فاقہ کش غریبوں پر ۲۰ لاکھ پونڈ ہر ہفتہ صرف کر کے اُن میں بے چینی پیدا نہیں ہونے دیتی۔

حکمراں جماعت کے دست و بازو وہاں کئی ہیں۔ ایک تو بحری طاقت ہے جو بجائے خود ایک قانون کی حیثیت رکھتی ہے، دوسرے بنک جو نہایت ہی عجیب وغریب ادارہ ہے اور تیسرے وہاں کے سرکاری مدارس۔ کابینہ کے ۵۵ ممبروں میں کم از کم سولہ تو اٹون کے مشہور مدرسہ کے طالب علم ہوتے ہیں، چھ ہیرو اسکول کے اور سترہ دوسرے مدارس کے۔ یہ لوگ اس کا بڑا لحاظ رکھتے ہیں کہ ان کا اسکول کسی طرح بدنام نہ ہو، چنانچہ مسٹر بالڈون نے لکھا ہے کہ جب ترتیب وزارت کی دعوت انھیں دی گئی تو انھوں نے پوری کوشش کی کہ مدرسۂ ہیرو (جہاں وہ طالب علم تھے) بدنام نہ ہو۔

اخباروں کا بھی وہاں بہت اثر ہے اور اس لئے حکمراں جماعت ہمیشہ ان کو بھی زیر اقتدار رکھتی ہے لیکن سول سروس کا نظام سب سے زیادہ عجیب وغریب ہے اور حقیقتاً یہی ریڑھ کی ہڈی سمجھی جاتی ہے۔

اس ملک کا طریق پروپاگنڈا بھی نہایت عجیب ہے۔ اقتساب سے وہ بھی کام لیتے ہیں لیکن زیادہ تر جاسوسی کے ذریعہ سے۔ حبشہ کی جنگ کے وقت بحر روم میں برطانوی بیڑہ کی قوت سے ہر اخبار واقف تھا، لیکن مخالف جماعت کے اخباروں نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ انتخاب کے وقت وہاں اتنا سخت ناجائز سیاسی دباؤ ڈالا جاتا ہے کہ اگر یہی صورت ترکی یا بلغاریہ میں پیش آئے تو آزاد خیال اخباروں میں ہلچل پڑ جائے۔

برطانیہ کی خارجہ پالیسی جو نسلاً بعد نسلٍ ایک ہی سی چلی آرہی ہے، صرف یہ ہے کہ مغربی سلطنتوں کی قوت متوازن رہے اور توازن کا قیام انگلستان کے ہاتھ میں ہو۔

سر آسٹن چمبرلین نے ایک بار ظاہر کیا تھا کہ "ہماری بڑی بڑی لڑائیاں صرف اس لئے لڑی گئی تھیں کہ کسی

ایک حکومت کا اقتدار دوسری مغربی حکومتوں پر قایم نہ ہوجائے"۔ ٹریولیان کا بیان ہے کہ "ٹیوڈروں کے زمانہ سے اسوقت تک انگلستان نے سیاسیات یورپ سے صرف یہ کام لیا کہ وہ خود حملوں سے محفوظ رہے اور جو تدبیریں سمندر پار کے ممالک کے قبضہ کے لئے اختیار کی جاتی ہیں وہ پٹ نہ پڑیں"۔

اسی پالیسی کے تحت انگلستان کا موجودہ طرزِ عمل یہ ہے کہ اگر فرانس کسی وقت جرمنی سے زیادہ مضبوط ہوجائے تو جرمنی کی مدد کرے اور اگر کبھی جرمنی فرانس سے بڑھ جائے تو فرانس کی مدد کرے۔ چنانچہ جنگ عظیم کے بعد سے لیگ اقوام اسی پالیسی کی تکمیل کا ذریعہ بنی ہوئی ہے اور اگر کسی وقت لیگ اس مقصد کی تکمیل میں ناکام ہوئی تو برطانیہ اس کو ختم کردے گا لیکن چونکہ برطانیہ نے اپنے دیگر مقبوضات (ہندوستان وغیرہ) کو بھی اس میں علحدہ مستقل حکومتوں کی طرح شامل کرلیا ہے اس لئے لیگ پر ہمیشہ انگلستان کا اقتدار قایم رہیگا۔

جنگ سے قبل برطانیہ کی پالیسی یہ نہ تھی کہ وہ یورپ کے آیندہ امکانی خطرات کو پیش نظر رکھکر، اپنی قوم کو کسی مخصوص طرزِ عمل پر مجبور کرے، لیکن اب انگلستان یورپ کے آیندہ خطرات کا پہلے ہی سے بندوبست چاہتا ہے تاکہ امن وسکون کی تباہی سے اس کی تجارت متاثر نہ ہو۔ تاہم انگلستان اپنی خارجہ پالیسی کو بالکل کھیل ہی سمجھتا ہے، اہل جرمن و فرانس کے لئے تو سیاسیات موت و زندگی کی چیز ہے، لیکن انگلستان سمجھتا ہے کہ یورپ ایک اسٹیج ہے جس پر ہر ایکٹر اپنا کام کررہا ہے اور اگر کسی سے کوئی غلطی ہوجائے تو سمجھنا چاہئے کہ یہ صرف اہرسل تھا اور دوبارہ کوشش کرکے اس غلطی کو دور کرنا چاہئے۔

انگلستان کے دفترِ خارجہ میں دو گروہ ہیں۔ ایک وہ جو لیگ اقوام کا طرفدار ہے اور یورپ میں قیام امن و سکون کے خیال سے ایک متحدہ ذمہ داری پیدا کرنے کے لئے جرمنی کو بھی دول عظمی کی صف میں شامل کرنا چاہتا ہے یہ گروہ لڑائی کے نام سے کانپ اٹھتا ہے اور حبشہ کی جنگ کو اس نے اخلاقی قانون کی خلاف ورزی سمجھا۔ دوسرا گروہ جس میں ذرا معمر آدمی شامل ہیں، وہ ان تمام جھگڑوں سے علحدہ ہوکر صرف یہ چاہتا ہے کہ بحری قوت کو بڑھایا جائے اور خواہ مخواہ دوسروں کے معاملات میں دخل نہ دیا جائے۔ چنانچہ اس جماعت کی یہی پالیسی تھی جس نے جرمنی کو اتنے ہاتھ پاؤں پھیلانے کا موقعہ دیا۔

اس میں شک نہیں کہ ہٹلر کی آمریت کے بعد بھی انگلستان میں جرمنی کی طرفداری کا جذبہ بہت قوی پایا جاتا ہے۔ اور اس کے متعدد اسباب ہیں۔

۱- انگلستان کی ٹوری جماعت، بالشیوزم سے بہت خایف ہے اور اپنی حماقت سے اس نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہٹلر اس امر کی گارنٹی ہے کہ یہ تحریک مغرب کی طرف نہ بڑھے گی۔ اس لئے انگلستان اور جرمنی کو متحد رہنا چاہئے۔

۲- انگلستان اور خصوصیت کے ساتھ لندن والوں کا بہت سا روپیہ جرمن کاروبار میں لگا ہوا ہے، اسلئے اس سے

لڑائی مول لینا ایک بڑے سرمایہ کو خطرہ میں ڈالنا ہے۔

۳۔ انگلستان کے بہت سے صاحب اقتدار ایسے ہیں جو فرانس اور فرانسیسیوں سے نفرت کرتے ہیں اور اسلئے وہ قدرتاً جرمنی کی طرف مایل ہیں۔

۴۔ لارڈ لوتھین اور ان کے حوارییں کا خیال ہے کہ یورپ میں امن وسکون صرف اسی طرح قایم رہسکتا ہے کہ جرمنی مضبوط رہے اور ہٹلر کا ساتھ دینا گویا جرمنی کو مضبوط بنانا ہے۔

۵۔ وہاں کے اخبارات ہرچند نازی تحریک کو پسند نہیں کرتے لیکن بالشیویت یا اشتراکیت کو اس سے بھی برا جانتے ہیں اور اس لئے وہ روس کے مقابلہ میں ہٹلر کی طرفداری کو پسند کرتے ہیں۔

۶۔ انگلستان میں عام میلان لوگوں کا یہی ہے کہ گو جرمن مغلوب دشمن ہے لیکن ہے قابل عزت۔

۷۔ لیبر پارٹی میں بھی جماعتیں جرمن کی طرفدار ہیں۔

اس لئے اگر کسی وقت جرمن کے خلاف یورپ میں جنگ چھڑی تو یہ تمام اثرات ضرور اپنا کام کرینگے اور چونکہ ہٹلر یہ سمجھتا ہے کہ انگلستان کا نیوٹرل رہنا ناممکن نہیں ہے اس لئے اس کی ہمتیں بہت بڑھ گئی ہیں۔

جرمنی کے ساتھ انگلستان کی پالیسی کا رُخ ۳۵ء کے بحری معاہدہ سے ظاہر ہوجاتا ہے جس کی رو سے اگر جرمن اپنی فوجی طاقت بڑھا سکتا ہے تو دوسری طرف برطانیہ بھی اپنی ہوائی طاقت کو سہ چند کرسکتا ہے اور تجارت میں جرمن مسابقت کی طرف سے مطمئن ہوجاتا ہے۔

۱۴ء میں برطانیہ نے جرمنی کے خلاف محض فرانس یا بلجیم کی ہمدردی میں جنگ نہیں کی تھی، بلکہ سبب یہ تھا کہ دنیا کے بازاروں میں جرمنی نے انگلستان کو پیچھے ڈھکیل دیا تھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ انگلستان کی تجارتی کساد بازاری بڑھ گئی تھی اور بیکاروں کی تعداد میں بہت اضافہ ہوگیا تھا۔ اب یہی اندیشہ جاپان کی طرف سے پیدا ہوگیا ہے، لیکن انگلستان اس سے براہ راست جنگ نہیں کرنا چاہتا، اس لئے چاہتا ہے کہ جرمنی کو مضبوط کردیا جائے تاکہ جاپان اس کے ساتھ ملکر روس پر حملہ کرے اور اس طرح آخر کار یہ تینوں قوتیں کمزور ہوجائیں۔

اس میں شک نہیں کہ انگلستان بڑی حد تک جرمن کا طرفدار ہے، لیکن وہ جرمن کے خلاف اپنے آپ کو پوری طرح مسلح کرنے سے بھی غافل نہیں ہے، کیونکہ اسے اگر کسی کی طرف سے اندیشہ ہے تو وہ جرمنی ہی ہے، اسلئے برطانیہ کی خارجہ پالیسی کا صحیح علم اسوقت تک نہیں ہوسکتا جب تک اس کے مسلح ہونے کا زبردست پروگرام پورا نہیں ہوجاتا اب تو وہاں بحری قوت بڑھائی جارہی ہے، ہوائی طاقت پر بیدریغ دولت صرف ہورہی ہے، ہلاکت بار آلاتِ حرب پہ آنکھ بند کرکے روپیہ خرچ کیا جارہا ہے اور جب یہ سب کچھ ہوچکے گا تو معلوم ہوگا کہ انگلستان کا صحیح ارادہ کیا ہے اور وہ یورپ میں کس کو باقی رکھنا چاہتا ہے اور کس کو پامال کردینا۔

آمرِ جرمنی کی داستانِ عشق

یورپ کی موجودہ فضائے سیاست جن روشن اور تابناک ستاروں سے مزین ہے اس میں جرمنی کے آمرِ اعظم اڈالف ہر ہٹلر کی ذات خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہے اس کی سیاسی فراست نے اس کے نام کو "روم برلن محور" سے ہمیشہ کے لئے وابستہ کر دیا ہے جس کے زور پر اس نے دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈالکر رائن، اسٹریا اور زیکوسلوویکیا کے ایک حصہ کو اپنے قبضہ میں کر لیا۔ یہ ہٹلر کی شدید خود اعتمادی کی دلیل ہے کہ اس نے لوکارنو اور ورسیلز کے عہد ناموں کو پس پشت ڈالکر برطانیہ اور فرانس کے ہاتھوں سے وہ اقتدار چھین لیا جس کے دینے کے لئے وہ خوشی سے آمادہ نہ تھے اس طرح اِن دو جمہوری طاقتوں کا اثر زائل کرنے اور یورپ کے توازنِ ملکی کے برباد کرنے میں ہٹلر نے بڑی مدد دی ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ اس نے یہ جو کچھ حاصل کیا وہ اخلاقی اُصولوں کی قربانی کر کے حاصل کیا لیکن نازیت اور فسطائیت اخلاقی اُصولوں سے یکسر مبرّا ہیں، اُن کی کتابِ سیاست میں ایفائے وعدہ سے زیادہ عہد شکنی میں اخلاقی شان مضمر ہے، وہاں طریقۂ کار کے بجائے نتیجہ سے بحث ہوتی ہے اور آغاز سے زیادہ انجام پر زور دیا جاتا ہے یہ سب باتیں اپنی جگہ صحیح و درست سہی لیکن اس حقیقت سے بھی مشکل سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ ہٹلر نے جرمنی میں ایک حیات آفریں صور پھونک دیا ہے اس کے بچہ بچہ میں نئی روح اور نئی زندگی پیدا کر دی ہے۔ اب جرمنی ایک حقیقت ہے ایک صداقت ہے، اس کے معاشی و فوجی وسایل اور ذرایع بہت وسیع ہوگئے ہیں، اس کی ہوائی طاقت انگلستان و فرانس کی متحدہ طاقت سے کہیں زیادہ بہتر ہے اور یہ سب کچھ ایک شخص - یعنی ہر ہٹلر کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

ہٹلر اپنے عادات و خصائل کے لحاظ سے اتنا "سنگین" اور "آہنی" قسم کا انسان معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر اسکے اوپر خدنگِ عشق کا کوئی اثر ہو ہی نہیں سکتا اور ہمارے ذہن میں اس کے کسی سے محبت کرنے کا مفہوم آتا ہی نہیں، لیکن حسن و عشق کی دار و گیر عام ہے اور محبت کی جنوں زائیاں کسی خاص شخص، نوع، مقام اور وقت کے لئے مختص نہیں۔ محبت کے دیوتا نے "لوہے کے انسانوں" اور شاہانِ جم مرتبت سبھی کو جب چاہا ہے، نوازا ہے، دردِ محبت کی تقسیم میں خدائے عشق نے فقیر و امیر کی تخصیص قطعًا نہیں کی ہے، ہٹلر نے بھی نپولین کی طرح عشق

میں کافی شدت والتہاب کا ثبوت دیا ہے، اس کے بعض افسانہائے محبت اسی وجہ سے اپنے اندر کافی جاذبیت رکھتے ہیں، لیکن اس کی فنا دگی نے اس کے سیاہیانہ جذبات کو کبھی ماند نہیں ہونے دیا ہے۔

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہوتی ہیں، معمولی لوگوں کے کانوں تک اُن کی بھنک بھی نہیں پہونچتی، ڈیوک آف ونڈسر سابق ایڈورڈ ہشتم کی محبت کا ذکر انگلستان کے اخبارات میں بہت کم آیا، امریکن اخبارات البتہ اسکے اوپر ہنگامہ مچاتے رہے لیکن یہ تمام قصہ انگلستان کی پبلک کے سامنے کما حقہ اُسوقت آیا جبکہ وہ اپنی تمام نیاز مندیاں "ناز" کی خدمتمیں پیش کر چکے تھے اور ایک ہستی کی خاطر تاج وتخت کو پائے استحقار سے ٹھکرا چکے تھے، آمرین یورپ کی "پس پردہ" زندگی کا بھی ہمیں بہت تھوڑا علم ہے خصوصاً جرمنی کے مقابلہ میں ہماری "بے علمی" بڑی قابلِ رحم ہے، ہمیں جو کچھ وہاں کے حالات معلوم ہوئے ہیں وہ یا تو اُن خبروں کے ذریعہ جو جرمنی سے تار کے ذریعہ دوسرے ملکوں میں بھیجی جاتی ہیں یا پھر ہٹلر کی سوانحعمری کے ذریعہ، یا اُن سیاحوں کے ذریعہ جو تفریح کے طور پر یا وہاں کے حالات کا مطالعہ کرنے کے لئے جاتے ہیں، یہ خبریں عام طور پر گپ اور پروپیگنڈے کی حیثیت رکھتی ہیں اور حقایق تک پہونچنے کے لئے بڑی چھان بین کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن کچھ نامہ نگاروں نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر ان آمرین یورپ کے اندرونی حالات کی نقاب کشائی کی ہے، ان لوگوں میں فرڈمان جو ایک امریکن ہے اور جین جو فرانسیسی ہے خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں لیکن ہٹلر کے نجی معاملات کی پردہ کشائی جس نامہ نگار نے کی ہے وہ ایک عورت ہے اور وہ شہزادی کیتھرائن ریڈزی ول (Princess Catherine Radziwill.) کے نام سے مشہور ہے اس نے جو کچھ معلومات حاصل کی ہے وہ جرمنی اور آسٹریا کی اُن عورتوں سے حاصل کی ہے جو وہاں کی سوسائٹی میں بڑی مقتدر اور با اثر ہیں۔

ہٹلر کی سوانح عمری (Mein Kemp) عورتوں کے ذکر سے یکسر خالی ہے اس میں گویا عورتوں کے وجود ہی کو قطعاً تسلیم نہیں کیا گیا، لیکن بہت سی مثالیں اس کی شاہد ہیں اور بہت سے مواقع ایسے آئے ہیں کہ جب ہٹلر اس نتیجہ پر پہونچنے پہ مجبور ہوا ہے کہ عورت کائنات کی غیر ضروری تخلیق نہیں ہے اور اگر اسے دنیا سے علٰحدہ کر دیا جائے تو یہ کائنات عالم یکسر ویران و سنسان نظر آنے لگے۔

ہٹلر نے بہت سی محبتیں کی ہیں، شروع زمانہ میں جو لڑکی اس کے دل ودماغ پر مسلط رہی ہے وہ اسکی بھانجی "گریٹ رابل" (Grete Raubal) تھی، وہ شمالی آسٹریا کے دیہاتی علاقہ کی رہنے والی تھی، ہٹلر اسی زمانہ میں "بطل میونک" (Munich) سمجھا جاتا تھا اسی وجہ گریٹ بھی اس سے بہت محبت کرتی تھی اور اس کے حضور میں سراپا عبودیت بنی ہوئی تھی، ہٹلر کو بھی اس سے بیحد محبت تھی لیکن اس کی وجہ سے وہ کبھی اپنے معمولات میں فرق نہیں ڈالتا تھا، وہ اسے فرطِ محبت سے گیلی کہتا اور گریٹ اسے

"چچا اُلف" کہتی تھی، ہٹلر کو جب کبھی انتظامی اور جنگی مصروفیتوں سے مہلت ملتی وہ اپنا وقت گیلی کے پاس صرف کرتا اس نے اپنی ایسی بہت سی فرصتیں جب آسمان پر "ملکۂ عرش" بے نقاب ہوتی، تارے شبگیر ہوتے، چڑیاں زمزمہ صبحگاہی چھیڑتی ہوتیں اور موجیں اپنا ساز درست کرتی ہوتیں، اپنی محبوبہ گیلی کے ساتھ گذاریں دنیا نے ان سب باتوں کو دیکھا، لوگوں میں چہ میگوئیاں ہوئیں لیکن ہٹلر کے آگے کون دم مار سکتا تھا، وہ اب نازیوں کا "انسان اعظم" تھا اسے اس بات سے بیحد کوفت ہوئی کہ کوئی اس کی نجی زندگی سے کیوں واسطہ رکھے، یہ کسی کو نہیں معلوم کہ اس نے اس برہمی کا اظہار "گریٹ رابل" پر بھی کیا یا نہیں لیکن ہاں اتنا معلوم ہے کہ ۱۹۲۸ء کی ایک صبح کو گیلی نے خودکشی کرلی!

اس واقعہ کے بعد سے ہٹلر کے مزاج میں سختی پیدا ہوتی گئی، کیتھرائن نے لکھا ہے کہ گیلی کی خودکشی اسکے مزاج کی "آہنیت" کی بڑی حد تک ذمہ دار ہے۔ اس کے بعد سے اس کے لب و لہجہ کا کھرا پن اور اسکی طبیعت کی درشتگی بڑھ گئی لیکن ہٹلر نے گیلی کی موت کو بری طرح محسوس کیا اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے جرمنی کے سب سے بڑے نقاش "زیگ لر" کو حکم دیا کہ وہ گیلی کی ایسی تصویر بنا دے جو اس کے نام کو بقائے دوام بخش دے جب وہ تصویر بن کر آئی تو ہٹلر اسکے سامنے انتہائی عجز و نیاز کے ساتھ بے اختیارانہ جھک گیا اور جب اُٹھا تو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔

کچھ عرصہ کے بعد ہٹلر کو ایک سینما اسٹار رے نیٹ مُلر (Renate Muller) سے محبت ہوگئی، جنرل گوئرنگ نے ایک دعوت کی جس میں ہٹلر کی رے نیٹ سے ملاقات ہوئی جب دعوت ختم ہونے والی تھی اُسوقت گوئرنگ ہٹلر کو رے نیٹ کے ساتھ تنہا چھوڑ کر کمرہ سے باہر چلا گیا، معلوم نہیں دونوں میں کیا گفتگو ہوئی اور کن معاملات پر بحث ہوئی لیکن کچھ دنوں کے بعد اتنا ضرور سننے میں آیا کہ رے نیٹ ایک یہودی سے بڑی شدومد سے محبت کر رہی ہے اور یہ بات ہٹلر اور گوئرنگ دونوں کو سخت ناگوار ہے — گوئرنگ اور اس کے دوستوں نے رے نیٹ کو سمجھایا کہ وہ ایک یہودی سے محبت کرکے بڑی سخت غلطی کا ارتکاب کر رہی ہے انھوں نے اُسے یہ بھی بتلایا کہ یہ صورت خطرہ سے خالی نہیں، ری نیٹ یہ دیکھکر جرمنی سے باہر چلی گئی اور اُس یہودی سے شادی کرلی لیکن اسے جرمنی واپس آنے پر مجبور کیا گیا اور اس پر زور دیا گیا کہ وہ اپنے فلم کے ٹھیکے پورے کرے ورنہ اسے سزا دیجائے گی، جرمنی میں وہ بالکل "اشک دادخواہ" تھی سرتاپا مظلومیت کی تمثیل، آخر اس نے ان زیادتیوں سے تنگ آکر خودکشی کا ارادہ کیا اور ۵۰ فٹ کی بلندی سے کود پڑی لیکن عجیب اتفاق تھا کہ وہ مری نہیں، ڈاکٹروں کو اس کی زندگی کی پوری امید تھی لیکن وہ خود اپنی زندگی سے بیزار ہو چکی تھی، اب وہ زندہ رہتی بھی تو اس کے لئے بیکار تھا، آخر ایک دن اخباروں نے اعلان کردیا کہ ری نیٹ اس دنیا سے رخصت ہوگئی، اسوقت تیسری ریش (Reich) برسرِ اقتدار تھی — ہٹلر نے اسکے بعد ایک اور لڑکی سے محبت کی اس نے بھی گریٹ اور ری نیٹ کی طرح تاریخی اہمیت حاصل کرلی ہے — اسکی تیسری محبوبہ کا نام "لینی رفنستال" (Leni Riefenstall) ہے اور وہ ایک یہودی لڑکی ہے!! — وہ بویریا کی رہنے والی نہایت حسین و جمیل لڑکی ہے اور اس وقت جرمنی کی ممتاز ترین

ایکٹریسوں میں شمار کی جاتی ہے، اسی یہودی لڑکی اور آمرِ جرمنی میں نہایت شدید محبت ہے، ہٹلر اپنی خستگی دور کرنے کے لئے لینی (Lenie) ہی کے نرم و نازک ہاتھ کا متمنی رہتا ہے۔ ہٹلر اور ایک یہودی لڑکی سے محبت کرے! یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی، دنیا کو اس محبت پر حیرت ہے، وہ یہودیوں کے خون کا پیاسا ہے لیکن اسی مطعون قوم کے ایک فرد کے لئے وہ بیتاب ہے، یہ بات عام لوگوں کے لئے شدید استعجاب کا باعث ہے لیکن عشق و محبت کی دنیا میں سیاسی اور نسلی تعصبات حائل نہیں ہوتے۔ ایک مرتبہ گوئرنگ نے ہٹلر کو اس حرکت پر بہت ملامت کی، "آپ بہت ہی ناعاقبت اندیشی سے کام لے رہے ہیں۔ اس یہودی لڑکی کو چھوڑ دیئے، تمام سلطنت میں اس کی وجہ سے چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں" لیکن ہٹلر نے نہایت سختی کے ساتھ جواب دیا "گوئرنگ! میرے نجی معاملات تم سے کوئی سروکار نہیں رکھتے، اگر تم نہیں دخل دوگے تو بڑی گستاخی کروگے۔ اس بات کو ہمیشہ کیلئے گرہ میں باندھ لو"۔ گوئرنگ نے اسکے بعد دوسری ترکیب سوچی، اس نے لینی کو دھمکایا کہ وہ ہٹلر کا پیچھا چھوڑ دے اور اس کی محبت سے باز آجائے ورنہ اسکی زندگی کو ختم کر دیا جائے گا، ہٹلر کی محبوبہ بھلا کب دبنے والی تھی اس نے صاف صاف کہدیا کہ "گوئرنگ! تم یہ خبط اپنے دماغ سے نکال دو، تمہارا ایڈ ہیتہ ہے تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ"۔ لینی نے اسی وقت ٹیلیفون کیا اور کہا کہ ہٹلر فوراً یہاں آؤ، مجھے بڑا ضروری کام ہے۔ ہاں، اور وہ کام تمہارے لئے بھی ضروری ہے"۔ ہٹلر نے فوراً تعمیل کی، لینی (Lenie) اس کو دیکھتے ہی اسکی آغوش میں گر پڑی اور رونے لگی، اس نے آمرِ جرمنی کو ان تمام خطرات سے آگاہ کیا جو اس کی اور ہٹلر کی جان کے لئے پیدا ہو رہے تھے، ہٹلر نے اپنی بھاری آواز میں اس کو تسکین دیتے ہوئے کہا "لینی! مت گھبراؤ، مجھے اور تمھیں سوائے موت کے اور کوئی چیز علٰحدہ نہیں کر سکتی"۔ ہٹلر کی یہ محبت جاری ہے اور اس کی یہود دشمنی بھی اسی طرح برقرار ہے اس محبت کا انجام کسی کو نہیں معلوم اگرچہ سب لوگوں کو اس کا انتظار ہے، ممکن ہے یہ محبت کچھ تاریخی امکانات اپنے اندر پوشیدہ رکھتی ہو اور یہودیوں کے ساتھ وہ جانوروں کا سا سلوک، جو جرمنی کی سرزمین پر روا رکھا جا رہا ہے، کچھ کم ہو جائے، لیکن کوئی بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی۔ اس لئے کہ ابھی چودہ ہزار یہودی محض ایک سِروان راتھ کے قتل کے جرم میں گرفتار کئے ہیں ان کے تمام مدارس، معابد، اخبارات، رقص گاہیں تھیٹر اور سینما بند کر دئے گئے ہیں اور ان کے اوپر جیسا عرصۂ حیات آج جرمنی میں تنگ ہے اس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔

خواجہ احمد فاروقی، بی۔اے

فلسفۂ مذہب

باب الاستفسار

خضر ــــ کافر

(جناب سید علی رضا صاحب - دہلی)

یوسف رضا صاحب بدایونی کا ایک مقالہ جوشؔ پر آپ کے رسالہ میں شایع ہوا ہے، اس کے دوسرے حصہ میں انھوں نے بعض اعتراضات بھی کئے ہیں، منجملہ ان کے ایک یہ بھی ہے کہ خضر، نظر اور شرر کا ہم قافیہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ اصل لفظ خِضر یا خَضِر ہے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ کافر کو سخنور کا ہم قافیہ قرار دیا ہے، حالانکہ صحیح تلفظ اس کا کافِر ہے۔

آپ نے اپنی کوئی رائے ان اعتراضات کی بابت نہیں درج کی۔ براہ کرم مطلع فرمائیے کہ آپ کا فیصلہ اس باب میں کیا ہے۔

(نگار) خضر اور کافر دونوں عربی لفظ ہیں۔ خضر کے تلفظ دو ہیں۔ خِضْر بروزن مصر اور دوسرا خَضِر بروزن فعِل جس کے معنے ہیں سبز و شاداب کے، لیکن اس غیر معلوم ہستی کے لئے جس کا ذکر موسیٰ کے ذکر کے ساتھ کلام مجید میں آیا ہے اور جسے عوام پیغمبر بھی سمجھتے ہیں، خِضْر (بروزن فِعْل) اور خَضِر (بروزن فَعِل) دونوں کا استعمال ہوا ہے اس لئے میری رائے میں جوشؔ نے غلطی نہیں کی ہے۔

کافر کے تلفظ کو ہر شخص جانتا ہے کہ وہ بروزن کاہل ہے، لیکن اردو فارسی والوں نے کبھی کبھی بہ فتح فا بھی استعمال کیا ہے میری رائے میں اس سے اجتناب اولیٰ ہے، کیونکہ اس میں عامیانہ انداز زیادہ پایا جاتا ہے۔

یہود اور صیہونیت

(جناب اسداللہ خانصاحب - مرزا پور)

آجکل فلسطین میں یہودیوں کی وجہ سے ہنگامہ برپا ہے اور ہٹلر نے اپنے ملک سے ان کو نکالکر دنیا کی توجہ ان کی طرف پھیر دی ہے۔ اسی سلسلہ میں صیہونیت کا بھی بار بار ذکر آتا ہے۔ کیا آپ مہربانی فرماکر یہودیوں کی تاریخ کے متعلق مختصر الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں گے، نیز یہ کہ صیہونیت کیا چیز ہے

(نگار) یہود سامی النسل قوم ہے جو اسوقت تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ انگریزی میں انھیں (Jews) کہتے ہیں جس کے معنے ہیں (A man of judge) اسی کا مترادف (Hebrews) ہے۔ یہودیوں کی ابتدائی تاریخ توریت میں بیان کی گئی ہے، لیکن آثاری تحقیقات کی بنا پر اس میں بہت کچھ تغیر و تبدل ہوگیا ہے۔ اس قوم نے حضرت ابراہیم کی سیادت میں ۲۰۰۰ سال قبل مسیح عراق سے فلسطین ہجرت کی۔ اس کے ۵۰۰ سال بعد یہ اپنے مویشی لیکر مصر چلے گئے، یہاں ان کو سخت ایذائیں دی گئیں اس لئے حضرت موسیٰ کی سرکردگی میں یہ پھر وہاں سے پلٹے اور ۴۰ سال تک پہاڑوں اور جنگلوں میں آوارہ پھرتے رہے۔

جب یہ کنعان پہونچے جسے اب فلسطین کہتے ہیں تو یہاں کی قوموں کو انھوں نے مغلوب کیا اور پھر اسی سرزمین میں آباد ہوگئے جس کو صدیوں قبل یہ چھوڑ چکے تھے۔ انھوں نے اس حصۂ زمین کو اپنے بارہ قبایل کے درمیان تقسیم کرلیا جو یعقوب کے بیٹوں یا پوتوں کے نام سے موسوم تھے۔ اس وقت انکا کوئی بادشاہ نہ تھا بلکہ ہر قبیلہ کا ایک سردار ہوتا تھا جو سرپنچ کی حیثیت سے تمام انتظام کرتا تھا۔ لیکن بعد کو انھوں نے اپنا ایک بادشاہ تجویز کرلیا جس کا نام طالوت (Saul) تھا۔ طالوت کے بعد داؤدؑ بادشاہ ہوئے اور ان کے بعد سلیمانؑ۔ سلیمانؑ کے عہد میں انکی سلطنت بہت مالدار تھی اور انھیں کے زمانہ میں ہیکل یروشلم تعمیر کی گئی۔ سلیمان کی وفات کے بعد سلطنت دو حصوں میں منقسم ہوگئی، جنوب میں یہودا (Judah) کی اور شمال میں اسرائیل کی ان میں باہم سخت لڑائیاں ہوئیں یہاں تک کہ ۵۸۶ سال قبل مسیح یہودا کی اور ۷۲۱ سال قبل مسیح بنی اسرائیل کی سلطنت ختم ہوگئی اور اہل بابل یہودیوں کو غلاموں کی حیثیت سے گرفتار کرکے اپنے ملک لیگئے طویل زمانہ کے بعد یہ پھر واپس آئے اور حکومت شام کے تحت زندگی بسر کرنے لگے۔ شام میں اسوقت سلیوکس کی اولاد حکمراں تھی (یہ سکندر اعظم کا مشہور جنرل تھا)

بعد کو مکابیوس کی اولاد نے آزادی حاصل کرکے اپنے آپ کو حکمراں بنالیا۔ ۶۳ سال قبل مسیح یہودی رومہ کی

حکومت کے متعلق ہوگئے، چنانچہ ولادت مسیح کے وقت جو سب سے بڑے یہودی تھے یہ تمام علاقہ رومہ کی سلطنت میں شامل تھا۔

سنہ ۷۰ء میں شہنشاہ طیطوس نے ان کے معبد کو تباہ کیا اور ملک سے باہر کر دیا۔ اسی وقت یہودی چاروں طرف منتشر ہوگئے اور تقریباً ہر جگہ ان کے ساتھ بہت برا سلوک کیا گیا۔ انگلستان سے یہ بارھویں صدی میں نکالے گئے لیکن سترھویں صدی میں پھر واپس آنے کی اجازت دیدی گئی۔ اُنیسویں صدی میں ان کو برابر کے شہری حقوق بھی مل گئے (اس سے قبل نہ ان کو ملازمت ملتی تھی اور نہ مساویانہ حقوق دوسری آبادی کے مقابلہ میں ان کو حاصل تھے)

سنہ ۱۹۳۳ء میں سامی النسل لوگوں کے خلاف ایک عام تحریک جرمنی میں شروع ہوئی اور اس کا سبب ہٹلر نے یہ بتایا کہ ملک کی تجارت پر یہ پوری طرح قابض تھے اور اہل ملک کے حقوق تلف ہو رہے تھے، تجارت اور لین دین میں ان کی مہارت ہمیشہ سے ضرب المثل رہی ہے اور اس باب میں ان کی سنگدلی کے واقعات بہت مشہور ہیں، چنانچہ شائی لاک کے افسانہ سے تقریباً ہر شخص واقف ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ان میں بعض بڑے بڑے اہلِ کمال بھی پیدا ہوئے۔ مثلاً برگساں۔ ڈسرائیلی۔ آئنسٹین۔ ہین اور اسپنوزا وغیرہ۔

انیسویں صدی میں ایک جدید تحریک یہ پیدا ہوئی کہ یہودیوں کو اپنے اصلی وطن فلسطین میں بسنا چاہئے، اس تحریک کا نام (Zionism) ہے جسے عربی میں صیہونیت کہتے ہیں۔ زیون یا صیہون اصل میں اس پہاڑی کا نام ہے جو یروشلم میں پائی جاتی ہے اور اسی لئے مجازاً یہودیوں کو اہل صیہون کہتے ہیں۔ جب جنگِ عظیم کے بعد فلسطین ترکوں کے قبضہ سے نکل گیا تو یہ تحریک اور زیادہ قوی ہوگئی۔

سنہ ۱۹۱۷ء میں (Balfour Declaration) کے ذریعہ سے برطانیہ نے وعدہ کر لیا کہ یہودیوں کو فلسطین میں آباد کیا جائے گا۔ سنہ ۲۱ء میں اس مقصد کے لئے مستقل فنڈ قایم کیا گیا اور یہودیوں کی آمد فلسطین میں شروع ہوگئی۔ اس وقت دنیا میں ایک کروڑ پچاس لاکھ خالص یہودی پائے جاتے ہیں، لیکن یہودی خون اس سے بہت زیادہ لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ برطانیہ عظمیٰ میں تقریباً تین لاکھ یہودی آباد ہیں، لیکن ان میں وہ لوگ شامل ہیں جنھوں نے برائے نام عیسوی مذہب اختیار کر لیا ہے۔ یہ زیادہ تر شہروں ہی میں پائے جاتے ہیں اور بڑے وسیع پیمانہ پر مختلف قسم کے کاروبار کرتے ہیں۔ دولت کے لحاظ سے کوئی قوم ان کی ہمسر نہیں اور یہی وجہ انکے ساتھ رعایت کی ہے

ان کا مذہب یکسر رسم و رواج ہے اور حلال حرام کے جھگڑے ان کے یہاں بہت پائے جاتے ہیں، مسلمانوں نے بہت سی باتیں انھیں سے لی ہیں۔ ان کی تقویم بھی علحدہ ہے، ان کا سال اکتوبر سے شروع ہوتا ہے اور اسوقت ان کا سنہ ۵۶۹۸ ہے۔ ان کی لٹریری زبان عبرانی ہے اور بڑا وسیع لٹریچر اس زبان میں پایا جاتا ہے۔ جس زبان میں گفتگو کرتے ہیں اس کا نام یدیش ہے جس میں متعدد اخبارات شایع ہوتے ہیں۔

رازونیاز

(ایک شاعر اپنے حقیقی ماحول میں)

جب غم بے انتہا سے دل مرا گھبرا گیا
کسب فرحت کے لئے میں جانبِ دریا گیا

وقتِ شب تھا، خامشی کا دلنشیں ہنگام تھا
کارواں در کارواں طاری سکوتِ عام تھا

مل گئی تھی شورشِ عالم کو ہر غم سے نجات
ایک نقطہ پر سمٹ کر آ گئی تھی کائنات

چودھویں کے چاند کی رعنائیاں تھیں بے نقاب
کر رہی تھیں وسعتِ عالم میں تقسیم شباب

ساحلِ دریا تک آ کر رک گئے میرے قدم
فطرت بیدار تھی آمادۂ لطف و کرم

دیکھ کر آبِ رواں کو نغمہ ریز و نغمہ بار
ہو گیا حاصل مری آشفتہ حالی کو قرار

چاند کی سیمیں شعاعیں چھا رہی تھیں ہر طرف
مستیاں ہی مستیاں برسا رہی تھیں ہر طرف

منچلی ہر موج سے تھیں آئینہ سامانیاں
بڑھتی جاتی تھیں نگاہِ شوق کی حیرانیاں

ریت کے ذرّے چمکتے تھے ثریا کی طرح
تھا یہاں سب کچھ مرے خوابِ تمنّا کی طرح

اسقدر پُرکیف منظر بیشتر دیکھا نہ تھا،
دل جلے تسکین پا سکتے ہیں، میں سمجھا نہ تھا

کثرتِ جلوہ سے حاصل دل کو سرشاری ہوئی
رفتہ رفتہ روح پر اک محویت طاری ہوئی

سازِ دل آخر شعاعِ ماہ سے مل ہی گیا
میری اُمیدوں کا پژمردہ کنول کھل ہی گیا

کر دیا جذباتِ وارفتہ نے فطرت سے قریب
ہو گیا دل میرا انوارِ حقیقت سے قریب

نطق پیرائی عطا کی جذبۂ خاموش نے
کر دیا گویا مجھے کیفیتِ پُرجوش نے

موجِ دریا سے رہا تا دیر سرگرمِ کلام
کر لیا معلوم میں نے رازِ تسکینِ دوام

چاند اور تاروں سے کی میں نے مسلسل گفتگو
ہو گئی حاصل مجھے معراجِ کیفِ آرزو

رات بھر میخانۂ فطرت کی مے پیتا رہا
چاند کی کرنوں سے اپنے زخمِ دل سیتا رہا

چن لئے میں نے نئے جلوے حریمِ ناز سے
ذہن نے بیداریاں پائیں، نئے انداز سے

بارشِ الہام سے ذہنِ رسا تاباں ہوا
از سرِ نو زندگیِ عشق کا ساماں ہوا

الغرض جاری رہا تا صبح یہ راز و نیاز
ہو گئی آغوشِ فطرت میں محبت کی نماز

صبح کی آمد حیاتِ نو کا اک عنوان ہوئی
قسمت تاریک جاگی اور نور افشاں ہوئی

نبی احمد بریلوی

کسی کی تصویر سے

یہ کس کی شبیہ دلکش ہے - ہاں، یہ تو تمھاری صورت ہے!
یہ رنگ چڑھایا ہے کس نے - یہ کس کا خونِ محبت ہے!
یہ ہار پنھایا ہے کس نے - شاید یہ کسی کی حسرت ہے!

پاکیزہ نگاہیں کیا کہنا - معصوم تبسم کیا کہنا!
ان پیارے پیارے ہونٹھوں پر خاموش ترنم کیا کہنا!
الفاظِ خموشی میں بھی نیا اندازِ تکلم کیا کہنا!

تم شمع سے بڑھ کر روشن ہو - جلتے ہوئے پروانوں کی قسم!
صہبا سے زیادہ رنگیں ہو - چلتے ہوئے پیمانوں کی قسم!
پھولوں سے زیادہ دلکش ہو - فطرت کے گلستانوں کی قسم!

لو آؤ کہ اب میں تم سے کچھ اظہارِ حقیقت کرتا ہوں
یعنی کہ لبِ خاموش کو اب رسوائے شکایت کرتا ہوں
کچھ سہمے سہمے لفظوں میں تشریح محبت کرتا ہوں!!

ہم دونوں محبت کی بستی بچپن میں بسایا کرتے تھے
مٹی کے گھروندے دریا کے گھاٹوں میں بنایا کرتے تھے
ہم تم سے لڑکپن میں اکثر شادی بھی رچایا کرتے تھے!!

معصوم محبت سے ہم کو کچھ اُنس سا ہوتا جاتا تھا،
دل میٹھے میٹھے خوابوں میں راتوں کو کھوتا جاتا تھا،
تھی کچھ نہ خبر اور بیج کوئی الفت کے بوتا جاتا تھا!!

اچھا ہے میں تم سے مل نہ سکوں اچھا ہے کہ مجھ سے دور رہو
میں ملنے سے مجبور رہوں - تم ملنے سے مجبور رہو
تم دور رہو - یا پاس رہو آباد رہو مسرور رہو

سلام مچھلی شہری

وجدانیات وجد

(سکندر علی وجد)

آنکھوں سے عیاں ہے تری لے جانِ تمنا
چھپتا ہے کہیں خونِ شہیدانِ تمنا

اُلفت میں شکستوں پہ شکستیں ہوئیں لیکن
چھوٹا نہ کبھی ہاتھ سے دامانِ تمنا

اے یاس یہ شعلہ نفسی چھوڑ خدا را!
برباد نہ ہو جائے گلستانِ تمنا

آسائشِ دائم مجھے درکار ہے یارب!
بجھتی بھی نہیں شمعِ شبستانِ تمنا

ہے وجد عبث دعوۂ اخفائے محبت
آنکھوں میں سماتا نہیں طوفانِ تمنا

فیضِ اثر سے عشق کے دل کا عجیب رنگ ہے
دولتِ حُسن کے لئے سارے جہاں سے جنگ ہے

قوتِ سیل سے نہ ڈر، موج سے کھیل بے خطر
ساحلِ پُرسکوں مگر، تیرے لئے نہنگ ہے

موت ہے ایسی زندگی جس میں خلش نہیں کوئی،
کوئے جفاکشی میں جی، عرصۂ عیش تنگ ہے

خشمِ عدو ہے دلنواز، طرزِ ستم ہے مثلِ ناز
ہاں نگہِ زمانہ ساز میرے لئے خدنگ ہے!

دولتِ صبح و شام لے، وقت کی باگ تھام لے
دستِ جنوں سے کام لے، پائے خرد میں لنگ ہے

وجد یہ اہلِ گلستاں، آج یہ راز ہے عیاں
عشق سحابِ درفشاں، حسن سرابِ رنگ ہے

افکارِ کاوش

(کاوش حیدرآبادی)

کاٹی تمام عمر غمِ زندگی کے ساتھ
اپنی تو دو گھڑی بھی نہ گزری خوشی کے ساتھ

ڈرتا ہوں وضع کی ہو نہ کوئی نئی جفا
تم اور یہ التفات میری بیکسی کے ساتھ!

ساقی! تری نگاہ کے صدقے پلائے جا
وابستہ زندگی ہے اسی بیخودی کے ساتھ

اُن کی نگاہِ ناز نے لے لی متاعِ ہوش،
اپنی خوشی بھی ہو گئی اُن کی خوشی کے ساتھ

آنکھوں میں انتظار کا عالم لئے ہوئے
دنیا سے جا رہا ہوں میں کس بیکسی کے ساتھ

کاوش! کمالِ ضبط کا انجام کچھ نہ پوچھ
کیا جانے کتنے اشک ہیں میری ہنسی کے ساتھ

جذباتِ کیف

(کیفی چریا کوٹی)

جہاں اک اک قدم پر ہے متاعِ زندگی اپنی
کوئی کہدے کہ اُس کوچے سے ہم کیونکر گزر جائیں؟

کوئی مستوں سے آکر سیکھ لے آدابِ میخانہ
کہ بیخود ہوکے نکلیں اور سب سے بیخبر جائیں

لبوں پر، دم رُکا ہے رہ گرائے بزمِ امکاں کا
تمھارا حکم کیا ہے اب؟ بڑھیں ہم یا ٹھہر جائیں

ہوائے تندِ آزادی میں جانِ مضطرب گم ہے
نشیمن کی طرف جائیں تو میرے بال و پر جائیں

جسے منزل سمجھ کر چل پڑے تھے، وہ نہیں ملتی
اگر جائیں تو ہم اب کس طرف اے ہم سفر جائیں

لطافت، طرزِ خودبینی میں پیدا ہو نہیں سکتی
اڑے رُخ سے جو رنگِ زندگانی، ہم نکھر جائیں

گریباں گیر ایماں، کفر ہے دامن کشاں کیفی،
نگاہِ مست جس پر ڈال دیں وہ، ہم اُدھر جائیں

عذاب

(کاوش)

رات کی بزم ہے سکوت فروش
کروٹیں لے رہی ہے روحِ سروش

رقص تاروں میں ہے بحدِ جمال
حسن اور عشق میں ہے قیل و قال

ذوقِ سرمایہ دار ہے مسرور
گنگناتا ہے جذبۂ مغرور

ہنس رہے ہیں ایاغ عشرت رنگ
رو رہی ہے نگاہِ عسرت رنگ

سو رہا ہے سڑک پہ اک مزدور
گرسنہ، مضمحل، صبور و شکور

کیا بھیانک ہے منظرِ خوں ریز،
آج بھی ہیں زمانہ میں چنگیز

ایک پستی میں اک یہ اوجِ کمال
گُل ہے شمعِ دماغِ فکر و خیال

خون رو اے نگاہِ شعرِ حیات
جگمگا اے رہ خرامِ نجات

یہ ہمارے خدا کا ہے انصاف
فاقہ کش! جاگ!! یہ ہے وقتِ مصاف

ٹوٹ اے برقِ انقلابِ خراب
ابتو دیکھا نہ جائے گا یہ عذاب

حضور!

نقیہہ شہر کا تکرار و بحث شغل ہوا
تہی خمی سے ہے اب صوفیا کے دل کا سرور
گریز راہب بے چارہ کو جہان سے ہے
کلیم چھوڑ چکا آرزوئے جلوۂ طور
ازل کا نور ہے زیر نقاب خاک ابھی
تلاش کر نہ سکا اس کو فلسفی کا شعور
ہے شاعروں کے خموں میں فقط شراب دروغ
غزل سرا ہے، سو اپنی نوا سے بھی ہے نفور
حرم کے شیخ کو اپنا پتا بھی مل نہ سکا
عجم کے دیر نشیں کعبۂ جمال سے دور
کوئی سبو نہ کسی ہاتھ میں نظر آیا
کہ جس میں سوز محبت کی ہو شراب طہور

کسی کی آنکھ میں ایسی نظر نہیں باقی!
اثر سے جس کے ترے غیب میں عیاں ہو "حضور"

نعیم صدیقی

آیندہ جنوری ۳۹ء کا نگار

یعنی مصحفی نمبر طیار ہے

اور اپنی جامعیت کے لحاظ سے اردو شاعری کی تاریخ میں بالکل پہلی چیز ہے۔ مصحفی کا مرتبہ اسوقت تک لوگوں نے نہیں پہچانا اور اب بالکل پہلی مرتبہ آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ کیسی غیر معمولی ہستی تھا۔

مصحفی کے غیر مطبوعہ دواوین اور غیر مطبوعہ مثنویوں کا انتخاب۔ مصحفی کی غزلیات پر بالکل جدید اصول انتقاد کے لحاظ سے تفصیلی تبصرہ۔ مصحفی کے شاگردوں کے متعلق ایک عالمانہ ریسرچ۔ مصحفی کے تذکروں اور دیگر تصانیف پر ایک فاضلانہ انتقاد۔ اور اسی طرح کے بہت سے عنوانات پر بے مثل مضامین آپ کو اس نمبر میں نظر آئیں گے۔

ضخامت کا اندازہ ۲۰۰ صفحات کیا گیا ہے لیکن ممکن ہے اس سے بڑھ جائے۔ غیر خریداران نگار کے لئے اس نمبر کی قیمت دو روپیہ مقرر ہے۔ اگر آپ نگار کے خریدار ہیں تو خریداری کے سلسلہ کو جاری رکھئے تاکہ یہ نمبر آپ کو مل سکے۔

منیجر نگار لکھنؤ

وضعداری و بیدار مغزی

اس کی وضع داری اور پختگی انتظام کی دوسری مثال یہ ہے کہ ایک بار گرمی کے موسم میں شیخ عبد الغنی جونپوری بادشاہ سے ملنے آئے۔ ان کے لئے جو کھانا آیا اس میں موسم گرما کی وجہ سے شربت کے ۶ شیشے بھی موجود تھے۔ اس کے بعد اتفاق سے شیخ صاحب جاڑوں میں آئے۔ لیکن شربت کے قرابے اب بھی پیش کئے گئے ایک بار وہ جس طرح ایک آدمی سے ملتا پھر عمر گزر جاتی اسی طرح پیش آتا اور اس میں سر مو تفاوت نہ ہوتا

اس کی عدالت و بیدار مغزی کا یہ عالم تھا کہ ہر متدین شخص سلطنت کا اپنی جگہ پر مطمئن اور ہر خائن شخص ہر وقت لرزاں رہتا تھا اس طرح اس کی دیانت و سیر چشمی کی یہ کیفیت تھی کہ اگر دنیا کی ساری دولت اسکے سامنے رکھدی جاتی تو وہ خلافِ احکام مذہب اس پر نگاہ نہ کرتا۔

لشکر کا معمول

جب لشکر کو وہ کسی مہم پر روانہ کرتا تو روزانہ دو فرمان عسکر کے نام پہونچتے۔ ایک نماز صبح کے وقت جس میں اور ہدایتیں درج ہوتیں سرایوں میں گھوڑوں کی ڈاک ہر وقت طیار رہتی۔ اگر لشکر ۵۰۰ کوس پر بھی ہوتا تو بھی اس معمول میں فرق نہ آتا۔

ارزانی و خوشحالی

روز اس کے سامنے کل اشیاء کا نرخ نامہ اور سلطنت کے تمام حالات و واقعات کی رپورٹ پیش ہوتی اور وہ فوراً تحقیقات کا حکم دیتا اگر کوئی نامناسب بات اُسے نظر آتی۔ یہی انتظام تھا کہ اس کے عہد میں غلّہ اور تمام زندگی کی ضروری چیزیں بہت ارزاں تھیں اور قلیل آمدنی رکھنے والا بھی فراغت سے زندگی بسر کرتا تھا۔

قضاۃ و علماء کا تقرر

اس نے ایک قاضی کے علاوہ بارہ علماء بھی صرف مقدمات فیصلہ کرنے کے لئے مقرر کئے تھے اور ہ جاسوس متعین تھے، جو عدالت کی تمام خبریں روزانہ بادشاہ تک پہونچاتے تھے۔ دریا خاں وکیل کو حکم دیا تھا کہ عدالت کے اندر پہر رات گئے تک بیٹھا رہے، کیونکہ ممکن ہے اس وقت کوئی مستغیث آجائے علاوہ اس کے وہ بعض اہم مقدمات کی خود تحقیقات کرتا اور سلطنت کے انتظام پر آپ توجہ کرکے آئین مقرر کرتا اور رعایا کے امن و سکون کی تدابیر ہر وقت سوچتا رہتا

مخبر و جاسوس

اس غرض کے لئے اس نے کثرت سے مخبر و جاسوس مقرر کر رکھے تھے جو رعایا و حکام کے تمام حالات اس تک پہونچاتے تھے اور یہ انتظام اس قدر مکمل تھا کہ بسا اوقات لوگوں کی وہ باتیں جو انتہائی خلوت سے متعلق ہوتیں اس کو معلوم ہو جاتیں۔ چنانچہ عام طور سے لوگوں کا خیال تھا کہ سلطان کے قابو میں کوئی جن ہے جو تمام باتوں سے آگاہ کر دیتا ہے[1]۔

---

[1] طبقات اکبری - ۱۷۱ -

رسوخ و دانائی

وہ انصاف کرنے میں حد درجہ کاوش کرتا اور خاص فراست و دانائی سے کام لیکر حقیقت تک پہونچتا۔ چنانچہ صاحب طبقات اکبری نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ :۔

گوالیار کے دو غریب آدمی جو بھائی بھائی تھے مفلسی سے تنگ آکر فوج میں شامل ہوگئے۔ ایک لڑائی میں انھیں غارت کے سلسلہ میں دو لعل بھی مل گئے۔ ایک اس دولت پر قانع ہوکر واپس جانا چاہتا تھا اور دوسرا اس کے بعد بھی قسمت آزمائی پر مصر تھا۔ جب ایک بھائی گھر جانے لگا تو دوسرے بھائی نے لعل سپرد کرکے کہا کہ میری بیوی کو دیدینا۔ جب یہ گوالیار واپس آیا تو اس نے اور چیزیں تو دیدیں لیکن لعل نہ دیا۔ جب مالک واپس آیا تو اس نے اپنی بیوی سے استفسار کیا۔ اس نے انکار کیا۔ الغرض یہ معاملہ میاں بھورا[1] تک پہونچا جو دربار سکندر لودی کے امراء کبار میں سے تھے اور وہاں کے میر عدل بھی تھے انھوں نے گواہ طلب کئے۔ خائن بھائی نے ایک قمار خانہ سے دو جھوٹے گواہ پیش کردئے، اور میاں بھورا نے ان گواہوں پر اعتبار کرکے فیصلہ کردیا کہ "لعل بیوی سے وصول کرلینا چاہئے"۔ یہ غریب بہت پریشان ہوئی اور سیدھی آگرہ جاکر بادشاہ کی خدمت میں پہونچی۔ بادشاہ نے فریقین اور گواہوں کو طلب کیا۔ یہاں بھی وہی صورت پیش آئی۔ بادشاہ کو یقین تھا کہ لعل اُس عورت کو نہیں دیا گیا۔ لیکن گواہوں کی موجودگی میں وہ کوئی خلاف حکم نہ دے سکتا تھا آخرکار اس نے سوچ کر گواہوں سے پوچھا کہ جب تمھارے سامنے اس عورت کو لعل دیا گیا ہے تو تم نے اسے ضرور دیکھا ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ ہاں ہم نے دیکھا تھا۔ یہ سنکر بادشاہ نے موم کا ایک ٹکڑا ان دونوں کو دیا اور کہا کہ جاؤ الگ الگ اس لعل کی صورت و مقدار موم کے ذریعہ سے ظاہر کرو۔ جب یہ دونوں بناکر لائے تو ایک کا بنایا ہوا نمونہ دوسرے کے نمونہ سے بالکل مختلف تھا اور لعل کی ہیئت و صورت سے کوئی مناسبت نہ تھی بادشاہ نے گواہوں کو دھمکایا اور انھوں نے سارا حال بیان کردیا جس سے حقیقت واضح ہوگئی[2]۔

انصاف و رعایا

انصاف کے باب میں وہ ضعیف اور قوی کو بالکل برابر سمجھتا اور کسی کی رعایت نہ کرتا۔ ایک بار کسی سید نے شکایت پیش کی کہ میاں ملک جاگیردار نے اس کی زمین چھین لی ہے۔ بادشاہ نے میاں بھورہ کو تحقیقات کا حکم دیا لیکن اس مسئلہ میں کچھ ایسے نزاعات پیش آگئے کہ دو ماہ تک فیصلہ نہ ہوسکا۔ بادشاہ نے میاں بھورہ کو بلاکر کہا کہ کیوں ابتک فیصلہ نہیں ہوسکا۔ آج اُس وقت تک عدالت گاہ سے کوئی نہ جائے جب تک یہ معاملہ طے نہ ہوجائے۔ چنانچہ تمام علماء تین پہر رات گئے تک بیٹھے رہے اور اسی وقت بادشاہ کو نتیجہ سے اطلاع دی گئی جو مستغیث سید کے حق میں تھا۔ بادشاہ نے میاں ملک جاگیر کو بلاکر دریافت کیا کہ کیوں تم نے میرے خلاف حکم ظلم کیا اور وظائف و املاک کی زمین تم نے کیوں چھینی۔

---

[1] اس نام میں اختلاف ہے بعض مورخین نے بھوہ اور بعض نے بھورا لکھا ہے۔ [2] طبقات اکبری۔ ۱۷۲۔ فرشتہ ۱۸۹۔

میاں ملک نے منفعل ہو کر اعتراف جرم کیا۔ بادشاہ نے اس سے تین بار سب کے سامنے اعتراف جرم کرا کے نادم کیا اور پھر کبھی اس کو کوئی جاگیر نہ دی[1]

وہ فطرتاً بے انتہا سیر چشم واقع ہوا تھا۔ ایک بار سنبھل کے ضلع میں کسی شخص کو زمین سے ۵۰۰۰ اشرفیوں کا دفینہ مل گیا۔ لیکن میاں قاسم حاکم سنبھل نے اس سے لے لیا۔ اس نے بادشاہ کی خدمت میں درخواست روانہ کی۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ فوراً دفینہ پانے والے کو واپس دیا جائے۔

حاکم سنبھل نے عرضداشت روانہ کی کہ اتنی بڑی رقم پانے کا یہ شخص مستحق نہیں ہے۔

بادشاہ نے ایک فرمان اس کے پاس بھیجا کہ "اے بیوقوف جس نے اس کو یہ دفینہ عطا کیا ہے وہ بہتر جاننے والا ہے اگر یہ شخص مستحق نہ ہوتا تو وہ کیوں دیتا۔ ہم لوگ سب خدا کے بندے ہیں اور وہی بہتر جانتا ہے کہ ہم میں سے کون کس چیز کا مستحق ہے"۔

اسی طرح ایک بار اجودھن میں ایک درویش شیخ محمد کے کھیت میں بہت بڑا دفینہ برآمد ہوا اس میں کچھ طلائی برتن ایسے بھی تھے جن پر سکندر کی مہر ثبت تھی۔ علی خاں حاکم لاہور و دیپال پور نے شیخ کو لکھا کہ یہ دفینہ میرے حدود حکومت کے اندر سے برآمد ہوا ہے اس لئے میرے پاس بھیجدو۔ شیخ نے انکار کیا اس پر علی خاں نے بادشاہ کو اطلاع دی کہ:۔

"اجودھن میں شیخ محمد کو شاہی خزانہ دستیاب ہوا ہے"۔

بادشاہ نے اس کے جواب میں صرف یہ لکھدیا کہ:۔

"تم کو اس سے کیا واسطہ ہے اور تم کیوں شیخ محمد کے حالات سے اعتناء کرتے ہو"

اس کے بعد شیخ محمد نے کچھ طلائی برتن بادشاہ کی خدمت میں روانہ کئے۔ لیکن اس نے واپس کردئے اور کہا کہ:۔

"تمھیں رکھو، ہمیں تمھیں سب کو خدا کے سامنے اپنے اپنے اعمال کی جوابدہی کرنا ہے"[2]

یہ واقعہ تاریخ سلاطین افاغنہ اور واقعات مشتاقی[3] میں بھی درج ہے۔

اگر وہ کسی کو جاگیر عطا کردیتا اور پھر کسی سبب سے اس کی آمدنی بڑھ جاتی تو مطلقاً پرواہ نہ کرتا۔

---

[1] تاریخ داؤدی (الیٹ) ۴-۴۵۴۔ [2] تاریخ داؤدی (الیٹ) ۴-۵۲ ۴-۵۳ ۴-

[3] واقعات مشتاقی کا مصنف شیخ رزق اللہ مشتاقی تھا۔ یہ ۸۹۷ھ میں پیدا ہوا اور ۹۸۹ھ میں اس کا انتقال ہوا مخزن افغانی میں اس کو صرف مولانا مشتاقی لکھا ہے۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۶۲ پر ملاحظہ ہو)

ایک بار اس نے ملک بدرالدین کا وظیفہ سات لاکھ تنکہ مقرر کرکے ایک پرگنہ تفویض کر دیا۔ پہلے ہی سال اسکی آمدنی ۹ لاکھ تنکہ ہوگئی اس نے بادشاہ سے عرض کیا کہ "زاید دو لاکھ کی بابت کیا حکم ہوتا ہے" بادشاہ نے کہا کہ:۔ "تم رکھ لو"۔ دوسرے سال گیارہ لاکھ آمدنی ہوئی اور بادشاہ نے پھر یہی حکم دیا تیسرے سال آمدنی پندرہ لاکھ ہوگئی اس نے پھر عرض کیا۔ بادشاہ نے کہا۔ "جاگیر تمھاری ہے اس لئے اس کی آمدنی بھی صرف تمھاری ہی ہو سکتی ہے مجھ سے کیوں بار بار ذکر کرتے ہو؟"[1]

چونکہ خود بادشاہ کی نیت ایسی اچھی تھی اس لئے تمام امرار وجاگیر دار بھی ایسے ہی دیانت دار وامین تھے۔

شیر شاہ سوری کی رعایا پروری

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۶۱)

اس کے باپ کا نام شیخ سعد اللہ تھا۔ مولانا مشتاقی کو کمسنی سے علما کی صحبت کا بہت شوق تھا اور اس طرح اس نے بہت فایدہ اُٹھایا۔ جو کچھ واقعات وحالات گزشتہ زمانہ کے اس کو علما و مشائخ کے ذریعہ سے معلوم ہوتے تھے وہ لوگوں کے سامنے بیان کرتا تھا۔ آخر کار اس کے احباب نے مجبور کیا کہ وہ ان تمام حالات کو قلمبند کرے چنانچہ اس نے اپنے تمام تاریخی معلومات وتحقیقات کو یکجا فراہم کر دیا اور اس کا نام واقعات مشتاقی رکھا۔

مولانا عبدالحق نے اپنے تاریخ حقی اور شیخ نور الحق (عبدالحق کے بیٹے) نے اپنی زبدۃ التواریخ میں مولانا مشتاقی کی نسبت لکھا ہے کہ وہ بہت بڑے سیاح تھے انھوں نے اپنے عصر کے بڑے بڑے علما، مشائخ اور صاحبان فضل وکمال کی صحبت سے فایدہ اٹھایا وہ خود بھی بڑے فاضل شخص تھے اور علم تصوف سے خاص ذوق رکھتے تھے۔ فارسی میں ان کا تخلص مشتاق اور ہندی میں راجن تھا ہندی زبان کے بہت بڑے ماہر تھے۔ ان کی تصنیف "پیما بن جوب نرنجن" اور دیگر رسایل ہندی زبان میں بہت مشہور ہیں۔

مولانا مشتاقی کے آٹھ بھائی تھے جو سب کے سب قابل تھے۔ ان کا دادا شیخ فیروز علاوہ صاحب سیف ہونے کے مشہور اہل قلم بھی تھا۔ اس نے سلطان بہلول اور سلطان حسین شرقی کی باہمی جنگ کا حال ایک طویل نظم میں تحریر کیا تھا جو مولانا عبدالحق کے پاس تھی لیکن بعد کو گم ہوگئی۔ شیخ فیروز کا انتقال ۸۶۰ھ میں ہوا۔

واقعات مشتاقی میں سلطان بہلول لودھی سے ابتدا کی گئی ہے اور سلسلہ وار عہد اکبری کے حالات لکھ کر شیر شاہ اسلام شاہ سلطان محمود عدلی، غیاث الدین خلجی (مالوہ) اور سلطان مظفر شاہ (گجرات) کے حالات پر یہ کتاب ختم ہو جاتی ہے۔

یہ کتاب نایاب ہے اور صرف دو نسخے اس وقت اس کے موجود ہیں۔ ایک مسٹر ایلیٹ کے پاس تھا جس سے انھوں نے فایدہ اٹھایا دوسرا لکھنؤ کے کتب خانہ موتی محل میں۔

[1] تاریخ داؤدی (ایلیٹ) ۴ - ۴۷۵م -

جاگیر مقرر کرنے کے بعد وہ کبھی اس میں تغیر نہ کرتا لیکن اسوقت کہ اگر کسی جاگیر دار پر کوئی قصور ثابت ہو جائے تو اس صورت میں اس کی جاگیر لے لیتا۔ لیکن اس کی توقیر و عزت میں کمی نہ کرتا۔

وہ حرص و طمع کے جذبات سے بالکل ناواقف تھا اور ہمیشہ ایسے جرموں میں جن کا تعلق سلطنت کی آمدنی سے ہوتا بہت نرمی سے کام لیتا۔ جشن عید اور ۱۲ ربیع الاول[1] کو قیدیوں کی فہرست اس کے سامنے پیش کی جاتی اور بقایائے مالگذاری کے سبب سے جتنے لوگ قید ہوتے سب کو رہا کر دیتا۔

مذہب کی طرف بہت غلو تھا اور چاہتا تھا کہ کوئی کام خلاف شریعت اس کی سلطنت میں نظر نہ آئے۔ چنانچہ اسنے اسی سلسلہ میں حکم نافذ کر دیا کہ مزاروں پر عورتوں کا جانا اور سالانہ سالار مسعود کی چھڑیاں نکالنا ممنوع قرار دیا جائے مولانا مشتاقی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تعزیہ داری اور سیتلا کی پوجا کو بھی اس نے روک دیا تھا۔

اس نے کثرت سے مساجد تعمیر کرائیں اور ہر مسجد میں ایک واعظ ایک قاری اور ایک جاروب کش مقرر کیا جن کو ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ موسم سرما میں محتاجوں کو کثرت سے کپڑے اور شالیں تقسیم کی جاتیں اور ہر جمعہ کو ایک مقررہ رقم غربا کو تقسیم کی جاتی۔ رمضان اور ربیع الاول کے مہینوں میں مساکین و مستحقین کو بیدریغ روپیہ دیتا۔

اس نے حکم دے رکھا تھا کہ ہر ششماہی پر سلطنت کے تمام غربا و مساکین کی فہرست پیش کی جائے جب یہ فہرست پیش ہوتی تو وہ اُن کو اس قدر روپیہ دیتا کہ ۶ ماہ کے لئے کافی ہو جاتا۔ علاوہ اس کے مختلف شہروں میں مدِ خیرات کے متعلق بہت سے مہتمم مقرر تھے جو غریبوں اور محتاجوں کا حال معلوم کر کے بادشاہ تک خبر پہونچاتے اور خزانہ شاہی سے روپیہ لیکر انھیں تقسیم کرتے[2]۔

چونکہ بادشاہ کو اس طرف بہت توجہ تھی اس لئے تمام امراء اراکین، خوانین و ملوک نے بھی غربا و مساکین کے وظائف مقرر کر رکھے تھے۔ چنانچہ واقعات مشتاقی میں لکھا ہے کہ اس داد و دہش کا نتیجہ تھا کہ اگر کوئی فقیر مر جاتا تو اس کے پاس سے کافی دولت نکلتی جو اس کے اعزہ کو دیجاتی اور اگر کوئی عزیز نہ ہوتا تو پھر فقراء کو تقسیم کر دیجاتی۔

اس کے عہد میں زراعت کثرت سے ہوتی تھی۔ چیزیں بہت ارزاں تھیں تاجر خوش حال تھے اور تمام اہل پیشہ اپنے اپنے مشاغل میں نہایت اطمینان کے ساتھ مصروف نظر آتے تھے۔ سلطنت میں کہیں چوروں اور رہزنوں کا پتہ نہ تھا اور قافلے نہایت امن و سکون کے ساتھ رات دن سفر کیا کرتے تھے۔ سکندر شاہ کو مغربی مورخین نے عام طور سے حد درجہ متعصب ظاہر کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ مذہب اسلام کا پابند تھا لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ ہندوؤں کی رواداری نہیں کرتا تھا بالکل غلط ہے۔ اس کا مقصود یہ تھا کہ جو عنداللہ حق ہے وہی کیا جائے۔ چنانچہ جس زمانہ میں

---

[1] رسول اللہؐ کی تاریخ رحلت — [2] تاریخ داؤدی (ایلیٹ) ۴ - ۴۶۴ -

وہ اپنے بھائی باربک شاہ سے لڑ رہا تھا ایک قلندر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس سے کہا کہ "فتح تیری ہے" بادشاہ نے جھنجھلا کر ہاتھ الگ کر لیا اور جواب دیا کہ "دعا یہ کرنی چاہئے کہ اللہ اُس کو فتح دے جو حق پر ہے اور وہی ظہور میں آئے جو بہتر و مناسب ہو"

رواداری

قبل تخت نشینی کے ایک بار سکندر کو معلوم ہوا کہ تھانیسر میں ایک گاؤں ہے۔ وہاں کے ایک تالاب میں ہندو جمع ہو کر اشنان کرتے ہیں اس نے علماء سے استصواب کیا۔ میاں عبداللہ اجودھنی نے جو بڑے جید عالم تھے کہا کہ

"ہندوؤں کے کسی قدیم معبد کو غارت کرنا یا اُن کی کسی مذہبی رسم سے تعرض کرنا مناسب نہیں ہے"

سکندر نے یہ سُن کر کچھ نہیں کہا اور اپنے خیال سے باز آ گیا[۱]

علم دوستی

وہ ان تمام صفات کے ساتھ علم دوست بھی اس درجہ کا تھا کہ اس کے عہد میں آگرہ (جو اس کا دارالحکومت تھا) علماء و فضلاء، مشائخ و صوفیہ شعراء و ادباء کا مرکز ہو گیا تھا۔ فارس و عرب، ہند و بخارا کے تمام صاحبان کمال کھنچ کھنچ کر آگرہ چلے آ رہے تھے اور بادشاہ کی فیاضیوں سے مالا مال نظر آتے تھے۔

مذہبی مباحث

مذہبی مباحث کا اُسے بہت شوق تھا اور اکثر علماء کو جمع کر کے وہ ان کی گفتگو سنا کرتا تھا۔ ایک بار جب بودھن نامی ایک برہمن نے یہ دعوے کیا کہ تمام مذاہب برابر ہیں تو سکندر شاہ نے بہت سے مقتدر علماء[۲] کو حکم دیا کہ وہ اس سے بحث کریں۔

ذوق شعر و شاعری

شعر و سخن کا بھی اُسے ذوق تھا گل رخ اس کا تخلص تھا کبھی کبھی شعر کہتا تھا[۳] اور شیخ جمال کنبوہ[۴] سے جو بڑے پایہ کا شاعر تھا اصلاح لیا کرتا تھا۔

---

[۱] تاریخ فرشتہ ۱۸۶، تاریخ داؤدی (ایلیٹ) ۴-۴۳۹ — [۲] ان علماء کی فہرست حسب روایت فرشتہ یہ تھی۔ میاں قادر بن شیخ خواجو۔ میاں عبداللہ۔ سید محمد بن سعید خاں دہلوی۔ ملا قطب الدین و ملا الہ داد صالح سرہندی۔ سید امان۔ سید برہان۔ سید احسن قنوجی۔ سید صدر الدین۔ میاں عبدالرحمن۔ میاں عبدالعزیز سنبھلی (فرشتہ ۱۸۲) — [۳] ملائے بدایونی نے یہ غزل اسکی منتخب التواریخ میں درج کی ہے۔

سروے کہ سمن پیرہن و گل بدن استش — روحے ست مجسم کہ دراں پیرہن استش
مشک ختن چیست کہ صد مملکت چین — در حلقہ آں زلف شکن در شکن استش
در سوزن مژگاں کشم رشتۂ جاں را — تا چاک بدوزم کہ دراں پیرہن استش
گل رخ چہ کند جوہر دنداں ترا وصف — ہیچوں در سیراب سخن در دہن استش

[۴] عہد سکندر شاہ میں شیخ جمال بڑا مشہور شاعر تھا اور بادشاہ اس سے بہت مانوس تھا اور مشورہ بھی لیا کرتا تھا۔ شیخ جمال کا یہ ایک شعر فرشتہ اور ملائے بدایونی نے نقل کیا ہے ؎
ما را ز خاک کویت پیراہنے ست بر تن — آنہم ز آب دیدہ صد چاک تا بدامن
سیر العارفین اسی کی تصنیف ہے اور اس کا ایک دیوان بھی ۹ ہزار سے زائد اشعار کا تھا۔

اس کی صحبت میں علماء کے ساتھ شعرا بھی رہا کرتے تھے ان میں سے ایک ڈونگر برہمن بھی تھا جو عربی و فارسی کا عالم ہونے کے علاوہ شاعر بھی اچھا تھا۔

ملا بدایونی، عہد سکندری کے بعض مقتدر علماء کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:-

شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ بڑے پایہ کے فاضل تھے۔ جب ملتان تباہ ہوا تو دہلی کی طرف آئے اور چالیس علماء (مثلاً جمال خاں دہلوی، شیخ لودی سید جلال الدین بدایونی وغیرہ) شیخ عبداللہ کی درگاہ سے نکل کر اشاعت علوم کا باعث ہوئے۔ ہندوستان میں علوم معقولی کا رواج شیخ عبداللہ کے وقت سے ہوا ورنہ اس سے قبل علم منطق و کلام میں صرف شرح شمسیہ اور شرح صحائف پڑھائی جاتی تھیں۔

سکندر شاہ، مولانا شیخ عبداللہ کا حد درجہ احترام کرتا تھا جب کبھی درس کے وقت پہونچتا تو پوشیدہ طور سے کسی کونہ میں جاکر بیٹھ جاتا۔ تاکہ درس و تدریس میں حرج واقع نہ ہو جب وہ فارغ ہو جاتے تو بادشاہ سلام علیک کہہ کر سامنے آجاتا۔

شیخ عزیز اللہ کے استحضار علوم کا یہ حال تھا کہ مشکل سی مشکل کتاب زبانی پڑھاتے تھے، انھیں کے شاگردوں میں میاں قاسم سنبھلی تھے۔

اسی عصر کے ایک اور زبردست عالم شیخ الہ دیا بھی تھے جنھوں نے ہدایہ کی شرح کئی جلدیں تحریر کی ہے علاوہ اس کے تفسیر مدارک پر اُن کے حواشی اور شرح کافیہ کافی شہرت رکھتے ہیں اس زمانہ میں ان کی یہ تمام کتابیں درسیات میں داخل تھیں۔

ایک بار سلطان سکندر نے تمام علماء کو جمع کر کے ایک جانب شیخ عبداللہ[1] اور شیخ عزیز کو، دوسری جانب شیخ الہ دیا اور اُن کے بیٹے بھکاری کو کر کے مباحثہ سنا اور آخر کار یہ فیصلہ ہوا کہ وہ دونوں تقریر میں اور یہ دونوں تحریر میں اپنا جواب نہیں رکھتے[2]۔

الغرض سکندر شاہ کے دربار میں ہر وقت علمی چرچے ہوا کرتا تھا اور یہ فخر اس بادشاہ کو حاصل ہے کہ اس کے عہد میں سب سے پہلے ہندؤں نے فارسی کی طرف توجہ کی اور مسلمانوں کے علوم حاصل کرنے شروع کئے[3]۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندو مسلمانوں کے درمیان کافی تعلقات قایم ہو گئے تھے اور وہ ایک دوسرے کی زبان کو نہایت شوق سے حاصل کرتے تھے۔ مسٹر بلاک مین کلکتہ ریویو میں ظاہر کرتے ہیں کہ "ہندؤں نے

لہ شیخ عبداللہ کا انتقال ۹۲۲ھ میں ہوا ـــــ ۲ منتخب التواریخ - ۸۶ -

۳) Cal. Review ol.-(Keen's Mediaeval India, Cal. Review CIV LXXIX P. 71

سولھویں صدی عیسوی سے فارسی کی طرف ایسی توجہ کی کہ ایک صدی گزرنے سے قبل وہ اس زبان میں مسلمانوں کے برابر ہوگئے"

ہندو اور فارسی زبان

اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ہندو مسلمانوں کے تعلقات میں زیادہ اتحاد پیدا ہوگیا تھا اور دوسرے یہ کہ سکندر لودی نے قصداً ہندؤں میں یہ مذاق پیدا کیا تاکہ انھیں سلطنت میں انتظامی عہدے دئے جائیں۔ چنانچہ جب فارسی خوان ہندؤں کی ضرورت ہوئی تو اس نے پہلے برہمنوں سے درخواست کی کہ فارسی سیکھیں۔ انھوں نے انکار کیا تو چھتریوں سے کہا گیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم اہلِ سیف ہیں اہل قلم بننا پسند نہیں کرتے۔ اس کے بعد ویش طبقہ کو توجہ دلائی گئی لیکن اس نے تجارت پیشہ ہونے کی وجہ سے عذر کیا آخر کار کایستھوں نے اسے قبول کیا اور قلیل زمانہ میں ایسی دستگاہ حاصل کرلی کہ وہ مسلمانوں کے علوم کا درس دینے لگے اور سلطنت میں بڑے بڑے عہدے ان کو ملے۔

تصانیف

سلطان سکندر کے عہد میں تصانیف کثرت سے ہوئیں۔ جن میں خود بادشاہ اور اس کے امراء کا ذوق علمی بہت کچھ شامل تھا۔ تاریخ داؤدی میں لکھا ہے کہ ارکر مہا ویدک جو فن طب کے متعلق سنسکرت کی مشہور کتاب تھی۔ فارسی زبان میں طبِ سکندری کے نام سے ترجمہ کی گئی اور بعد کو اطبارِ ہند نے اس سے بہت فایدہ اٹھایا۔[1]

دیگر فنون

بادشاہ کو دیگر فنون وصناعات کے علاوہ جن کے کارخانہ کثرت سے قایم تھے۔ موسیقی کا بھی بہت ذوق تھا

ذوقِ موسیقی

وہ دربارِ عام میں تو کبھی گانا سننا پسند نہ کرتا تھا لیکن تنہائی میں اہل موسیقی کو اپنا کمال ظاہر کرنے کی اجازت دیتا اس وقت صرف سید روح اللہ اور سید ابن رسول جو مقربانِ خصوصی میں سے تھے، اس کے خیمہ کے قریب ہوتے اُسے سُرنا اور شہنائی کا بھی شوق تھا۔ جو دربار میں ۹ بجے شب تک بجائی جاتی تھی۔ بادشاہ کا حکم تھا کہ صرف چار راگنیاں مالی کور، (غالباً مالکوس) کلیان۔ کانڑا اور حسینی بجائی جائیں۔[2]

---

[1] واقعات مشتاقی کا مصنف اس کتاب کے متعلق لکھتا ہے کہ "میاں بودہ نے جو خواص خاں کے جانشین ہوئے تھے خراسان سے بہت سی کتابیں فراہم کیں اور تمام علماءِ ہند و ایران کو طلب کرکے طبِ سکندری کو مرتب کرایا تھا۔

میاں بودہ بڑا علم دوست امیر تھا۔ بڑے بڑے اہل کمال اس کے دربار میں موجود رہتے تھے اور یہ اُن سے مختلف فنون پر کتابیں تصنیف کرایا کرتا تھا

[2] یہ بیان تاریخ داؤدی کا ہے۔ واقعاتِ مشتاقی میں ان چار راگنیوں کا نام گورا، کلیان، کانڑا، مقام حسینی تحریر کیا ہے۔ احمد یادگار (مصنف سلاطین افاغنہ) بیان کرتا ہے کہ بادشاہ کے چار غلام تھے جو موسیقی کے ماہر تھے ایک چنگ نہایت خوب بجاتا تھا دوسرا قانون، تیسرا طنبورہ کا ماہر تھا اور چوتھا بین کا۔ یہ غلام حسن صورت کے لحاظ سے بھی بے مثل تھے۔

عمارت کی طرف توجہ

عمارات کی طرف بھی اسے خاص توجہ تھی چنانچہ جب وہ مہم بلکھات سے کامیاب واپس آیا تو اس نے حکم دیا کہ دارالحکومت آگرہ سے لیکر دھولپور تک جابجا باغات اور مکانات تعمیر کرائے جائیں تاکہ شکار سے واپس آنے کے بعد یہاں توقف کیا جائے۔[1]

آگرہ کی ترقی

پھر علاوہ اس کے خود آگرہ کی رونق و ترقی، جس کو اس نے اک معمولی گاؤں سے بڑے شہر میں تبدیل کر دیا تھا، اسکے ذوقِ تعمیر، آرائشِ شہر و اُمور رفاہِ عام کا کافی ثبوت ہے۔

مخصوص امرا

یہ خصوصیت بھی اسی بادشاہ کو حاصل ہوئی کہ اس کے عہد میں ایسے ایسے امراء گزرے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے خصایل و عادات اپنے اخلاق و شایستگی، اپنے علم پرستی و ہنر پروری کے لحاظ سے ایک مستقل تصنیف چاہتا ہے۔
چنانچہ تاریخ داؤدی اور واقعات مشتاقی میں بعض امراء کے مفصل حالات درج ہیں۔
ان میں سے خاص امراء یہ تھے:۔ اسد خاں[2] ابن مبارک خاں یوسف خیل۔ خان جہاں لودی[3] جسے سند علی حسین خاں کہتے تھے۔ میاں زین الدین[4]۔ خواص خاں[5] اور میاں معروف[6] فرملی۔
ان کے حالات دیکھنے سے (جو مختصراً ہم نے فٹ نوٹ میں درج کر دئے ہیں) ایک شخص اچھی طرح معلوم کر سکتا ہے کہ سکندر لودی کا عہد کیسا عجیب و غریب عہد تھا اور امراء و ارکین سلطنت پر خود اس کی سیرۃ کا کیسا زبردست اثر پڑا تھا۔

---

[1] منتخب التواریخ - ۱۵ — [2] اسد خاں، مبارک خاں یوسف خیل کا بیٹا تھا اس کی دریا دلی اور فیاضی کی داستانیں مشہور ہیں تاریخ داؤدی کا مصنف بیان کرتا ہے کہ جب وہ کھانے کے لئے بیٹھتا تو سونے و قیمتی چینی کے قابوں میں ہر قسم کا کھانا الگ کیا جاتا اور ہر قاب پر ایک پان معہ ایک اشرفی کے رکھ کر سب غرباء کو تقسیم کر دیا جاتا۔ اس کے اخلاق کی یہ حالت تھی کہ اپنے خادم سے بھی وہ اسی طرح خطاب کرتا تھا جیسے اپنے کسی ہمسر سے۔

ایک بار اُسے معلوم ہوا کہ شیخ محمد فرملی آج کل عسرت کی حالت میں ہے اور اس کی لڑکی کی شادی ہونے والی ہے۔ اسد خاں نے اسے بلایا اور اپنے غلام کو حکم دیا کہ دونوں مٹھیوں میں اشرفیاں لیکر اس کے دامن میں ڈالدے جب اس کی تعمیل ہو چکی تو اسد خاں نے اشرفیوں کا شمار کرایا۔ معلوم ہوا کہ ستر ہزار تنکہ قیمت کی اشرفیاں ہیں۔ یہ دیکھ کر اسد خاں نے حکم دیا کہ ایک لاکھ تنکہ پورا کر دیا جائے (احمد یادگار نے اس واقعہ کو بھیکن خاں ہفت ہزاری سے منسوب کیا ہے جس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے چالیس مساجد تعمیر کرائیں اور ہر مسجد میں ایک امام اور ایک داعظ مقرر کیا۔ یہ بھی بڑا دریا دل امیر تھا۔ روزانہ سوار ہو کر بازار میں نکلتا اور جب تک ۵۰۰ تنکہ غرباء کو تقسیم نہ کر دیتا گھر واپس نہ آتا)

ایک بار شکار میں کسی دیہاتی نے دہی کسی برتن میں پیش کیا اسد خاں نے اس برتن کو اشرفیوں سے بھروا دیا۔ اسی طرح ایک بار گاؤں کی کوئی عورت نیم کی پتیوں کی ترکاری بنا کر لائی۔ اسد خاں بہت خوش ہوا اور وہ ترکاری لیکر اسکے برتن میں بھی اشرفیاں چھوٹی کا چنوا دیں۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۶۸ پر ملاحظہ ہو)

عہدِ سلطان سکندر کے خاص واقعات میں زلزلۂ آگرہ کا بھی شمار کیا جاتا ہے۔ یہ زلزلہ ۹۱۱ھ (۳ ماہ صفر) کو تمام ہندوستان میں آیا تھا۔ یہ اس قدر شدت کے ساتھ محسوس ہوا کہ لوگوں نے سمجھ لیا کہ قیامت آگئی ہے۔ اس میں جان و مال کا سخت نقصان ہوا۔ تمام مورخین نے اس کا ذکر کیا ہے۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۶۷)

(احمد یادگار نے اس واقعہ کو بھی بہلول خاں سے منسوب کیا ہے) ایک دن اسد خاں گھوڑوں کی خریداری کر رہا تھا اور صدر خاں کو (جو خود بھی امرا میں سے تھا اور اسد خاں کا مخلص دوست تھا) دکھاتا جاتا تھا۔ جب سودا ختم ہوا اور صدر خاں گھر پہونچا تو معلوم ہوا کہ ۱۰۸ گھوڑے جنکی تعریف صدر خاں نے کی تھی اس کے مکان پر موجود ہیں (احمد یادگار نے اس واقعہ کو دولت خاں لودہی سے اور مصنف واقعات مشتاقی نے سید خاں سے منسوب کیا ہے)۔ اسی طرح ایک بار جواہرات کی خریداری میں مصروف تھا۔ سات لاکھ، پانچ لاکھ، تین لاکھ تنکہ کے تین الماس اس نے پسند کئے اتفاق سے ایک شخص وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے کہا کہ تم ان میں سے کسی الماس کو اپنے لئے پسند کرتے ہو؟ اس نے سب سے کم قیمت ہیرے کی طرف اشارہ کیا۔ لیکن اسد خاں نے وہ تینوں الماس اس کو دیدئے (واقعات مشتاقی میں یہ واقعہ سید خاں کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور احمد یادگار دولت خاں لودہی سے متعلق کرتا ہے اور اس قدر اضافہ اور کرتا ہے کہ سلطان سے کسی نے شکایت کی کہ دولت خاں، خزانۂ شاہی کو نہایت بیدردی سے لٹا رہا ہے لیکن سلطان نے جواب دیا کہ "تمھیں مجھے مبارکباد دینی چاہئے کہ ایسے ایسے امرا میرے دربار میں ہیں" اور دولت خاں کو طلب کر کے نگینہ اور چاندپور کے پرگنے جاگیر میں اضافہ کر دئے)

ایک دفعہ سلطان سکندر لودہی نے اسد خاں کو کسی خاص خدمت پر مامور کیا۔ جب یہ چندیری پہونچا تو معلوم ہوا کہ جن جانوروں کی پیٹھ پر خزانہ لدا ہوا ہے وہ بہت مجروح ہو گئے ہیں۔ لوگوں نے تجویز پیش کی کہ سارا روپیہ فوج کو تقسیم کر دیا جائے پھر بعد کو ان کی تنخواہ اور جاگیر سے وضع ہو کر خزانہ میں داخل ہو جائے گا۔ اسد خاں نے منظور کر لیا لیکن جب بعد کو اس کے سامنے حساب پیش کیا گیا تو اس نے کہا میں صراف نہیں ہوں کہ روپیہ دوں اور لوں یہ کہکر اس نے سارے کاغذات پھاڑ ڈالے اور سات لاکھ تنکہ جو فوج کو تقسیم کیا گیا تھا معاف کر دیا۔

۲۔ خان جہاں لودہی کا نام مسند علی حسین خاں تھا۔ اسکی جاگیر بہت بڑی تھی اور میر منشی کے عہدہ پر ممتاز تھا۔ اس نے اپنی تمام عمر میں کبھی کسی سپاہی کی تنخواہ میں کوئی کمی نہیں کی اور نہ جرمانہ کیا۔ جب کوئی ملازم مرتا تھا تو اس کی تنخواہ اس کے بیٹے کے نام منتقل ہوتی تھی۔ اگر بیٹا نہ ہوتا تو بھتیجے یا بھانجے کو دیجاتی اور اگر یہ بھی نہ ہوتے تو وہ ماں یا کسی اور عزیز کو۔ وہ درباداری کو پسند نہ کرتا تھا اور اگر کوئی خادم خلاف اوقات آتا تو اس سے کہتا کہ تم گھر جاؤ کیونکہ میں بھی گھر میں ہوں تمھارے اوپر تمھارے اہل و عیال کے بھی حقوق ہیں انھیں ادا کرو۔ سیر چشمی اور فیاضی بھی اس کی مشہور تھی۔ بندگی میاں ایک دن خلاف معمول ذرا سویرے پہونچے اور کھچڑی کھانے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن جب وہاں سے واپس آئے تو خلعت اور گھوڑے کے سلاوہ ایک گانوں بھی جاگیر میں لیکر آئے۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۶۹ پر ملاحظہ

احتساب نفس اور کفارۂ گناہ

جب بادشاہ بیمار ہوا اور اس نے خیال کیا کہ شاید وہ زندہ نہ رہیگا تو اسنے اپنے مشیر مذہبی شیخ لاون دانشمند سے پوچھا کہ قضائے نماز۔ ترک صیام۔ شراب خوری وغیرہ کا کفارہ کیا ہو سکتا ہے۔ شیخ نے تفصیل لکھ کر بھیجدی۔ سلطان نے

(بقیہ فٹ نوٹ صفحۂ ۲۶۸)

جب خان جہاں لودی کا انتقال ہوا تو سلطان سکندر لودہی نے تمام جاگیر معہ عہدۂ میر بخشی کے میاں زین الدین کو عطا کر دی جو خان جہاں لودہی کا نہایت معتمد علیہ افسر فوج تھا اور خان جہاں کے بیٹے احمد خاں کو ضلع کیتھل میں جاگیر دیکر تین لاکھ تنکہ نقد سالانہ مصارف ملبوس و سواری کے لئے مقرر کر دیا۔ ؁ میاں زین الدین اپنے زہد و اتقاء، فیاضی و اولوالعزمی کے لحاظ سے بے مثل شخص کے طلوع صبح صادق کے وقت یہ بیدار ہوتے اور دوپہر تک عبادت و وظایف میں مشغول رہتے۔ لکھا جاتا ہے کہ روزانہ کم از کم دس منزل کلام مجید کی کھڑے ہو کر ختم کرتے۔

کھانے کے وقت علمائے عصر دستر خوان پر ہوتے اور مسایل علمیہ پر اس وقت گفتگو ہوا کرتی۔ سہ پہر کو انتظامی معاملات کی طرف توجہ کرتے اور پھر نماز مغرب کے وقت سے عشاء تک عبادت میں مشغول رہتے۔ اس کے بعد پھر کھانا کھا کر خلوت میں چلے جاتے۔ شب جمعہ میں وہ کوئی کام سوائے ذکر و شغل کے نہ کرتے۔ ایک شب سلطان سکندر لودہی نے تین آدمی ان کی طلب میں روانہ کئے لیکن یہ نہیں آئے اور سلطان نے بھی کچھ نہیں کہا کیونکہ شب جمعہ میں ان کا گھر سے باہر نکلنا یا کوئی دنیاوی کام کرنا خلاف معمول تھا۔

ان کا دستر خوان بہت وسیع تھا۔ اور دن میں تین بار تازہ کھانا تمام غرباء کو (اور جو شخص آجائے) تقسیم کیا جاتا تھا رمضان بھر افطار و اسحار میں حکم تھا کہ جو شخص آجائے اُسے دودھ چاول کھانے کے لئے دیا جائے ۔ ہر سال وہ اپنے تمام اعزہ کو دہلی سے آگرہ بلاتے اور وقت رخصت ہر شخص کی تمام ضروریات و خواہشات مہیا کرتے ۔ ربیع الاول کی پہلے بارہ دنوں میں دوہزار تنکہ روزانہ کا کھانا پکوا کر غرباء کو تقسیم کرتے۔ اول و آخر دن چار ہزار تنکہ زائد کے خرچ سے حلوا وغیرہ بھی تیار کیا جاتا۔ سلطان سکندر لودہی کی وفات پر میاں زین الدین کی جاگیر وغیرہ سب لے لی گئی اور عسرت بہت بڑھ گئی لیکن اُن کی خوش نیتی اور سیر چشمی کا وہی عالم رہا اور باوجود عسرت و تنگدستی کے تین لاکھ تنکہ کی دستاویزیں چاک کر کے صرف اس لئے ضایع کرا دیں کہ کہیں عسرت کے زمانہ میں مدیون لوگوں سے وصولی روپیہ کا خیال نہ آجائے۔

؁ خواص خاں نہایت بہادر و ذی ہمت افسر تھا۔ سلطان سکندر لودی نے نگرکوٹ کا کوہستانی علاقہ زیر کرنے کے لئے اسکو مامور کیا تھا اسنے بہت جلد یہ تمام صوبہ فتح کر کے دیبی شنکر کا مشہور مندر توڑا اور وہاں سے ہندؤں کا سنگ مقدس اور تانبہ کا چھتر لے آیا۔ پہلے اس نواح کی جاگیریں، صرف ۳ لاکھ تنکہ آمدنی رکھتی تھیں۔ لیکن اس فتح کے بعد ۱۵ لاکھ تک آمدنی بڑھ گئی۔ جب یہ واپس آیا تو بیمار تھا۔ اس نے بادشاہ سے ملنے کی درخواست کی اور حاضر ہو کر تمام حسابات پیش کئے۔ سکندر لودی نے کہا میں نے تمھیں مختار کامل بنا کر بھیجا تھا اور جو کچھ تم نے کیا وہ بالکل درست و بجا ہے۔ میں حسابات دیکھ کر کیا کروں گا۔ چنانچہ بادشاہ نے حساب کے تمام کاغذات پانی میں ڈلوا دئے۔

خواص خاں بڑا معتمد علیہ اور نہایت وفادار و امین افسر تھا۔ اس کے مرنے کے بعد میاں بھورہ کو اس کی جگہ دی گئی۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحۂ ۲۷۰ پر ملاحظہ ہو)

وقائع نگار سے دریافت کیا کہ اس قسم کے گناہ مجھ سے کتنی مرتبہ سرزد ہوئے ہیں جب اس نے بھی تفصیل لکھ دی تو بادشاہ نے حساب لگا کر حکم دیا کہ اس قدر سونا غربا کو دیا جائے لیکن خزانۂ شاہی سے ایک پیسہ نہ لیا جائے۔ علماء کو اس پر حیرت ہوئی کہ بادشاہ کے پاس سلاطین و امرا کی طرف سے جو تحایف آتے تھے وہ علیحدہ رکھے جاتے تھے اور ان کا سالانہ حساب طیار ہوتا تھا۔

انتقال

بادشاہ کا مرض بڑھتا جاتا تھا[1] لیکن وہ اُمور سلطنت سے غافل نہ تھا اور برابر اپنے فرایض انجام دیتا جاتا تھا آخرکار ۷ ذی قعدہ ۹۲۳ھ (نومبر ۱۵۱۷ء) کو اس نے انتقال کیا۔

تاریخ خان جہاں لودی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد کو اس کا جنازہ دہلی گیا اور وہاں ایک باغ میں مدفون ہوا۔

سلطان ابراہیم

۹۲۳ھ سے ۹۳۲ھ تک
۱۵۱۷ء سے ۱۵۲۶ء تک

ابراہیم خاں کی تخت نشینی

سلطان سکندر لودی نے اپنے دو بیٹے چھوڑے، جو حقیقی بھائی ایک ہی ماں سے تھے، بڑے کا نام ابراہیم تھا اور چھوٹے کا نام جلال خاں۔

چونکہ ابراہیم اپنی حسن صفات کی وجہ سے امراء کے طبقہ میں بہت مقبول تھا اور یوں بھی وہ بڑا بیٹا تھا اس لئے

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۶۹)

[1] میاں معروف فرملی بھی، عہد سکندر لودی کا نہایت مشہور امیر تھا اپنے زہد و ورع، ہمت و شجاعت، فیاضی و سخاوت کی وجہ سے بہت ممتاز درجہ رکھتا تھا۔ یہ سلطان لودی کے زمانہ سے لیکر اسلام شاہ کے عہد تک سیکڑوں لڑائیوں میں شریک رہا، لیکن کبھی زخمی نہیں ہوا اس نے تمام عمر کبھی کوئی انعام یا تحفہ بادشاہ کی طرف سے قبول نہیں کیا۔ جب شیر شاہ اور مالدیو کے درمیان جنگ ہوئی تو یہ بھی تلوار سے زخمی ہوا۔ اس وقت اسکی عمر ۱۰۰ سال کی تھی شیر شاہ نے اس کے زخمی ہونے کے بعد سو اشرفیاں اسکے پاس بھیجے لیکن اس نے واپس کر دئے اور کہلا بھیجا کہ میں نے آج تک کبھی سلطانی انعامات کو قبول نہیں کیا کیونکہ جو کچھ مجھے فی الحال ملتا ہے وہ بھی میرے خدمات سے زاید ہے رہا زخم کھانا سو اس کا معاوضہ میں کیا لوں گا جبکہ وہ صرف اللہ کی راہ میں میں نے حاصل کیا ہے۔

[1] تاریخ داؤدی (الیٹ) ۴۰۰/۴-۴۷۱ — [2] مرض یہ تھا کہ تنفس میں دشواری تھی اور غذا وغیرہ ضیق نفس کی وجہ سے ترک ہوگئی تھی۔

سلطان سکندر لودی کی وفات پر وہ نہایت تزک و احتشام کے ساتھ تخت نشین کیا گیا[1]۔ لیکن یہ کہنا کہ تمام امرا سلطنت اس کی تخت نشینی پر دل سے رضامند تھے درست نہ ہوگا۔ کیونکہ اُن میں سے بعض ایسے بھی تھے جو سلطنت میں تفریق پیدا کرکے اپنی اغراض پوری کرنے کی غرض سے یا حقیقتہً ابراہیم سے برہم ہونے کی وجہ سے[2] جلال خاں دوسرے بیٹے کے طرفدار تھے۔

جب ابراہیم تخت نشین ہوگیا تو انھیں امراء نے جو سلطان ابراہیم کی سلطنت کو زیادہ قوی دیکھنا گوارا نہ کرسکتے تھے یہ تجویز پیش کی کہ سلطنت کے دو حصے کر دئیے جائیں۔ ایک حصہ آگرہ سے جونپور تک، جو سلطان ابراہیم کے قبضہ میں رہے اور دوسرا جونپور کا مع اس کے اطراف کے، جو جلال خاں کو ملنا چاہئے۔ چنانچہ فوراً اس تجویز پر عمل ہوگیا اور جلال خاں کو جلال الدین کا لقب دیکر جونپور کی طرف روانہ کردیا[3]۔

فرشتہ کا بیان ہے کہ جلال خاں کالپی میں تھا اور وہ وہیں سے جونپور روانہ ہوگیا اور مسند شاہی پر بیٹھ گیا۔ بہرحال جلال خاں آگرہ سے گیا ہو یا کالپی سے یہ امر متفق علیہ ہے کہ سلطنت کی تفریق ہوگئی اور جونپور کا حصۂ سلطنت جلال خاں کے سپرد کردیا گیا۔

اس کے بعد جب خان جہاں[4] ریپری سے سلطان ابراہیم کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے ملامت کی کہ ایک سلطنت کے دو حصے کردینا کسی طرح مناسب نہیں ہے، چنانچہ سلطان ابراہیم نے ہیبت خاں گرگ انداز کو روانہ کیا کہ وہ کسی طرح لطایف الحیل سے جلال الدین کو لے آوے۔ مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی مجبوراً نواحِ جونپور کے امرا و حکام کو ترغیب دی گئی کہ وہ جلال الدین کی اطاعت نہ کریں۔ چنانچہ ان لوگوں نے اس سے سرتابی اختیار کی اور جلال الدین کو مجبوراً کالپی جانا پڑا۔ یہاں پہونچکر اس نے علانیہ مخالفت شروع کردی اور اپنے نام کا سکہ و خطبہ جاری کردیا اسوقت اعظم ہمایوں سردار، کالنجر[5] کے محاصرہ میں مصروف تھا۔ جلال الدین نے اس کو اپنی بے بسی و بے کسی کے اظہار سے اپنی طرف مائل کرلیا اور یہ قلعۂ کالنجر کا محاصرہ چھوڑ کر جلال الدین سے مل گیا۔ اب جلال الدین کو تقویت پہونچی اور اعظم ہمایوں کے مشورہ سے جونپور کی طرف چلا۔ راستہ میں سلطان ابراہیم کے

---

[1] مخزنِ افاغنہ تاریخ خان جہاں لودی میں تاریخ تخت نشینی ۸ ذیقعدہ ۹۲۳ھ تحریر ہے۔ اور تمام دیگر مورخین کا بھی یہی بیان ہے۔ البتہ احمد یادگار (تاریخ سلاطین افاغنہ کا مصنف) بجائے ۸ ذیقعدہ کے ۸ ذی الحجہ تحریر کرتا ہے جو غالباً درست نہیں ہے۔ کیونکہ سلطان سکندر لودی کی تاریخ وفات محقق طور سے ۷ ذی قعدہ کو وقوع میں آئی اور ظاہر ہے کہ اس کے ایک ماہ بعد رسم تاجپوشی ادا نہیں ہوسکتی بلکہ دوسرے ہی دن دوسرا بادشاہ تخت نشین ہوگیا ہوگا۔ [2] برہم ہونے کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ابراہیم نے جانشین ہوتے ہی اپنے باپ دادا کے خلاف تمام افغان امراء کے ساتھ اپنا طرزِ عمل بدل دیا اور اُن کے ساتھ ایسا سلوک شروع کیا جو اخوانِ سلطنت کے ساتھ نہیں کیا جاتا۔ مثلاً یہ کہ دیگر عام وابستگان کی طرح انھیں بھی دست بستہ تخت کے سامنے کھڑا ہونے پر مجبور کیا۔ [3] سلاطین افاغنہ (الیٹ) ۵-۸-[4] یہ نام فرشتہ، نام نظام الدین احمد اور ملائے بدایونی نے تحریر کیا ہے۔ احمد یادگار نے اعظم ہمایوں لودی اور خانخانان فرملی کا نام تحریر کیا ہے۔

[5] کالنجر تقسیم کے مطابق جلال الدین کے قبضہ میں تھا۔

نظام الدین اور ملا بدایونی (handwritten margin notes, partly illegible)

مقرر کردہ حاکم اودھ (سعید خاں پسر مبارک خاں لودی) سے مقابلہ ہوا۔ یہ بھاگ کر کڑہ کی طرف چلا گیا اور سلطان ابراہیم کو تمام حالات کی اطلاع دی۔

سلطان ابراہیم کا خود مقابلہ

یہ خبریں سنکر سلطان ابراہیم خود ۹۲۳ھ میں مقابلہ کے لئے روانہ ہوا۔ قبل اس کے کہ بادشاہ وہاں تک پہونچتا، اعظم ہمایوں، جلال خاں سے منحرف ہو کر راستہ میں اس سے آکر مل گیا اور جلال خاں اپنے متعلقین کو کالپی میں چھوڑ کر تیس ہزار فوج کے ساتھ آگرہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ لیکن اسے اس میں بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ کالپی بھی مفتوح ہو گیا اور آگرہ پر بھی قبضہ نہ ہو سکا۔ ناچار یہ گوالیار گیا اور وہاں کے راجہ مان سنگھ[1] کی حمایت چاہی۔

جلال الدین کی فراری

شاہی افواج نے گوالیار کا محاصرہ کیا اور بادل گڑھ وغیرہ مسمار کر کے جلال الدین کو یہاں سے بھی بھاگ جانے پر مجبور کر دیا۔

جلال خاں کی گرفتاری اور قتل

جلال خاں اب مالوہ گیا۔ لیکن وہاں کے فرمانروا محمود خلجی نے کچھ زیادہ مدارات نہ کی تو وہ گڑھ کٹنگ کی طرف بھاگ نکلا جہاں گونڈوں نے اسے گرفتار کر کے سلطان ابراہیم لودی کے پاس بھیجدیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ قلعۂ ہانسی میں قید کر دیا جائے۔ لیکن وہاں پہونچنے سے قبل ہی راستہ میں اُسے قتل کرا دیا[2]۔ اس کے بعد جب سلطان ابراہیم لودی ذرا اطمینان سے آگرہ میں بیٹھا تو اس کی بدگمانی اور نخوت بہت زیادہ بڑھ گئی اور انھیں امراء وارکین کے ساتھ بُرا سلوک کرنے لگا جو حقیقتاً مدارِ سلطنت تھے۔ اعظم ہمایوں اور اس کے بیٹے فتح خاں کو بلا کر قید کر دیا۔ میاں بھوا کو جو عہد سکندری کے مشہور امراء میں سے تھے، پابزنجیر کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بغاوتیں رونما ہونے لگیں اور امراء بددل ہو گئے۔ دریا خاں بہار کے حاکم نے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور اس کے بیٹے محمد[3] نے جو دریا خاں کے بعد جانشین ہوا اپنے نام کا خطبہ و سکہ جاری کر دیا۔

تمام امراء جو بادشاہ سے منحرف تھے محمد سے مل گئے اور اس طرح تقریب ایک لاکھ سواروں نے سنبھل تک قبضہ کر لیا۔

دلاور خاں کی بغاوت

اتفاق سے اس زمانہ میں دلاور خاں (دولت خاں لودی حاکم پنجاب کا بیٹا) آگرہ آیا اور بادشاہ کی برہمی کا حال اپنے باپ سے بیان کیا۔ یقیناً دلاور خاں بغاوت نہ کرتا اگر وہ بادشاہ کی بے وجہ برہمی سے خائف نہ ہوتا۔ اس نے مفر اسی میں دیکھا کہ وہ اس سے الگ ہو جائے۔ چنانچہ اس نے بھی بغاوت شروع کر دی اور بابر کو ہندوستان آنے کی دعوت دی۔

بابر کا حملہ

اس کا نتیجہ پانی پت کی وہ مشہور لڑائی تھی جس نے سلطان ابراہیم کو ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر کے اور بابر کو

---

[1] مان سنگھ نہایت بہادر راجہ تھا لیکن اتفاق سے جلال خاں کے پہونچنے پر وہ مر گیا اور اس کا بیٹا بکرماجیت جانشین ہوا۔

[2] فرشتہ ۱۹۰۔ طبقات ۱۷۷۔ سلاطین افاغنہ (الیٹ) ۵-۱۳۔

[3] فرشتہ نے اس کا نام غازی خاں اور منتخب التواریخ میں خانخاناں لکھا ہے۔

[4] چونکہ یہ جنگ بابر کا مشہور کارنامہ ہے اس لئے اس کی مفصل کیفیت اس کے حالات میں درج کی جائے گی۔

دہلی کا فرمانروا بنا کے ۹۳۲ھ؁ میں ہندوستان کی سلطنت چغتائیہ تیموریہ خاندان میں منتقل کر دی۔

سلطان ابراہیم نے کل ۹ سال تک سلطنت کی (جس کو فرشتہ نے خدا جانے کس حساب سے بیس سال تحریر کیا ہے) اور اس کے دوران حکومت میں اگر کوئی خاص بات نظر آتی ہے تو وہ غیر معمولی ارزانی ہے۔

مصنف تاریخ داؤدی کا بیان ہے کہ سلطان بہرام کے عہد میں، غلہ، کپڑا اور تمام چیزیں ایسی ارزاں تھیں کہ اس سے قبل کبھی نظر نہیں آئیں۔ سلطان علاء الدین خلجی کے عہد میں جو ارزانی تھی وہ جبر و سختی سے پیدا ہوئی تھی لیکن ابراہیم کے زمانہ میں پیداوار اس قدر کثرت سے ہوتی تھی کہ لوگ خود ارزاں فروخت کرنے پر مجبور تھے۔ سکندر لودی کے وقت میں بھی ارزانی بہت تھی، لیکن نہ اس قدر۔ اس کے عہد میں ایک بہلولی سکہ[1] کا دس من غلہ آتا تھا، پانچ سیر گھی اور دس گز کپڑے کی قیمت بھی ایک بہلولی تھی۔ علاوہ ان کے اور تمام اشیاء کی ارزانی کا بھی یہی عالم تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ بارش کی موزونی سے وہ چند غلہ پیدا ہونے لگا اور بادشاہ نے حکم دیدیا کہ لگان میں بجائے روپیہ کے غلہ وصول کیا جائے جس نے سکہ کی قیمت کو گھٹا دیا اور امراء و جاگیرداروں کو مجبور کر دیا کہ اپنے اپنے اقطاع کا غلہ نہایت ارزاں قیمت پر فروخت کریں۔ ایک معزز آدمی معہ اپنے خاندان کے پانچ تنکہ ماہوار کی آمدنی میں نہایت امن و راحت سے زندگی بسر کرتا تھا اور اگر کوئی سوار[2] دہلی سے آگرہ تک کا سفر کرتا تو صرف ایک بہلولی سکہ اس کے، اس کے گھوڑے اور سائیس کے مصارف کے لئے کافی ہوتا تھا۔[3]

---

[1] تانبہ کا سکہ تقریباً پونے دو تولہ کے برابر۔

[2] سوار کی تنخواہ بیس سے تیس تنکہ تک تھی اور اس سے اُس عہد کی خوشحالی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

[3] تاریخ داؤدی (الیٹ)۔ ۴ - ۷۵ - ۴۷۶ ...

عہدِ لودی میں ارزانی

ہندوستان ۹۳۲ھ (۱۵۲۵ء) میں

حملۂ بابر کے وقت

راجپوتانہ

مالوہ

گجرات

وجیانگر

۷۰ ۷۵ ۸۰ ۸۵ ۹۰

پتہ:- منیجر

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

ترغیبات جنسی (یا) شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات انکی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کیساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جسمیں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے

قیمت تین روپیہ (سے ر) علاوہ محصول

خریداران نگار سے ایک روپیہ کم

مجموعۂ استفسار و جواب ۳ جلد

ان تینوں جلدوں میں سنہ ۲۲ء سے لیکر سنہ ۳۶ء تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان تینوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی، مسایل شامل ہیں اور اسکی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلو پیڈیا کی ہے۔

قیمت فی جلد تین روپیہ (سے ر) علاوہ محصول

خریداران نگار سے فی جلد ایکروپیہ کم

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت علاوہ محصول بارہ آنہ (۱۲؍)

خریداران نگار سے تین آنہ (۳؍) کم

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں:-

۱- چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔

۲- مادئین کا مذہب۔

۳- حرکت کے کرشمے۔

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے چار آنہ (۴؍) کم

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ، حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ فسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کا نظیر نہیں مل سکتی۔

قیمت دس آنے (۱۰؍)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے دو آنہ (۲؍) کم

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص با آسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت، عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے چار آنہ (۴؍) کم

مذاکرات نیاز

یہ ہے حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اسکو شروع کر دینا آخیر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔

قیمت بارہ آنے (۱۲؍)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے تین آنہ (۳؍) کم

گہوارۂ تمدن

یہ وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جس میں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیائے تہذیب و شائستگی اس کی کس قدر ممنون ہے اردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی مصنف کو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔

قیمت دو روپیہ (عـ؍)

علاوہ محصول

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴